

التَّحْقِيقُ

(٤٤)

التحریم

نام پہلی ہی آیت کے الفاظ **لَعَلَّكُمْ تَحْرَمُونَ** سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ اس نام سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ سورہ ہے جس میں تحریم کے واقعہ کا ذکر آیا ہے۔

زمانہ نزول اس میں تحریم کے جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق احادیث کی روایات میں دو خواتین کا ذکر آیا ہے جو اُس وقت حضور کے حرم میں تھیں۔ ایک حضرت صفیہؓ دوسری حضرت ماریہ قبطیہؓ ان میں سے ایک، یعنی حضرت صفیہؓ فتح خیبر کے بعد حضور کے نکاح میں آئیں، اور خیبر کی فتح بالاتفاق سحر میں ہوئی ہے۔ دوسری خاتون حضرت ماریہ کو سحر میں مصر کے فرمانروا منقوس نے حضور کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور اُن کے بطن سے ذی الحجہ ۸ھ میں حضور کے فرزند حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے یہ بات قریب قریب متعین ہو جاتی ہے کہ اس سورہ کا نزول سحر یا سحر کے دوران میں کسی وقت ہوا ہے۔

موضوع اور مباحث یہ ایک بڑی اہم سورہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے متعلق بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند مہمات مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عام انسان تو درکنار خود اللہ کے نبی کی طرف بھی اُن کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اُس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو، یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطور خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز نبی بھی نہیں ہے کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ انسانی معاشرہ میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ اقدام بھی منشاءِ الہی سے ہٹا ہوا

نہ ہو۔ ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشاء الہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

تیسری بات جو مذکورہ بالا نکتہ سے خود بخود نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ذرا سی بات پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک دیا گیا اور نہ صرف اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اسے ربیکار ٹر پر بھی لے آیا گیا، تو یہ چیز قطعی طور پر ہمارے دل میں یہ اطمینان پیدا کرتی ہے کہ حضور کی حیاتِ طیبہ میں جو اعمال و افعال اور جو احکام و ہدایات بھی ہمیں اب ملتے ہیں، اور جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت یا اصلاح ربیکار ٹر پر موجود نہیں ہے، وہ سراسر برحق ہیں، اللہ کی مرضی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں، اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ ان سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

چوتھی بات جو اس کلام میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس رسولِ مقدس کی عزت و حرمت کو اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کے حق میں لازمہ ایمان قرار دیتا ہے اُس کے متعلق اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ اللہ کی حلال کی ہوئی ایک چیز اپنے اوپر حرام کر لی۔ اور جن ازواجِ مطہرات کو اللہ تعالیٰ خود تمام اہل ایمان کی ماں قرار دیتا ہے اور جن کے احترام کا اس نے خود مسلمانوں کو حکم دیا ہے انہی کو اس نے بعض غلطیوں پر اس سورہ میں شدت سے تنبیہ فرمائی ہے پھر نبی پر یہ گرفت اور ازواجِ مطہرات کو یہ تنبیہ بھی خفیہ طور پر نہیں کی گئی بلکہ اُس کتاب میں درج کر دی گئی جسے تمام امت کو ہمیشہ ہمیشہ تلاوت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں اس ذکر کا منشا نہ یہ تھا، نہ یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اہل ایمان کو اہل ایمان کی نگاہوں سے گرا دینا چاہتا تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی یہ سورۃ پڑھ کر کسی مسلمان کے دل سے ان کا احترام اٹھ نہیں گیا ہے۔ اب قرآن میں یہ ذکر لانے کی مصلحت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اپنے بزرگوں کے احترام کی صحیح حدوں سے آشنا کرنا چاہتا ہے، نبی ہے، خدا نہیں ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہ ہو۔ نبی کا احترام اس بنا پر نہیں ہے کہ اس سے لغزش کا صدور ناممکن ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مرضی الہی کا مکمل نمائندہ ہے اور اس کی ادنیٰ سی لغزش کو بھی اللہ نے اصلاح کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے جس سے ہمیں یہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ نبی کا چھوڑا ہوا اُسوۂ حسنہ اللہ کی مرضی کی پوری نمائندگی کر رہا ہے اسی طرح

صحابہ کرام ہوں یا ازواج مطہرات، یہ سب انسان تھے، فرشتے یا فوق البشر نہ تھے۔ اُن سے غلطیوں کا صدور ہو سکتا تھا۔ اُن کو جو مرتبہ بھی حاصل ہوا اس وجہ سے ہوا کہ اللہ کی رہنمائی اور اللہ کے رسول کی تربیت نے ان کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ اُن کا جو کچھ بھی احترام ہے اسی بنا پر ہے، نہ کہ اس مفروضے پر کہ وہ کچھ ایسی ہستیاں تھیں جو غلطیوں سے بالکل مبرا تھیں۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ یا ازواج مطہرات سے بشریت کی بنا پر جب بھی کسی غلطی کا صدور ہوا اُس پر ٹوکا گیا۔ اُن کی بعض غلطیوں کی اصلاح حضور نے کی جس کا ذکر احادیث میں بکثرت مقامات پر آیا ہے۔ اور بعض غلطیوں کا ذکر قرآن مجید میں کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ان کی اصلاح کی تاکہ مسلمان کبھی بزرگوں کے احترام کا کوئی ایسا مبالغہ آمیز تصور نہ قائم کر لیں جو انہیں انسانیت کے مقام سے اٹھا کر دیویوں اور دیوتاؤں کے مقام پر پہنچا دے۔ آپ قرآن پاک کا مطالعہ آنکھیں کھول کر کریں تو اس کی پے درپے مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ سورہ آل عمران میں جنگ اُحد کا ذکر کرتے ہوئے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا:

”اللہ نے (تا یبدا نصرت) کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا جبکہ اُس کے اذن سے تم اُن کو قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جو نبی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم حکم کی نافرمانی کر بیٹھے، تم میں سے کوئی دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا طلب گار، تب اللہ نے تمہیں اُن کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا، اللہ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے“ (آیت ۱۵۲)۔

سورہ نور میں حضرت عائشہ پر نہمت کا ذکر کرتے ہوئے صحابہ سے فرمایا گیا:

”ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت مومن مرد اور عورتیں، سب اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو صریح بہتان ہے؟... اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آ لیتا۔ ذرا غور کرو، جب تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس قصے کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے؟ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو“ (آیات ۱۲ تا ۱۱)۔

سورہ احزاب میں ازواج مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

”اے نبی اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طلبگاہ ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے“ (آیات ۲۸-۲۹)۔

سورہ جمدہ میں صحابہ کے متعلق فرمایا:

”جب انہوں نے کاروبار تجارت یا کھیل نماشا دیکھا تو اس کی طرف دوڑ گئے اور (اے نبی) تم کو (خطبے میں) کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل نماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے“ (آیت ۱۱)۔

سورہ مُنْتَحَنہ میں ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعنہ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی کہ انہوں نے فتح مکہ سے پہلے حضور کے حملے کی خفیہ اطلاع کفارِ قریش کو بھیج دی تھی۔ یہ ساری مقالیں خود قرآن میں موجود ہیں، اسی قرآن میں جس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ اور ازواجِ مطہرات کے فضل و شرف کو خود بیان فرمایا ہے اور انہیں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہم کا پروانہ خوشنودی عطا فرمایا ہے۔ بزرگوں کے احترام کی یہی مبنی براعتدالِ تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کو انسان پرستی کے اُس صدادیر میں گرنے سے بچایا جس میں یہود و نصاریٰ گر گئے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حدیث، تفسیر اور تاریخ کے موضوعات پر جن اکابر اہل سنت نے کتابیں مرتب کی ہیں ان میں جہاں صحابہ کرام اور ازواجِ مطہرات اور دوسرے بزرگوں کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں، ان کی کمزوریوں اور لغزشوں اور غلطیوں کے واقعات بیان کرنے میں کبھی تاثر نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ آج کے مدعیانِ احترام کی یہ نسبت وہ ان بزرگوں کے زیادہ قدر شناس تھے اور ان سے زیادہ حدودِ احترام کو جانتے تھے۔

پانچویں بات جو اس سورہ میں کھول کر بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین بالکل بے لاگ ہے۔ اس میں ہر شخص کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کا وہ اپنے ایمان اور اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی کے ساتھ نسبت بھی اس کے لیے قطعاً نافع نہیں ہے اور کسی بڑی سے بڑی ہستی کے ساتھ نسبت بھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس معاملہ میں خاص طور پر ازواجِ مطہرات کے سامنے تین قسم کی عورتوں کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثال حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کی ہے، جو اگر ایمان لاتیں اور اپنے جلیل القدر شوہروں کا ساتھ دیتیں تو ان کا مقام امتِ مسلمہ میں وہی ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے اس کے برعکس رویہ اختیار کیا، اس لیے انبیاء کی بیویاں ہونا ان کے کچھ کام نہ آیا اور وہ جہنم کی مستحق ہوئیں۔ دوسری مثال فرعون کی بیوی کی ہے، جو اگرچہ ایک بدترین دشمن خدا کی بیوی تھیں، لیکن چونکہ وہ ایمان

لے آئیں اور انہوں نے قوم فرعون کے عمل سے اپنے عمل کا راستہ الگ کر لیا، اس لیے فرعون جیسے
اکفر الکافرین کی بیوی ہونا بھی اُن کے لیے کسی نقصان کا موجب نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کا
مستحق بنا دیا۔ تیسری مثال حضرت مریم علیہا السلام کی ہے جنہیں یہ مرتبہ عظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے
جس شدید آزمائش میں انہیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا اس کے لیے انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ حضرت
مریم کے سوا دنیا میں کسی شریف اور نیک لڑکی کو کبھی ایسی سخت آزمائش میں نہیں ڈالا گیا کہ کنوارے بچے
کی حالت میں اللہ کے حکم سے اس کو معجزے کے طور پر حاملہ کر دیا گیا ہو اور اُسے بتا دیا گیا ہو کہ اُس
کا رب اُس سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے جب حضرت مریم نے اس پر کوئی واویلانا کیا بلکہ ایک سچی
سومنہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ برداشت کرنا قبول کر لیا جو اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لیے برداشت
کرنا ناگزیر تھا، نب اللہ نے ان کو سیدۃ النساء فی الجنتہ مستندہ احمد کے مرتبہ عالی پر سرفراز فرمایا۔
ان امور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت جو اس سورہ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرت وہی علم نہیں آتا تھا جو قرآن میں درج ہوا ہے، بلکہ آپ
کو وحی کے ذریعہ سے دوسری باتوں کا علم بھی دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی صریح
دلیل اس سورہ کی آیت ۳ ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات میں سے
ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور انہوں نے وہ کسی اور کو بتا دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کو مطلع کر دیا۔ پھر جب حضور نے اس غلطی پر اپنی اُن بیوی کو تنبیہ فرمائی، اور انہوں نے پوچھا کہ آپ
کو میری یہ غلطی کس نے بتائی تو حضور نے جواب دیا کہ مجھے علیم وخبیر ہستی نے اس کی خبر دی ہے۔ اب سوال
یہ ہے کہ پورے قرآن میں کہاں وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ ”اے نبی، تم نے اپنی بیوی سے
راز میں جو بات کہی تھی وہ اُس نے کسی اور پر، یا فلاں شخص پر ظاہر کر دی ہے“؟ اگر ایسی کوئی آیت قرآن
میں نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی
اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس سے منکرین حدیث کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہو جاتا ہے
کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی تھی۔



آيَاتُهَا ۱۲

سُورَةُ التَّحْرِيمِ مَدَنِيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تَحْرِمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ
أَزْوَاجِكَ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ

اسے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ کیا اس لیے کہ تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ — اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تم لوگوں کے لیے

۱۵۔ یہ دراصل استفہام نہیں ہے بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے یعنی مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرنا نہیں ہے کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا ہے، بلکہ آپ کو اس بابت پر متنبہ کرنا ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا جو فعل آپ سے صادر ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال کیا ہے اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں رکھتے۔ اگرچہ حضور نے اس چیز کو نہ عقیدۃً حرام سمجھا تھا اور نہ اسے شرعاً حرام قرار دیا تھا، بلکہ صرف اپنی ذات پر اس کے استعمال کو حرام کر لیا تھا، لیکن چونکہ آپ کی حیثیت ایک عام آدمی کی نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی تھی، اور آپ کے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے سے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ امت بھی اس شے کو حرام یا کم از کم مکروہ سمجھنے لگے، یا امت کے افراد یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس فعل پر گرفت فرمائی اور آپ کو اس تحریم سے باز رہنے کا حکم دیا۔

۱۶۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور نے تحریم کا یہ فعل خود اپنی کسی خواہش کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ آپ کی بیویوں نے یہ چاہا تھا کہ آپ ایسا کریں اور آپ نے محض ان کو خوش کرنے کے لیے ایک حلال چیز اپنے لیے حرام کر لی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کے اس فعل پر ٹوکنے کے ساتھ اس کی اس وجہ کا ذکر خاص طور پر کیوں فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اگر مقصود کلام صرف تحریم حلال سے آپ کو باز رکھنا ہوتا تو یہ مقصد پہلے فقرے سے پورا ہو جاتا تھا اور اس کی ضرورت نہ تھی کہ جس وجہ سے آپ نے یہ کام کیا تھا اس کی بھی تصریح کی جاتی۔ اس کو بطور خاص بیان کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصد صرف حضور ہی کو تحریم حلال پر ٹوکنا نہیں تھا بلکہ ساتھ ساتھ ازواج مطہرات کو بھی اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ انہوں نے ازواج نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی نازک ذمہ داریوں کا احساس نہ کیا

اور حضور سے ایک ایسا کام کرا دیا جس سے ایک حلال چیز کے حرام ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔

اگرچہ قرآن میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ چیز کیا تھی جسے حضور نے اپنا اور پر حرام کیا تھا، لیکن محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں دو مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس آیت کے نزول کا سبب بنے۔ ایک واقعہ حضرت مارثہ قبظیہ کا ہے اور دوسرا واقعہ یہ کہ آپ نے شہدا استعمال نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

حضرت مارثہ کا قصہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط

اطراف و نواح کے بادشاہوں کو بھیجے تھے اُن میں سے ایک اسکندریہ کے رومی بطریق (Patriarch)

کے نام بھی تھا جسے عرب مقوقس کہتے تھے۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعنہ یہ نامہ گرامی لے کر جب اس کے پاس پہنچے

تو اُس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر اُن کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ ”مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک

نبی آنا بھی باقی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے اچھی کے ساتھ احترام سے

پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قبظیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں“ (ابن سعد)۔

اُن لڑکیوں میں سے ایک میزبن تھیں اور دوسری ماریہ (عیسائی حضرت مریم کو ماریہ Mary کہتے ہیں)۔

مصر سے واپسی پر راستہ میں حضرت حاطب نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے سیرین کو حضرت حسان بن ثابت کی ملک میں دے دیا

اور حضرت ماریہ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ ۳ھ میں انہی کے بطن سے حضور کے صاحبزادے ابراہیم

پیدا ہوئے (الاستیعاب - الاصابہ)۔ یہ خاتون نہایت خوبصورت تھیں۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں ان کے

متعلق حضرت عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”مجھے کسی عورت کا آنا اس قدر ناگوار نہ ہوا جتنا ماریہ کا آنا ہوا تھا،

کیونکہ وہ حسین و جمیل تھیں اور حضور کو بہت پسند آئی تھیں۔ ان کے بارے میں متعدد طریقوں سے جو قصہ

احادیث میں نقل ہوا ہے وہ مختصر یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حفصہ کے مکان میں

تشریف لے گئے اور وہ گھر پر موجود نہ تھیں۔ اُس وقت حضرت ماریہ آپ کے پاس دبا آگئیں اور تخلیہ میں

آپ کے ساتھ رہیں۔ حضرت حفصہ کو یہ بات ناگوار کزری اور انہوں نے حضور سے اس کی سخت شکایت کی۔ اس پر

آپ نے اُن کو راضی کرنے کے لیے اُن سے یہ عہد کر لیا کہ آئندہ ماریہ سے کوئی ازدواجی تعلق نہ رکھیں گے۔ بعض روایات

میں یہ ہے کہ آپ نے ماریہ کو اپنے اور پر حرام کر لیا، اور بعض میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے اس پر قسم بھی کھائی تھی۔

یہ روایات زیادہ تر تابعین سے مُرسلاً نقل ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے بعض حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباس اور

حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہیں۔ ان کی کثرت طروق کو دیکھتے ہوئے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں یہ خیال

ظاہر کیا ہے کہ اس قصے کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔ مگر صحاح ستہ میں سے کسی میں بھی یہ قصہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔

نسائی میں حضرت انس سے صرف اتنی بات منقول ہوئی ہے کہ ”حضور کی ایک لونڈی تھی جس سے آپ منع فرماتے

تھے۔ پھر حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ آپ کے چھپے پڑ گئیں یہاں تک کہ آپ نے اُسے اپنے اور پر حرام کر لیا۔ اس

پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اُسے بھی تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جسے اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے۔
 دوسرا واقعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور دوسری متعدد کتب حدیث میں خود حضرت عائشہ سے جس طرح
 نقل ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ہر روز عصر کے بعد تمام ازواجِ مطہرات کے
 ہاں چکر لگاتے تھے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ آپ حضرت زینب بنت جحش کے ہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے،
 کیونکہ ان کے ہاں کہیں سے شہد آیا ہوا تھا، اور حضور کو شیرینی بہت پسند تھی، اس لیے آپ ان کے ہاں شہد کا شکر
 نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ مجھ کو اس پر رشک لاحق ہوا اور میں نے حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ،
 اور حضرت صفیہؓ سے مل کر یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپ آئیں وہ آپ سے یہ کہے کہ آپ کے منہ
 سے مغفیر کی بو آتی ہے۔ مغفیر ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جس میں کچھ پانہ ہوتی ہے اور اگر شہد کی مکھی اس سے
 شہد حاصل کرے تو اس کے اندر بھی اس پانہ کا اثر آجاتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حضور نہایت نفاست
 پسند ہیں اور آپ کو اس سے سخت نفرت ہے کہ آپ کے اندر کسی قسم کی بدبو پائی جائے۔ اس لیے آپ کو حضرت
 زینبؓ کے ہاں ٹھہرنے سے روکنے کی خاطر یہ تدبیر کی گئی اور یہ کارگر ہوئی۔ جب متعدد بیویوں نے آپ سے کہا
 کہ آپ کے منہ سے مغفیر کی بو آتی ہے تو آپ نے عہد کر لیا کہ اب یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔ ایک روایت
 میں آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ فَلَئِنْ اَعُوذَ لَهٗ وَ قَدْ حَلَفْتُ "اب میں ہرگز اسے نہ پیونگا، میں نے قسم کھالی ہے"
 دوسری روایت میں صرف فَلَئِنْ اَعُوذَ لَهٗ کے الفاظ ہیں، و قد حلفت کا ذکر نہیں ہے۔ اور ابن عباسؓ
 سے جو روایت ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردودہ نے نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ وَاللّٰهِ
 لَا اَشْرُبُ لَهٗ، "خدا کی قسم میں اسے نہ پیونگا۔"

اکابر اہل علم نے ان دونوں قصوں میں سے اسی دوسرے قصے کو صحیح قرار دیا ہے اور پہلے قصے کو ناقابل
 اعتبار ٹھہرایا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ "شہد کے معاملہ میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نہایت صحیح ہے، اور حضرت
 مارثیہؓ کو حرام کر لینے کا قصہ کسی عمدہ طریقہ سے نقل نہیں ہوا ہے۔" قاضی عیاض کہتے ہیں "صحیح یہ ہے کہ یہ آیت
 مارثیہؓ کے معاملہ میں نہیں بلکہ شہد کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔" قاضی ابوبکر ابن العزنی بھی شہد ہی کے قصے کو
 صحیح قرار دیتے ہیں، اور سیارائے امام نووی اور حافظ بدرالدین عینی کی ہے۔ ابن ہمام فتح القدير میں کہتے ہیں کہ
 "شہد کی تحریم کا قصہ صحیحین میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا تھا، اس لیے یہ زیادہ
 قابل اعتبار ہے۔" حافظ ابن کثیر کہتے ہیں: "صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینے کے بارے
 میں نازل ہوئی ہے۔"

۷ یعنی بیویوں کی خوشی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام کر لینے کا جو فعل آپ سے صادر ہوا ہے یا اگرچہ آپ
 کے اہم ترین ذمہ دارانہ منصب کے لحاظ سے مناسب نہ تھا، لیکن یہ کوئی گناہ بھی نہ تھا کہ اس پر مواخذہ کیا جائے۔ اس
 لیے اللہ تعالیٰ نے صرف ٹوک کر اس کی اصلاح کر دینے پر اکتفا فرمایا اور آپ کی اس لغزش کو معاف کر دیا۔

تَحِلَّةَ اٰیْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيْمُ ۝۲

اپنی قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور وہی علیم و حکیم ہے

۸۶ مطلب یہ ہے کہ کفارہ دے کر قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ، آیت ۸۹ میں مقرر کر دیا ہے اس کے مطابق عمل کر کے آپ اُس عہد کو توڑ دیں جو آپ نے ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہاں ایک اہم فقہی سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ حکم اُس صورت کے لیے ہے جبکہ آدمی نے قسم کھا کر حلال کو حرام کر لیا ہو، یا بجائے خود تحریم ہی قسم کی ہم معنی ہے خواہ قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں؟ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ محض تحریم قسم نہیں ہے۔ اگر آدمی نے کسی چیز کو، خواہ وہ بیوی ہو یا کوئی دوسری حلال چیز، قسم کھا کر بغیر اپنے اوپر حرام کر لیا ہو تو یہ ایک لغو بات ہے جس سے کوئی کفارہ لازم نہیں آتا، بلکہ آدمی کفارہ کے بغیر ہی وہ چیز استعمال کر سکتا ہے جسے اُس نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے مشروق، شعبی، ربیعہ اور ابو سلمہ کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور تمام ظاہر توں نے اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک تحریم صرف اُس صورت میں قسم ہے جبکہ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرتے ہوئے قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ان کا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ حلال چیز کو اپنے لیے حرام کرنے کے ساتھ قسم بھی کھائی تھی، جیسا کہ متعدد روایات میں بیان ہوا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا کہ ہم نے قسموں کی پابندی سے نکلنے کا جو طریقہ مقرر کر دیا ہے اس پر آپ عمل کریں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم کے الفاظ استعمال کیے بغیر کسی چیز کو حرام کر لینا بجائے خود قسم تو نہیں ہے، مگر بیوی کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ دوسری اشیاء، مثلاً کسی کپڑے یا کھانے کو آدمی نے اپنے اوپر حرام کر لیا ہو تو یہ لغو ہے، کوئی کفارہ دیے بغیر آدمی اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اگر بیوی یا لونڈی کے لیے اس نے کہا ہو کہ اُس سے مباشرت میرے اوپر حرام ہے، تو وہ حرام تو نہ ہوگی، مگر اس کے پاس جانے سے پہلے کفارہ یمن لازم آئے گا۔ یہ رائے شافعیہ کی ہے (مفہم المحتاج)۔ اور اسی سے ملتی جلتی رائے مالکیہ کی بھی ہے (احکام القرآن لابن العزنی)۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ تحریم بجائے خود قسم ہے خواہ قسم کے الفاظ استعمال نہ کیے گئے ہوں۔ یہ رائے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عائشہ، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی ہے۔ اگرچہ ابن عباس سے ایک دوسری رائے بخاری میں یہ نقل ہوئی ہے کہ اذا حرم ما امر آتہ فلیس بشیء (اگر آدمی نے اپنی بیوی کو حرام کیا ہو تو یہ کچھ نہیں ہے)، مگر اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ اُن کے نزدیک یہ طلاق نہیں بلکہ قسم ہے اور اس پر کفارہ ہے، کیونکہ بخاری، مسلم، اور ابن ماجہ میں

ابن عباس کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ حرام قرار دینے کی صورت میں کفارہ ہے، اور نساہی میں روایت ہے کہ ابن عباس سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا ”وہ تیرے اوپر حرام تو نہیں ہے مگر تجھ پر کفارہ لازم ہے“ اور ابن جریر کی روایت میں ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: ”اگر لوگوں نے اپنے اوپر کسی چیز کو حرام کیا ہو جسے اللہ نے حلال کیا ہے تو ان پر لازم ہے کہ اپنی قسموں کا کفارہ ادا کریں۔“ یہی رائے حسن بصری، عطاء، طاؤس، سلیمان بن یسار، ابن جریر اور قتادہ کی ہے، اور اسی رائے کو حنفیہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو بکر جعفاں کہتے ہیں کہ ”آیت لِحَرْمِ مِمَّا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ کے ظاہر الفاظ اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریم کے ساتھ ساتھ قسم بھی کھائی تھی، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ تحریم ہی قسم ہے، کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی تحریم کے معاملہ میں قسم کا کفارہ واجب فرمایا۔“ آگے چل کر پھر کہتے ہیں ”ہمارے اصحاب (یعنی حنفیہ) نے تحریم کو اس صورت میں قسم قرار دیا ہے جبکہ اس کے ساتھ طلاق کی نیت نہ ہو۔ اگر کسی شخص نے بیوی کو حرام کہا تو گویا اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤں گا، اس لیے وہ ایلاء کا مرتکب ہوا۔ اور اگر اس نے کسی کھانے پینے کی چیز وغیرہ کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو گویا اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم میں وہ چیز استعمال نہ کروں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ فرمایا کہ آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے، اور پھر فرمایا کہ اللہ نے تم لوگوں کے لیے قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تحریم کو قسم قرار دیا اور تحریم کا لفظ اپنے مفہوم اور حکم شرعی میں قسم کا ہم معنی ہو گیا۔“

اس مقام پر فائدہ عام کے لیے یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے، اور بیوی کے سوا دوسری چیزوں کو حرام کر لینے کے معاملہ میں فقہاء کے نزدیک شرعی حکم کیا ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر طلاق کی نیت کے بغیر کسی شخص نے بیوی کو اپنے لیے حرام کیا ہو، یا قسم کھائی ہو کہ اس سے مُقَارَبَت نہ کرے گا، تو یہ ایلاء ہے اور اس صورت میں مُقَارَبَت سے پہلے اسے قسم کا کفارہ دینا ہو گا لیکن اگر اس نے طلاق کی نیت سے یہ کہا ہو کہ تو میرے اوپر حرام ہے تو معلوم کیا جائے گا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ اگر تین طلاق کی نیت تھی تو تین واقع ہونگی اور اگر اس سے کم کی نیت تھی، خواہ ایک کی نیت ہو یا دو کی، تو دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق وارد ہوگی۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ جو کچھ میرے لیے حلال تھا وہ حرام ہو گیا، تو اس کا اطلاق بیوی پر اس وقت تک نہ ہو گا جب تک اس نے بیوی کو حرام کرنے کی نیت سے یہ الفاظ نہ کہے ہوں۔ بیوی کے سوا دوسری کسی چیز کو حرام کرنے کی صورت میں آدمی اس وقت تک وہ چیز استعمال نہیں کر سکتا جب تک قسم کا کفارہ ادا نہ کر دے (بدائع الصنائع، ہدایہ، فتح القدر، احکام القرآن للجصاص)۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ بیوی کو اگر طلاق یا ظہار کی نیت سے حرام کیا جائے تو جس چیز کی نیت ہوگی وہ واقع ہو جائے گی۔ زوجی طلاق کی نیت ہو تو زوجی، بائن کی نیت ہو تو بائن، اور ظہار کی نیت ہو تو ظہار اور اگر کسی طلاق و ظہار دونوں کی نیت سے تحریم کے الفاظ استعمال کیے ہوں تو اس سے کہا جائے گا کہ دونوں میں سے

کسی ایک چیز کو اختیار کرے۔ کیونکہ طلاق و ظہار، دونوں بیک وقت ثابت نہیں ہو سکتے۔ طلاق سے نکاح زائل ہوتا ہے، اور ظہار کی صورت میں وہ باقی رہتا ہے۔ اور اگر کسی نیت کے بغیر مطلقاً بیوی کو حرام قرار دیا گیا ہو تو وہ حرام نہ ہوگی مگر قسم کا کفارہ لازم آئے گا۔ اور اگر بیوی کے سوا کسی اور چیز کو حرام قرار دیا ہو تو یہ لغو ہے، اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے (مغنی المحتاج)۔

مالکیہ کہتے ہیں کہ بیوی کے سوا دوسری کسی چیز کو آدمی اپنے اوپر حرام کرے تو نہ وہ حرام ہوتی ہے اور نہ اسے استعمال کرنے سے پہلے کوئی کفارہ لازم آتا ہے۔ لیکن اگر بیوی کو کہہ دے کہ تو حرام ہے، یا میرے لیے حرام ہے، یا میں تیرے لیے حرام ہوں، تو خواہ مدخولہ سے یہ بات کہے یا غیر مدخولہ سے، ہر صورت میں یہ تین طلاق ہیں، الایہ کہ اس نے تین سے کم کی نیت ہو۔ اہلبغ کا قول ہے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ جو کچھ مجھ پر حلال تھا وہ حرام ہے تو جب تک وہ بیوی کو مستثنیٰ نہ کرے، اس سے بیوی کی تحریم بھی لازم آجائے گی۔ المدخولہ میں مدخولہ اور غیر مدخولہ کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ مدخولہ کو حرام کہہ دینے سے تین ہی طلاقیں پڑیں گی، خواہ نیت کچھ بھی ہو، لیکن غیر مدخولہ کے معاملہ میں اگر نیت کم کی ہو تو جتنی طلاقوں کی نیت کی گئی ہے اتنی ہی پڑیں گی، اور کسی خاص تعداد کی نیت نہ ہو تو پھر یہ تین طلاقیں ہوں گی (حاشیۃ الدسوقی)۔ قاضی ابن العربی نے احکام القرآن میں اس مسئلے کے متعلق امام مالکؒ کے تین قول نقل کیے ہیں۔ ایک یہ کہ بیوی کی تحریم ایک طلاق بائن ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ تین طلاق ہیں۔ تیسرا یہ کہ مدخولہ کے معاملہ میں تو یہ بہر حال تین طلاقیں ہیں البتہ غیر مدخولہ کے معاملہ میں ایک کی نیت ہو تو ایک ہی طلاق پڑے گی۔ پھر کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ بیوی کی تحریم ایک ہی طلاق ہے کیونکہ اگر آدمی حرام کہنے کے بجائے طلاق کا لفظ استعمال کرے اور کسی تعداد کا تعین نہ کرے تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی۔

امام احمد بن حنبلؒ سے اس مسئلے میں تین مختلف اقوال منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ بیوی کی تحریم، یا حلال کو مطلقاً اپنے لیے حرام قرار دینا ظہار ہے خواہ ظہار کی نیت ہو یا نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ یہ طلاق کا مزج کناہ ہے اور اس سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں خواہ نیت ایک ہی کی ہو۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ قسم ہے، الایہ کہ آدمی نے طلاق یا ظہار میں سے کسی کی نیت کی ہو، اور اس صورت میں جو نیت بھی کی گئی ہو وہی واقع ہوگی۔ ان میں سے پہلا قول ہی مذہب حنبلی میں مشہور ترین ہے (الانصاف)۔

۵۵ یعنی اللہ تمہارا آقا اور تمہارے معاملات کا منتوی ہے۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ تمہاری بھلائی کس چیز میں ہے اور جو احکام بھی اُس نے دیے ہیں سراسر حکمت کی بنا پر دیے ہیں۔ پہلی بات ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم خود مختار نہیں ہو بلکہ اللہ کے بندے ہو اور وہ تمہارا آقا ہے، اس لیے اس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں میں رد و بدل کرنے کا اختیار تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تمہارے لیے حق یہی ہے کہ اپنے معاملات اس کے حوالے کر کے بس اُس کی اطاعت کرتے رہو۔ دوسری بات ارشاد فرمانے سے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ نے جو طریقے اور قوانین مقرر کیے ہیں وہ سب علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ جس چیز کو حلال

وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ
وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا
نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ﴿۵﴾

(اور یہ معاملہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ) نبی نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی۔ پھر جب اُس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا، اور اللہ نے نبی کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی تو نبی نے اس پر کسی حد تک (اُس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی نے اُسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اُس نے پوچھا آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبی نے کہا ”مجھے اُس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے۔“

کیا ہے علم و حکمت کی بنا پر حلال کیا ہے اور جسے حرام قرار دیا ہے اسے بھی علم و حکمت کی بنا پر حرام قرار دیا ہے یہ کوئی اکلِ مپ کام نہیں ہے کہ جسے چاہا حلال کر دیا اور جسے چاہا حرام ٹھہرا دیا۔ لہذا جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ علیم و حکیم ہم نہیں ہیں بلکہ اللہ ہے اور ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اس کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کریں۔

۵۶ مختلف روایات میں مختلف باتوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ فلاں بات تھی جو حضور نے اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی اور اُن بیوی نے ایک دوسری بیوی سے اس کا ذکر کر دیا۔ لیکن ہمارے نزدیک اول تو اُس کا کھوج لگانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ راز کے افشا کرنے پر ہی تو اللہ تعالیٰ یہاں ایک بیوی کو ٹوک رہا ہے پھر ہمارے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم اُس کی ٹٹول کریں اور اسے کھولنے کی فکر میں لگ جائیں۔ دوسرے جس مقصد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ راز کی بات تھی کیا۔ مقصود کلام سے اس کا کوئی تعلق ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے خود بیان فرما دیتا۔ اصل غرض جس کے لیے اس معاملے کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے، ازواجِ مطہرات میں سے ایک کو اس غلطی پر ٹوکنا ہے کہ اُن کے عظیم الشوہر نے جو بات راز میں اُن سے فرمائی تھی اُسے انہوں نے راز نہ رکھا اور اس کا افشا کر دیا یہ محض ایک نجی معاملہ ہوتا، جیسا دنیا کے عام میاں اور بیوی کے درمیان ہوا کرتا ہے، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست وحی کے ذریعہ سے حضور کو اس کی خبر کر دیتا اور پھر محض خبر دینے ہی پر اکتفا نہ کرتا بلکہ اسے اپنی اُس کتاب میں بھی درج کر دیتا جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کو پڑھنا ہے۔ لیکن اسے یہ اہمیت جس وجہ سے دی گئی وہ یہ تھی کہ وہ بیوی

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ

اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل بیدھی
راہ سے ہٹ گئے ہیں اور اگر تمہاری کے مقابلہ میں تم نے باہم جتنہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ

کسی معمولی شوہر کی نہ تھیں بلکہ اُس عظیم ہستی کی بیوی تھیں جسے اللہ تعالیٰ نے انتہائی اہم ذمہ داری کے منصب پر
مامور فرمایا تھا، جسے ہر وقت کفار و مشرکین اور منافقین کے ساتھ ایک مسلسل جہاد سے سابقہ درپیش تھا، جس
کی قیادت میں کفر کی جگہ اسلام کا نظام برپا کرنے کے لیے ایک زبردست جدوجہد ہو رہی تھی۔ ایسی ہستی کے گھر
میں بے شمار ایسی باتیں ہو سکتی تھیں جو اگر راز نہ رہتی اور قبل از وقت ظاہر ہو جاتیں تو اُس کا عظیم کو نقصان پہنچ
سکتا تھا جو وہ ہستی انجام دے رہی تھی۔ اس لیے جب اُس گھر کی ایک خاتون سے پہلی مرتبہ یہ کمزوری صادر ہوئی کہ اس
نے ایک ایسی بات کو جو راز میں اُس سے کہی گئی تھی کسی اور پر ظاہر کر دیا اگرچہ وہ کوئی غیر نہ تھا بلکہ اپنے ہی گھر کا
ایک فرد تھا تو اس پر فوراً ٹوک دیا گیا، اور درپردہ نہیں بلکہ قرآن مجید میں برملا لٹوکا گیا تاکہ نہ صرف ازواجِ مطہرات
کو، بلکہ مسلم معاشرے کے تمام ذمہ دار لوگوں کی بیویوں کو رازوں کی حفاظت کی تربیت دی جائے۔ آیت میں اس
سوال کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ جس راز کی بات کو افشا کیا گیا تھا وہ کوئی خاص اہمیت رکھتی تھی یا نہیں، اور
اس کے افشا سے کسی نقصان کا خطرہ تھا یا نہیں۔ گرفت بجائے خود اس امر پر کی گئی ہے کہ راز کی بات کو دوسرے
سے بیان کر دیا گیا۔ اس لیے کہ کسی ذمہ دار ہستی کے گھر والوں میں اگر یہ کمزوری موجود ہو کہ وہ رازوں کی حفاظت
میں تساہلی برتیں تو آج ایک غیر اہم راز افشا ہوا ہے، کل کوئی اہم راز افشا ہو سکتا ہے۔ جس شخص کا منصب معاشرے
میں جتنا زیادہ ذمہ دارانہ ہو گا اتنے ہی زیادہ اہم اور نازک معاملات اس کے گھر والوں کے علم میں آئیں گے۔
اُن کے ذریعہ سے راز کی باتیں دوسروں تک پہنچ جائیں تو کسی وقت بھی یہ کمزوری کسی بڑے خطرے کی موجب
بن سکتی ہے۔

۷ اصل الفاظ میں فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا۔ صغوع عربی زبان میں مُڑ جانے اور ٹیڑھا ہو جانے کے

معنی میں بولا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: ”ہر آئینہ کج شدہ است دل شما“
اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے ”کج ہو گئے ہیں دل تمہارے“ حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ
سفیان ثوری اور ضحاکؓ نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے ذَاعَتْ قُلُوبُكُمَا، یعنی ”تمہارے دل راہِ راست سے ہٹ
گئے ہیں“ امام رازیؒ اس کی تشریح میں کہتے ہیں عدالت و مالک عن الحق و هو حق الرسول صلی اللہ علیہ
وسلم، ”حق سے ہٹ گئے ہیں، اور حق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے“ اور علامہ آلوسیؒ کی
تشریح یہ ہے: مالک عن الواجب من موافقته صلی اللہ علیہ وسلم بِحُبِّ مَا يَحِبُّه وَكُلُّهُ مَا

يَكْرَهُهُ إِلَىٰ مَخَالَفَتِهِ یعنی ”تم پر واجب تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پسند کریں اسے پسند کرنے میں اور جو کچھ آپ ناپسند کریں اسے ناپسند کرنے میں آپ کی موافقت کرو۔ مگر تمہارے دل اس معاملہ میں آپ کی موافقت سے ہٹ کر آپ کی مخالفت کی طرف مڑ گئے ہیں“

۵۸ اصل الفاظ میں وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ تَظَاهَرَا كَمَا تَظَاهَرَا فِي شَيْءٍ مِّنْهُمَا فَمَنْ يَمُنْ بِمَا هُمَا مُتَّفِقُونَ فَاُولَٰئِكَ سَيَجْزِي اللَّهُ كَمَا يَشَاءُ ۗ وَمَنْ يَمُنْ بِمَا هُمَا مُتَّفِقُونَ فَاُولَٰئِكَ سَيَجْزِي اللَّهُ كَمَا يَشَاءُ ۗ

کسی کے خلاف ایسا کرنا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: ”اگر باہم متفق شوید بر رنجائی کسی پیغمبر شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے: ”اگر تم دونوں چڑھاٹی کرو گیاں اُس پہ“ مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ ہے: ”اور اگر اسی طرح پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کا رد و اٹیاں کرتی رہیں“ اور مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ”اگر تم دونوں اسی طرح کی کارروائیاں اور مظاہرے کرتی رہیں“

آیت کا خطاب صاف طور پر دو خواتین کی طرف ہے، اور سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے ہیں، کیونکہ اس سورے کی پہلی آیت سے پانچویں آیت تک مسلسل حضور کی ازواج کے معاملات ہی زیر بحث آئے ہیں۔ اس حد تک تو بات خود قرآن مجید کے انداز بیان سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دونوں بیویاں کون تھیں، اور وہ معاملہ کیا تھا جس پر یہ خطاب ہوا ہے، اس کی تفصیل ہمیں حدیث میں ملتی ہے۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک مفصل روایت نقل ہوئی ہے جس میں کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ یہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”میں ایک مدت سے اس فکر میں تھا کہ حضرت عمر سے پوچھوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی بیویوں میں سے وہ کون سی دو بیویاں تھیں جنہوں نے حضور کے مقابلہ میں جھگڑا بنی کر لی تھی اور

جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ارشاد فرمائی ہے کہ اِنْ تَوَابَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا۔

لیکن اُن کی ہیبت کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک مرتبہ وہ حج کے لیے تشریف لے

گئے اور میں اُن کے ساتھ گیا۔ واپسی پر راستہ میں ایک جگہ اُن کو وضو کراتے ہوئے مجھے موقع مل

گیا اور میں نے یہ سوال پوچھ لیا۔ انہوں نے جواب دیا وہ عائشہ اور حفصہ تھیں۔ پھر انہوں نے

بیان کرنا شروع کیا کہ ہم قریش کے لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھنے کے عادی تھے۔ جب ہم مدینہ

آئے تو ہمیں یہاں ایسے لوگ ملے جن پر اُن کی بیویاں حاوی تھیں، اور یہی سبب ہماری عورتیں بھی

اُن سے سیکھنے لگیں۔ ایک روز میں اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے پلٹ کر

جواب دے رہی ہے اصل الفاظ ہیں فَاِذَا هِيَ تَرَا جَعْنِي۔ مجھے یہ بہت ناگوار ہوا کہ وہ مجھے پلٹ

کر جواب دے۔ اس نے کہا آپ اس بات پر کیوں بگڑتے ہیں کہ میں آپ کو پلٹ کر جواب دوں؟

خدا کی قسم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں حضور کو دُور و دُور جواب دیتی ہیں اصل لفظ ہے

لیٰرَاجِعْنَهُ) اور ان میں سے کوئی حضور سے دن دن بھر روٹھی رہتی ہے (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضور اس سے دن بھر ناراض رہتے ہیں)۔ یہ سن کر میں گھر سے نکلا اور حفصہ کے ہاں گیا (جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور حضور کی بیوی تھیں)۔ میں نے اُس سے پوچھا کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بد و جواب دیتی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے پوچھا اور کیا تم میں سے کوئی دن دن بھر حضور سے روٹھی رہتی ہے؟ (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضور دن بھر اس سے ناراض رہتے ہیں)۔ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا تا مراد ہو گئی اور گھائے میں پڑ گئی وہ عورت جو تم میں سے ایسا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات سے بے خوف ہو گئی ہے کہ اپنے رسول کے غضب کی وجہ سے اللہ اس پر غضبناک ہو جائے اور وہ ہلاکت میں پڑ جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر رہیاں بھی وہی الفاظ ہیں (لا تراجعی) اور نہ اُن سے کسی چیز کا مطالبہ کر، میرے مال سے تیرا جو جی چاہے مانگ لیا کر تو اس بات سے کسی دھوکے میں نہ پڑ کہ تیری پڑ سن (مراد ہیں حضرت عائشہؓ) تجھ سے زیادہ تو بصورت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب ہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے نکل کر ام سلمہؓ کے پاس پہنچا جو میری رشتہ دار تھیں، اور میں نے اس معاملہ میں ان سے بات کی۔ انہوں نے کہا، ابن خطاب تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہر معاملہ میں تم نے دخل دیا یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملے میں بھی دخل دینے چلے ہو۔ اُن کی اس بات نے میری ہمت توڑ دی۔ پھر ایسا ہوا کہ میرا ایک انصاری بڑا وسی رات کے وقت میرے گھر آیا اور اس نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں یاری باری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور جوابات کسی کی باری کے دن ہوتی تھی وہ دوسرے کو بتا دیا کرتا تھا۔ زمانہ وہ تھا جب ہمیں غسان کے حملے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ اُس کے پکارنے پر جب میں نکلا تو اس نے کہا ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے کہا کیا غسانی چڑھ آئے ہیں؟ اس نے کہا نہیں، اس سے بھی زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا برباد ہوئی اور نامراد ہو گئی حفصہؓ (بخاری کے الفاظ ہیں رَغِمَ أَنْفُ حَفْصَةَ دَعَا شَةَ)، مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ ہونے والی بات ہے۔

اس کے آگے کا قصہ ہم نے چھوڑ دیا ہے جس میں حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ دوسرے روز صبح حضور کی خدمت میں جا کر انہوں نے کس طرح حضور کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس قصے کو ہم نے مستد احمد اور بخاری کی مدعا جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ نے مراجعت کا لفظ جو استعمال کیا ہے اُسے لغوی معنی میں نہیں لیا جا سکتا بلکہ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ یہ لفظ دو بد و جواب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور حضرت عمرؓ کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ لا تراجعی رسول اللہ صاف طور پر اس معنی میں ہے کہ حضور سے زبان درازی نہ کیا کر

هُوَ مَوْلَاهُ وَجَبْرِیلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِینَ وَالْمَلِیْکَةُ بَعْدَ ذٰلِکَ

اُس کا مولیٰ ہے اور اُس کے بعد جبریل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور
اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مراجعت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا، یا دود بدو جواب دینا
تو صحیح ہے، مگر اس کا ترجمہ ”زبان درازی“ صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم مرتبے کا
آدمی اپنے سے بڑے مرتبے کے آدمی کو پلٹ کر جواب دے، یا دود بدو جواب دے تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔
مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش
رہے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے، تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا
جاسکتا۔ پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور امت کے کسی فرد کے درمیان
ہو تو صرف ایک غبی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔

بعض دوسرے لوگ ہمارے اس ترجمے کو سوء ادب قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ سوء ادب اگر ہو سکتا تھا
تو اُس صورت میں جبکہ ہم اپنی طرف سے اس طرح کے الفاظ حضرت حفصہ کے متعلق استعمال کرنے کی جسارت
کرتے۔ ہم نے تو حضرت عمرؓ کے الفاظ کا صحیح مفہوم ادا کیا ہے، اور یہ الفاظ انہوں نے اپنی بیٹی کو اُس کے
قصور پر سرزنش کرتے ہوئے استعمال کیے ہیں۔ اسے سوء ادب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یا تو باپ اپنی بیٹی کو ڈانٹتے
ہوئے بھی ادب سے بات کرے، یا پھر اس کی ڈانٹ کا ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے اس کو با ادب کلام بنا دے۔
اس مقام پر سوچنے کے قابل بات دراصل یہ ہے کہ اگر معاملہ صرف ایسا ہی ہلکا اور معمولی سا تھا کہ حضورؐ
کبھی اپنی بیویوں کو کچھ کہتے تھے اور وہ پلٹ کر کچھ جواب دے دیا کرتی تھیں، تو آخر اس کو اتنی اہمیت کیوں
دی گئی کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے براہ راست خود ان ازواج مطہرات کو شدت کے ساتھ تنبیہ فرمائی؟
اور حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو کیوں اتنا سمحت سمجھا کہ پہلے بیٹی کو ڈانٹا اور پھر ازواج مطہرات میں سے ایک
ایک کے گھر جا کر ان کو اللہ کے غضب سے ڈرایا؟ اور سب سے زیادہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ
کے خیال میں ایسے ہی زور و زنج تھے کہ دراز اسی باتوں پر بیویوں سے ناراض ہو جاتے تھے اور کیا معاذ اللہ آپ
کے نزدیک حضورؐ کی تنگ مزاجی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایسی ہی باتوں پر ناراض ہو کر آپ ایک دفعہ سب
بیویوں سے مقاطعہ کر کے اپنے حجرے میں عزت گزیں ہو گئے تھے؟ ان سوالات پر اگر کوئی شخص غور کرے
تو اسے لامحالہ ان آیات کی تفسیر میں دو ہی راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے گا۔ یا تو اسے ازواج مطہرات
کے احترام کی اتنی فکر لاحق ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر حروف آجانے کی پروا نہ کرے۔ یا پھر سیدھی طرح یہ
مان لے کہ اُس زمانہ میں ان ازواج مطہرات کا رویہ فی الواقع ایسا ہی قابل اعتراض ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم اس پر ناراض ہو جانے میں حق بجانب تھے اور حضورؐ سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ اس بات میں حق بجانب تھا کہ

ظَهَرَ ۴ عَسَى رَبُّهُ إِنْ طَلَّقَنَّ أَنْ يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا
مِّنْكَ مُسْلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ قَنَاطٍ تَبَيَّنَتِ غِيُوتُ

مددگار ہیں۔ بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دیدے تو اللہ سے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرمائے جو تم سے بہتر ہوں، سچی مسلمان، باایمان، اطاعت گزار، توبہ گزار، عبادت گزار،

ان ازواج کو اس رویہ پر شدت سے تنبیہ فرمائے۔

۹ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جتنے بندے کر کے تم اپنا ہی نقصان کرو گی، کیونکہ جس کا مولیٰ اللہ ہے اور جبریل اور ملائکہ اور تمام صالح اہل ایمان جس کے ساتھ ہیں اُس کے مقابلہ میں جتنے بندے کر کے کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۱۰ اس سے معلوم ہوا کہ قصور صرف حضرت عائشہ اور حفصہ ہی کا نہ تھا، بلکہ دوسری ازواج مطہرات بھی کچھ نہ کچھ قصور وار تھیں، اسی لیے اُن دونوں کے بعد اس آیت میں باقی سب ازواج کو بھی تنبیہ فرمائی گئی۔ قرآن مجید میں اس قصور کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، البتہ احادیث میں اس کے متعلق کچھ تفصیلات آئی ہیں۔ اُن کو ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے آپس کے رشک و رقابت میں بل جُل کر حضور کو تنگ کر دیا تھا۔ اصل الفاظ میں اجتمع نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الغیبة علیہ۔ اس پر میں نے اُن سے کہا کہ بعید نہیں اگر حضور تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تم سے بہتر بیویاں آپ کو عطا فرمادے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ”مجھے خبر پہنچی کہ امہات المؤمنین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس پر میں ان میں سے ایک ایک کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے سے باز آ جاؤ ورنہ اللہ تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں حضور کو عطا فرمادے گا۔ بیان تنگ کہ جب میں امہات المؤمنین میں سے آخری کے پاس گیا اور یہ بخاری کی ایک روایت کے بموجب حضرت ام سلمہؓ تھیں، تو انہوں نے مجھے جواب دیا اے عمر، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی نصیحت کے لیے کافی نہیں ہیں کہ تم انہیں نصیحت کرنے چلے ہو؟ اس پر میں خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔“

مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بیان کیا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار فرمائی تو میں مسجد نبوی میں پہنچا۔ دیکھا کہ لوگ متفکر بیٹھے ہوئے کنگریاں

اٹھا اٹھا کر گرا رہے ہیں اور آپس میں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے ہاں اپنے جانے اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا "بیویوں کے معاملہ میں آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اگر آپ ان کو طلاق دے دیں تو اللہ آپ کے ساتھ ہے، سارے ملائکہ اور جبریل و میکائیل آپ کے ساتھ ہیں اور میں اور ابو بکر اور سب اہل ایمان آپ کے ساتھ ہیں" میں اللہ کا شکر بجالاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ امید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق فرمادے گا، چنانچہ اس کے بعد سورہ تخریم کی یہ آیات نازل ہو گئیں۔ پھر میں نے حضورؐ سے پوچھا کیا آپ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ اس پر میں نے مسجد نبوی کے دروازے پر کھڑے ہو کر باواز بلند اعلان کیا کہ حضورؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔

بخاری میں حضرت انسؓ سے اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایات منقول ہوئی ہیں کہ حضورؐ نے ایک مہینہ تک کے لیے اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد فرمایا تھا اور اپنے بالا خانے میں بیٹھ گئے تھے۔ ۲۹ دن گزر جانے پر جبریل علیہ السلام نے آکر کہا آپ کی قسم پوری ہو گئی ہے، مہینہ مکمل ہو گیا۔

حافظ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں حضرت عائشہ کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ ازواج مطہرات کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک میں خود حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، حضرت سوڈہؓ اور حضرت صفیہؓ تھیں، اور دوسری میں حضرت زینبؓ، حضرت ام سلمہؓ اور باقی ازواج شامل تھیں۔

ان تمام روایات سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی میں کیا حالات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنا پر یہ ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ مداخلت کرے ازواج مطہرات کے طرد عمل کی اصلاح فرمائے۔ یہ ازواج اگرچہ معاشرے کی بہترین خواتین تھیں، مگر بہ حال تھیں انسان ہی، اور بشریت کے تقاضوں سے مبرا نہ تھیں۔ کبھی ان کے لیے مسلسل عسرت کی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا تھا اور وہ بے صبر ہو کر حضورؐ سے نفقہ کا مطالبہ کرنے لگتیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ نازل فرما کر ان کو تلقین کی کہ اگر تمہیں دنیا کی خوشحالی مطلوب ہے تو ہمارا رسول تم کو بخیر و خوبی رخصت کر دیگا، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہو تو پھر صبر و شکر کے ساتھ ان تکلیفوں کو برداشت کرو جو رسول کی رفاقت میں پیش آئیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، الاحزاب حاشیہ ۴۱، اور دیباچہ سورہ احزاب، صفحہ ۸۴)۔ پھر کبھی نسائی فطرت کی بنا پر ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہو جاتا تھا جو عام انسانی زندگی میں معمول کے خلاف نہ تھیں، مگر جس گھریں ہونے کا شرف اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا، اس کی شان اور اس کی عظیم ذمہ داریوں سے وہ مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ ان باتوں سے جب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کہیں تلخ نہ ہو جائے اور اُس کا اثر اُس کا بزرگوار پر مترتب نہ ہو جو اللہ تعالیٰ حضورؐ سے لے

رہا تھا، تو قرآن مجید میں یہ آیت نازل کر کے ان کی اصلاح فرمائی گئی تاکہ ازواج مطہرات کے اندر اپنے اُس مقام اور مرتبے کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو جو اللہ کے آخری رسولؐ کی رفیقِ زندگی ہونے کی حیثیت سے ان کو نصیب ہوا تھا، اور وہ اپنے آپ کو عام عورتوں کی طرح اور اپنے گھر کو عام گھروں کی طرح نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس آیت کا پہلا ہی فقرہ ایسا تھا کہ اس کو سن کر ازواج مطہرات کے دل لرز اٹھے ہوں گے۔ اس ارشاد سے بڑھ کر ان کے لیے تشبیہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ ”اگر نبی تم کو طلاق دے دے تو بعید نہیں کہ اللہ اس کو تمہاری جگہ تم سے بہتر بیویاں عطا کر دے“ اقل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق مل جانے کا تصور ہی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، اس پر یہ بات مزید کہ تم سے اہمات المؤمنین ہونے کا شرف چھین جائے گا اور دوسری عورتیں جو اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں لائے گا وہ تم سے بہتر ہوں گی۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ازواج مطہرات سے پھر کبھی کسی ایسی بات کا صدور ہوتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت کی نوبت آتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بس دو ہی مقامات ہم کو ایسے ملنے ہیں جہاں ان پر گزیدہ خوانین کو تشبیہ فرمائی گئی ہے۔ ایک سورہ احزاب اور دوسرے سورہ تحویم۔

۱۱ **اللہ** مسلم اور مومن کے الفاظ سب ایک ساتھ لائے جاتے ہیں تو مسلم کے معنی عملاً احکام الہی پر عمل کرنے والے کے ہوتے ہیں اور مومن سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو صدقِ دل سے ایمان لائے۔ پس بہترین مسلمان بیویوں کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین پر ایمان رکھتی ہوں، اور عملاً اپنے اخلاق، عادات، خصائل اور برتاؤ میں اللہ کے دین کی پیروی کرنے والی ہوں۔

۱۲ **اس** کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی جہاں مراد ہیں۔ ایک، اللہ اور اس کے رسولؐ کی تابع فرمان۔ دوسرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرنے والی۔

۱۳ **تائب** کا لفظ جب آدمی کی صفت کے طور پر آئے تو اس کے معنی بس ایک ہی دفعہ توبہ کر لینے والے کے نہیں ہوتے بلکہ ایسے شخص کے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اللہ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتا رہے، جس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو جسے بروقت اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا احساس ہوتا رہے اور وہ ان پر نام و شر مسار ہو۔ ایسے شخص میں کبھی غرور و تکبر اور نخوت و خود پسندی کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ وہ طبعاً نرم مزاج اور حلیم ہوتا ہے۔

۱۴ **عبادت گزار** آدمی ہر حال کبھی اُس شخص کی طرح خدا سے غافل نہیں ہو سکتا جس طرح عبادت نہ کرنے والا انسان ہوتا ہے۔ ایک عورت کو بہترین بیوی بنانے میں اس چیز کا بھی بڑا دخل ہے۔ عبادت گزار ہونے کی وجہ سے وہ حدود اللہ کی پابندی کرتی ہے، حق والوں کے حق پہچانتی اور ادا کرتی ہے، اس کا ایمان ہر وقت تازہ اور زندہ رہتا ہے، اُس سے اس امر کی زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ احکام الہی کی پیروی سے منہ نہیں موڑے گی۔

سَيَحْتِ ثَيِّبٌ وَأَبْكَارًا ۝ يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ
وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ
شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ①

اور روزہ دار، خواہ شوہر دیدہ ہوں یا بکرہ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا
ابندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ
کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں (اُس وقت کہا

۱۵ اصل میں لفظ ساٹھ استعمال ہوا ہے۔ متعدد صحابہ اور بکثرت تابعین نے اس کے معنی صائمات بیان
کیے ہیں۔ روزے کے لیے سیاحت کا لفظ جس مناسبت سے استعمال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں سیاحت زیادہ
راہب اور درویش لوگ کرتے تھے، اور ان کے ساتھ کوئی زاد راہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثر ان کو اُس وقت تک بھوکا رہنا پڑتا تھا
جب تک کہیں سے کچھ کھانے کو نہ مل جائے۔ اس بنا پر روزہ بھی ایک طرح کی درویشی ہی ہے کہ جب تک افطار کا وقت نہ
آئے روزہ دار بھی بھوکا رہتا ہے۔ ابن جریر نے سورہ توبہ، آیت ۱۲ کی تفسیر میں حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ سیاحت
هذه الامة الصيام، اس امت کی سیاحت (یعنی درویشی) روزہ ہے۔ اس مقام پر نیک بیویوں کی تعریف میں ان کی
روزہ داری کا ذکر اس معنی میں نہیں کیا گیا ہے کہ وہ محض رمضان کے فرض روزے رکھتی ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ فرض
کے علاوہ نفل روزے بھی رکھ کرتی ہیں۔

ازواج مطہرات کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ کا بہ ارشاد کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے
بد سے میں ان کو ایسی بیویاں عطا فرمائے گا جن میں یہ اور یہ صفات ہونگی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ازواج مطہرات یہ صفات
نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری جس غلط روش کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت ہو رہی ہے
اُس کو تھپوڑ دو اور اُس کے بجائے اپنی ساری توجہات اس کو شش میں صرف کرو کہ تمہارے اندر یہ پاکیزہ صفات
بدرجہ اتم پیدا ہوں۔

۱۶ یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات ہی کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش تک
محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ نظام فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اُس پر ڈالا ہے اس کو بھی وہ اپنی
حد استطاعت تک ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں، اور اگر وہ جہنم کی راہ پر جا رہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْرُونَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن

جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو، تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم
عمل کر رہے تھے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ یعنی نہ کہ اللہ تمہاری

ہوں تو جہاں تک بھی اس کے بس میں ہو، ان کو اس سے روکنے کی کوشش کرے۔ اُس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہیے
کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوشحال ہوں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ وہ آخرت میں جہنم کا
ابند صحن نہ بنیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں
سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے معاملہ میں جواب دہ ہے۔ حکم راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے
معاملہ میں جواب دہ ہے۔ مرد اپنے گھروالوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔ اور عورت اپنے
شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔“

جہنم کا ابند صحن پتھر ہونگے، اس سے مراد غالباً پتھر کا کوئلہ ہے۔ ابن مسعود، ابن عباس، مجاہد، امام محمد الباقی
اور سیدی کہتے ہیں کہ یہ گندھک کے پتھر ہوں گے۔

۵۰ یعنی ان کو جو سزا بھی کسی مجرم پر نافذ کرنے کا حکم دیا جائے گا اُسے جوں کاتوں نافذ کریں گے اور ذرا
رحم نہ کھائیں گے۔

۵۱ ان دونوں آیتوں کا انداز بیان اپنے اندر مسلمانوں کے لیے سخت تشبیہ لیے ہوئے ہے۔ پہلی آیت
میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس خوفناک عذاب سے بچاؤ۔ اور دوسری
آیت میں فرمایا گیا کہ جہنم میں عذاب دینے وقت کافروں سے یہ کہا جائے گا۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح
ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں وہ طرز عمل اختیار کرنے سے بچنا چاہیے جس کی بدولت آخرت میں ان کا انجام
کافروں کے ساتھ ہو۔

۵۲ اصل میں تَوْبَةً نَّصُوحًا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نصح کے معنی عربی زبان میں خلوص اور
غیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو غسل نامح کھنے میں جس کو موسم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو۔ پھٹے
ہوئے کپڑے کو سی دینے اور اُدھڑے ہوئے کپڑے کی مرمت کر دینے کے لیے نَصَاكَةُ التَّوْبِ کا لفظ استعمال کیا
جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا توبہ ہو گا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے جس میں

ریاء اور نفاق کا شائبہ تک نہ ہو۔ یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بد انجامی سے بچائے۔ یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شکاف پڑ گیا ہے، توبہ کے ذریعہ سے اس کی اصلاح کر دے۔ یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی کی طرح اپنی اصلاح کر لیں۔ یہ تو ہیں تو بڑے نصوص کے وہ مفہومات جو اس کے لغوی معنوں سے مترشح ہوتے ہیں۔ رہا اس کا شرعی مفہوم تو اس کی تشریح ہمیں اُس حدیث میں ملتی ہے جو ابی ابی حاتم نے زبیر بن جُبَیْش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت اُبی بن کعب سے توبہ نصوص کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا۔ آپ نے فرمایا ”اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔ یا یہی مطلب حضرت عمرؓ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی منقول ہے، اور ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے توبہ نصوص کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اعادہ تو درکنار، اُس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے (ابن جریر)۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بَدُو کو جلدی جلدی توبہ واستغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا یہ توبہ لکڑا ہیں ہے۔ اس نے پوچھا پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا، اُس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہئیں (۱) جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو۔ (۲) اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو اُن کو ادا کر۔ (۳) جس کا حق مارا ہو اُس کو واپس کر۔ (۴) جس کو تکلیف پہنچائی ہو اُس سے معافی مانگ۔ (۵) آئندہ کے لیے عزم کر لے کہ اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا۔ اور (۶) اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گھلادے جس طرح تُو نے اب تک اسے معصیت کا خوگر بنائے رکھا ہے اور اُس کو طاعت کی تلخی کا مزہ چکھا جس طرح اب تک تو اُسے معصیتوں کی حلاوت کا مزہ چکھاتا رہا ہے۔ (کشاف)

توبہ کے سلسلہ میں چند امور اور بھی ہیں جنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اول یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لیے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ ورنہ کسی گناہ سے اس لیے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے، یا کسی بدنامی کا، یا مالی نقصان کا موجب ہے، توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ دوسرے یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے، اسی وقت اسے توبہ کرنی چاہیے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو بلاتا خیر اس کی تلافی کر دینی چاہیے، اُسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور توبہ کو کھیل بنا لینا اور اسی گناہ کا بار بار اعادہ کرنا جس سے توبہ کی گئی ہو، توبہ کے چھوٹے ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے، اور بار بار کی توبہ شکنی اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے پیچھے کوئی شرمساری موجود نہیں ہے۔ چوتھے یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا، اس سے اگر بشری کمزوری کی بنا پر اسی گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پھلا گناہ نازہ نہ

يَكْفُرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا نُورَنَا وَاعْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۵﴾

بڑائیاں تم سے دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہو گا جب اللہ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ہو گا، البتہ اسے بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہیے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہیے کہ آئندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے، توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا نفس اپنی سابق گناہ گارا نہ زندگی کی یاد سے لطف لے رہا ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہیے یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لیے لذت کے بجائے شرمساری کی موجب بن جائے۔ اس لئے کہ جس شخص نے فی الواقع خدا کے خوف کی بنا پر معصیت سے توبہ کی ہو وہ اس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اُس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے خوف نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی ہے۔

۵۲ آیت کے الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ توبہ کر لو تو تمہیں ضرور معاف کر دیا جائے گا اور لازماً تم جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے، بلکہ یہ امید دلائی گئی ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کر دو گے تو بعید نہیں کہ اللہ تمہارے ساتھ یہ معاملہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ گار کی توبہ قبول کر لینا اور اسے سزا دینے کے بجائے جنت عطا فرمادینا اللہ پر واجب نہیں ہے، بلکہ یہ سراسر اس کی عنایت و مہربانی ہوگی کہ وہ معاف بھی کرے اور انعام بھی دے۔ بندے کو اس سے معافی کی امید تو ضرور رکھنی چاہیے مگر اس بھروسے پہ گناہ نہیں کرنا چاہیے کہ توبہ سے معافی مل جائے گی۔

۵۱ یعنی ان کے اعمالِ حسنہ کا اجر ضائع نہ کرے گا۔ کفار و منافقین کو یہ کہتے کا موقع ہرگز نہ دے گا کہ ان لوگوں نے خدا پرستی بھی کی تو اس کا کیا صلہ پایا۔ رسوائی یا غیبوں اور نافرمانوں کے حصے میں آئے گی نہ کہ وقاداروں اور فرماں برداروں کے حصے میں۔

۵۲ اس آیت کو سورہ حدید کی آیات ۱۲-۱۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَايُسُّ الْمَصِيرُ ① ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا
لِّلَّذِينَ كَفَرُوا أُمْرَاتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ
مِّنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانا
جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

اللہ کافروں کے معاملہ میں نوح اور لوط کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں
کی زوجیت میں تھیں، مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی نہ

اہل ایمان کے آگے نور کے دوڑنے کی یہ کیفیت اُس وقت پیش آئے گی جب وہ میدانِ حشر سے جنت کی
طرف جا رہے ہوں گے۔ وہاں ہر طرف گھپ اندھیرا ہو گا جس میں وہ سب لوگ ٹھوکر بن کر کھا رہے ہوں گے جن کے حق میں
دوزخ کا فیصلہ ہو گا، اور روشنی صرف اہل ایمان کے ساتھ ہو گی جس کے سہارے وہ اپنا راستہ طے کر رہے ہوں گے۔
اس نازک موقع پر تار کیسیوں میں بھٹکنے والے لوگوں کی آہ و فغاں سن سن کر اہل ایمان پر خشیت کی کیفیت طاری ہو رہی
ہو گی، اپنے تصوروں اور اپنی کونا بیسیوں کا احساس کر کے انہیں اندیشہ لاحق ہو گا کہ کہیں ہمارا نور بھی نہ چھن
جائے اور ہم ان بد بختوں کی طرح ٹھوکر بن کر کھاتے نہ رہ جائیں، اس لیے وہ دعا کریں گے کہ اے ہمارے رب
ہمارے تصور معاف فرما دے اور ہمارے نور کو جنت میں پہنچنے تک ہمارے لیے باقی رکھ۔ ابن جریر نے حضرت
عبداللہ بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ”رَبَّنَا آتِنَا نُورًا سَرًّا“ کے معنی یہ ہیں کہ ”وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے
کہ ان کا نور اُس وقت تک باقی رکھا جائے اور اسے بچھنے نہ دیا جائے جب تک وہ میل صراط سے بچریت نہ گزر جائیں“
حضرت حسن بصری اور مجاہد اور ضحاک کی تفسیر بھی قریب قریب یہی ہے۔ ابن کثیر نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اہل
ایمان جب دیکھیں گے کہ منافقین نور سے محروم رہ گئے ہیں تو وہ اپنے حق میں اللہ سے تکمیل نور کی دعا کریں گے“ (مزید
تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۱۷)۔

۵۲۳ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۸۲۔

۵۲۴ یہ خیانت اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ بدکاری کی ترکیب ہوئی تھیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ انہوں نے

شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ۝۱۰ وَضَرَبَ اللَّهُ
 مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَاتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي
 عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي
 مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝۱۱ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَتَ فَرْجَهَا
 فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ
 وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ۝۱۲

کام آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ۔ اور اہل ایمان
 کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے جبکہ اس نے دعا کی "اے میرے رب، میرے
 لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم
 سے مجھ کو نجات دے" اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی،
 پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے رُوح پھونک دی، اور اس نے اپنے رب کے ارشادات
 اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی۔

ایمان کی راہ میں حضرت نوح اور حضرت لوط کا ساتھ نہ دیا بلکہ ان کے مقابلہ میں دشمنانِ دین کا ساتھ دیتی رہیں۔ ابن عباس
 رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "کسی نبی کی بیوی کبھی بدکار نہیں رہی ہے۔ ان دونوں عورتوں کی خیانت دراصل دین کے معاملہ
 میں تھی۔ انہوں نے حضرت نوح اور حضرت لوط کا دین قبول نہیں کیا۔ حضرت نوح کی بیوی اپنی قوم کے جباروں کو ایمان
 لانے والوں کی خبریں پہنچایا کرتی تھی۔ اور حضرت لوط کی بیوی اپنے شوہر کے ہاں آنے والے لوگوں کی اطلاع اپنی قوم
 کے بد اعمال لوگوں کو دے دیا کرتی تھی" (ابن جریر)۔

۵۲۵ یعنی فرعون جو بڑے اعمال کر رہا ہے ان کے انجام بد میں مجھے شریک نہ کر۔

۵۲۶ ہو سکتا ہے کہ حضرت مریم کے والد ہی کا نام عمران ہو، یا ان کو عمران کی بیٹی اس لیے کہا گیا ہو کہ

وہ آل عمران سے تھیں۔

۵۲۷ یہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید ہے کہ ان کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معاذ اللہ کسی گناہ کا نتیجہ تھی۔ سورۃ نساء، آیت ۱۵۶ میں ان ظالموں کے اسی الزام کو بہتانِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، سورۃ النساء، حاشیہ ۱۹۰)۔

۵۲۸ یعنی بغیر اس کے کہ ان کا کسی مرد سے تعلق ہوتا، اُن کے رحم میں اپنی طرف سے ایک جانی ڈال دیا۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، النساء، حواشی ۲۱۲-۲۱۳ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۹)۔

۵۲۹ جس مقصد کے لیے ان تین قسم کی عورتوں کو مثال میں پیش کیا گیا ہے اس کی تشریح ہم اس سورہ کے دیباچے میں کر چکے ہیں، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

تفسير القرآن

الملك

(٤٦)

الملک

نام | پہلے فقرے تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ کے لفظ الملک کو اس سُوْرہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زماۃ نزول | کسی معتبر روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانے میں نازل ہوئی ہے، مگر مضامین اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سُوْرتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس میں ایک طرف مختصر طریقے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے اور دوسری طرف بڑے مؤثر انداز میں ان لوگوں کو چونکا یا گیا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ مکہ معظمہ کی ابتدائی سُوْرتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کی ساری تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کو پیش کرتی ہیں، مگر تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ تاکہ وہ بتدریج لوگوں کے ذہن نشین ہوتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ ان میں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی غفلت دور کی جائے، ان کو سوچنے پر مجبور کیا جائے، اور ان کے سوٹے ہوئے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔

پہلی پانچ آیتوں میں انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ جس کائنات میں رہتا ہے وہ ایک انتہائی منظم اور محکم سلطنت ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نقص یا خلل تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلطنت کو عدم سے وجود میں بھی اللہ تعالیٰ ہی لایا ہے اور اس کی تدبیر و انتظام اور فرمانروائی کے تمام اختیارات بھی بالکل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اس کی قدرت لامحدود ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس انتہائی حکیمانہ نظام میں وہ بے مقصد پیدا نہیں کر دیا گیا ہے بلکہ یہاں اسے امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اور اس امتحان میں وہ اپنے حسن عمل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے۔

آیت ۶ سے آٹھ کفر کے وہ ہوناک نتائج بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں نکلنے والے ہیں اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو بھیج کر تمہیں اسی دنیا میں ان نتائج سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اگر یہاں تم انبیاء کی بات مان کر اپنا رویہ درست نہ کرو گے تو آخرت میں تمہیں خود

اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو سزا تم کو دی جا رہی ہے وہی واقعی تم اُس کے مستحق ہو۔
آیت ۱۲ سے ۲۴ تک یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں
ہو سکتا۔ وہ تمہاری ہر کھلی اور چھپی بات، حتیٰ کہ تمہارے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔ لہذا
اخلاق کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ انسان اُس اُن دیکھے خدا کی باز پرس سے ڈر کر بُرائی سے بچے، خواہ دنیا
میں کوئی طاقت اُس پر گرفت کرنے والی ہو یا نہ ہو اور دنیا میں اُس سے کسی نقصان کا امکان ہو یا
نہ ہو بہر طرز عمل جو لوگ اختیار کریں گے وہی آخرت میں بخشش اور اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

آیت ۱۵ سے ۲۴ تک اُن پیش پا افتادہ حقیقتوں کی طرف جنہیں انسان دنیا کے معمولات سمجھ کر
قابل توجہ شمار نہیں کرتا، پے در پے اشارے کر کے اُن پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ
اس زمین کو دیکھو جس پر تم اطمینان سے چل پھر رہے ہو اور جس سے اپنا رزق حاصل کر رہے ہو۔ خدا ہی
نے اسے تمہارے لیے تابع کر رکھا ہے، ورنہ کسی وقت بھی اس زمین میں ایسا زلزلہ آ سکتا ہے کہ تم
پیوندِ خاک ہو جاؤ، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمہیں تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اپنے اوپر
اُڑنے والے پرندوں کو دیکھو۔ خدا ہی تو ہے جو انہیں فضا میں تھامے ہوئے ہے۔ اپنے تمام ذرائع و
وسائل پر نگاہ ڈال کر دیکھو۔ خدا اگر تمہیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو کون تمہیں اُس سے بچا سکتا
ہے اور خدا اگر تمہارے لیے رزق کے دروازے بند کر دے تو کون انہیں کھول سکتا ہے؟ یہ ساری
چیزیں تمہیں حقیقت سے آگاہ کرتے کے لیے موجود ہیں۔ مگر انہیں تم حیوانات کی طرح دیکھتے
ہو جو مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور اُس سماعت و بینائی اور اُن سوچنے
کھنسنے والے دماغوں سے کام نہیں لیتے جو انسان ہونے کی حیثیت سے خدا نے تمہیں دیے ہیں۔
اسی وجہ سے راہِ راست تمہیں نظر نہیں آتی۔

آیت ۲۴ سے ۲۷ تک بتایا گیا ہے کہ آخر کار تمہیں لازماً اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔
نئی کام یہ نہیں ہے کہ تمہیں اُس کے آنے کا وقت اور تاریخ بتائے۔ اُس کا کام بس یہ ہے کہ
تمہیں اُس آنے والے وقت سے پیشگی خبردار کر دے۔ تم آج اُس کی بات نہیں مانتے اور مطالبہ کر
ہو کہ وہ وقت لا کر تمہیں دکھا دیا جائے۔ مگر جب وہ آ جائے گا اور تم آنکھوں سے اسے دیکھ لو گے تو
تمہارے ہوش اُڑ جائیں گے۔ اُس وقت تم سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جسے جلدی سے آنے کا نام
مطالبہ کر رہے تھے۔

آیت ۲۸ اور ۲۹ میں کفار مکہ کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپ کے ساتھیوں کے خلاف کرتے تھے۔ وہ حضور کو کوسنے تھے اور آپ کے لیے اور اہل ایمان
کے لیے ہلاکت کی دعائیں مانگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ تمہیں راہِ راست کی طرف بلانے



وائے خواہ ہلاک ہوں یا اللہ ان پر رحم کرے، اس سے آخر تمہاری قسمت کیسے بدل جائے گی؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کا عذاب اگر تم پر آ جائے تو کون نہیں بچائے گا؟ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں اور جہنموں نے اُس پر توکل کیا ہے، انہیں تم گمراہ سمجھ رہے ہو۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بات کھل جائے گی کہ حقیقت میں گمراہ کون تھا۔

آنحضرتؐ لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا ہے اور اسی پر سوچنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ عرب کے صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں، جہاں تمہاری زندگی کا سارا انحصار اُس پانی پر ہے جو کسی جگہ زمین سے نکل آیا ہے، وہاں اگر یہ پانی زمین میں اتر کر غائب ہو جائے تو خدا کے سوا کون نہیں یہ آپ حیات لاکر دے سکتا ہے؟



رُكُوْعَاتُهَا ۲

سُورَةُ الْمَلِكِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا ۳۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ②

نہایت بزرگ برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے

① تَبَارَكَ بَرَکَت سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بَرَکَت میں رفعت و عظمت، افزائش اور فراوانی، دوام و ثبات اور کثرت خیرات و حسنات کے مفہومات شامل ہیں۔ اس سے جب مبالغہ کا صیغہ تَبَارَكَ بنا یا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بے انتہا بزرگ و عظیم ہے، اپنی ذات و صفات و افعال میں اپنے سوا ہر ایک سے بالاتر ہے، بے حد و حساب بھلائیوں کا فیضان اُس کی ذات سے ہو رہا ہے، اور اُس کے کمالات لازوال ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۴۳۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حواشی ۱۹)۔

② الْمَلِكُ کا لفظ چونکہ مطلقاً استعمال ہوا ہے اس لیے اسے کسی محدود معنوں میں نہیں لیا جاسکتا۔ لامحالہ اس سے مراد تمام موجوداتِ عالم پر شاہانہ اقتدار ہی ہو سکتا ہے۔ اور اُس کے ہاتھ میں اقتدار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جسمانی ہاتھ رکھتا ہے، بلکہ یہ لفظ محاورہ کے طور پر قبضہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی کی طرح ہماری زبان میں بھی جب یہ کھتے ہیں کہ اختیارات فلاں کے ہاتھ میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہی سارے اختیارات کا مالک ہے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

③ یعنی وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اُسے عاجز کرنے والی نہیں ہے کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔

④ یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اُس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اول یہ کہ موت اور حیات اُسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ

الجلس

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝۲ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَى فِي
 خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفْوُتٍ فَأَرْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ ۝۳
 ثُمَّ أَرْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝۴

اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی جس نے تہ بہ تہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ ٹھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔

سوت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا بُرائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور بُرائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ لہذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اُسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ممتحن کے نزدیک حسن عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہوگا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔

۵ اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بے انتہا زبردست اور سب پر پوری طرح غالب ہونے کے باوجود اپنی مخلوق کے حق میں ریم و غفور ہے، ظالم اور سخت گیر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ بُرے سے عمل کرنے والوں کو سزا دینے کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں کہ اُس کی سزا سے بچ سکے۔ مگر جو نام ہو کر بُرائی سے باز آجائے اور معافی مانگ لے اس کے ساتھ وہ درگزر کا معاملہ کرنے والا ہے۔

۶ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۳۔ جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حاشیہ ۸۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۱۳۔ المؤمنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، الصافات، حاشیہ ۵۔ المؤمن، حاشیہ ۹۰۔

۷ اصل میں تفاوت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں، عدم تناسب۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے میل نہ کھانا۔ اُنیل بے جوڑ ہونا۔ پس اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں تم کہیں بد نظمی، بے ترتیبی اور بے ربطی نہ پاؤ گے۔ اللہ کی پیدا کردہ اس دنیا میں کوئی چیز اُنیل بے جوڑ نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں اور ان میں کمال درجے کا تناسب پایا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيْطَانِ
وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا ابْرِيضُوا فِي
جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ إِذَا الْقَوَا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا

ہم نے تمہارے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیطان
کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے تیار رکھی ہے۔
جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی بُرا
ٹھکانا ہے۔ جب وہ اُس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دہاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے

۵۸ اصل میں لفظ فُطُور استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں دراز، شگاف، رخسہ، پھٹا ہوا ہونا، ٹوٹا پھوٹا
ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کی بندش ایسی چست ہے، اور زمین کے ایک ذرے سے لے کر عظیم الشان کہکشاؤں
تک ہر چیز ایسی مربوط ہے کہ میں نظم کائنات کا نسل نہیں ٹوٹتا تم خواہ کتنی ہی جستجو کرو، تمہیں اس میں کسی جگہ کوئی
رخسہ نہیں مل سکتا (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ ق، حاشیہ ۸)۔

۵۹ قریب کے آسمان سے مراد وہ آسمان ہے جس کے تاروں اور ستاروں کو ہم برہنہ آنکھوں سے دیکھتے
ہیں۔ اس سے آگے جن چیزوں کے مشاہدے کے لیے آلات کی ضرورت پیش آتی ہو وہ دُور کے آسمان ہیں۔ اور ان سے بھی
زیادہ دُور کے آسمان وہ ہیں جن تک آلات کی رسائی بھی نہیں ہے۔

۶۰ اصل میں لفظ ”مصابیح“ نکرہ استعمال ہوا ہے اور اس کے نکرہ ہونے سے خود بخود ان چراغوں کے
عظیم الشان ہونے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات ہم نے اندھیری اور سُناں میں بنائی
ہے بلکہ اسے ستاروں سے خوب مزین اور آراستہ کیا ہے جس کی شان اور جگمگاہٹ رات کے اندھیروں میں دیکھ کر
انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

۶۱ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بین تارے شیطانوں پر پھینک مارے جاتے ہیں، اور یہ مطلب بھی نہیں
ہے کہ شباب ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گرتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد حساب
شباب ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں، اور جن کی بارش زمین پر بھی بروقت
ہوتی رہتی ہے، وہ اس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالم بالا میں جاسکیں۔ اگر وہ اوپر جانے کی کوشش
کریں بھی تو یہ شباب انہیں مار بھگاتے ہیں۔ اس چیز کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ عرب کے لوگ

وَهِيَ تَفُورٌ ۝ تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ
خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ ۖ فَكَذَّبْنَا

اور وہ جوش کھا رہی ہوگی، شدتِ غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوءہ اس میں ڈالا جائے گا، اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟" وہ جواب دیں گے "ہاں، خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا، مگر ہم نے اسے جھٹلادیا

کاہنوں کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے اور یہی خود کاہنوں کا دعویٰ بھی تھا، کہ شیاطین اُن کے تابع ہیں، یا شیاطین سے اُن کا رابطہ ہے، اور اُن کے ذریعے سے انہیں غیب کی خبریں حاصل ہوتی ہیں اور وہ صحیح طور پر لوگوں کی قسمتوں کا حال بتا سکتے ہیں۔ اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین کے عالم بالا میں جانے اور وہاں سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الحج، حواشی ۹ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصافات، حواشی ۶-۷)۔

رہا یہ سوال کہ ان شہابیوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دور تک انسان کے علم میں آئے ہیں، اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی تیار سے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آکر اِدھر کا رخ کر لیتے ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن ۱۹۶۷ء۔ جلد ۱۵۔ لفظ Meteorites)۔

۱۱۲ یعنی انسان ہوں، یا شہطان، جن لوگوں نے بھی اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کا یہ انجام ہے (رب سے کفر کرنے کے مفہوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۶۱۔ النساء، حاشیہ ۱۷۸۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۳۹۔ جلد چہارم، المؤمن، حاشیہ ۳)۔

۱۱۳ اصل میں لفظ شہیق استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنم سے آرہی ہوگی جہاں اُن لوگوں سے پہلے گرے ہوئے لوگ جنہیں مار رہے ہوں گے۔ اس دوسرے مفہوم کی تائید سورہ ہود کی آیت ۱۰۶ سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ "انہیں گے اور پھنکارے ماریں گے" اور پہلے مفہوم کی تائید سورہ فرقان آیت ۱۲ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ

وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ كَبِيرٍ ۙ وَقَالُوا

اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ اور وہ کہیں گے
دُور ہی سے اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔ اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ یہ شور خود جہنم کا بھی ہو گا اور
جہنمیوں کا بھی۔

۱۴ اس سوال کی اصل نوعیت سوال کی نہیں ہوگی کہ جہنم کے کارندے ان لوگوں سے یہ معلوم کرنا
چاہتے ہوں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خبردار کرنے والا آیا تھا یا نہیں، بلکہ اس سے مقصود اُن
کو اس بات کا قائل کرنا ہو گا کہ انہیں جہنم میں ڈال کر اُن کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی جا رہی ہے۔ اس
لیے وہ خود اُن کی زبان سے یہ اقرار کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے خبر نہیں رکھا تھا، اُن کے پاس
انبیاء بھیجے تھے، اُن کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور راہِ راست کونسی ہے، اور ان کو تنبیہ کر دیا تھا کہ
اس راہِ راست کے خلاف چلنے کا نتیجہ اسی جہنم کا ایندھن بننا ہو گا جس میں اب وہ جھونکے گئے ہیں، مگر انہوں
نے انبیاء کی بات نہ مانی، لہذا اب جو سزا انہیں دی جا رہی ہے وہ فی الواقع اس کے مستحق ہیں۔

یہ بات قرآن مجید میں بار بار ذہن نشین کرانی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امتحان کے لیے دنیا میں انسان
کو بھیجا ہے وہ اس طرح نہیں یا جا رہا ہے کہ اُسے بالکل بے خبر رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہو کہ وہ خود راہِ راست پاتا
ہے یا نہیں، بلکہ اُسے راہِ راست بتانے کا جو معقول ترین انتظام ممکن تھا وہ اللہ نے پوری طرح کر دیا ہے،
اور وہ ہی انتظام ہے کہ انبیاء بھیجے گئے ہیں اور کتابیں نازل کی گئی ہیں۔ اب انسان کا سارا امتحان اس امر
میں ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کی لائی ہوئی کتابوں کو مان کر سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے یا ان سے
مُتنبہ ہو کر خود اپنی خواہشات اور تخیلات کے پیچھے چلتا ہے۔ اس طرح نبوت در حقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ
نُجحت ہے جو اس نے انسان پر قائم کر دی ہے، اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے پر انسان کے مستقبل کا انحصار
ہے۔ انبیاء کے آنے کے بعد کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ ہم حقیقت سے آگاہ نہ تھے، ہمیں
اندھیرے میں رکھ کر ہم کو اتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا گیا، اور اب ہمیں بے قصور سزا دی جا رہی ہے۔
اس مضمون کو اتنی بار اتنے مختلف طریقوں سے قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے۔ مثال
کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفسیر القرآن، جلد اول، البقرہ، آیت ۲۱۳، حاشیہ ۲۳۔ النساء،
آیات ۴۱-۴۲، حاشیہ ۶۴۔ آیت ۱۶۵، حاشیہ ۲۰۸۔ الانعام، آیات ۱۳-۱۳۱، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد دوم،
بنی اسرائیل، آیت ۱۵، حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، طہ، آیت ۱۳۴۔ القصص، آیت ۴۷، حاشیہ ۶۶۔ آیت ۵۹،
حاشیہ ۸۳۔ آیت ۶۵۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۳۷۔ المؤمن، آیت ۵۰، حاشیہ ۶۶۔

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿۱۰﴾ فَأَعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ
فَنُفِقُوا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿۱۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۲﴾ وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ

”کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے۔“ اس طرح وہ اپنے قصور
کا خود اعتراف کر لیں گے، لعنت ہے ان دوزخیوں پر۔

جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، یقیناً ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر۔
تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دونوں کا حال تک

۱۵ یعنی تم بھی بکے ہوئے ہو اور تم پر ایمان لانے والے لوگ بھی سخت گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔
۱۶ یعنی ہم نے طالبِ حق بن کر انبیاء کی بات کو توجہ سے سنا ہوتا، یا عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے
کی کوشش کی ہوتی کہ فی الواقع وہ بات کیا ہے جو وہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہاں سننے کو سمجھنے پر
مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے نبی کی تعلیم کو توجہ سے سنا لیا اگر وہ لکھی ہوئی شکل میں ہو تو طالبِ حق
بن کر اُسے پڑھنا ہدایت پانے کے لیے شرطِ اول ہے۔ اُس پر غور کر کے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا
مرتبہ اس کے بعد آتا ہے۔ نبی کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل سے بطورِ خود کام سے کرنا سببِ براہِ راست حق تک نہیں
پہنچ سکتا۔

۱۷ تصور کا لفظ واحد استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اصل تصور جس کی بنا پر وہ جہنم کے
مستحق ہوئے رسولوں کا جھٹلانا اور ان کی پیروی سے انکار کرنا ہے۔ باقی سارے گناہ اسی کی فرع ہیں۔

۱۸ یہ دین میں اخلاق کی اصل جڑ ہے۔ کسی کا بُرائی سے اس لیے بچنا کہ اس کی ذاتی رائے میں وہ بُرائی
ہے، یا دنیا سے بُرا سمجھتی ہے، یا اس کے ارتکاب سے دنیا میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، یا اس پر کسی
دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ ہے، یہ اخلاق کے لیے ایک بہت ہی ناپائیدار بنیاد ہے۔ آدمی کی ذاتی رائے غلط بھی
ہو سکتی ہے، وہ اپنے کسی فلسفے کی وجہ سے ایک اچھی چیز کو بُرا اور ایک بُری چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کے معیار
غیر مشراؤل تو یکساں نہیں ہیں، پھر وہ ذوقاً فوقاً بدلتے بھی رہتے ہیں، کوئی عالمگیر اور ازلی وابدی معیار دنیا کے اخلاقی
فلسفوں میں نہ آج پایا جاتا ہے نہ کبھی پایا گیا ہے۔ دنیوی نقصان کا اندیشہ بھی اخلاق کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم
نہیں کرتا۔ جو شخص بُرائی سے اس لیے بچتا ہو کہ وہ دنیا میں اُس کی ذات پر مرتب ہونے والے کسی نقصان سے

يَذَاتِ الصُّدُورِ ۱۳ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللّٰطِيفُ الْخَبِيرُ ۱۴

جانتا ہے۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔

ڈرتا ہے وہ ایسی حالت میں اُس کے ارتکاب سے باز نہیں رہ سکتا جبکہ اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی وہ چیز نہیں ہے جو انسان کو ایک شریف انسان بنا سکتی ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی دنیوی طاقت بھی عالم الغیب والشہادہ نہیں ہے۔ بہت سے جرائم اُس کی نگاہ سے بچ کر کیے جاسکتے ہیں۔ اور ہر دنیوی طاقت کی گرفت سے بچنے کی بے شمار تدبیریں ممکن ہیں۔ پھر کسی دنیوی طاقت کے قوانین بھی تمام بُرائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔ بیشتر برائیاں ایسی ہیں جن پر دنیوی قوانین کوئی گرفت سرے سے کرتے ہی نہیں، حالانکہ وہ اُن برائیوں سے قبیح تر ہیں جن پر وہ گرفت کرتے ہیں۔ اس لیے دین حق نے اخلاق کی پوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اُس اُن دیکھے خدا سے ڈر کر بُرائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے، جس کی گرفت سے انسان بچ کر نہیں جاسکتا جس نے خیر و شر کا ایک ہمہ گیر، عالمگیر اور مستقل معیار انسان کو دیا ہے۔ اُس کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے اگر کوئی انسان بدی نہیں کرتا، یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے جو افعال نیکی میں شمار ہوتے ہیں اُن کو اختیار کرتا ہے تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے، کیونکہ ان کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو ریت پر تعمیر ہوئی ہو۔

۱۹ یعنی خدا سے بالغیب ڈرنے کے دو لازمی نتائج ہیں۔ ایک یہ کہ جو قصور بھی بشری کمزوریوں کی بنا پر آدمی سے سرزد ہو گئے ہوں وہ معاف کر دیے جائیں گے، بشرطیکہ ان کی تہ میں خدا سے بے خوفی کا فرما نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جو نیک اعمال بھی انسان اس عقیدے کے ساتھ انجام دے گا اُس پر وہ بڑا اجر پائیگا۔

۲۰ یہ بات تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرمائی گئی ہے، خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ مومن کے لیے اس میں یہ تلقین ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہر وقت یہ احساس اپنے ذہن میں تازہ رکھنا چاہیے کہ اس کے کھلے اور چھپے افعال و اعمال ہی نہیں، اس کی تمیز اور اس کے خیالات تک اللہ سے مخفی نہیں ہیں۔ اور کافر کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ اپنی جگہ خدا سے بے خوف ہو کر جو کچھ چاہے کرتا رہے، اس کی کوئی بات اللہ کی گرفت سے چھوٹی نہیں رہ سکتی۔

۲۱ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”کیا وہ اپنی مخلوق ہی کو نہ جانے گا؟ اصل میں مَنْ خَلَقَ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ”جس نے پیدا کیا ہے“ بھی ہو سکتے ہیں، اور ”جس کو اُس نے پیدا کیا ہے“ بھی۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ یہ دلیل ہے اُس بات کی جو اُدھر کے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے۔ یعنی آخر یہ کیسے

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذُلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا
مِنْ رِزْقِهِ وَإِلَيْهِ الشُّورُ ⑤ ءَأَمِنْتُمْ مَّن فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق اسی کے
حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جاننے ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تمہیں زمین میں

ممکن ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر ہو؟ مخلوق خود اپنے آپ سے بے خبر ہو سکتی ہے، مگر خالق اس سے بے خبر
نہیں ہو سکتا۔ تمہاری رگ رگ اس نے بنائی ہے۔ تمہارے دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ اس کا بنایا ہوا ہے۔
تمہارا ہر سانس اس کے جاری رکھنے سے جاری ہے۔ تمہارا ہر عضو اس کی تدبیر سے کام کر رہا ہے۔ اس سے تمہاری
کوئی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے؟

۵۲۲ اصل میں لفظ "لطیف" استعمال ہوا ہے جس کے معنی غیر محسوس طریقے سے کام کرنے والے کے

بھی ہیں اور پوشیدہ حقائق کو جاننے والے کے بھی۔

۵۲۳ یعنی یہ زمین تمہارے لیے آپ سے آپ تابع نہیں بن گئی ہے اور وہ رزق بھی جو تم کھا رہے ہو خود

بخود بیاں پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اللہ نے اپنی حکمت اور قدرت سے اس کو ایسا بنایا ہے کہ یہاں تمہاری زندگی
ممکن ہوئی اور یہ عظیم الشان گڑھ ایسا پڑ سکون بن گیا کہ تم اطمینان سے اس پر چل پھر رہے ہو اور ایسا خواہن نعمت بن
گیا کہ اس میں تمہارے لیے زندگی بسر کرنے کا بے حد حساب سر و سامان موجود ہے۔ اگر تم غفلت میں مبتلا نہ ہو اور
کچھ ہوش سے کام لے کر دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ اس زمین کو تمہاری زندگی کے قابل بنانے اور اس کے اندر
رزق کے اتنا ذخیرہ جمع کر دینے میں کتنی حکمتیں کار فرما ہیں۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم
المئل، حواشی ۷۳-۷۴-۸۱-جلد چہارم، بیس، حواشی ۲۹-۳۲-المومن، حواشی ۹-۱۰-۹۱-الزخرف، حاشیہ ۷-
المجادل، حاشیہ ۷-جلد پنجم، حق، حاشیہ ۱۸)۔

۵۲۴ یعنی اس زمین پر چلتے پھرتے اور خدا کا بخشنا ہوا رزق کھاتے ہوئے اس بات کو نہ بھولو کہ آخر کار

تمہیں ایک دن خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔

۵۲۵ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے، بلکہ یہ بات اس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ

انسان فطری طور پر جب خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی
طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کسی آفت کے موقع پر سب سہاروں سے مایوس ہوتا ہے تو آسمان کا رخ کر کے خدا سے
فریاد کرتا ہے۔ کوئی ناگہانی بلا آ پڑتی ہے تو کہتا ہے یہ ادب سے نازل ہوئی ہے۔ غیر معمولی طور پر حاصل ہونے
والی چیز کے متعلق کہتا ہے یہ عالم بالا سے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کتب سماوی یا کتب آسمانی

يَكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورٌ ﴿١٦﴾ أَمْ أَمِنْتُمْ مَن فِي السَّمَاءِ أَنْ يَرْسِلَ
عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرٍ ﴿١٧﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ

دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکے کھانے لگے؛ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے
تم پر پتھر اڑ کرنے والی ہو یا بھیج دے؛ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔ ان سے پہلے

کہا جاتا ہے۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص ایک کالی لونڈی کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ پر ایک مومن غلام آزاد کرنا واجب ہو گیا ہے، کیا میں اس
لونڈی کو آزاد کر سکتا ہوں؟ حضور نے اُس لونڈی سے پوچھا اللہ کہاں ہے؟ اُس نے انگلی سے آسمان کی طرف
اشارہ کر دیا۔ حضور نے پوچھا اور میں کون ہوں؟ اُس نے پہلے آپ کی طرف اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کیا،
جس سے اُس کا یہ مطلب واضح ہو رہا تھا کہ آپ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا، اسے آزاد
کر دو، یہ مومن ہے (اسی سے ملنا جلتا تَعْتَمِدُ مَوْطَأًا مُسْلِمًا اور نشائی میں بھی روایت ہوا ہے)۔ حضرت خولہ بنت ثعلبہ
کے متعلق حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے فرمایا، یہ وہ خاتون ہیں جن کی شکایت سات آسمانوں پر سُنی گئی
(تفسیر سورہ مجادلہ حاشیہ ۲ میں ہم اس کی تفصیل نقل کر چکے ہیں)۔ ان ساری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات
کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اُس کا ذہن نیچے زمین کی طرف نہیں بلکہ اوپر
آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کر یہاں اللہ تعالیٰ کے متعلق مَن فِي السَّمَاءِ (وہ جو آسمان میں
ہے) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ اس میں اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان
میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جبکہ اسی سورہ ملک کے آغاز میں فرمایا جا چکا ہے کہ الَّذِي
خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا (جس نے تہ بترتہ سات آسمان پیدا کیے) اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے،
فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (ہیں تم جہر بھی رخ کرو اُس طرف اللہ کا رخ ہے)۔

۱۷۔ ملا یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اس زمین پر تمہارا بقا اور تمہاری سلامتی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل
پر منحصر ہے۔ اپنے بل بوتے پر تم یہاں مزے سے نہیں دندنا رہے ہو۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جو یہاں
گزر رہا ہے، اللہ کی حفاظت اور نگہبانی کا رہن منت ہے۔ ورنہ کسی وقت بھی اُس کے ایک اشارے سے ایک
زلزلہ ایسا آ سکتا ہے کہ یہی زمین تمہارے لیے آغوشِ مادر کے بجائے قبر کا گڑھا بن جائے، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا
ہے جو تمہاری بستیوں کو غارت کر کے رکھ دے۔

۱۸۔ تنبیہ سے مراد وہ تنبیہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے ذریعہ سے کفار تک

مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۱۸ ۱۸ اَوْلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ
صَفَاتٍ وَ يَقْبِضْنَ ۱۹ ۱۹ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمَنُ اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
بَصِيرٌ ۲۰ ۲۰ اَمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصَرُكُمْ مِنْ دُونِ
الرَّحْمَنِ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۲۱ ۲۱ اَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ

وقف لازم اختلا
وقف غفران
وقف منزل

گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ میری گرفت کیسی سخت تھی۔ کیا یہ لوگ اپنے اوپر
اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سیکرتے نہیں دیکھتے؟ رحمان کے سوا کوئی نہیں جو انہیں
تھامے ہوئے ہو۔ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ بتاؤ، آخر وہ کونسا شکر تھا جسے پاس ہے
جو رحمان کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے
میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا پھر بتاؤ، کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمان

کوئی جا رہی تھی کہ اگر کفر و شرک سے باز نہ آؤ گے اور اس دعوتِ توحید کو نہ مانو گے جو تمہیں دی جا رہی ہے تو خدا
کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

۵۲۸ اشارہ ہے ان قوموں کی طرف جو اپنے ہاں آنے والے انبیاء کو جھٹلا کر اس سے پہلے مبتلائے
عذاب ہو چکی تھیں۔

۵۲۹ یعنی ایک ایک پرندہ جو ہوا میں اڑ رہا ہے، خدائے رحمن کی حفاظت میں اڑ رہا ہے۔ اسی نے
ہر پرندے کو وہ ساخت عطا فرمائی جس سے وہ اڑنے کے قابل ہوا۔ اسی نے ہر پرندے کو اڑنے کا طریقہ سکھایا۔
اسی نے ہوا کو ان قوانین کا پابند کیا جن کی بدولت ہوا سے زیادہ بھاری جسم رکھنے والی چیزوں کا اُس میں اڑنا ممکن
ہوا۔ اور وہی ہوا اڑنے والے کو فضا میں تھامے ہوئے ہے، ورنہ جس وقت بھی اللہ اپنی حفاظت اُس سے ہٹائے
وہ زمین پر آجے۔

۵۳۰ یعنی کچھ پرندوں ہی پر قوت نہیں، جو چیز بھی دنیا میں موجود ہے اللہ کی نگہبانی کی بدولت موجود ہے۔
وہی ہر شے کے لیے وہ اسباب فراہم کر رہا ہے جو اس کے وجود کے لیے درکار ہیں، اور وہی اس بات کی نگرانی
کر رہا ہے کہ اس کی پیدا کردہ ہر مخلوق کو اس کی ضروریات ہم پہنچیں۔

۵۳۱ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”رحمان کے سوا وہ کون ہے جو تمہارا شکر بنا جو تمہاری دستگیری

اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهُ بَلْ لَجُوْا فِى عُنُوْبِهِمْ وَّ نَفُوْرًا ۝۲۱ اَمِنْ يَّمْسِيْهِ مِكْبًا
 عَلٰى وَّجْهِهِ اَهْدٰى اَمِنْ يَّمْسِيْهِ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۲
 قُلْ هُوَ الَّذِىْ اَنْشَاَكُمْ وَّجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَّالْاَبْصَارَ وَاَلْفِیْدَةَ
 قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۲۳ قُلْ هُوَ الَّذِىْ ذَرَاكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاَلْبَسَكُمْ ثِيَابًا

اپنا رزق روک لے ۶ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچو، جو شخص
 منہ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار
 سڑک پر چل رہا ہو، ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں
 دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلا یا ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔

کرتا ہو یہ ہم نے تم میں جو ترجمہ کیا ہے وہ آگے کے فقرے سے مناسبت رکھتا ہے، اور اس دوسرے ترجمہ کی
 مناسبت پچھلے سلسلہ کلام سے ہے۔

۵۲۲ یعنی جانوروں کی طرح منہ نیچا کیے ہوئے اسی ڈگر پر چلا جا رہا ہو جس پر کسی نے اسے ڈال دیا ہو۔

۵۲۳ یعنی اللہ نے تو تمہیں انسان بنایا تھا، جانور نہیں بنایا تھا۔ تمہارا کام یہ نہیں تھا کہ جو گمراہی بھی دنیا میں
 پھیلی ہوئی ہو اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑو اور کچھ نہ سوچو کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔
 یہ کان تمہیں اس لیے تو نہیں دیے گئے تھے کہ جو شخص تمہیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھانے کی کوشش کرے اس کی بات
 سن کر نہ دو اور جو غلط باتیں پہلے سے تمہارے دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں انہی پر اڑے رہو یہ آنکھیں تمہیں اس
 لیے تو نہیں دی گئی تھیں کہ اندھے بن کر دوسروں کی پیروی کرتے رہو اور خود اپنی بیٹائی سے کام لے کر یہ نہ
 دیکھو کہ زمین سے آسمان تک ہر طرف جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ آباؤ اجداد کی شہادت دے رہی ہیں جسے خدا
 کا رسول پیش کر رہا ہے یا یہ شہادت دے رہی ہیں کہ یہ سارا نظام کائنات بے خدا ہے یا بہت سے خدا اس کو
 چلا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ دل و دماغ بھی تمہیں اس لیے نہیں دیے گئے تھے کہ تم سوچنے سمجھنے کا کام دوسروں کے
 حوالے کر کے ہر اُس طریقے کی پیروی کرنے لگو جو دنیا میں کسی نے جاری کر دیا ہے اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچنے
 کی کوئی زحمت گوارا نہ کر دو کہ وہ غلط ہے یا صحیح۔ اللہ نے علم و عقل اور سماعت و بینائی کی یہ نعمتیں تمہیں حق شناسی کے

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۵۰﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ

یہ کہتے ہیں ”اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟“ کہو، ”اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے، میں تو بس صاف صاف خبردار کرنے دینے والا ہوں۔“ پھر جب یہ اُس چیز کو قریب دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے

لیے دی گئی تھی۔ تم ناشکری کر رہے ہو کہ ان سے اور سارے کام تو لیتے ہو مگر بس وہی ایک کام نہیں لیتے جس کے لیے یہ دی گئی تھی (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۴۲-۴۳۔ جلد سوم، المؤمنون، حواشی ۴۵-۴۶۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۷-۱۸۔ الاحقاف، حاشیہ ۳۱)۔

۵۲۲ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ہر گوشہ زمین سے گھیر لائے جاؤ گے اور اس کے سامنے حاضر کر دیے جاؤ گے۔

۵۲۵ یہ سوال اس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کا وقت اور اُس کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے اور اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر انہیں اُس کی آمد کا سال، مہینہ، دن اور وقت بتا دیا جائے تو وہ اسے مان لیں گے بلکہ دراصل وہ اُس کے آنے کو غیر ممکن اور بعید از عقل سمجھتے تھے اور یہ سوال اس غرض کے لیے کرتے تھے کہ اُسے جھٹلانے کا ایک بہانہ ان کے ہاتھ آئے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ حشر و نشر کا یہ عجیب و غریب افسانہ جو تم ہمیں سنارہے ہو آخر یہ کب ظہور میں آئے گا؟ اسے کس وقت کے لیے اٹھار کھا گیا ہے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر اسے دکھا کیوں نہیں دیتے کہ ہمیں اس کا یقین آجائے؟ اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی شخص اگر قیامت کا قائل ہو سکتا ہے تو عقلی دلائل سے ہو سکتا ہے، اور قرآن میں جگہ جگہ وہ دلائل تفصیل کے ساتھ دے دیے گئے ہیں۔ رہی اُس کی تاریخ، تو قیامت کی بحث میں اُس کا سوال اٹھانا ایک جاہل آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض وہ بتا بھی دی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ماننے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ جب وہ تمہاری بتائی ہوئی تاریخ پر آجائے گی تو مان لوں گا، آج آخر میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ اُس روز ضرور آجائے گی (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۶۳۔ الاحزاب، حاشیہ ۱۱۶۔ سبأ، حواشی ۵-۲۸۔ یس، حاشیہ ۴۵)۔

۵۲۶ یعنی یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور آئے گی، اور لوگوں کو اس کی آمد سے پہلے خبردار کر دینے کے لیے یہی جانا کافی ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ کب آئے گی، تو اس کا علم اللہ کو ہے، مجھے نہیں ہے، اور خبردار کرنے کے لیے اس علم کی کوئی حاجت نہیں۔ اس معاملہ کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات کہ کون شخص کب مرے گا، اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ ہمارا یہ علم اس بات کے لیے

وَجُوهَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدْعُونَ ﴿۲۷﴾ قُلْ
 أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكِنِي اللَّهُ وَمَنْ مَعِيَ أَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُجِيرُ الْكَافِرِينَ
 مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۸﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا
 فَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ
 مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ ﴿۳۰﴾

چہرے بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا ہے، اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز
 جس کے لیے تم تقاضے کر رہے تھے۔

ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر
 رحم کرے، کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا؟ ان سے کہو، وہ بڑا رحیم ہے، اسی پر ہم ایمان
 لائے ہیں، اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے
 ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی
 کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لادے گا؟

کافی ہے کہ ہم اپنے کسی غیر محتاط دوست کو یہ تنبیہ کریں کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مفاد کی حفاظت کا انتظام
 کرے۔ اس تنبیہ کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ وہ کس روز مرے گا۔

۵۲۷ یعنی ان کا وہی حال ہو گا جو پھانسی کے تختہ کی طرف سے چلے جانے والے کسی مجرم کا ہوتا ہے۔
 ۵۲۸ مکہ معظمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آغاز ہوا اور قریش کے مختلف خاندانوں
 سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تو گھر گھر حضور اور آپ کے ساتھیوں کو بددعاؤں سے
 جانے لگیں۔ جادو ٹونے کیے جانے لگے تاکہ آپ ہلاک ہو جائیں۔ حتیٰ کہ قتل کے منصوبے بھی سوچے جانے لگے۔
 اس پر یہ فرمایا گیا کہ ان سے کہو، خواہ ہم ہلاک ہوں یا خدا کے فضل سے زندہ رہیں، اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟
 تم اپنی فکر کرو کہ خدا کے عذاب سے تم کیسے بچو گے۔

۵۲۹ یعنی ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور تم اس سے انکار کر رہے ہو، ہمارا بھروسہ خدا پر ہے اور تمہارا اپنے



جنتوں اور اپنے وسائل اور اپنے معبودانِ غیر اللہ پر۔ اس لیے خدا کی رحمت کے مستحق ہم ہو سکتے ہیں نہ کہ تم۔
 ۵۷۔ یعنی کیا خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہے کہ ان سوتوں کو پھر سے جاری کر دے؟ اگر نہیں ہے، اور تم
 جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر عبادت کا مستحق خدا ہے، یا تمہارے وہ معبود جو انہیں جاری کرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتے؟
 اس کے بعد تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ گمراہ خداؤںے واحد کو ماننے والے ہیں یا وہ جو شرک کر رہے ہیں؟



تعبير القرآن

القلم

(٩٨)

القلم

نام | اس کا نام سورۃ ن بھی ہے اور القلم بھی۔ دونوں الفاظ سورۃ کے آغاز ہی میں موجود ہیں۔

زمانہ نزول | یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون سے یہ بات حترشح ہوتی ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون | اس میں تین مضامین بیان ہوئے ہیں۔ مخالفین کے اعتراضات کا جواب، ان کو تنبیہ اور نصیحت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔

آغاز کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا ہے کہ یہ کفار تم کو دیوانہ کہتے ہیں، حالانکہ جو کتاب تم پیش کر رہے ہو اور اخلاق کے جس اعلیٰ مرتبے پر تم فائز ہو رہے ہو خود ان کے اس جھوٹ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب سب ہی دیکھ لیں گے کہ دیوانہ کون تھا اور فرزانہ کون۔ لہذا مخالفت کا جو طوفان تمہارے خلاف اٹھایا جا رہا ہے اس کا دباؤ ہرگز قبول نہ کرو۔ دراصل یہ ساری باتیں اس لیے جاری ہیں کہ تم کسی نہ کسی طرح دب کر ان سے مصالحت (Compromise) کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

پھر عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے نام لیے بغیر مخالفین میں سے ایک نمایاں شخص کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے اہل مکہ خوب جانتے تھے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق بھی سب کے سامنے تھے، اور ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ آپ کی مخالفت میں مکہ کے جو سردار پیش پیش ہیں ان میں کس سیرت و کردار کے لوگ شامل ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱ سے ۲۳ تک ایک باغ والوں کی مثال پیش کی گئی ہے جنہوں نے اللہ سے نعمت پا کر اُس کی ناشکری کی اور ان کے اندر جو شخص سب سے بہتر تھا اس کی نصیحت برود نہ مانی، آخر کار وہ اُس نعمت سے محروم ہو گئے اور ان کی آنکھیں اُس وقت کھلیں جب ان کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ یہ مثال دے کر اہل مکہ کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پستت سے تم بھی اُسی آزمائش میں پڑ گئے ہو جس میں وہ باغ والے پڑے تھے۔ اگر ان کی بات نہ مانو گے تو دنیا میں بھی عذاب بھگتو گے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

پھر آیت ۳۲ سے ۷۷ تک مسلسل کفار کو نمائش کی گئی ہے جس میں کہیں تو خطاب براہ راست اُن سے ہے اور کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے دراصل تنبیہ اُن کو کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کی بھلائی لازماً انہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماں فرما نبرداروں کا انجام وہ ہو جو مجرموں کا ہونا چاہیے۔ کفار کی یہ غلط فہمی قطعی بے بنیاد ہے کہ خدا اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جو وہ خود اپنے لیے تجویز کرتے ہیں، حالانکہ اس کے لیے اُنہیں کوئی ضمانت حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو دنیا میں خدا کے آگے ٹھکنے کی دعوت دی جا رہی ہے، اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں، قیامت کے روز وہ سجدہ کرنا چاہیں گے بھی تو نہ کر سکیں گے اور ذلت کا انجام انہیں دیکھنا پڑے گا۔ قرآن کو جھٹلا کر وہ خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ اُنہیں جو ڈھیل دی جا رہی ہے اس سے وہ دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس تکذیب کے باوجود جب اُن پر عذاب نہیں آ رہا ہے تو وہ صحیح راستے پر ہیں، حالانکہ وہ بے خبری میں ہلاکت کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس رسول کی مخالفت کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک بے غرض مبلغ ہے، اپنی ذات کے لیے اُن سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے، اور وہ یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ اُنہیں اُس کے رسول نہ ہونے اور اُس کی باتوں کے غلط ہونے کا علم حاصل ہے۔

آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا فیصلہ آنے تک جو سختیاں بھی تبلیغ دین کی راہ میں پیش آئیں اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے چلے جائیں اور اُس بے صبری سے بچیں جو یونس علیہ السلام کے لیے ایتلا کی موجب بنی تھی۔

رُكُومًا ۲

سُورَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ

اِيَاتَهَا ۵۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ① مَا أَنْتَ بِمُعْجِزٍ لِّكَ بِمَجْنُونٍ ②

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ③ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ④

ن۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

۱۔ امام تفسیر مجاہد کہتے ہیں کہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے ذکر یعنی قرآن لکھا جا رہا تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ چیز جو لکھی جا رہی تھی اُس سے مراد قرآن مجید ہے۔

۲۔ یہ ہے وہ بات جس پر قلم اور کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن جو کاتبین وحی کے ہاتھوں سے ثبت ہو رہا ہے، بجائے خود کفار کے اس بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں۔ حضور کے دعوائے نبوت سے پہلے تو اہل مکہ آپ کو اپنی قوم کا بہترین آدمی مانتے تھے اور آپ کی دیانت و امانت اور عقل و فراست پر اعتماد رکھتے تھے۔ مگر جب آپ نے ان کے سامنے قرآن پیش کرنا شروع کیا تو وہ آپ کو دیوانہ قرار دینے لگے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ قرآن ہی ان کے نزدیک وہ سبب تھا جس کی بنا پر انہوں نے آپ پر دیوانگی کی تہمت لگائی۔ اس ویسے فرمایا گیا کہ قرآن ہی اس تہمت کی تردید کے لیے کافی ثبوت ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا فصیح و بلیغ کلام جو ایسے بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، اس کا پیش کرنا تو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کا خاص فضل ہوا ہے، کجا کہ اسے اس امر کی دلیل بنایا جائے کہ آپ معاذ اللہ دیوانہ ہو گئے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب تو بیٹا ہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل مقصود کفار کو ان کی تہمت کا جواب دینا ہے۔ لہذا کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آیت حضور کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہ نہ تھا کہ اسے دور کرنے کے لیے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی۔ مدعا کفار سے یہ کہنا ہے کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اُس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمہارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ طور، حاشیہ ۲۲)۔

۳۔ یعنی آپ کے لیے اس بات پر بے حساب اور لازوال اجر ہے کہ آپ خلق خدا کی ہدایت کے لیے جو

کوششیں کر رہے ہیں اُن کے جواب میں آپ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سُنی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپ اپنے اس فرض کو انجام دیے چلے جا رہے ہیں۔

۷۔ اس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آپ اخلاق کے بہت بلند مرتبے پر فائز ہیں اسی وجہ سے آپ ہدایتِ خلق کے کام میں یہ اذیتیں برداشت کر رہے ہیں، ورنہ ایک کمزور اخلاق کا انسان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن کے علاوہ آپ کے بلند اخلاق بھی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے، کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہل مکہ اُن سے ناواقف نہ تھے۔ اس لیے اُن کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اُن کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ خود اُن کے لیے نقصان دہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابل تصور نہ مان سکتا تھا۔ یہ معاملہ اُن مدعیانِ علم و تحقیق کا بھی ہے جو اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی اور جنون کی تہمت رکھ رہے ہیں۔ قرآن پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضور کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اس بے مثل کتاب کے پیش کرنے والے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغو بات کہہ رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اس قول میں فرمائی ہے کہ کان خلقہ القرآن۔ قرآن آپ کا اخلاق تھا، امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور ابن جریر نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اُن کا یہ قول متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اس کا مجسم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا آپ نے خود سب سے زیادہ اُس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا سب سے بڑھ کر آپ کی ذات اُن سے منصف تھی، اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھہرایا گیا سب سے زیادہ آپ اُن سے پاک تھے۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو

فَسْتَبْصِرُ وَيَصِيرُونَ ۝ يَا أَيُّكُمُ الْمَفْتُونُ ۝ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
 مِمَّنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ۝
 وَذُواكُودُ تَدُهِنُ فَيُدْهِنُونَ ۝ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَتَّاءِ
 مَثَآءٍ بِمِثْمِمْ ۝ مَثَآءٍ لِلْخَيْرِ مَعْتَدٍ آثِيمٍ ۝ عَتِلٌّ بَعْدَ ذَلِكَ

عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔ تمہارا رب
 ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا
 ہے جو راہِ راست پر ہیں۔ لہذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم
 بدامنت کرو تو یہ بھی بدامنت کریں۔ ہرگز نہ دو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے وقت
 آدمی ہے، طعنے دیتا ہے، پھیلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے
 گزر جانے والا ہے، سخت بد اعمال ہے، جھنکار ہے، اور ان سب عیوب کے ساتھ

نہیں ملا، اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپ کو پہنچانی گئی ہو، آئیے کہ اللہ کی حرمتوں
 کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو، اور آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک
 کا آپ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ آسان تر کام کو پسند فرماتے ہتھے، آئیے کہ وہ گناہ ہو، اور اگر کوئی کام
 گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دُور رہتے ہتھے، دُستِ احمدی حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ”میں نے
 دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے کبھی میری کسی بات پر اُفت نہ کی، کبھی
 میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا، اور کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں
 نہ کیا“ (بخاری و مسلم)۔

۵۵ یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کر
 لیں، یا تم ان کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو یہ تمہارے ساتھ
 مصالحت کر لیں۔

۵۶ اصل میں لفظ مہینہ استعمال ہوا ہے جو حقیر و ذلیل اور گھٹیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ درحقیقت
 یہ بہت قسمیں کھانے والے آدمی کی لازمی صفت ہے۔ وہ بات بات پر اس لیے قسم کھاتا ہے کہ اُسے خود یہ احساس

زَنِيۡمٍ ۱۳ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيۡنَ ۱۴ اِذَا تُتْلٰۤى عَلَيْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ
الْاَوَّلِيۡنَ ۱۵ سَنَسِيۡمُهُ عَلٰى الْخُرطُوۡمِ ۱۶ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَا اَصْحٰبَ

بداصل ہے، اس بنا پر کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے جب ہماری آیات اُس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے۔

ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش

ہو تا ہے کہ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کی بات پر اُس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک وہ قسم نہ کھائے۔ اس بنا پر وہ اپنی نگاہ میں خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

۱۳ اصل میں مَنَامٍ لِلْخَيْرِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ خیر عربی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کو مال کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ وہ سخت بخیل اور کنجوس آدمی ہے، کسی کو پھوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں۔ اور اگر خیر کو نیکی اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہر نیکی کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے لوگوں کو روکنے میں بہت سرگرم ہے۔

۱۴ اصل میں لَفْظٌ عُنُقٌ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا اور بہت کھانے پینے والا ہو، اور اس کے ساتھ نہایت بدخلق، جھگڑا لوار سفاک ہو۔

۱۵ اصل میں لَفْظٌ زَنِيۡمٍ استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں یہ لفظ اُس ولد الزنا کے لیے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہو گیا ہو۔ سعید بن جبیر اور شعبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اُس شخص کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شرکی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔

ان آیات میں جس شخص کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں اُس کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص زبید بن ربیعہ تھا۔ کسی نے اسود بن عبد یغوث کا نام لیا ہے۔ کسی نے اُخَس بن شریق کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ اور بعض لوگوں نے کچھ دوسرے اشخاص کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں نام لیے بغیر صرف اُس کے اوصاف بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں وہ اپنے ان اوصاف کے لیے اتنا مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی یہ صفات سنتے ہی ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے۔

۱۶ اس فقرے کا تعلق اوپر کے سلسلہ کلام سے بھی ہو سکتا ہے اور بعد کے فقرے سے بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ایسے آدمی کی دھونس اس بنا پر قبول نہ کر کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔ دوسری صورت

الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۝۱۷ وَلَا يَسْتَنْوُونَ ۝۱۸ فَطَافَ
 عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّنْ سَرِّيَكٍ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝۱۹ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝۲۰
 فَتَنَادُوا مُصْبِحِينَ ۝۲۱ أَنْ ائْتُوا عَلٰى حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۲۲
 فَأَنْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ۝۲۳ إِنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينٌ ۝۲۴
 وَغَدَوَا عَلَىٰ حَرْدٍ قٰدِرِينَ ۝۲۵ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُونَ ۝۲۶

میں ڈالا تھا، جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی
 استثناء نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر
 پھرنے اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو بچارا کہ اگر
 پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں جھکے
 جھکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے
 کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر)
 قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے ”ہم راستہ بھول گئے ہیں، نہیں“

میں معنی یہ ہوں گے کہ بہت مال اولاد والا ہونے کی بنا پر وہ مغرور ہو گیا ہے، جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی
 ہیں تو کہتا ہے یہ اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔

۱۷ چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑی ناک والا سمجھتا تھا اس لیے اس کی ناک کو سونڈ کہا گیا ہے۔ اور ناک پر
 داغ لگانے سے مراد تذلیل ہے۔ یعنی ہم دنیا اور آخرت میں اس کو ایسا ذلیل و خوار کریں گے کہ ابد تک یہ عار اس
 کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

۱۸ اس مقام پر سورہ کعبہ رکوع ۵ بھی پیش نظر رہے جس میں اسی طرح عبرت دلانے کے لیے دو باغ
 والوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔

۱۹ یعنی انہیں اپنی قدرت اور اپنے اختیار پر ایسا بھروسہ تھا کہ قسم کھا کر بے تکلف کہہ دیا کہ ہم ضرور کل
 اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت وہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم یہ
 کام کریں گے۔

بَلْ نَحْنُ مُسْرِمُونَ ﴿۲۸﴾ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ﴿۲۹﴾
 قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۳۰﴾ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ
 يَتَلَاوَمُونَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا يَوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۳۲﴾ عَسَى رَبَّنَا أَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا
 مِنْهَا إِنَّا إِلَى رَبِّنَا رَاغِبُونَ ﴿۳۳﴾ كَذَلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ

وقف لازم

بلکہ ہم محروم رہ گئے۔ ان میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اُس نے کہا ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ وہ پکارا اٹھے پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گارتھے۔ پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کو انہوں نے کہا ”افسوس ہمارے حال پر بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“ ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے،

۱۴۔ کہتے ہیں کہ لفظ غالباً اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ باغ میں درختوں کے درمیان کھیت بھی تھی۔

۱۵۔ اصل الفاظ ہیں علیٰ حوڑ۔ حوڑ عربی زبان میں روکنے اور نہ دہنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، قصد اور

طے شدہ فیصلے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور سرعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں تینوں معنوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

۱۶۔ یعنی پہلے تو انہیں باغ کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ انہی کا باغ ہے اور کہنے لگے شاید ہم راستہ

بھول کر کسی اور جگہ نکل آئے ہیں، پھر جب غور کیا اور معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا باغ ہی ہے تو چیخ اٹھے کہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

۱۷۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور توڑیں گے

اُس وقت اس شخص نے ان کو تنبیہ کی تھی کہ تم خدا کو بھول گئے، ان شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟ مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی۔ پھر جب وہ مسکینوں کو کچھ نہ دینے کا فیصلہ کر رہے تھے اُس وقت بھی اس نے انہیں نصیحت کی کہ اللہ کو یاد کرو اور اس بڑی نیت سے باز آ جاؤ، مگر وہ اپنی بات پر جھگے رہے۔

۱۸۔ یعنی ہر ایک نے دوسرے کو الزام دینا شروع کیا کہ اُس کے بھکانے سے ہم اس خدا فراموشی اور

بدنیتی میں مبتلا ہوئے۔

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝۳۳ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ ۝۳۴
 أَفَتَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۝۳۵ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝۳۶
 أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝۳۷ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝۳۸ أَمْ
 لَكُمْ آيَاتٌ عَلَيْنَا بِاللِّغَةِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝۳۹
 سَلِّمُوا إِلَيْهِمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ ۝۴۰ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ

کاش یہ لوگ اس کو جانتے

یقیناً خدا ترس لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں۔ کیا ہم فرماں برداروں
 کا حال مجرموں کا سا کریں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے
 جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر
 کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا
 تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر ان کے ٹھہرائے ہوئے
 کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اس کا ذمہ لیا ہوا)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے شرکیوں کو

۵۱۹ مکہ کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو یہ نعمتیں جو دنیا میں مل رہی ہیں، یہ خدا کے
 ہاں ہمارے مقبول ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بد حالی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے غضوب
 ہو۔ لہذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی، جیسا کہ تم کہتے ہو، تو ہم وہاں بھی مزے کریں گے اور عذاب تم پر ہو گا نہ کہ ہم
 پر۔ اس کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

۵۲۰ یعنی یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرمانبردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمہاری سمجھ میں آخر
 کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا رہا ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے
 احکام کی اطاعت کی اور بڑے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ نئے جو اس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور
 جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوشحالی تو دیکھ لی، مگر اچھے اور ان کے
 اخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں ان فرمانبرداروں کے ساتھ تو مجرموں

إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ﴿۳۱﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى
السُّجُودِ فَلَا يَسْتِطِيعُونَ ﴿۳۲﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهُقُهُمْ
ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ﴿۳۳﴾

اگر یہ سچے ہیں۔

جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے، ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی۔ یہ جب صحیح و سالم تھے اُس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے)۔

کام معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔

۵۲۱ یعنی اللہ تعالیٰ کی کبھی ہوئی کتاب۔

۵۲۲ اصل میں لفظ زَعِيم استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں زَعِيم اس شخص کو کہتے ہیں جو کفیل، یا ضامن یا کسی قوم کی طرف سے بولنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کوئی آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمانہ رکھا ہے۔

۵۲۳ یعنی تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اُس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے اُن میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلو سکتے کہ خدا کے ہاں تمہیں جنت دلوادینے کا وہ ذمہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمہیں کہاں سے لاسخ ہو گئی؟

۵۲۴ اصل الفاظ ہیں يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ، جس روز پنڈلی کھولی جائے گی یہ صحابہ اور تابعین

کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آپڑنے کو کشف ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس نے بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں اور ثبوت میں کلام عرب سے استشہاد کیا ہے۔ ایک اور قول جو ابن عباس اور ربیع بن انس سے منقول ہے اس میں کشف ساق سے مراد حقائق پر پردہ اٹھانا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

۵۲۵ اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز علی الاطلاق اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ
حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿۳۴﴾ أَمْ
تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ﴿۳۵﴾ أَمْ عِنْدَهُمْ

پس اے نبی، تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقہ سے
ان کو تدریجاً تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رستی دراز کر رہا
ہوں، میری چال بڑی زبردست ہے۔

کیا تم ان سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس حقیقی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟ کیا ان کے پاس

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اُس سے منحرف تھا۔ اس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ
وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجالائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ اور جن
لوگوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سر نیا نہ جھکانے سے انکار کر دیا تھا ان کی کمر تختہ ہو جائے گی۔ ان کے لیے
یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ اس لیے وہ ذلت اور پشیمانی کے ساتھ
کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

۳۶ یعنی ان سے نکلنے کی فکر میں نہ پڑو۔ ان سے ٹھننا میرا کام ہے۔

۳۷ بے خبری میں کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک دشمن حق اور ظالم کو دنیا میں
نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اولاد اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں، جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں
جو کچھ کر رہا ہوں خوب کر رہا ہوں، میرے عمل میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس طرح وہ حق دشمنی اور ظلم و طغیان میں زیادہ
سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں بلکہ درحقیقت یہ اس
کی ہلاکت کا سامان ہے۔

۳۸ اصل میں لفظ کید استعمال ہوا ہے جس کے معنی کسی کے خلاف خفیہ تدبیر کرنے کے ہیں۔ یہ چیز
صرف اُس صورت میں ایک برائی ہوتی ہے جب یہ ناخوش کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے ہو۔ ورنہ بجاٹے خود اس
میں کوئی برائی نہیں ہے، خصوصاً جب کسی ایسے شخص کے خلاف یہ طریقہ اختیار کیا جائے جس نے اپنے آپ کو
اس کا مستحق بنایا ہو۔

۳۹ سوال بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جا رہا ہے، مگر اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپ

الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿۳۷﴾ فَأَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ
 إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿۳۸﴾ لَوْلَا أَن تَدْرِكُهُ نِعْمَةٌ مِّنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ
 بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿۳۹﴾ فَاجْتَبِهْ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۴۰﴾

غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہوں؟ پس اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے
 (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جاؤ، جب اُس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اگر اس کے
 رب کی مہربانی اُس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔ آخر کا
 اُس کے رب نے اسے برگزیدہ فرمایا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر دیا۔

کی مخالفت میں حد سے گزرے جا رہے تھے۔ اُن سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ہمارا رسول تم سے کچھ مانگ رہا ہے کہ تم
 اس پر اتنا بگڑ رہے ہو؟ تم خود جانتے ہو کہ وہ ایک بے غرض آدمی ہے اور جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے صرف
 اس لیے کر رہا ہے کہ اس کے نزدیک اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ تم نہیں ماننا چاہتے تو نہ مانو، مگر اس تبلیغ پر
 آخر اتنے چراغ پا کیوں ہوئے جا رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ
 طور، حاشیہ ۳۱)۔

۳۲ یہ دوسرا سوال بھی بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل آپ کے مخالفین اس
 کے مخاطب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں نے پردہ غیب کے پیچھے جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ یہ رسول
 فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا رسول نہیں ہے اور جو حقیقتیں یہ تم سے بیان کر رہا ہے وہ بھی غلط ہیں، اس لیے تم
 اس کو جھٹلانے میں اتنی شدت برت رہے ہو؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورہ طور، حاشیہ ۳۲)۔

۳۱ یعنی وہ وقت ابھی دُور ہے جب اللہ تعالیٰ تمہاری فتح و نصرت اور تمہارے ان مخالفین کی شکست
 کا فیصلہ فرمادے گا۔ اُس وقت کے آنے تک جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی اس دین کی تبلیغ میں پیش آئیں انہیں صبر
 کے ساتھ برداشت کرتے چلے جاؤ۔

۳۲ یعنی یونس علیہ السلام کی طرح بے صبری سے کام نہ لو جو اپنی بے صبری کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ میں
 پہنچا دیے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کی تلقین کرنے کے بعد فوراً ہی یہ
 فرمانا کہ یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جاؤ، خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے اللہ کا فیصلہ آنے سے
 پہلے بے صبری سے کوئی کام کیا تھا جس کی بنا پر وہ عتاب کے مستحق ہو گئے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،

وقف لازم

وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ
وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۗ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝

وقف لازم
۱۹

جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ
گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے، حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں
کے لیے ایک نصیحت ہے۔

جلد دوم، یونس، آیت ۹۸، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، الانبیاء، آیات ۸۷-۸۸۔ حواشی ۸۲ تا ۸۵۔ جلد چہارم، الصافات،
آیات ۳۹ تا ۴۸، حواشی ۷۸ تا ۸۵۔

۳۳ سورہ انبیاء میں اس کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ مچھلی کے پیٹ اور سمندر کی نارہکیوں میں حضرت
یونس علیہ السلام نے پکارا تھا اَلَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، ”کوئی خدا نہیں تیری پاک ذات
کے سوا، میں واقعی خطا دار ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی فریاد سن لی اور ان کو غم سے نجات دی (آیات
۸۷-۸۸)۔

۳۴ اس آیت کو سورہ صافات کی آیات ۴۲ تا ۴۶ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس
وقت حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں ڈالے گئے تھے اُس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے، لیکن جب انہوں
نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کر لیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی ستیم حالت میں
ایک چٹیل زمین پر پھینکے گئے، مگر وہ اُس وقت مذمت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُس
جگہ ایک بیلدار درخت اُگا دیا، تاکہ اُس کے پتے ان پر سایہ بھی کریں اور وہ اس کے پھل سے بھوک اور تشنگی
بھی دور کر سکیں۔

۳۵ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُس
کو کھا جائے گا۔ کفار مکہ کے اس جذبہ غیظ و غضب کی کیفیت سورہ بنی اسرائیل، آیات ۳ تا ۷ میں بھی بیان
ہوئی ہے۔

تفسير القرآن

الكشاف

(49)

الْحَاقَّةُ

نام | سُورۃ کے پہلے ہی لفظ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سُورتوں میں سے ہے اور اس کے

مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی مخالفت تو شروع ہو چکی تھی، مگر اس نے ابھی نہ بدہ شدت نہ اختیار کی تھی۔ مُسَدِّدِ اَحْمَد میں حضرت

عمرؓ کی روایت ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تانے

کے لیے گھر سے نکلا مگر آپ مجھ سے پہلے مسجد حرام میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپ نماز میں

سورۃ الحاقۃ پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر

میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش

کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضورؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ”یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے کسی

شاعر کا قول نہیں ہے“ میں نے اپنے دل میں کہا شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اُسی وقت زبان

مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے ”اور نہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ

تو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے“ یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اُتر گیا حضرت

عمرؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اُن کے قبولِ اسلام سے بہت پہلے نازل

ہو چکی تھی، کیونکہ اس واقعہ کے بعد بھی ایک مدت تک وہ ایمان نہیں لائے تھے اور وقتاً فوقتاً متعدد

واقعات اُن کو اسلام سے متاثر کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اپنی بہن کے گھر میں اُن کے دل پر

وہ آخری ضرب لگی جس نے ان کو ایمان کی منزل پر پہنچا دیا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن،

جلد سوم، دیباچہ سورۃ مریم۔ جلد پنجم، دیباچہ سورۃ واقعہ۔

موضوع اور مضمون | اس کا پہلا رکوع آخرت کے بیان میں ہے، اور دوسرا رکوع قرآن کے

مُنزَل من اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول برحق ہونے کے بارے میں۔

پہلے رکوع کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک

ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آکر رہنی ہے۔ پھر آیت ۴۴ سے ۲۱ تک یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے

جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا ہے وہ آخر کار خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہی ہیں۔

اس کے بعد آیت ۷۱ تک قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ کس طرح برپا ہوگی۔ پھر آیت ۱۸ سے ۷۰ تک وہ اصل مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد نوع انسانی کے لیے ایک دوسری زندگی مقدر فرمائی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اُس روز تمام انسان اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوں گے جہاں اُن کا کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا۔ ہر ایک کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی تھی کہ ایک دن اُنہیں اپنے رب کو اپنا حساب دینا ہے، اور جنہوں نے دنیا کی زندگی میں نیک عمل کر کے اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے پیشگی سامان کر لیا تھا، وہ اپنا حساب پاک دیکھ کر خوش ہو جائیں گے اور انہیں جنت کا ابدی عیش نصیب ہو گا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے نہ خدا کا حق مانا نہ بندوں کا حق ادا کیا، انہیں جہنم کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

دوسرے رکوع میں کفار مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اس قرآن کو ایک شاعر اور کاہن کا کلام کہتے ہو، حالانکہ یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے جو ایک رسول کریم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ رسول اس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس میں اپنی من گھڑت کوئی چیز شامل کر دے تو ہم اُس کی رگ گردن دبا رگ دلا، کاٹ دیں۔ یہ ایک یقینی برحق کلام ہے اور جو لوگ اسے جھٹلائیں گے انہیں آخر کار پچھتانا پڑے گا۔

ایاتھا ۵۲

سُورَةُ الْحَاقَّةِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعَاتُهَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَاقَّةُ ① مَا الْحَاقَّةُ ② وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْحَاقَّةُ ③ كَذَّبَتْ
ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالقَارِعَةِ ④ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ⑤

ہونی شدنی! کیا ہے وہ ہونی شدنی؟ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شدنی؟
ثمود اور عادنے اُس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا۔ تو ثمود ایک سخت حادثہ سے ہلاک کیے گئے

۱۔ اصل میں لفظ الحاقۃ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ واقعہ جس کو لازماً پیش آکر رہتا ہے، جس کا آنا
برحق ہے، جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ قیامت کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا اور پھر کلام کا آغاز ہی اس
سے کرنا خود بخود یہ ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو اُس کے آنے کو جھٹلا رہے تھے۔ اُن کو خطاب کر کے فرمایا
جا رہا ہے کہ جس چیز کی تم تکذیب کر رہے ہو وہ ہونی شدنی ہے، تمہارے انکار سے اُس کا انارک نہیں جائے گا۔
۲۔ یکے بعد دیگرے یہ دو سوالات سامعین کو پوچھنے کے لیے کیے گئے ہیں تاکہ وہ بات کی اہمیت کو سمجھیں
اور پوری توجہ کے ساتھ آگے کی بات سُنیں۔

۳۔ کفار مکہ چونکہ قیامت کو جھٹلا رہے تھے اور اُس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے اس لیے پہلے اُن کو خبردار
کیا گیا کہ وہ تو ہونی شدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہر حال آکر رہے گی۔ اس کے بعد اب اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ
یہ معاملہ صرف اتنا سادہ سا معاملہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعہ کی خبر کو تسلیم کرنا ہے یا نہیں، بلکہ
اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اخلاق اور پیراؤں کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ
شناہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جھٹلا دیا
کہ انسان کو آخر کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اخلاق بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا
کے عذاب نے اکر دنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دیا۔

۴۔ اصل لفظ القارۃ ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھوکنے، کوٹنے، کھڑکھڑا دینے، اور ایک چیز کو
دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے لیے یہ دوسرا لفظ اُس کی بولناکی کا تصور دلانے کے
لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۵۔ سورۃ اعراف، آیت ۷۸ میں اس کو الرَّجْفَةُ (زبردست زلزلہ) کہا گیا ہے۔ سورۃ ہود، آیت ۶۷

وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۖ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ
 وَتَمِيْنَةٍ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أُجِازٌ يُنخَل
 خَاوِيَةٌ ۗ فَهَلْ تَرَى لَهُم مِّنْ بَاقِيَةٍ ۝ ۸ وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ
 وَالْمُؤْتَفِكَةُ بِالْخَاطِئَةِ ۗ فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ فَأَخَذَهُمُ أَخْذَةً
 رَّابِيَةً ۝ ۱۰ إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۗ لِنَعْلَمَ مَا لَكُمْ

اور عا د ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو مسلسل سات رات
 اور آٹھ دن اُن پر مسلط رکھا۔ تم وہاں ہوتے تو دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح کچھڑے پڑے ہیں جیسے
 وہ کھجور کے بوسیدہ تھے ہوں۔ اب کیا اُن میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے؟
 اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اُس سے پہلے کے لوگوں نے اور تل پٹ ہو جانے
 والی بستیوں نے کیا۔ ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اُس نے اُن کو بڑی سختی کے
 ساتھ پکڑا۔

جب پانی کا طوفان حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا تاکہ اس واقعہ کو تمہارے

میں اس کے لیے الصَّيْحَةُ (زور کے دھماکے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سورہ ظم السجدہ، آیت ۷۷ میں فرمایا گیا
 ہے کہ اِنَّا كَوَّصْنَا عِقَّةَ الْعَذَابِ (عذاب کے کڑکے) نے آیا۔ اور یہاں اسی عذاب کو الطاغیہ (حد سے زیادہ
 سخت حادثہ) سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف کیفیات کا بیان ہے۔

۷۷ مراد ہیں قوم نوح کی بستیاں جن کے متعلق سورہ ہود (آیت ۸۲) اور سورہ حجر (آیت ۷۴) میں
 فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو تلیپٹ کر کے رکھ دیا۔

۷۸ اشارہ ہے طوفان نوح کی طرف جس میں ایک پوری قوم اسی خطائے عظیم کی بنا پر غرق کر دی گئی
 اور صرف وہ لوگ بچا لیے گئے جنہوں نے اللہ کے رسول کی بات مان لی تھی۔

۷۹ اگرچہ کشتی میں سوار وہ لوگ کیے گئے تھے جو ہزاروں برس پہلے گزر چکے تھے، لیکن چونکہ بعد کی
 پوری انسانی نسل انہی لوگوں کی اولاد ہے جو اُس وقت طوفان سے بچائے گئے تھے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے تم کو کشتی

تَذِكْرَةً وَتَعِيَهَا أذَنٌ وَوَاعِيَةٌ ۝۱۳ فَاذْأَنْفِخْ فِي الصُّورِ نَفْحَةً وَوَاحِدَةً ۝۱۴
 وَجَحَلْتِ الْأَرْضَ وَالْجِبَالَ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَوَاحِدَةً ۝۱۵ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ
 الْوَاقِعَةُ ۝۱۶ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ۝۱۷ وَالْمَلَكُ عَلَىٰ

لئے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں۔

پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک
 ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، اُس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا۔ اُس
 دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ فرشتے اس کے اطراف و جوانب

بھی سوار کرادیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم آج دنیا میں اسی لیے موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس طوفان میں صرف منکرین کو
 غرق کیا تھا اور ایمان لانے والوں کو بچا لیا تھا۔

۵۹ یعنی وہ کان نہیں جو سنی اُن سنی کر دیں اور جن کے پردے پر سے آواز اُچٹ کر گزر جائے، بلکہ وہ
 کان جو سنیں اور بات کو دل تک اُتار دیں۔ یہاں بظاہر کان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر مراد ہیں سننے والے
 لوگ جو اس واقعہ کو سن کر اُسے یاد رکھیں، اُس سے عبرت حاصل کریں اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ آخرت
 کے انکار اور خدا کے رسول کی تکذیب کا انجام کیسا ہولناک ہوتا ہے۔

۶۰ آگے آنے والی آیات کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں کیسے تو قیامت
 کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے، اور کیسے سب کو
 سمیٹ کر پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ نمل آیت
 ۸۷ میں پہلے نفعِ صور کا ذکر کیا گیا ہے جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اُس
 وقت نظامِ عالم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورۃ حج آیات ۱-۲،
 سورۃ یس آیات ۲۹-۵۰، اور سورۃ تکویر آیات ۱-۶ میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۃ زمر آیات ۶۷ تا ۷۰ میں دوسرے
 اور تیسرے نفعِ صور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفعِ صور پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب پھر صور
 پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ سورۃ ظہ آیات ۱۰۲ تا ۱۱۲، سورۃ انبیاء
 آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳، سورۃ یس آیات ۱۵ تا ۵۳، اور سورۃ ق آیات ۲۰ تا ۲۲ میں صرف تیسرے نفعِ صور کا ذکر ہے (تشریح
 کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، ظہ، حاشیہ ۷۸-۷۹، الحج، حاشیہ ۱-جلد چہارم، یس، حواشی ۲۶-۲۷)۔ لیکن

أَرْجَاهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمِينًا ۝۱۴ يَوْمَئِذٍ
تَعْرَضُونَ لَا تَخْفَى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝۱۵ فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ
بِيَمِينِهِ ۝۱۶ فَيَقُولُ هَذَا مَا آقَرُوءُ وَآكْتِيْبِيَةٌ ۝۱۷ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْقٍ
حِسَابِيَةٍ ۝۱۸ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝۱۹ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۲۰

میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اُس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ وہ دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا۔

اُس وقت جس کا نامہ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا ”لو دیکھو، پڑھو میرا نامہ اعمال، میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے“ پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا، عالی مقام جنت

بیاں اور بہت سے دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نفعِ صورت سے لے کر جنت اور جہنم میں لوگوں کے داخل ہونے تک قیامت کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلے میں بیان کر دیا گیا ہے۔

اللہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین کرنا مشکل ہے۔ ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔ مگر یہ بات بہر حال قابلِ تصور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوگا اور آٹھ فرشتے اس کو عرش سمیت اٹھائے ہوئے ہونگے۔ آیت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا، اور فات باری کا جو تصور ہم کو قرآن مجید میں دیا گیا ہے وہ بھی یہ خیال کرنے میں مانع ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مقام سے منزہ ہستی کسی جگہ متمکن ہو اور کوئی مخلوق اُسے اٹھائے۔ اس لیے کھوج کرید کر کے اس کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو گمراہی کے خطرے میں مبتلا کرنا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی اور اس کے معاملات کا تصور دلانے کے لیے لوگوں کے سامنے وہی نقشہ پیش کیا گیا ہے جو دنیا میں بادشاہی کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو انسانی زبانوں میں سلطنت اور اس کے مظاہر و لوازم کے لیے مستعمل ہیں، کیونکہ انسانی ذہن اسی نقشے اور انہی اصطلاحات کی مدد سے کسی حد تک کائنات کی سلطانی کے معاملات کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اصل حقیقت کو انسانی فہم سے قریب تر کرنے کے لیے ہے۔ اس کو بالکل لفظی معنوں میں لے لینا درست نہیں ہے۔

اللہ سیدھے ہاتھ میں نامہ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اُس کا حساب بے باقی ہے اور وہ اللہ

قُطِرَ فِيهَا دَانِيَةٌ ۚ ﴿۲۳﴾ كُلُّوْا وَاشْرَبُوْا هٰنِيًْا يٰمَآ سَلَفْتُمْ فِي الْاٰيَٰمِ
 الْخَالِيَةِ ۚ ﴿۲۴﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ
 اُوْتِ كِتٰبَهٗ ۙ ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيْهٗ ۙ ﴿۲۶﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۙ ﴿۲۷﴾

میں جس کے پھلوں کے گچھے بھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ
 اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔

اور جس کا نامہ اعمال اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا
 گیا، مرنے اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔"

تعالیٰ کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ ا غلب یہ ہے کہ
 اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامہ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے
 وقت سے میدانِ حشر میں حاضری تک اُس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہو گا اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ طینا
 حاصل ہو چکا ہو گا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآن مجید میں
 یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہو جاتی ہے
 کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت
 سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔
 اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے اسی وقت سے صالحین کی حالت و کیفیت کچھ
 اور ہوتی ہے اور کفار و منافقین اور مجرمین کی حالت و کیفیت کچھ اور تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،
 جلد دوم، الانفال، آیت ۵۰۔ النمل، آیات ۲۸ و ۳۲، مع حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، آیت ۹۷۔ جلد سوم، طہ،
 آیات ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۲۴ تا ۱۲۶، مع حواشی ۷۹، ۸۰، ۸۱۔ الانبیاء، آیت ۱۰۳، مع حاشیہ ۹۸۔ الفرقان، آیت
 ۲۴، مع حاشیہ ۳۸۔ النمل، آیت ۸۹، مع حاشیہ ۱۰۹۔ جلد چہارم، سبأ، آیت ۵۱، مع حاشیہ ۷۲۔
 یس، آیات ۲۶، ۲۷، مع حواشی ۲۲-۲۳۔ المؤمن، آیات ۴۵، ۴۶، مع حاشیہ ۶۳۔ جلد پنجم، محمد، آیت
 ۲۷ مع حاشیہ ۲۷۔ ق، آیات ۱۹ تا ۲۳۔ مع حواشی ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵۔

۱۵ یعنی نامہ اعمال ملتے ہی وہ خوش خوش ہو جائے گا اور اپنے ساتھیوں کو دکھاٹے گا۔ سورہ انشقاق، آیت

۹ میں بیان ہوا ہے کہ "وہ خوش خوش اپنے لوگوں کی طرف پلٹے گا۔"

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَا حَبِيمٌ ﴿۳۵﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَيْبِنٍ ﴿۳۶﴾ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿۳۷﴾ فَلَا اقْبِسْ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تَبْصِرُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۴۰﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تَوْمِنُونَ ﴿۴۱﴾

لہذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یارِ غم خوار ہے اور نہ زخمیوں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا، جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے، یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔

۳۵ یعنی خود کسی غریب کو کھانا کھلانا تو درکنار، کسی سے یہ کتنا بھی پسند نہ کرنا تھا کہ خدا کے بھوکے بندوں کو روٹی دے دو۔

۳۶ یعنی تم لوگوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے بات وہ نہیں ہے۔

۳۷ یہاں رسولِ کریم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور سورۃ تکوید (آیت ۱۹) میں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کو رسولِ کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریل کو نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اور کاہن کہتے تھے۔ بخلاف اس کے سورۃ تکوید میں قرآن کو رسولِ کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مرتبہ رکھنا ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو روشن اُفق پر دیکھا ہے۔ قریب قریب یہی مضمون سورۃ نجم آیات ۵ تا ۱۰ میں جبریل علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضور کی زبان سے اور حضور اسے جبریل کی زبان سے سُن رہے تھے، اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضور کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریل کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فی الاصل یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبریل کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ پیغامِ برہموتے کی حیثیت سے انہوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔

وَلَا يَقُولِ كَاهِنٌ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۴۳﴾

اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

۴۲۔ ”کم ہی ایمان لاتے ہو“ کا ایک مطلب عربی محاورے کے مطابق یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایمان نہیں

لاتے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کو سن کر کسی وقت تمہارا دل خود پکارا ٹھنکتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا، مگر پھر تم اپنی ضد پر اڑ جاتے ہو اور اس پر ایمان لاتے سے انکار کر دیتے ہو۔

۴۳۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے اور جو کچھ تم کو نظر نہیں آتا، اُس سب کی قسم میں اس بات

پر کھاتا ہوں کہ یہ قرآن کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جو ایک ایسے رسول کی زبان سے ادا ہو رہا ہے جو کریم (نہایت معزز اور شریف) ہے۔ اب دیکھیے کہ یہ قسم کس معنی میں کھائی گئی ہے۔ جو کچھ لوگوں کو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ:

(۱) اس کلام کو ایک ایسا شخص پیش کر رہا تھا جس کا شریف النفس ہونا کلمہ کے معاشرے میں کسی سے چھپا

ہو نہ تھا سب جانتے تھے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ اُن کی قوم کا بہترین آدمی ہے۔ ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ لے کر اٹھ کھڑا ہو گا کہ خدا پر بتان باندھے اور اپنے دل سے ایک بات گھر کر اُسے خداوند عالم کی طرف منسوب کر دے۔

(۲) وہ یہ بھی غلابہ دیکھ رہے تھے کہ اس کلام کو پیش کرنے میں اپنا کوئی ذاتی مفاد اُس شخص کے پیش نظر

نہیں ہے، بلکہ یہ کام کر کے تو اُس نے اپنے مفاد کو قربان کر دیا ہے۔ اپنی تجارت کو برباد کیا۔ اپنے عیش و آرام کو فوج دیا۔ جس معاشرے میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، اُس میں گالیاں کھانے لگا۔ اور نہ صرف خود بلکہ اپنے بال بچوں تک کو ہر قسم کے مصائب میں مبتلا کر لیا۔ ذاتی مفاد کا خواہشمند ان کانٹوں میں اپنے آپ کو کیوں گھسیٹتا؟

(۳) اُن کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ اُنہی کے معاشرے میں سے جو لوگ اُس شخص پر ایمان لا رہے

تھے ان کی زندگی میں یک نخت ایک انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ کسی شاعر یا کاہن کے کلام میں یہ تاثیر آ کر بدمعاشی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں ایسی زبردست اخلاقی تبدیلی پیدا کر دے اور اس کے ماننے والے اُس کی خاطر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟

(۴) اُن سے یہ بات بھی چھپی ہوئی نہ تھی کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے۔

ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کون یہ کہہ سکتا تھا کہ قرآن کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے اس پر مفصل بحث ہم تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷۔ جلد چہارم، الشعراء، حواشی ۴۲ تا ۴۵۔ اور جلد پنجم، الطور

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿۳۳﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿۳۵﴾
ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿۳۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿۳۷﴾

اور اگر اس (نبی) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔

حاشیہ ۲۲ میں کرچکے ہیں۔

(۵) یہ بات بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے تھی کہ پورے عرب میں کوئی شخص ایسا فصیح و بلیغ نہ تھا جس کا کلام قرآن کے مقابلے میں لایا جاسکتا ہو۔ اُس کے برابر تو درکنار، اس کے قریب تک کسی کی فصاحت و بلاغت نہیں پہنچتی تھی۔

(۶) اُن سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بھی اپنی ادبی شان کے لحاظ سے قرآن کی ادبی شان سے بہت مختلف تھی۔ کوئی اہل زبان حضور کی اپنی تقریر، اور قرآن کو سن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہیں۔

(۷) قرآن جن مضامین اور علوم پر مشتمل تھا، دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی مکہ کے لوگوں نے کبھی وہ باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہ سنی تھیں، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان معلومات کے حصول کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے مخالفین اگر یہ الزامات لگاتے بھی تھے کہ آپ کہیں سے خفیہ طریقے پر یہ معلومات حاصل کرتے ہیں تو مکہ میں کوئی شخص اُن کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا اس کی تشریح ہم تفسیر القرآن جلد دوم، النحل حاشیہ ۱۰، اور جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲ میں کرچکے ہیں۔

(۸) زمین سے لے کر آسمان تک اس عظیم الشان کارخانہ ہستی کو بھی وہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا دیکھ رہے تھے جس میں ایک زبردست حکیمانہ قانون اور ہمہ گیر نظم و ضبط کا فرمان نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں اُس شرک اور انکارِ آخرت کے لیے کوئی شہادت نہیں پائی جاتی تھی جس کے اہل عرب معتقد تھے، بلکہ ہر طرف توجید اور آخرت ہی کی صداقت کے شواہد ملتے تھے جسے قرآن پیش کر رہا تھا۔

یہ سب کچھ تو وہ دیکھ رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ نہیں دیکھ رہے تھے وہ یہ تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور فرمانروا ہے، کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں، خدا اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنا رسول مقرر کیا ہے، اور اُن پر اللہ ہی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ ان دونوں قسم کے حقائق کی قسم کھا کر وہ بات کہی گئی ہے

وَإِنَّهُ لَتَذِكْرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٣٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِينَ ﴿٣٩﴾
 وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿٤٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٤١﴾
 فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٤٢﴾

در حقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ بھٹلا
 والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجب حسرت ہے۔ اور یہ بالکل یقینی حق ہے پس اسے نبی،
 اپنے ربّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔

جو اوپر کی آیات میں ارشاد ہوئی ہے۔

۱۵۲۵ اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ نبی کو اپنی طرف سے دجی میں کوئی کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں ہے،
 اور اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کو سخت سزا دیں۔ مگر اس بات کو ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے جس سے آنکھوں
 کے سامنے یہ تصویر کھنچ جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کا مقرر کردہ افسر اُس کے نام سے کوئی جعل سازی کرے تو بادشاہ
 اس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کا سر قلم کر دے۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ غلط استدلال کیا ہے کہ جو شخص بھی نبوت
 کا دعویٰ کرے، اُس کی رگِ دل یا رگِ گردن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً نہ کاٹ ڈالی جائے تو یہ اُس کے نبی
 ہونے کا ثبوت ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ سچے نبی کے بارے میں ہے، نبوت کے
 جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ جھوٹے مدعی تو نبوت ہی نہیں خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور
 زمین پر مدتوں دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ اُن کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث ہم تفسیر القرآن
 جلد دوم، تفسیر سورہ یونس حاشیہ ۲۳ میں کر چکے ہیں۔

۱۵۲۶ یعنی قرآن اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو غلط روی اور اُس کے برے نتائج سے بچنا چاہتے ہیں

(تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲)۔

۱۵۲۷ یعنی اُفکار انہیں اس بات پر پھٹانا پڑے گا کہ انہوں نے کیوں اس قرآن کی تکذیب کی۔



الْمَعَارِجِ

المعارج

نام | تیسری آیت کے لفظ ذی المعارج سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ اس کا نزول بھی قریب قریب انہی حالات میں ہوا ہے جن میں سورہ الحاقہ نازل ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون | اس میں ان کفار کو تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے جو قیامت اور آخرت اور دوزخ اور جنت کی خبروں کا مذاق اڑاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو اور تمہیں مجھ سے زیادہ علم عذاب جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں تو لے آؤ وہ قیامت جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس سورہ کی ساری تقریر اسی چیلنج کے جواب میں ہے۔

ابتداء میں ارشاد ہوا ہے کہ مانگنے والا عذاب مانگتا ہے۔ وہ عذاب انکار کرنے والوں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا، اور جب وہ واقع ہو گا تو اسے کوئی دفع نہ کر سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر واقع ہو گا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ لہذا ان کے مذاق اڑانے پر صبر کرو۔ یہ اُسے دُور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

پھر بتایا گیا ہے کہ قیامت، جس کے جلدی لے آنے کا مطالبہ یہ لوگ ہنسی اور کھیل کے طور پر کر رہے ہیں کیسی سخت چیز ہے اور جب وہ آئے گی تو ان مجرمین کا کیسا برا حشر ہو گا۔ اُس وقت یہ اپنے بیوی بچوں، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں تک کو فدیہ میں دے ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں گے تاکہ کسی طرح عذاب سے بچ سکیں، مگر نہ بچ سکیں گے۔

اس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اُس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر ان کے عقیدے اور اخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں حق سے منہ موڑا ہے اور مال سمیٹ سمیٹ کر اور سینت سینت کر رکھا ہے وہ جہنم کے مستحق ہوں گے۔ اور جنہوں نے یہاں خدا کے عذاب کا خوف کیا ہے، آخرت کو مانا ہے، نماز کی پابندی کی ہے، اپنے مال سے خدا کے محتاج بندوں کا حق ادا کیا ہے، بدکاریوں سے دامن پاک رکھا ہے، امانت میں خیانت نہیں کی ہے، عہد و پیمان اور قول و قرار کا پاس کیا ہے اور گواہی میں راست بازی پر قائم رہے ہیں وہ جنت میں عورت کی جگہ پائیں گے۔

آخر میں مکہ کے اُن کفار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ کا مذاق اڑانے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے، خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ ان کے تمسخر کی پروا نہ کریں، یہ اگر قیامت ہی کی ذلت دیکھنے پر مُصر ہیں تو انہیں اپنے ہیورہ مشغلوں میں پڑا رہنے دیں، اپنا بُرا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

آیاتھا ۲۳

سُورَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ① لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ② مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ③ تَعْرَجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے لیے ہے، کوئی اُسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور رُوح اُس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس

۱۔ اصل الفاظ ہیں سَأَلَ سَائِلٌ۔ بعض مفسرین نے یہاں سوال کو پوچھنے کے معنی میں لیا ہے اور وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب، جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے، کس پر واقع ہوگا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ کافروں پر واقع ہوگا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ سوال کو مانگنے اور مطالبہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ نسائی اور دوسرے محدثین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ نُضْرِبُ بِن حَارِثِ بْنِ كَلْدَةَ نَسَى كَمَا تَقَالُ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَامْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ اَوْ اِنْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۔ (الانفال، آیت ۳۲)۔

”خدا یا اگر یہ واقعی تیری ہی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا ہم پر دردناک عذاب سے آ“

اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قرآن مجید میں کفار مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: یونس، آیات ۶ تا ۲۸۔ الانبیاء، ۲۶ تا ۴۱۔ النمل، ۶۷ تا ۷۷۔ سبا، ۲۶ تا ۳۰۔ یس، ۴۵ تا ۵۲۔ الملک، ۲۷ تا ۲۷۔

۲۔ اصل میں لفظ ذِي الْمَعَارِجِ استعمال ہوا ہے۔ معارج، معارج کی جمع ہے جس کے معنی زینے، یا سیڑھی، یا ایسی چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے اوپر چڑھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو معارج والا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بہت بالا و بزرگ ہے اور اس کے حضور باریاب ہونے کے لیے فرشتوں کو پے در پے بلند یوں سے گزرتا ہوتا ہے، جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

۳۔ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ملائکہ سے الگ اُن کا ذکر اُن کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ سورہ شعراء میں فرمایا گیا ہے کہ نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِينُ عَلٰی قَلْبِكَ رَاسُ الْقُرْآنِ كُوْرُوْحِ الْاَمِيْنِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ

أَلْفَ سَنَةٍ ۝ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَنَرَاهُ

ہزار سال ہے پس اسے نبی صبر کرو، ثلاثہ صبر۔ یہ لوگ اُسے دُور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ

دل پر نازل ہوئے ہیں۔ اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ (کہو کہ جو شخص جبریل کا اس لٹے دشمن ہو کہ اس نے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے...)۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ روح سے مراد جبریل ہی ہیں۔

۷۰ یہ سارا مضمون تشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جاسکتے۔ ہم نہ فرشتوں کی حقیقت جانتے ہیں، نہ ان کے چڑھنے کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ بات ہمارے ذہن کی گرفت میں آسکتی ہے کہ وہ زمین کیسے ہیں جن پر فرشتے چڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی خاص مقام پر رہتا ہے، کیونکہ اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے منزہ ہے۔

۷۱ سورہ حج، آیت ۷۴ میں ارشاد ہوا ہے ”یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تم سے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے“ سورہ السجدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے ”وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر اُس کی رُوداد اور اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے“ اور یہاں عذاب کے مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی ہے کہ جو لوگ مذاق کے طور پر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کی باتوں پر صبر کریں اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اُس کو دُور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ ان سب ارشادات پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگ اپنے ذہن اور اپنے دائرہ فکر و نظر کی تنگی کے باعث خدا کے معاملات کو اپنے وقت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور انہیں سو پچاس برس کی مدت بھی بڑی لمبی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ایک اسکیم ہزار ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اور یہ مدت بھی محض بطور مثال ہے، ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کروڑوں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں۔ انہی منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ وہ ہے جس کے تحت زمین پر نوع انسانی کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ فلاں ساعت خاص تک یہاں اس نوع کو کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کوئی انسان یہ نہیں جان سکتا کہ یہ منصوبہ کب شروع ہوا، کتنی مدت اس کی تکمیل کے لیے طے کی گئی ہے، کونسی ساعت اس کے اختتام کے لیے مقرر کی گئی ہے جس پر قیامت برپا کی جائے گی، اور کونسا وقت اس غرض کے لیے رکھا گیا ہے کہ آغازاً فرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کو بیک وقت اٹھا کر ان

قَرِيْبًا ۛ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَاوُتُ كَالذُّهَبِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيْدٌ حَمِيْمًا ۝ يَبْصُرُوْنَهُمْ يَوْمَ يُؤَدُّ الْمَجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ

رہے ہیں۔ (وہ عذاب اُس روز ہوگا) جس روز آسمان پگھل ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے ڈھنکے ہوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے

کا حساب لیا جائے۔ اس منصوبے کے صرف اُس حصے کو ہم کسی حد تک جانتے ہیں جو ہمارے سامنے گزر رہا ہے یا جس کے گزشتہ ادوار کی کوئی جزوی سی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے۔ رہا اُس کا آغاز و انجام، تو اسے جانتا تو درکنار، اسے سمجھنا بھی ہمارے بس سے باہر ہے، کجا کہ ہم اُن حکمتوں کو سمجھ سکیں جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہیں۔ اب جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس منصوبے کو ختم کر کے اس کا انجام فوراً اُن کے سامنے لے آیا جائے، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو اسے اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ انجام کی بات ہی سرے سے غلط ہے، وہ درحقیقت اپنی ہی نادانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد سوم، الحج، حواشی ۹۲-۹۳۔ جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۱۹)۔

۵۶ یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایانِ شان ہے۔

۵۷ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ لوگ اُسے بے نیازا مکان سمجھتے ہیں اور ہمارے نزدیک وہ قریب الوقوع ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو بڑی دُور کی چیز سمجھتے ہیں اور ہماری نگاہ میں وہ اس قدر قریب ہے گویا کل پیش آنے والی ہے۔

۵۸ مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس فقرے کا تعلق فی یومہ کان مقداره خمسين ألف سنة سے مانا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کی مدت جس دن کی بتائی گئی ہے اُس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مُسند احمد اور تفسیر ابن جریر میں حضرت ابو سعید خدری سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق عرض کیا گیا کہ وہ تو بڑا ہی طویل دن ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں جتنا وقت لگتا ہے مومن کے لیے وہ دن اس سے بھی زیادہ ہلکا ہوگا“ یہ روایت اگر صحیح سند سے منقول ہوتی تو پھر اس کے سوا اس آیت کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس کی سند میں ذراچ اور اس کے شیخ ابوالہثیم، دونوں ضعیف ہیں۔

۵۹ یعنی بار بار رنگ بدلے گا۔

عَذَابٍ يَوْمَئِذٍ بِبَنِيهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَاتِهِ وَأَخِيهِ ۝۱۲ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي
تُؤَيُّوهُ ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝۱۴ كَلَّا إِنَّهَا لَأَنْظَى ۝۱۵
نَزَاعَةَ اللَّشْوَى ۝۱۶ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى ۝۱۷ وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۝۱۸
إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝۱۹ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝۲۰ وَإِذَا مَسَّهُ

بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے
والا تھا، اور رُوئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دینے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں۔
وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی، پکار پکار کر اپنی طرف
بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا۔
انسان تھڑولا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی

۱۱ چونکہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں، اس لیے جب وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر ادرے دزن ہو کر اُڑنے
لگیں گے تو ایسے معلوم ہونگے جیسے رنگ برنگ کا ڈھنکا ہوا اون اڑ رہا ہو۔
۱۲ یعنی ایسا نہ ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے نہیں،
ہر ایک آنکھوں سے دیکھ رہا ہو گا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی
ہی پٹی ہوگی۔

۱۳ یہاں بھی سورہ الحاقہ آیات ۲۳-۲۴ کی طرح آخرت میں آدمی کے بڑے انجام کے دو وجوہ بیان کیے
گئے ہیں۔ ایک حق سے انحراف اور ایمان لانے سے انکار۔ دوسرے دنیا پرستی اور بخل، جس کی بنا پر آدمی مال
جمع کرتا ہے اور اسے کسی بھلائی کے کام میں خرچ نہیں کرتا۔

۱۴ جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ ”یہ بات انسان کی سرشت میں ہے“ یا ”یہ انسان
کی فطری کمزوری ہے“ اسی کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ”انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اس مقام پر یہ
بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں بکثرت مواقع پر نوع انسانی کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے
بعد ایمان لانے والے اور راہِ راست اختیار کر لینے والے لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اور یہی
مضمون آگے کی آیات میں بھی آ رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں

الْخَيْرُ مَنْوَعًا ۲۱) إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۲۲) الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۲۳) وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ۲۴) لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۲۵) وَالَّذِينَ

نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے، جو

ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں ہیں، بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کے لیے عملاً کوشش کرے تو وہ ان کو دور کر سکتا ہے، اور اگر وہ نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو یہ اُس کے اندر راسخ ہو جاتی ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۴۱۔ جلد چہارم، الزمر، حواشی ۲۳-۲۸-الشوریٰ، حاشیہ ۷۵)۔

۱۴ کسی شخص کا نماز پڑھنا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب اور آخرت پر ایمان بھی رکھتا ہے اور اپنے اس ایمان کے مطابق عمل بھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

۱۵ یعنی کسی قسم کی سُستی اور آرام طلبی، یا مصروفیت، یا دلچسپی اُن کی نماز کی پابندی میں مانع نہیں ہوتی۔ جب نماز کا وقت آ جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے خدا کی عبادت بجالانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ کے ایک اور معنی حضرت عقبہ بن عامر نے یہ بیان کیے ہیں کہ وہ پورے سکون اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ کوسے کی طرح ٹھونگیں نہیں مارتے۔ مارا مار پڑھ کر کسی نہ کسی طرح نماز سے فارغ ہو جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نماز کے دوران میں ادھر ادھر التفات بھی نہیں کرتے۔ عربی محاورے میں ٹھیرے ہوئے پانی کو مابہ دائم کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ تفسیر ماخوذ ہے۔

۱۶ سورۃ ذاریات آیت ۱۹ میں فرمایا گیا ہے کہ ”اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے“ اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ ”ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے“ بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مقرر حق سے مراد فرض زکوٰۃ ہے، کیونکہ اسی میں نصاب اور شرح، دونوں چیزیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر اس بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے کہ سورۃ معارج بالاتفاق مکی ہے، اور زکوٰۃ ایک مخصوص نصاب اور شرح کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔ اس لیے مقرر حق کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصہ طے کر رکھا ہے جسے وہ اُن کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ یہی معنی حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، مجاہد، شعبی اور ابراہیم نخعی نے بیان کیے ہیں۔

سائل سے مراد پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مدد مانگے۔ اور

يَصْدِقُونَ يَوْمَ الدِّينِ ۝۲۶ وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝
 إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَا مُنِنُوا ۝۲۷ وَالَّذِينَ هُمْ لِغُرُوحِهِمْ حَفِظُونَ ۝۲۸
 إِلَّا عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝۳۰ فَمَنْ
 ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝۳۱ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ

روز جزا کو برحق مانتے ہیں، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔۔۔ جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا

محروم سے مراد ایسا شخص ہے جو بے روزگار ہو، یا روزی کمانے کی کوشش کرتا ہو مگر اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں، یا کسی حادثے یا آفت کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو، یا روزی کمانے کے قابل ہی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے متعلق جب معلوم ہو جائے کہ وہ واقعی محروم ہیں تو ایک خدا پرست انسان اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ وہ اس سے مدد مانگیں، بلکہ ان کی محرومی کا علم ہوتے ہی وہ خود آگے بڑھ کر ان کی مدد کرتا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ ذاریات، حاشیہ ۱۷)۔

۱۷ یعنی دنیا میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں سمجھتے، بلکہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

۱۸ بالفاظ دیگر ان کا حال کفار کی طرح نہیں ہے جو دنیا میں ہر قسم کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کر کے بھی خدا سے نہیں ڈرتے، بلکہ وہ اپنی حد تک اخلاق اور اعمال میں نیک رویہ اختیار کرنے کے باوجود خدا سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ اندیشہ ان کو لاحق رہتا ہے کہ کہیں خدا کی عدالت میں ہماری کوتاہیاں ہماری نیکیوں سے بڑھ کر نہ نکلیں اور ہم سزا کے مستحق نہ قرار پائیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۵۴۔ جلد پنجم، الذاریات، حاشیہ ۱۹)۔

۱۹ شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد زنا سے پرہیز بھی ہے اور عریانی سے پرہیز بھی (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۶۔ النور، حواشی ۳۰-۳۲۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۲)۔

۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰ ۱۷۰۰
 رَعُونَ ۳۳ وَالَّذِينَ هُمْ يُشْهَدُونَ قَائِمُونَ ۳۴ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى
 صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۳۵ أُولَئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۳۶ فَمَالِ
 الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ۳۷ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ۳۸

پاس کرتے ہیں، جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے۔
 پس اے نبی! کیا بات ہے کہ یہ منکرین ایمں اور بائیں سے گروہ درگروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں؟

۵۲۰ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ۔

۵۲۱ امانتوں سے مراد وہ امانتیں بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے سپرد کی ہیں اور وہ امانتیں بھی جو انسان کسی دوسرے انسان پر اعتماد کر کے اس کے حوالے کرتا ہے۔ اسی طرح عہد سے مراد وہ عہد بھی ہیں جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور وہ عہد بھی جو بندے سے کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی امانتوں اور دونوں قسم کے عہد و پیمان کا پاس و لحاظ ایک مومن کی سیرت کے لازمی خصائص میں سے ہے۔ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے جو تقریر بھی فرماتے اس میں یہ بات ضرور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آلا، لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له، "خبردار رہو، جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں، اور جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں" (تبیح فی شعب الایمان) ۵۲۲ یعنی نہ شہادت چھپاتے ہیں، نہ اس میں کوئی کمی بیشی کرتے ہیں۔

۵۲۳ اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس بلند سیرت و کردار کے لوگ خدا کی جنت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں ان کی صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع اور اسی پر ختم کیا گیا ہے۔ نمازی ہونا ان کی پہلی صفت ہے، نماز کا ہمیشہ پابند رہنا ان کی دوسری صفت، اور نماز کی حفاظت کرنا ان کی آخری صفت۔ نماز کی حفاظت سے بہت سی چیزیں مراد ہیں۔ وقت پر نماز ادا کرنا۔ نماز سے پہلے یہاں طہان کر لینا کہ جسم اور کپڑے پاک ہیں۔ با وضو ہونا اور وضو میں اعضاء کو اچھی طرح دھونا۔ ارکان اور واجبات اور مستحبات نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا۔ نماز کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنا۔ خدا کی نافرمانیاں کر کے اپنی نمازوں کو ضائع نہ کرنا۔ یہ سب چیزیں نماز کی حفاظت میں شامل ہیں۔

۵۲۴ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوت قرآن کی آواز سن کر مذاق

اڑانے اور آواز سے کہنے کے لئے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔

أَيُّطْعَمُ كُلُّ أُمَّرِيٍّ مِنْهُمَا أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ۝ ۳۸ كَلَّا إِنَّا
خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ ۝ ۳۹ فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغْرِبِ

کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کر دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں ہم جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اُسے یہ خود جانتے ہیں۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کے

۵۲۵ مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ابھی ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ جو حق بات سنا تک گوارا نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبا دینے کے لیے یوں دوڑے چلے آ رہے ہیں جنت کے امیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ النظم کی آیات ۳۲-۳۱ بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں جن میں کفار مکہ کو ان کی اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو وہاں وہ اُسی طرح مزے کریں گے جس طرح دنیا میں کر رہے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اُسی طرح خستہ حال رہیں گے جس طرح آج دنیا میں ہیں۔

۵۲۶ اس مقام پر اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ مضمون سابق کے ساتھ اس کا تعلق مانا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ جس مادے سے یہ لوگ بنے ہیں اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔ اگر وہ مادہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔ لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادہ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اُس کے اوصاف کے لحاظ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس فقرے کو بعد کے مضمون کی تہید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں اور جو شخص نہیں ہماری پکڑ سے ڈراتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ ہم ان کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خود جانتے ہیں کہ نطفے کی ایک حقیر سی بوند سے ان کی تخلیق کی ابتدا کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اس خلقت پر یہ غور کرتے تو انہیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ اب یہ ہماری گرفت سے باہر ہو گئے ہیں، یا ہم انہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

۵۲۷ یعنی بات وہ نہیں ہے جو انہوں نے سمجھ رکھی ہے۔

۵۲۸ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع اور نئے زاویے پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے درپے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا

إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿۳۰﴾ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۳۱﴾
 فَذَرَهُمْ مَخْرُوضًا وَيَلْعَبُونَ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ
 يُخْرِجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿۳۳﴾ خَاشِعَةً
 أَبْصَارُهُمْ تَرَاهُمْ ذَلَّةً ذُلًّا ذَلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۳۴﴾

ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔
 لہذا انہیں اپنی بیودہ باتوں اور اپنے کھیل میں پڑا رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس کا
 ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے، جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے
 بتوں کے استخوانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت ان پر چھا رہی ہوگی۔
 وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے ۷

ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور
 جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب۔ اس بنا پر سورہ شعراء، آیت ۲۸، اور
 سورہ مزمل، آیت ۱۹ میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے
 زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں، کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کرے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے
 پر طلوع ہوتا ہے۔ اس بنا پر سورہ رحمن، آیت ۷ میں دَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَدَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ کے الفاظ استعمال
 فرمائے گئے ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، الرحمن، حاشیہ ۱)۔

۵۲۹ یہ ہے وہ بات جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رب المشارق والمغرب ہونے کی قسم کھائی ہے اس
 کے معنی یہ ہیں کہ ہم چونکہ مشرقوں اور مغربوں کے مالک ہیں اس لیے پوری زمین ہمارے قبضہ قدرت میں ہے اور
 ہماری گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں تمہیں ہلاک کر سکتے ہیں اور تمہاری جگہ کسی
 دوسری قوم کو اٹھا سکتے ہیں جو تم سے بہتر ہو۔

۵۳۰ اصل الفاظ ہیں اِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ۔ نصب کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ان میں سے بعض نے
 اس سے مراد بت لیے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو مشرقی مقرر کی ہوئی جگہ کی طرف اس طرح دوڑے جا رہے
 ہوں گے جیسے آج وہ اپنے بتوں کے استخوانوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد وہ نشان لیے
 ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے والوں کے لیے لگائے جاتے ہیں تاکہ ہر ایک دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔



نوح

(٤١)

نوح

نام | ”نوح“ اس سورۃ کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں از اول تا آخر حضرت نوح علیہ السلام ہی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر اس کے مضمون کی داخلی شہادت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں کفار مکہ کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی۔

موضوع اور مضمون | اس میں حضرت نوح کا قصہ محض قصہ گوئی کی خاطر بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس سے مقصود کفار مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی رو تیار اختیار کر رہے ہو جو حضرت نوح کے ساتھ ان کی قوم نے اختیار کیا تھا، اور اس رو تے سے اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں بھی وہی انجام دیکھنا پڑے گا جو ان لوگوں نے دیکھا۔ یہ بات پوری سورۃ میں کہیں نہ الفاظ میں نہیں کہی گئی ہے، لیکن جس موقع پر اور جن حالات میں یہ قصہ اہل مکہ کو سنایا گیا ہے اُس پس منظر میں خود بخود یہ مضمون اس سے مترشح ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح کو جب اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر مامور فرمایا تھا اُس وقت کیا خدمت اُن کے سپرد کی گئی تھی۔

آیات ۲-۴ میں مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کیا اور اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے کیا بات پیش کی۔

پھر نہ تھائے دراز تک دعوت و تبلیغ کی زحماتیں اٹھانے کے بعد جو رُوداد حضرت نوح نے اپنے رب کے حضور پیش کی وہ آیات ۵-۴ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں وہ عرض کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں اور قوم نے ان کا مقابلہ کس ہٹ دھرمی سے کیا۔

اس کے بعد حضرت نوح کی آخری گزارش آیات ۲۱-۲۴ میں درج کی گئی ہے جس میں وہ اپنے رب سے عرض کرتے ہیں کہ یہ قوم میری بات قطعی طور پر رد کر چکی ہے، اس نے اپنی تکبیل

اپنے ریشموں کے ہاتھ میں دے دی ہے، اور انہوں نے بہت بڑا مکر کا جال پھیلا رکھا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ ان لوگوں سے ہدایت کی توفیق سلب کر لی جائے۔ یہ حضرت نوح کی طرف سے کسی بے صبری کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ صدیوں تک انتہائی صبر اور حالات میں تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب وہ اپنی قوم سے پوری طرح مایوس ہو گئے تو انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ اب اس قوم کے راہ راست پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے۔ یہ رائے ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے اپنے فیصلے کے مطابق تھی۔ چنانچہ اس کے متصلاً بعد آیت ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُس قوم پر اس کے کرتوتوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہو گیا۔

آخری آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعا درج کی گئی ہے جو انہوں نے عین نزولِ عذاب کے وقت اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس میں وہ اپنے لیے اور سب اہل ایمان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، اور اپنی قوم کے کافروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو زمین پر بسنے کے لیے جتنا نہ چھوڑا جائے، کیونکہ ان کے اندر اب کوئی خیر باقی نہیں رہی ہے، ان کی نسل سے جو بھی اٹھے گا کافر اور فاجر ہی اٹھے گا۔

اس سورہ کا مطالعہ کرتے ہوئے حضرت نوح کے قصے کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہیں جو اس سے پہلے قرآن مجید میں بیان ہو چکی ہیں۔ ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۵۔ ہود، ۲۵ تا ۲۹۔ المؤمنون، ۲۲ تا ۳۱۔ الشعراء، ۵ تا ۱۲۲۔ العنکبوت، ۱۴ تا ۱۵۔ الصافات، ۷۵ تا ۸۲۔ القمر، ۹ تا ۱۶۔

ایاتھا ۲۸

سُورَةُ نُوحٍ مَكِّيَّةٌ

زکوٰۃ ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا ارْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۱ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّي لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۲ اِنْ اَعْبُدُوْا اللّٰهَ
وَاطَّقُوْهُ وَاَطِيعُوْنَ ۳ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُخْرِجْكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَدَّدٍ

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو
خبردار کر دے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔

اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیئے ایک صاف صاف خبردار کر دینے
والا پیغمبر ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت
کرو، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔
۱ یعنی ان کو اس بات سے آگاہ کر دے کہ جن گناہوں اور اخلاقی خرابیوں میں وہ مبتلا ہیں وہ ان کو
خدا کے عذاب کا مستحق بنا دیں گی اگر وہ ان سے باز نہ آئے، اور ان کو تباہی سے کہ اس عذاب سے بچنے کے لیے انہیں
کو نسا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

۲ یہ تین باتیں تھیں جو حضرت نوح نے اپنی رسالت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔
ایک، اللہ کی بندگی۔ دوسرے، تقویٰ۔ تیسرے، رسول کی اطاعت۔ اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی بندگی
و عبادت چھوڑ کر اور صرف اللہ ہی کو اپنا معبود تسلیم کر کے اسی کی پرستش کرو اور اسی کے احکام بجالاؤ۔ تقویٰ کا
مطلب یہ تھا کہ ان کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کے موجب ہیں، اور اپنی زندگی میں
وہ روش اختیار کرو جو خدا ترس لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ یہی تیسری بات کہ "میری اطاعت کرو" تو اس کا مطلب یہ
تھا کہ ان احکام کی اطاعت کرو جو اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میں تمہیں دیتا ہوں۔

۳ اصل الفاظ ہیں يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
میں سے بعض کو معاف کر دے گا، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان تین باتوں کو قبول کر لو جو تمہارے سامنے
پیش کی جا رہی ہیں تو اب تک جو گناہ تم کر چکے ہو ان سب سے وہ درگزر فرمائے گا۔ یہاں مِّنْ تَبِيعِضِ کے لیے

إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۵۱﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي
دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ﴿۵۲﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ﴿۵۳﴾
وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ کاش تمہیں
اس کا علم ہو۔

۵۱۔ ایش نے عرض کیا "اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا
مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں
معاف کر دے، انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک
نہیں بلکہ عن کے معنی میں ہے۔

۵۲۔ یعنی اگر تم نے یہ تین باتیں مان لیں تو تمہیں دنیا میں اُس وقت تک جینے کی مہلت دے دی جائے گی
جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری طبعی موت کے لیے مقرر کیا ہے۔

۵۳۔ اس دوسرے وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ نے کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے
مقرر کر دیا ہو۔ اس کے متعلق متعدد مقامات پر قرآن مجید میں یہ بات بصراحت بیان کی گئی ہے کہ جب کسی قوم
کے حق میں نزول عذاب کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے اُس کے بعد وہ ایمان بھی لے آئے تو اسے معاف نہیں
کیا جاتا۔

۵۴۔ یعنی اگر تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ میرے ذریعہ سے اللہ کا پیغام پہنچ جانے کے بعد
اب جو وقت گزر رہا ہے یہ دراصل ایک مہلت ہے جو تمہیں ایمان لانے کے لیے دی جا رہی ہے، اور اس مہلت
کی مدت ختم ہو جانے کے بعد پھر خدا کے عذاب سے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے، تو تم ایمان لانے میں جلدی کرو گے
اور نزول عذاب کا وقت آنے تک اس کو ٹالتے نہ چلے جاؤ گے۔

۵۵۔ بیچ میں ایک طویل زمانے کی تاریخ چھوڑ کر اب حضرت لوط علیہ السلام کی وہ عرضداشت نقل کی جا
رہی ہے جو انہوں نے اپنی رسالت کے آخری دور میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی۔

۵۶۔ یعنی جتنا جتنا میں ان کو پکارتا گیا اتنے ہی زیادہ وہ دُور بھاگتے چلے گئے۔

۵۷۔ اس میں خود بخود یہ مضمون شامل ہے کہ وہ نافرمانی کی روش چھوڑ کر معافی کے طلب گار ہوں، کیونکہ



يَا بَهُمْ وَأَصْرُوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۸ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا ۝
 ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝۹ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا
 رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝۱۱ وَيُمِدُّكُمْ
 بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلُ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلُ لَكُمْ أَنْهَارًا ۝۱۲ مَا لَكُمْ

لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے
 علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا
 معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد سے نازیگا،
 تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ

اسی صورت میں ان کو اللہ تعالیٰ سے معافی مل سکتی تھی۔

۱۱۔ منہ ڈھانکنے کی غرض یا تو یہ تھی کہ وہ حضرت نوح کی بات سنا تو درکنار، آپ کی شکل بھی دیکھنا پسند
 نہ کرتے تھے، یا پھر یہ حرکت وہ اس لیے کرتے تھے کہ آپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے منہ چھپا کر نکل جائیں اور
 اس کی نوبت ہی نہ آنے دیں کہ آپ انہیں پہچان کر ان سے بات کرنے لگیں۔ یہ ٹھیک وہی طرز عمل تھا جو کفار کبر رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کر رہے تھے۔ سورہ ہود آیت ۵ میں ان کے اس رویے کا ذکر اس طرح کیا گیا
 ہے: ”دیکھو یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ رسول سے چھپ جائیں۔ خبردار! جب یہ اپنے آپ کو کپڑوں سے
 ڈھانکتے ہیں تو اللہ ان کے کھلے کو بھی جانتا ہے اور چھپے کو بھی، وہ تو دلوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے“
 (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ہود، حواشی ۵-۶)۔

۱۲۔ تکبر سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کر لینے
 کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے
 اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہو اور پاؤں نیچتا ہوا نکل جائے تو یہ تکبر کے ساتھ کلام نصیحت کو رد
 کرنا ہوگا۔

۱۳۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت
 ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی کو تنگ کر دیتی ہے، اور اس کے برعکس اگر کوئی قوم نافرمانی کے بجائے
 ایمان و تقویٰ اور احکام الہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کرے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں ہے بلکہ دنیا میں

لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ ۱۳ ۝ الْمُرْتَدُونَ

اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؛ حالانکہ اُس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے کیا دیکھتے نہیں تم

بھی اُس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ سورہ طہ میں ارشاد ہوا ہے "اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے" (آیت ۱۲۴)۔ سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے "اور اگر ان اہل کتاب نے توراہ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہونا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں تو ان کے لیے اور یہ سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا" (آیت ۶۶)۔ سورہ اعراف میں فرمایا "اور اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے" (آیت ۹۶)۔ سورہ ہود میں ہے کہ حضرت ہود نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا "اور اسے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا" (آیت ۵۲)۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بھی اسی سورہ ہود میں اہل مکہ کو مخاطب کر کے یہ بات فرمائی گئی "اور یہ کہ اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مقرر وقت تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا" (آیت ۳)۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لوگوں سے فرمایا کہ "ایک کلمہ ہے جس کے تم قائل ہو جاؤ تو عرب و عجم کے فرمانروا ہو جاؤ گے" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد اول، المائدہ، حاشیہ ۹۶۔ جلد دوم، ہود، حواشی ۳ و ۵۔ جلد سوم، طہ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم، دیباچہ سورہ ص)۔

قرآن مجید کی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ تھپ کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا، امیر المؤمنین آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔ فرمایا، میں نے آسمان کے اُن دروازوں کو کھٹکھا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے، اور پھر سورہ نوح کی یہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں (ابن جریر و ابن کثیر)۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت حسن بصری کی مجلس میں ایک شخص نے خشک سالی کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا اللہ سے استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے تنگ دستی کی شکایت کی، تیسرے نے کہا میرے ماں اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا میری زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ ہر ایک کو وہ یہی جواب دیتے چلے گئے کہ استغفار کرو۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ سب کو مختلف شکایتوں کا ایک ہی علاج بتا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب میں سورہ نوح کی یہ آیات سنا دیں (کشاف)۔

۱۳ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ریشیوں اور سرداروں کے بارے میں تو تم یہ سمجھتے ہو

كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا ۝۱۵ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ۝۱۶ وَاللَّهُ أُنْتَبِهُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝۱۷
ثُمَّ يَعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝۱۸ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ
الْأَرْضَ سَبَاطًا ۝۱۹ لِّتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝۲۰

کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا ہے اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح آگایا، پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے بیکام تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔

کہ ان کے دقار کے خلاف کوئی حرکت کرنا خطرناک ہے، مگر خداوند عالم کے متعلق تم یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بھی کوئی باوقار ہستی ہوگا۔ اُس کے خلاف تم بغاوت کرتے ہو، اُس کی خدائی میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو، اُس کے احکام کی نافرمانیاں کرتے ہو، اور اس سے تمہیں یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اس کی سزا دے گا۔

۱۵ یعنی تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارنا ہوا تمہیں موجودہ حالت پر لایا ہے۔ پہلے تم ماں اور باپ کی صلب میں الگ الگ نطفوں کی شکل میں تھے۔ پھر خدا کی قدرت ہی سے یہ دونوں نطفے ملے اور تمہارا استقرار حمل ہوا۔ پھر نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں بند رہی نشوونما دے کر تمہیں پوری انسانی شکل دی گئی اور تمہارے اندر تمام وہ قوتیں پیدا کی گئیں جو دنیا میں انسان کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تمہیں درکار تھیں۔ پھر ایک زندہ بچے کی صورت میں تم بطنِ مادر سے باہر آئے اور ہر آن تمہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی دی جاتی رہی یہاں تک کہ تم جوانی اور کبوت کی عمر کو پہنچے۔ ان تمام منازل سے گزرتے ہوئے تم ہر وقت پوری طرح خدا کے بس میں تھے۔ وہ چاہتا تو تمہارا استقرار حمل ہی نہ ہونے دیتا اور تمہاری جگہ کسی اور شخص کا استقرار ہوتا۔ وہ چاہتا تو ماں کے پیٹ ہی میں تمہیں اندھا، بہرا، گونگا، یا اباہج بنا دیتا یا تمہاری عقل میں کوئی فتور رکھ دیتا۔ وہ چاہتا تو تم زندہ بچے کی صورت میں پیدا ہی نہ ہوتے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ تمہیں ہر وقت ہلاک کر سکتا تھا، اور اس کے ایک اشارے پر کسی وقت بھی تم کسی حادثے کے شکار ہو سکتے تھے جس خدا کے بس میں تم اس طرح بے بس ہو اُس کے متعلق تم نے یہ کیسے سمجھ رکھا ہے کہ اس کی شان میں ہر گستاخی کی جا سکتی ہے، اس کے ساتھ ہر طرح کی نمک حرامی اور احسان فراموشی کی جا سکتی ہے، اس کے خلاف ہر قسم کی بغاوت

قَالَ نُوحٌ رَبِّ انْتَهَمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مِنْ لَمُزِيدَهُ مَالَهُ وَوَلَدَهُ
 الْاَخْسَارًا ۝۲۱ وَمَكْرًا وَمَكْرًا كُبْرًا ۝۲۲ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ
 وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝۲۳ وَقَدْ

نوح نے کہا، "میرے رب، انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رُعیوں) کی پیروی کی جو مال اور
 اولاد پاکر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلارکھا ہے۔ انہوں نے
 کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو وود اور سواع کو، اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ انہوں نے

کی جاسکتی ہے اور ان حرکتوں کا کوئی خمیازہ تمہیں بھگتنا نہیں پڑے گا۔

۱۵ یہاں زمین کے مادوں سے انسان کی پیدائش کو نباتات کے اُگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح
 کسی وقت اس کڑے پر نباتات موجود نہ تھیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن کو اُگایا، اُسی طرح ایک وقت
 تھا جب روئے زمین پر انسان کا کوئی وجود نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی پود لگائی۔

۱۶ مکر سے مراد اُن سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو
 حضرت نوح کی تعلیمات کے خلاف بہکانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوح تمہی جیسا ایک آدمی
 ہے، کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آئی ہے (الاعراف ۶۳-ہود ۲۷)۔ نوح کی پیروی تو ہمارے
 اُرافل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان
 لاتے (ہود ۲۷)۔ خدا کو اگر بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا (المومنون ۲۴)۔ اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہوتا
 تو اس کے پاس خزانے ہوتے، اس کو علم غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے
 بے نیاز ہوتا (ہود ۲۱)۔ نوح اور اس کے پیروں میں آخر کونسی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت
 مان لی جائے (ہود ۲۷)۔ یہ شخص دراصل تم پر اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے (المومنون ۲۴)۔ اس شخص پر کسی جن
 کا سایہ ہے جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے (المومنون ۲۵)۔ قریب قریب یہی باتیں تھیں جن سے قریش کے سردار
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو بہکایا کرتے تھے۔

۱۷ قوم نوح کے معبودوں میں سے یہاں اُن معبودوں کے نام لیے گئے ہیں جنہیں بعد میں اہل عرب
 نے بھی پوجنا شروع کر دیا تھا اور آغاز اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ اُن کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں
 کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قوم نوح کے قدیم معبودوں کا ذکر سنا ہوگا

أَصْلُوا كَثِيرًا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَاءً ﴿۷۱﴾

بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔

اور جب از سر نو ان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی ہوگی تو انہی معبودوں کے بت بنا کر انہوں نے پھر انہیں پوجنا شروع کر دیا ہوگا۔

وَدُ قَبِيلُهُ قُضَاعَةُ كِي شَاخِ بَنِي كَلْبِ بْنِ وَرْبَرَةَ كَامَعْبُودٍ تَحَاجِسُ كَا اسْتَحَانَ انْمُؤُن نَمَ دُؤْمَثُ الْجَدَلِ مِيں
بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام دُؤْمُ اَبْمِ (دو دو بالوں) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا
بت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان
کے ہاں دُؤ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبید وُؤ ملتا ہے۔

سُؤَاعُ قَبِيلُهُ بُذَيْلُ كِي دِيؤِي تَقِي اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنا یا گیا تھا۔ يَثُؤَاعُ كِي قَرِيْبُ رُؤَا ط كِي
مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

يَعُؤُؤُ قَبِيلُهُ طُ كِي شَاخِ اَنْعُمُ اور قَبِيلُهُ مَذُؤُج كِي بَعْضُ شَاخُوْن كَامَعْبُودٍ تَحَاجِسُ مَذُؤُجِ وَالُوْن نَمَ مِيْن اور
حجاز کے درمیان جُؤُش كِي مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی
بعض کا نام عبید يعُؤُؤُ ملتا ہے۔

يَعُؤُؤُ مِيْن كِي عِلَاقَةُ بَمْدَانِ مِيْن قَبِيلُهُ بَمْدَانِ كِي شَاخِ شِيؤَان كَامَعْبُودٍ تَحَاجِسُ اور اس کا بت گھوڑے
کی شکل کا تھا۔

نَسُؤُؤُؤُ كِي عِلَاقَةُ مِيْن قَبِيلُهُ حَمِيْر كِي شَاخِ اَلِ ذِؤَا الْكَلْعِ كَامَعْبُودٍ تَحَاجِسُ اور بَلُؤُؤُ كِي مقام پر اس کا بت نصب
تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نَسُؤُؤُؤُ لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ
بیت نَسُؤُؤُؤُ اور اس کے پجاریوں کو اَبِلِ نَسُؤُؤُؤُ کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں
میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

۷۱ جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی یہ بددعا کسی
بے صبری کی بنا پر نہ تھی بلکہ یہ اُس وقت اُن کی زبان سے نکلی تھی جب صدیوں تک تبلیغ کا حق ادا کرنے کے
بعد وہ اپنی قوم سے پُوری طرح مایوس ہو چکے تھے۔ ایسے ہی حالات میں حضرت موسیٰ نے بھی فرعون اور قوم
فرعون کے حق میں یہ بددعا کی تھی کہ ”پروردگار! ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی ٹہر کر دے
کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں“ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:
”تمہاری دعا قبول کی گئی“ (یونس، آیات ۸۸-۸۹)۔ حضرت موسیٰ کی طرح حضرت نوح کی یہ بددعا بھی عین
منشائے الہی کے مطابق تھی۔ چنانچہ سورہ ہود میں ارشاد ہوا ہے: **وَأَوْحِي إِلَى نُوْحٍ أَنَّهُ كُنْ يُؤْمِنُ مِنْ قَوْمِكَ**

مِمَّا خَطِيئَتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ
 دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ۝ (۲۵) وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ
 الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۲۶) إِنَّكَ إِنْ تَذَرَهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا
 يَلِدُوا إِلَّا فٰجِرًا كَفَّارًا ۝ (۲۷) رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ

اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیے گئے، پھر انہوں نے
 اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا۔ اور نوح نے کہا، ”میرے رب، ان کافروں میں سے
 کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی
 نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔ میرے رب، مجھے اور میرے والدین کو اور ہر

إِلَّا مَنْ قَدَّامًا مِّن قَلْبِنَا يَسْتِيسِرُ بِنَارِ كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ اور نوح پر وحی کی گئی کہ تیری قوم
 میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، اب ان کے کرتوتوں پر غم
 کھانا چھوڑو۔“ (ہود-۳۶)۔

۱۹ یعنی غرق ہونے پر ان کا قصہ تمام نہیں ہو گیا، بلکہ مرنے کے بعد فوراً ہی ان کی روحیں آگ کے
 عذاب میں مبتلا کر دی گئیں۔ یہ بعینہ وہی معاملہ ہے جو فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ کیا گیا، جیسا کہ سورہ مومن،
 آیات ۴۵-۴۶ میں بیان کیا گیا ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۶۲)۔ یہ
 آیت بھی ان آیات میں سے ہے جن سے بزرگ کا عذاب ثابت ہوتا ہے۔

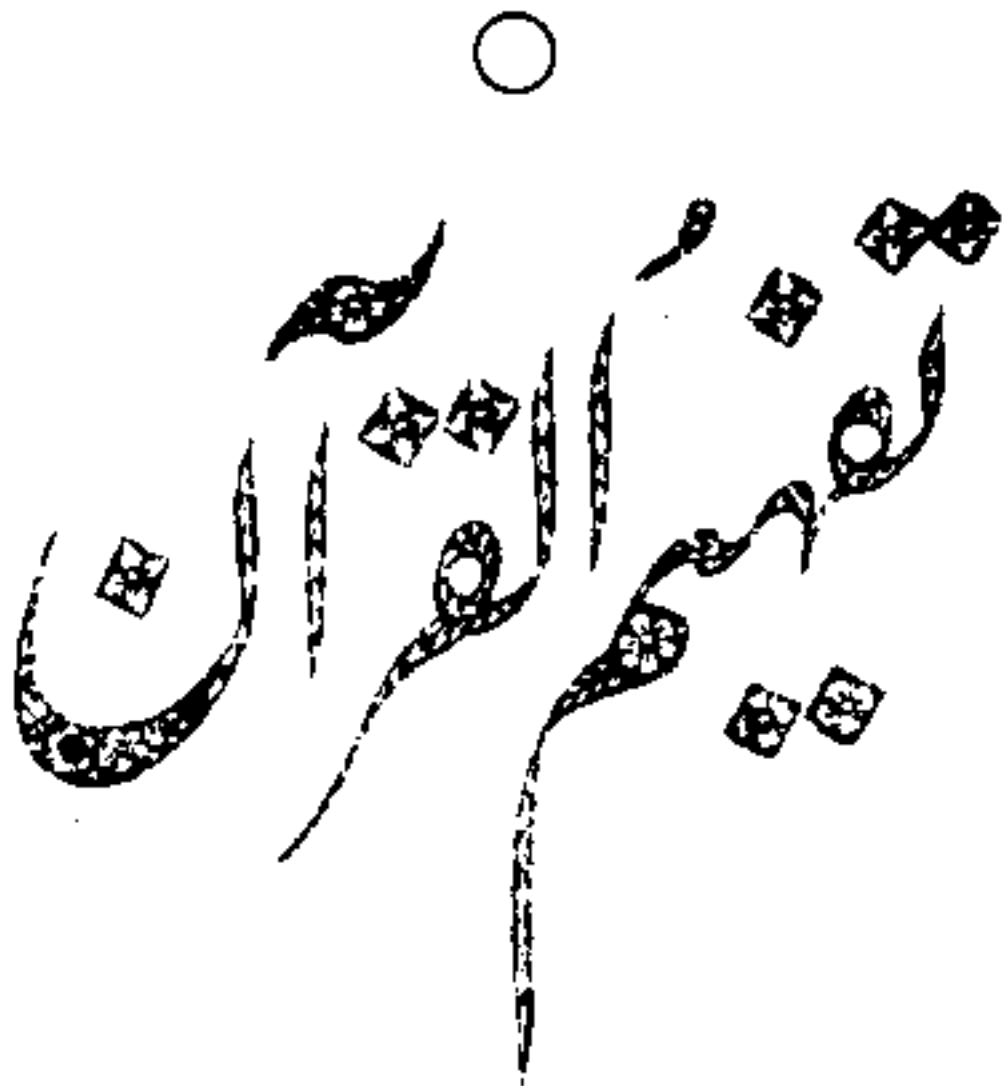
۲۰ یعنی اپنے جن معبودوں کو وہ اپنا حامی و مددگار سمجھتے تھے ان میں سے کوئی بھی انہیں بچانے کے
 لیے نہ آیا۔ یہ گویا تنبیہ تھی اہل مکہ کے لیے کہ تم بھی اگر خدا کے عذاب میں مبتلا ہو گئے تو تمہارے یہ معبود، جن پر تم
 بھروسہ کیے بیٹھے ہو، تمہارے کسی کام نہ آئیں گے۔

دَخَلَ بَيْتِي مُؤْمِنًا وَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَلَا تَزِدِ

الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝۳۸

اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے، اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے، اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کرے۔





۳
ای

(۲۷)

الجن

نام | "الجن" اس سورہ کا نام بھی ہے اور اس کے مضامین کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں جنوں کے قرآن سن کر جانے اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ یازار عکاظ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں نخلہ کے مقام پر آپ نے صبح کی نماز پڑھائی، اُس وقت جنوں کا ایک گروہ اُدھر سے گزر رہا تھا، تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ اسی واقعہ کا ذکر اس سورہ میں کیا گیا ہے۔

اکثر مفسرین نے اس روایت کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ یہ حضیر کے مشہور سفر طائف کا واقعہ ہے جو ہجرت سے تین سال پہلے سلمہ نبوی میں پیش آیا تھا۔ لیکن یہ قیاس متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ طائف کے اُس سفر میں جنوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ پیش آیا تھا اُس کا قصہ سورہ اُحْقاف آیات ۲۹-۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن آیات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس موقع پر جو جن قرآن مجید سن کر ایمان لائے تھے وہ پہلے سے حضرت موسیٰ اور سابق کتب آسمانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اس سورہ کی آیات ۲-۷ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآن سننے والے جن مشرکین اور منکرین آخرت و رسالت میں سے تھے۔ پھر یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ طائف کے اُس سفر میں حضرت زید بن حارثہ کے سوا اور کوئی حضور کے ساتھ نہ تھا۔ بخلاف اس کے اس سفر کے متعلق ابن عباس فرما رہے ہیں کہ اس میں چند صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ مزید برآں روایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اُس سفر میں جنوں نے قرآن اُس وقت سنا تھا جب حضور طائف سے مکہ واپس تشریف لاتے ہوئے نخلہ میں ٹھہرے تھے۔ اور اس سفر میں ابن عباس کی روایت کے مطابق جنوں کے قرآن سننے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب آپ مکہ سے عکاظ تشریف لے جا رہے تھے۔ ان وجوہ سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورہ

احقاف اور سورہ جن میں ایک ہی واقعہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ دو الگ واقعات تھے جو دو مختلف سفروں میں پیش آئے تھے۔

جہاں تک سورہ احقاف کا تعلق ہے، اُس میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں روایات متفق ہیں کہ وہ سلسلہ نبوی کے سفر طائف میں پیش آیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دو سرا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا، اس کا کوئی جواب ہمیں ابن عباس کی روایت سے نہیں ملتا، نہ کسی اور تاریخی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ عکاظ کے بازار میں کب تشریف لے گئے تھے۔ البتہ اس سورہ کی آیات ۸-۱۰ پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نبوت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن عالم بالاک کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمان میں سُن گُن لینے کا کوئی نہ کوئی موقع پالیتے تھے، مگر اس کے بعد یکایک انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف فرشتوں کے سخت پر سے لگ گئے ہیں اور شہابیوں کی بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے کہیں اُن کو ایسی جگہ نہیں ملتی جہاں ٹھیک کر وہ کوئی ٹھنک پاسکیں۔ اس سے اُن کو یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ زمین میں ایسا کیا واقعہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کے لیے یہ سخت انتظامات کیے گئے ہیں۔ غالباً اسی وقت سے جنوں کے بہت سے گروہ اس تلاش میں پھرتے رہے ہوں گے اور اُن میں سے ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن سُن کر یہ رائے قائم کی ہوگی کہ یہی وہ چیز ہے جس کی خاطر جنوں پر عالم بالاک کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

جن کی حقیقت | اس سورے کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے تاکہ ذہن کسی الجھن کے شکار نہ ہوں۔ موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پُرانے زمانے کا وہام خرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ یہ رائے اُنہوں نے کچھ اس بنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور اُنہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جن کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایسے علم کا دعویٰ وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔ مگر اُنہوں نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو اُن کو محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔ یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ

محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے، اور جو موجود ہے اسے لازماً محسوس ہونا چاہیے، وہ دراصل خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ طرز فکر اختیار کر لیا جائے تو ایک جن ہی کیا، انسان کسی ایسی حقیقت کو کبھی نہیں مان سکتا جو براہ راست اُس کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آتی ہو اور اُس کے لیے خدا تک کا وجود قابل تسلیم نہیں ہے کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرز فکر سے متاثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے انہوں نے جن اور ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختہ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بھی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے، اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے۔ لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے اُن کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورہ اعراف، آیت ۲۸۔ ہود، ۱۱۹۔ خم السجدہ، آیات ۲۵ اور ۲۹۔ الاحقاف، ۱۸۔ الذاریات، ۵۶۔ الناس، ۶۔ اور سورہ رحمان تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی۔

سورہ اعراف، آیت ۱۲، سورہ حجر، آیات ۲۶-۲۷، اور سورہ رحمان، آیات ۱۴-۱۵ میں صاف بتایا گیا ہے کہ انسان کا مادہ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادہ تخلیق آگ۔

سورہ حجر آیت ۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے تھے۔ اسی بات پر قصہ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ نیز سورہ کہف آیت ۵۰ میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔

سورہ اعراف آیت ۲۷ میں بالفاظ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان اُن کو نہیں دیکھتے۔

سورہ حجر آیات ۱۶-۱۸، سورہ صافات، آیات ۶-۱۰، اور سورہ ملک آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن اگر چہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں، مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اُس سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری

چھپے سُن گئی ہیں تو شہابِ ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔ اس سے مشرکین عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں یا خدا کی کوئی رسائی حاصل ہے۔ اسی غلط خیال کی تردید سورہ سبا آیت ۱۴ میں بھی کی گئی ہے۔

سورہ بقرہ، آیات ۳۰-۳۴ اور سورہ کہف آیت ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہیں۔ اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں جن کی ایک مثال ہمیں سورہ نمل آیت ۷ میں ملتی ہے، لیکن اسی طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں، اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک با اختیار مخلوق ہے اور اُس کو طاعت و معصیت اور کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اس پر ابلیس کا قہقہہ اور سورہ احقاف اور سورہ جن میں بعض جنوں کے ایمان لانے کا واقعہ مزیح دلالت کرتا ہے۔

قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر وہ اُس پر مُسلط ہو کر زبردستی اُس سے کوئی کام کرا لینے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اُس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں، اُس کو بہکاتے ہیں اور بدی و گمراہی کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: النساء، ۱۱۷ تا ۱۲۰۔ الاعراف، ۱۱ تا ۱۷۔ ابراہیم، ۲۲۔ الحجر، ۳۰ تا ۳۲۔ النحل، ۹۸ تا ۱۰۰۔ بنی اسرائیل، ۶۱ تا ۶۵۔

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرکین عرب زماٹہ جاہلیت میں جنوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، اُن کی عبادت کرتے تھے، اور اُن کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ ملاحظہ ہو الانعام، آیت ۱۰۰۔ سبا، آیات ۲۰-۲۱۔ الصفات، ۱۵۸۔

ان تفصیلات سے یہ بات باسکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ اُن کی پُر سرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کی ہستی اور ان کی طاقتوں کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کر رکھے ہیں، حتیٰ کہ ان کی پستش تک کر ڈالی گئی ہے، مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

موضوع اور مباحث | اس سورہ میں پہلی آیت سے لے کر آیت ۵ تک یہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن مجید سن کر اس کا کیا اثر کیا اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کے دوسرے جنوں سے کیا کیا باتیں کہیں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ساری گفتگو نقل نہیں کی ہے، بلکہ صرف وہ خاص خاص باتیں نقل فرمائی ہیں جو قابل ذکر تھیں۔ اسی لیے طرز بیان ایک مسلسل گفتگو کا سا نہیں ہے، بلکہ ان کے مختلف فقروں کو اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ کہا اور یہ کہا۔ جنوں کی زبان سے نکلے ہوئے ان فقروں کو اگر آدمی بغور پڑھے تو باسانی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کے ایمان لانے کے اس واقعے اور اپنی قوم کے ساتھ ان کی اس گفتگو کا ذکر قرآن میں کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے حواشی میں ان کے اقوال کی جو تشریحات کی ہیں وہ اس کا مقصد سمجھنے میں مزید مددگار ہوں گی۔

اس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ تک لوگوں کو فہمائش کی گئی ہے کہ وہ مشرک سے باز آجائیں اور راہِ راست پر ثابت قدمی کے ساتھ چلیں تو ان پر نعمتوں کی بارش ہوگی ورنہ اللہ کی بھینچی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۳ تک کفار مکہ کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ کا رسول دعوت الی اللہ کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، حالانکہ رسول کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچانا ہے، وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ لوگوں کو نفع یا نقصان پہنچا دینا اس کے اختیار میں ہے۔ پھر آیات ۲۴-۲۵ میں کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آج وہ رسول کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں بے یار و مددگار کون ہے۔ وہ وقت دور ہے یا قریب؟ رسول کو اس کا علم نہیں ہے، مگر بہر حال اسے آنا ضرور ہے۔ آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول کو صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے۔ یہ علم ان امور سے متعلق ہوتا ہے جو فرائض رسالت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اور یہ علم ایسے محفوظ طریقہ سے دیا جاتا ہے جس میں کسی بیرونی مداخلت کا امکان نہیں ہوتا۔

رُكُوْعَاتُهَا ۲

سُورَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ

اٰیَاتُهَا ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 قُلْ اُوْحِیْ اِلَیَّ اِنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا
 عَجَبًا ۙ یَهْدِیْۤ اِلَی الرُّشْدِ فَاَمَّا بِهٖۤ وَ لٰكِن نُّشْرِكُ بِرَبِّنَا اَحَدًا ۙ

اے نبی! کو، میری طرف وحی بھی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا پھر جا کر
 اپنی قوم کے لوگوں سے کہا:

”ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم
 اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔“

۱۵ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر نہیں آ رہے تھے اور آپ کو
 یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن سن رہے ہیں، بلکہ بعد میں وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ حضرت
 عبداللہ بن عباس بھی اس قصے کو بیان کرتے ہوئے صراحت فرماتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں
 کے سامنے قرآن نہیں پڑھا تھا، نہ آپ نے ان کو دیکھا تھا“ (مسلم - ترمذی - مسند احمد - ابن جریر)۔

۱۶ اصل الفاظ میں قُرْاٰنًا عَجَبًا۔ قرآن کے معنی ہیں ”پڑھی جانے والی چیز“ اور یہ لفظ غالباً جنوں
 نے اسی معنی میں استعمال کیا ہوگا کیونکہ وہ پہلی مرتبہ اس کلام سے منعارف ہوئے تھے اور شاید اُس وقت ان کو
 یہ معلوم نہ ہوگا کہ جو چیز وہ سن رہے ہیں اس کا نام قرآن ہی ہے۔ عجب بالغة کا صیغہ ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں
 بہت زیادہ حیرت انگیز چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس جنوں کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسا کلام سن کر
 آئے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن نہ صرف یہ کہ انسانوں کی باتیں سنتے ہیں بلکہ ان کی زبان بخوبی سمجھتے بھی ہیں۔
 اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام جن تمام انسانی زبانیں جانتے ہوں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے جو گروہ زمین کے جس
 علاقے میں رہتے ہوں اُسی علاقے کے لوگوں کی زبان سے وہ واقف ہوں۔ لیکن قرآن کے اس بیان سے بہر حال
 یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جن جنہوں نے اُس وقت قرآن سنا تھا وہ عربی زبان اتنی اچھی جانتے تھے کہ انہوں نے
 اس کلام کی بے مثل بلاغت کو بھی محسوس کیا اور اُس کے بلند پایہ مضامین کو بھی خوب سمجھ لیا۔

وَأَنَّهُ تَعَلَّىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۗ وَأَنَّهُ كَانَ
 يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَىٰ اللَّهِ شَطَطًا ۗ وَأَنَّا ظَنَنَّا أَن لَّنْ نَقُولَ الْإِنسَ
 وَالْجِنِّ عَلَىٰ اللَّهِ كَذِبًا ۗ وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالِ

اور یہ کہ ”ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے، اُس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں

بنایا ہے۔“

اور یہ کہ ”ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلافِ حق باتیں کہتے رہے ہیں۔“

اور یہ کہ ”ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے۔“

اور یہ کہ ”انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے

۳۵ اس سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جن اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے کے منکر
 نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں بھی مشرکین پائے جاتے ہیں جو مشرک انسانوں کی طرح اللہ کے ساتھ دوسروں
 کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہیں، چنانچہ جنوں کی یہ قوم جس کے افراد قرآن سن کر گٹھے ٹھٹھے مشرک ہی تھی۔ تیسرے
 یہ کہ نبوت اور کتبِ آسمانی کے نزول کا سلسلہ جنوں کے ہاں جاری نہیں ہوا ہے، بلکہ ان میں سے جو جن بھی ایمان
 لاتے ہیں وہ انسانوں میں آنے والے انبیاء اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ہی ایمان لاتے ہیں۔ یہی بات سورہ
 احقاف آیات ۲۹-۳۱ سے بھی معلوم ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ جن جنوں نے اُس وقت قرآن
 سنا تھا، حضرت موسیٰ کے پیروں میں سے تھے اور انہوں نے قرآن سننے کے بعد اپنی قوم کو دعوت دی تھی کہ
 اب جو کلام خدا کی طرف سے پچھلی کتبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے اُس پر ایمان لاؤ۔ سورہ رحمان بھی اسی
 بات پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اس کا پورا مضمون ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت
 کے مخاطب انسان اور جن دونوں ہیں۔

۳۶ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ یہ جن یا تو عیسائی جنوں میں سے تھے، یا ان کا کوئی
 اور مذہب تھا جس میں اللہ تعالیٰ کو بیوی بچوں والا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم نماز میں قرآن پاک کا کوئی ایسا حصہ پڑھ رہے تھے جسے سن کر ان کو اپنے عقیدے کی غلطی معلوم
 ہو گئی اور انہوں نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی بلند و بزرگ ذات کی طرف بیوی بچوں کو منسوب کرنا سخت
 بہالت اور گستاخی ہے۔

مِّنَ الْجِنِّ فَرَادُوهُمْ رَهَقًا ۝۶ وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَن لَّنْ يَبْعَثَ
اللَّهُ أَحَدًا ۝۷ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَا فِيهَا مَلَأَتْ حَرَسًا شَدِيدًا

تھے، اس طرح انہوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا۔

اور یہ کہ ”انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمہارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔“

اور یہ کہ ”ہم نے آسمان کو ٹوٹا تو دیکھا کہ وہ پرے داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی

۵۵ اصل میں لفظ مَفِئْتًا استعمال کیا گیا ہے جو ایک فرد کے لیے بھی بولا جاسکتا ہے اور ایک

گروہ کے لیے بھی۔ اگر اسے ایک نادان فرد کے معنی میں لیا جائے تو مراد ابلیس ہوگا۔ اور اگر ایک گروہ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنوں میں بہت سے احمق اور بے عقل لوگ ایسی باتیں کہتے تھے۔

۵۶ یعنی اُن کی غلط باتوں سے ہمارے گمراہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہم کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ

انسان یا جن اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑنے کی جرأت بھی کر سکتے ہیں، لیکن اب یہ قرآن سن کر ہمیں معلوم ہو گیا کہ فی الواقع وہ جھوٹے تھے۔

۵۷ ابن عباس کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں جب عرب کسی سُنسان وادی میں رات گزارتے

تھے تو پکار کر کہتے ”ہم اس وادی کے مالک جن کی پناہ مانگتے ہیں“ عہد جاہلیت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت

اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ پانی اور چارہ ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدو اپنا ایک آدمی کوٹی دوسری جگہ

تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارہ مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں

اُترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے ”کہ ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں“

ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگے بغیر وہاں کوٹی بٹیر جائے

تو وہ جن یا تو خورد سنا تا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے۔ اسی بات کی طرف یہ ایمان لانے والے جن

اشارہ کر رہے ہیں۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین کے خلیفہ انسان نے اُٹا ہم سے ڈرنا شروع کر دیا اور خدا

کو چھوڑ کر وہ ہم سے پناہ مانگنے لگا تو ہماری قوم کے لوگوں کا دماغ اور زیادہ خراب ہو گیا، ان کا کبر و غرور اور کفر و

ظلم اور زیادہ بڑھ گیا، اور وہ گمراہی میں زیادہ جری ہو گئے۔

۵۸ اصل الفاظ ہیں اَنْ لَّنْ يَبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا - اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو

ہم نے تازہ جہ میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ”اللہ کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے گا“ چونکہ الفاظ

جامع ہیں اس لیے ان کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنوں میں بھی رسالت اور آخرت دونوں

وَشَهَابًا ۸ وَأَنَا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ
لَهُ شَهَابًا بِرَّصَدًا ۹ وَأَنَا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدُ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ
بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۱۰ وَأَنَا وَمِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِمَّا دُونَ ذَلِكَ كُنَّا طَرَائِقَ

بارش جو رہی ہے۔ اور یہ کہ ”پہلے ہم سُن گُن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پالیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے سُننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہابِ ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔“

اور یہ کہ ”ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی بُرا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اُن کا رب اُنہیں راہِ راست دکھانا چاہتا ہے۔“

اور یہ کہ ”ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں ہم مختلف طریقوں میں

کا انکار پایا جاتا تھا۔ لیکن آگے کے مضمون کی مناسبت سے پہلا مفہوم ہی زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ اس میں یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ خیال غلط نکلا کہ اللہ کسی رسول کو مبعوث کرنے والا نہیں ہے، آسمانوں کے دروازے ہم پر اسی وجہ سے بند کیے گئے ہیں کہ اللہ نے ایک رسول بھیج دیا ہے۔“

۹ یہ ہے وہ وجہ جس کی بنا پر یہ جن اس تلاش میں نکلے تھے کہ آخر زمین پر ایسا کیا معاملہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کی خبروں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس قدر سخت انتظامات کیے گئے ہیں کہ اب ہم عالمِ بالا میں سُن گُن لینے کا کوئی موقع نہیں پاتے اور جہر بھی جاتے ہیں مار بھگائے جاتے ہیں۔

۱۰ اس سے معلوم ہوا کہ عالمِ بالا میں اس قسم کے غیر معمولی انتظامات دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشا ہے الہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اُس کی بھنگ پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور تحفظ کے ان انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں اُن میں نہ تو شیطاں کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چہرے دیکھے اور شہابوں کی اس بارش کا مشاہدہ کیا تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی

قَدَاً ۱۱) وَأَنَا ظَنَنَّا أَنَّ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهُ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ
هَرَبًا ۱۲) وَأَنَا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ أَمَنَّا بِهِ ۖ فَمَنْ يُؤْمِنُ بِرَبِّهِ فَلَا
يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ۱۳) وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَمِنَ الْقَاسِمِينَ ۖ

بٹے ہوئے ہیں۔

اور یہ کہ ”ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہراسکتے ہیں“
اور یہ کہ ”ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر
ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہوگا“
اور یہ کہ ”ہم میں سے کچھ مسلم اللہ کے اطاعت گزار ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔

صورت درپیش ہے۔ آیا اللہ تعالیٰ نے زمین میں کسی قوم پر بیکایک عذاب نازل کر دیا ہے؟ یا کہیں کوئی رسول
مبعوث ہوا ہے؟ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا جو راہ راست کی طرف رہنمائی
کرتا ہے اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے عذاب نازل نہیں کیا ہے بلکہ خلق کو راہ راست دکھانے کے لیے ایک
رسول مبعوث فرما دیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الحج، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد چہارم
الصافات، حاشیہ ۷، جلد ششم، الملک، حاشیہ ۱۱)۔

۱۱ یعنی اخلاقی حیثیت سے بھی ہم ہیں اچھے اور برے دونوں طرح کے جن پائے جاتے ہیں، اور
اعتقادات میں بھی ہمارا کوئی ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ہم مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ یہ بات کہہ کر ایمان
لانے والے جن اپنی قوم کے جنوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہم راہ راست معلوم کرنے کے یقیناً محتاج ہیں، اس
سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

۱۲ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اسی خیال نے ہمیں نجات کی راہ دکھادی۔ ہم چونکہ اللہ سے بے خوف
نہ تھے اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم نے اس کی نافرمانی کی تو اس کی گرفت سے کسی طرح بچ نہ سکیں گے، اس لیے جب
وہ کلام ہم نے سنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہ راست بتانے آیا تھا تو ہم یہ جرأت نہ کر سکے کہ حق معلوم ہو جانے کے
بعد بھی انہی عقائد پر جمے رہتے جو ہمارے نادان لوگوں نے ہم میں پھیلا رکھے تھے۔

۱۳ حق تلفی سے مراد یہ ہے کہ اپنی نیکی پر وہ جننے اجر کا مستحق ہو اس سے کم دیا جائے۔ اور ظلم یہ ہے
کہ اسے نیکی کا کوئی اجر نہ دیا جائے اور جو قصور اس سے سرزد ہوں ان کی زیادہ سزا دے ڈالی جائے۔ یا بلا قصور

فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝۱۳ وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝۱۵ وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقِينَهُمْ مَّاءً غَدَقًا ۝۱۶ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ

تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔

اور (اے نبی، کہو مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے کہ) لوگ اگر راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب میراب کرتے، تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں۔ اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑ چکا اس کا ایسے

ہی کسی کو عذاب دے دیا جائے۔ کسی ایمان لانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قسم کی کسی بے انصافی کا خوف نہیں ہے۔

۱۴ سوال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی رو سے جن تو خود آتشیں مخلوق ہیں، پھر جہنم کی آگ سے ان کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی رو سے تو آدمی بھی مٹی سے بنا ہے، پھر اگر اسے مٹی کا ڈھیلہ کھینچ مارا جائے تو اس کو چوٹ کیوں لگتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پورا جسم اگر چیزیں کے مادوں سے بنا ہے، مگر جب ان سے گوشت پوست کا زندہ انسان وجود میں آ جاتا ہے تو وہ ان مادوں سے بالکل مختلف چیز بن جاتا ہے اور انہی مادوں سے بنی ہوئی دوسری چیزیں اس کے لیے اذیت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جن بھی اگر چہ اپنی ساخت کے اعتبار سے آتشیں مخلوق ہیں، لیکن آگ سے جب ایک زندہ اور صاحب احساس مخلوق وجود میں آ جاتی ہے تو وہی آگ اس کے لیے تکلیف کی موجب بن جاتی ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، الرحمن، حاشیہ ۱۵)۔

۱۵ اوپر جنوں کی بات ختم ہو گئی۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ کے اپنے ارشادات شروع ہوتے ہیں۔

۱۶ یہ وہی بات ہے جو سورہ نوح میں فرمائی گئی ہے کہ اللہ سے معافی مانگو تو وہ تم پر آسمان سے خوب

بارشیں برسائے گا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد ششم، تفسیر سورہ نوح، حاشیہ ۱۲)۔ پانی کی کثرت کو نعمتوں کی کثرت کے لیے بطور کنایہ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پانی ہی پر آبادی کا انحصار ہے۔ پانی نہ ہو تو سرے سے کوئی بستی بس ہی نہیں سکتی، نہ انسان کی بنیادی ضروریات فراہم ہو سکتی ہیں، اور نہ انسان کی صنعتیں چل سکتی ہیں۔

عَذَابًا صَعَدًا ۱۷) وَإِنَّ الْمَسْجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۱۸) وَ
 أَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۱۹) قُلْ
 إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ۲۰) قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا
 وَلَا رَشَدًا ۲۱) قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِنْ دُونِ

سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں لہذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسے نبی، کہو کہ ”میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا“ کہو، ”میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا۔ کہو، مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جاٹے پناہ

۱۷ یعنی یہ دیکھیں کہ وہ نعمت پا کر بھی شکر گزار رہتے ہیں یا نہیں، اور ہماری دی ہوئی نعمت کا صحیح

استعمال کرتے ہیں یا غلط۔

۱۸ ذکر سے منہ موڑنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آدمی اللہ کی بھٹی ہوئی نصیحت کو قبول نہ کرے، اور

یہ بھی کہ وہ اللہ کا ذکر سننا ہی گوارا نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کی عبادت سے روگردانی کرے۔

۱۹ مفسرین نے بالعموم ”مساجد“ کو عبادت گا ہوں کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کے لحاظ سے آیت

کا مطلب یہ ہے کہ عبادت گا ہوں میں اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ

زمین پوری کی پوری عبادت گاہ ہے اور آیت کا منشا یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کہیں بھی شرک نہ کیا جائے۔ ان

کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے کہ جعلت لی الارض مسجدا وظہورا۔ میرے

لیے پوری زمین عبادت کی جگہ اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بناٹی گئی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے

مساجد سے مراد وہ اعضاء لیے ہیں جن پر آدمی سجدہ کرتا ہے، یعنی ہاتھ، گھٹنے، قدم اور پیشانی۔ اس تفسیر

کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعضاء اللہ کے بناٹے ہوئے ہیں۔ ان پر اللہ کے سوا کسی اور کے

لیے سجدہ نہ کیا جائے۔

۲۰ اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مُلْتَحِدًا ۲۲) إِلَّا بَلَاغًا مِّنَ اللَّهِ وَرِسَالَةً ۖ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
فَإِنَّ لَهُ نَاصِرًا جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۲۳) حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا
يُوعَدُونَ فَيَسْئَلُونَ مَن أُضْعِفُ نَاصِرًا وَّاقِلُّ عَدَدًا ۲۴)

پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔
اب جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ
اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے
وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتنا تعداد میں کم ہے۔

۵۲۱) یعنی خدا کو پکارنا تو کوئی قابل اعتراض کام نہیں ہے جس پر لوگوں کو اس قدر غصہ آئے، البتہ
بری بات اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص خدا کے ساتھ کسی اور کو خدائی میں شریک بٹھرائے، اور یہ کام میں نہیں کرتا
بلکہ وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا کا نام سن کر مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔

۵۲۲) یعنی میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی خدائی میں میرا کوئی دخل ہے، یا لوگوں کی قسمتیں بنانے اور
بگاڑنے کا کوئی اختیار مجھے حاصل ہے۔ میں تو صرف ایک رسول ہوں اور جو خدمت میرے سپرد کی گئی ہے وہ
اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات تمہیں پہنچا دوں۔ باقی رہے خدائی کے اختیارات، تو وہ
سارے کے سارے اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانا تو درکنار، مجھے تو خود اپنے
نفع و نقصان کا اختیار بھی حاصل نہیں۔ اللہ کی نافرمانی کروں تو اس کی پکڑ سے بچ کر میں پناہ نہیں لے سکتا، اور اللہ
کے دامن کے سوا کوئی ملجا و ماویٰ میرے لیے نہیں ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم)
الشوری، حاشیہ ۷۔

۵۲۳) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور معصیت کی سزا ابدی جہنم ہے، بلکہ جس سلسلہ کلام میں یہ بات
فرمائی گئی ہے اس کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے توجید کی جو دعوت دی
گئی ہے اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے اس کے لیے ابدی جہنم کی سزا ہے۔

۵۲۴) اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں قریش کے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت
انی اللہ کو سنتے ہی آپ پر ٹوٹ پڑتے تھے وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ اُن کا جتنا بڑا زبردست ہے اور رسول

قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ مَا تُوْعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا ۝۲۵
 عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝۲۶ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ
 رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۝۲۷

کہو میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو، تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چند مٹھی بھر آدمی ہیں اس لیے وہ باسانی آپ کو دبا لیں گے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ آج یہ لوگ رسول کو بے یار و مددگار اور اپنے آپ کو کثیر التعداد دیکھ کر حق کی آواز کو دبانے کے لیے بڑے دلیر ہو رہے ہیں، مگر جب وہ بڑا وقت آجائے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو ان کو پتہ چل جائے گا کہ بے یار و مددگار حقیقت میں کون ہے۔

۵۲۵ انداز بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک سوال کا جواب ہے جو سوال نقل کیے بغیر دیا گیا ہے۔ غالباً اوپر کی بات سن کر مخالفین نے طنز اور مذاق کے طور پر سوال کیا ہو گا کہ وہ وقت جس کا ڈراوا آپ دے رہے ہیں آخر کب آئے گا؟ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے کہو، اُس وقت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کی تاریخ مجھے نہیں بتائی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ آیا وہ جلدی آنے والا ہے یا اس کے لیے ایک طویل مدت مقرر کی گئی ہے۔

۵۲۶ یعنی غیب کا پورا علم اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اور یہ مکمل علم غیب وہ کسی کو بھی نہیں دیتا۔
 ۵۲۷ یعنی رسول بجائے خود عالم الغیب نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ جب اس کو رسالت کا فریضہ انجام دینے کے لیے منتخب فرماتا ہے تو غیب کے حقائق میں سے جن چیزوں کا علم وہ چاہتا ہے اسے عطا فرمادیتا ہے۔

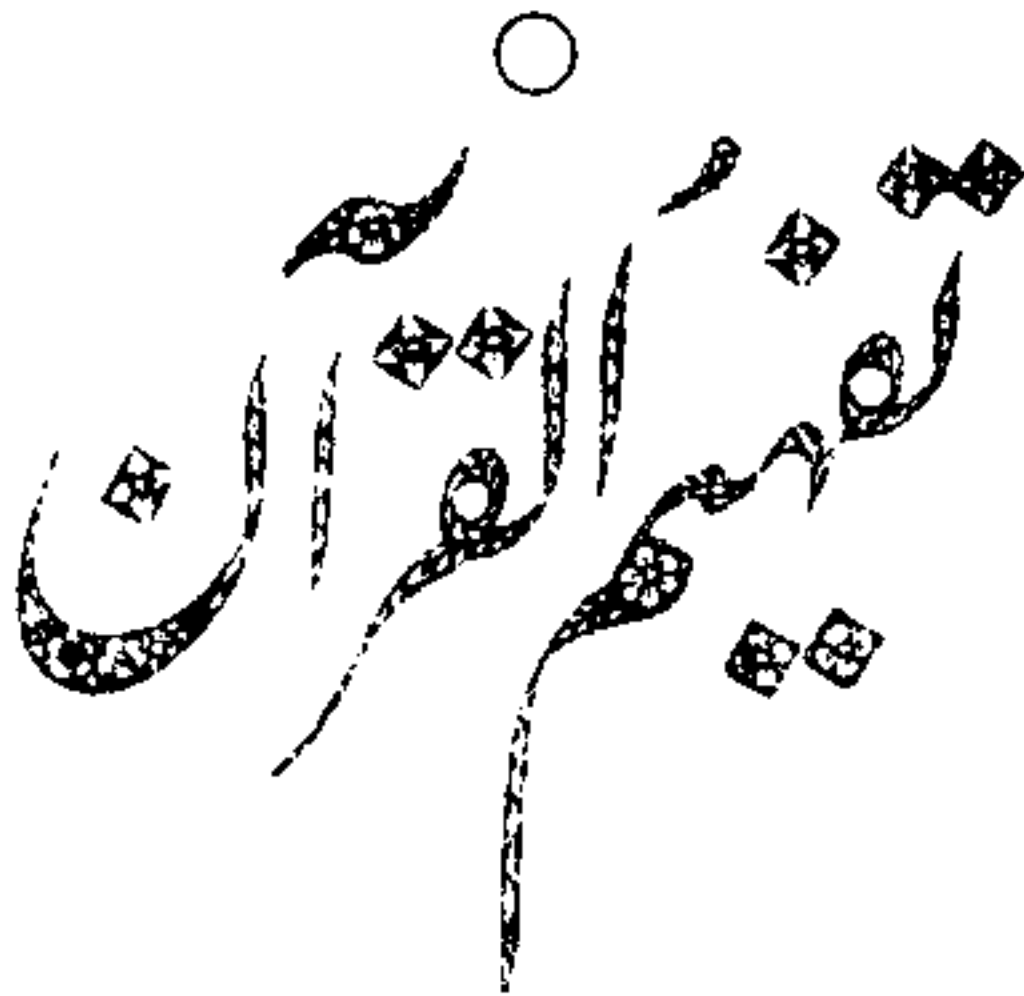
۵۲۸ محافظوں سے مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ سے غیب کے حقائق کا علم رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی نگہبانی کرنے کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ یہ وہی بات ہے جو اوپر آیات ۸-۹ میں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جنوں نے اپنے لیے عالمِ بالا تک رسائی کے تمام دروازے بند پائے اور انہوں نے دیکھا کہ سخت چوکی پر سے لگ گئے ہیں جن کے باعث کہیں ذرا سی سُن گئیے کا موقع بھی ان کو نہیں ملتا۔

لَيَعْلَمَ أَنَّ قَدْ أَبْلَغُوا رَسُولِي سِرِّيهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ
وَأَحْصَى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝۲۸

تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے، اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔ ع

۲۸ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رسول یہ جان لے کہ فرشتوں نے اُس کو اللہ تعالیٰ کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیغامات اس کے رسول تک صحیح صحیح پہنچا دیے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ رسولوں نے اس کے بندوں تک اپنے رب کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیے۔ آیت کے الفاظ ان تینوں معنوں پر حاوی ہیں اور بعید نہیں کہ تینوں ہی مراد ہوں۔ اس کے علاوہ یہ آیت دو مزید باتوں پر بھی دلالت کرتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ رسول کو وہ علم غیب عطا کیا جاتا ہے جو فریضہ رسالت کی انجام دہی کے لیے اس کو دینا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو فرشتے نگہبانی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں وہ صرف اسی بات کی نگہبانی نہیں کرتے کہ رسول تک وحی محفوظ طریقے سے پہنچ جائے بلکہ اس بات کی نگہبانی بھی کرتے ہیں کہ رسول اپنے رب کے پیغامات اس کے بندوں تک بے کم و کاست پہنچا دے۔

۲۹ یعنی رسول پر بھی اور فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اس طرح محیط ہے کہ اگر بال برابر بھی وہ اس کی مرضی کے خلاف جنبش کرے تو فوراً گرفت میں آجائیں۔ اور جو پیغامات اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے ان کا حرف حرف گنا ہوا ہے، رسولوں اور فرشتوں کی یہ مجال نہیں ہے کہ ان میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی کر سکیں۔



التَّوْبَةُ

(٤٣)

الْمُرْتَلِّ

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ المرْتَلِّ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زماثہ نزول | اس سورہ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔

پہلا رکوع بالاتفاق مکی ہے۔ اس کے مضامین اور احادیث کی روایات دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مکی زندگی کے کس دور میں نازل ہوا ہے، اس کا جواب ہمیں روایات سے تو نہیں ملتا، لیکن اس رکوع کے مضامین کی داخلی شہادت اس کا زمانہ متعین کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے:

اولاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپ راتوں کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کیا کریں تاکہ آپ کے اندر نبوت کے بارِ عظیم کو اٹھانے اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم حضور کی نبوت کے ابتدائی دور ہی میں نازل ہوا ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس منصب کے لیے آپ کی تربیت کی جا رہی تھی۔

ثانیاً، اس میں حکم دیا گیا ہے کہ نماز تہجد میں آدھی آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش قرآن مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت قرآن مجید کا کم از کم اتنا حصہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قرأت کی جاسکے۔

ثالثاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے اور کفارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رکوع اُس زمانے میں نازل ہوا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے اور مکہ میں آپ کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکہ ہی میں نازل ہوا ہے، لیکن بعض دوسرے مفسرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے، اور اس رکوع کے مضامین سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس میں قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ مکہ میں اس کا کوئی سوال پیدا ہوتا تھا، اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔

موضوع اور مضامین | پہلی سات آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس

کارِ عظیم کا بار آپ پر ڈالا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے آپ اپنے آپ کو تیار کریں، اور اُس کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ راتوں کو اُٹھ کر آپ آدھی آدھی رات، یا اس سے کچھ کم و بیش نماز پڑھا کریں۔

آیت ۸ سے ۱۴ تک حضور کو تلقین کی گئی ہے کہ سب سے کٹ کر اُس خدا کے ہور ہیں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ اپنے سارے معاملات اُسی کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیں۔ مخالفین جو باتیں آپ کے خلاف بنا رہے ہیں ان پر صبر کریں، اُن کے منہ نہ لگیں اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں کہ وہی اُن سے منٹ لے گا۔

اس کے بعد آیات ۱۵ سے ۱۹ تک مکہ کے اُن لوگوں کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے، مُنذِبہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اُسی طرح تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف بھیجا تھا، پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر فرض کر لو کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب نہ آیا تو قیامت کے روز تم کفر کی سزا سے کیسے بچ نکلو گے؟

یہ پہلے رکوع کے مضامین ہیں۔ دوسرا رکوع حضرت سعید بن جبیر کی روایت کے مطابق اُس کے دس سال بعد نازل ہوا اور اس میں نماز تہجد کے متعلق اُس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز کا تعلق ہے وہ تو جتنی باسانی پڑھی جاسکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اصل اہتمام جس چیز کا کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ پنجوقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں، فریضہ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خلوص نیت کے ساتھ صرف کریں۔ آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جو بیلانی کے کام تم دنیا میں انجام دو گے وہ ضائع نہیں جائیں گے بلکہ اُن کی حیثیت اُس سامان کی سی ہے جو ایک مسافر اپنی مستقل قیام گاہ پر پہلے سے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر تم وہ سب کچھ موجود پاؤ گے جو دنیا میں تم نے آگے روانہ کیا ہے، اور یہ پیشگی سامان نہ صرف یہ کہ اُس سامان سے بہت بہتر ہے جو تمہیں دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں تمہیں اپنے بھیجے ہوئے اصل مال سے بڑھ کر بہت بڑا اجر بھی ملے گا۔

آيَاتُهَا ۲۰

سُورَةُ الْمُرْقَلِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَا أَيُّهَا الْمُرْمَلُ ۱ قِمِ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا ۲ نِصْفَهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ
 قَلِيلًا ۳ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۴ إِنَّا سَنُلْقِي

اسے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، اودھی رات یا اس کے کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک

۱۔ ان الفاظ کے ساتھ حضور کو مخاطب کرنے اور پھر یہ حکم دینے سے کہ آپ اٹھیں اور راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے رہا کریں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت یا تو آپ سوچکے تھے یا سونے کے بیٹے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ اس موقع پر آپ کو اسے نبی، یا اسے رسول کہہ کر خطاب کرنے کے بجائے "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے" کہہ کر پکارنا ایک لطیف اندازِ خطاب ہے جس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اب وہ دور گزر گیا جب آپ آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتے تھے۔ اب آپ پر ایک کارِ عظیم کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

۲۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رات نماز میں کھڑے رہ کر گزارو اور اس کا کم حصہ سونے میں صرف کرو۔ دوسرا یہ کہ پوری رات نماز میں گزار دینے کا مطالبہ تم سے نہیں ہے بلکہ آرام بھی کرو اور رات کا ایک قلیل حصہ عبادت میں بھی صرف کرو۔ لیکن آگے کے مضمون سے پہلا مطلب ہی زیادہ مناسب رہتا ہے اور اسی کی تائید سورہ دہر کی آیت ۲۶ سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے وَ مِنْ آيَاتِنَا سَجْدَةٌ لَكَ دَسَبَعُهُ لَيْلًا طَوِيلًا، "رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو اور رات کا طویل حصہ اُس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔"

۳۔ یہ اُس مقدارِ وقت کی تشریح ہے جسے عبادت میں گزارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو اختیار دیا گیا کہ خواہ اودھی رات نماز میں صرف کریں، یا اس سے کچھ کم کر دیں، یا اس سے کچھ زیادہ۔ لیکن اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابلِ تزییح اودھی رات ہے، کیونکہ اُسی کو معیار قرار دے کر کمی و بیشی کا اختیار دیا گیا ہے۔

۴۔ یعنی تیز تیز رواں درواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک

عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَ

بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر

ایک آیت پر ٹھہرو، تاکہ ذہن پوری طرح کلام الہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قرأتِ محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبیر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا طریقہ حضرت انس سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ الفاظ کو بچھین کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپ اللہ، رحمان اور رحیم کو مد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے (بخاری)۔ حضرت ام سلمہ سے یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ حضور ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر پھرتے جاتے تھے، مثلاً الْحَمْدُ لِلَّهِ سَابِغِ الْعَالَمِينَ پڑھ کر رک جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھتے اور اس کے بعد رک کر مَلِکِ یَوْمَ الدِّیْنِ کہتے (مسند احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی)۔ دوسری ایک روایت میں حضرت ام سلمہ بیان فرماتی ہیں کہ حضور ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھا کرتے تھے (ترمذی۔ نسائی)۔ حضرت حذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضور کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپ کی قرأت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے، جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے (مسلم، نسائی)۔ حضرت ابو ذر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضور اس مقام پر پہنچے اِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَعْفُ عَنْهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف فرما دے تو تو غالب اور داناجے، تو اسی کو ڈہرانے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی (مسند احمد، بخاری)۔

۵ مطلب یہ ہے کہ تم کو رات کی نماز کا یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ایک بھاری کلام ہم تم پر نازل کر رہے ہیں جس کا بار اٹھانے کے لیے تم میں اُس کے تحمل کی طاقت پیدا ہونی ضروری ہے، اور یہ طاقت تمہیں اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ راتوں کو اپنا آرام چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھو اور ادھی ادھی رات یا کچھ کم و بیش عبادت میں گزارا کرو۔ قرآن کو بھاری کلام اس بنا پر بھی کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا، اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا، اور اس کے مطابق عقائد و انکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری

کام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس بنا پر بھی اس کو بھاری کلام کہا گیا ہے کہ اس کے نزول کا تحمل بڑا دشوار کام تھا۔ حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے زمانے میں حضور پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپ کی پیشانی سے اُس وقت پسینہ پکنے لگتا تھا۔ بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نسائی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپ اونٹنی پر بیٹھے ہوں تو اونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزول وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا۔ مسند احمد، حاکم، ابن جریر۔

۵۶ اصل میں لفظ نَائِشَةٌ الْيَلِ استعمال کیا گیا ہے جس کے متعلق مفترین اور اہل لغت کے چار مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ نائشہ سے مراد نفس نائشہ ہے، یعنی وہ شخص جو رات کو اٹھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رات کے اوقات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں رات کو اٹھنا۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض رات کو اٹھنے پر نہیں ہوتا بلکہ سوکر اٹھنے پر ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ اور مجاہد نے اسی چوتھے قول کو اختیار کیا ہے۔

۵۷ اصل میں لفظ اَشَدُّ وَطْأً استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اسے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چونکہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اُس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پائے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دین حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔

اقوم قِيْلًا ۖ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيْلًا ۗ وَاذْكُرْ اِسْمَ رَبِّكَ
وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۙ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلَهَ اِلَّا هُوَ
فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۙ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاَنْجُرْهُمْ هَجْرًا جَبِيْلًا ۙ

اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت
مصرفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق
و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو۔ اور جو
باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔

۱۵۸ اصل میں اقوم قِيْلًا ارشاد ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ”قول کو زیادہ راست اور درست
بنانا ہے“ لیکن مدعا یہ ہے کہ اُس وقت انسان قرآن کو زیادہ سکون و اطمینان اور توجہ کے ساتھ سمجھ کر پڑھ
سکتا ہے۔ ابن عباس اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اجدران یفقه فی القرآن، یعنی ”وہ اس کے
لیے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی قرآن میں غور و خوض کرے“ (ابوداؤد)۔

۱۵۹ دن کے اوقات کی مصرفیتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد کہ ”اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو“
خود بخود یہ مفہوم ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام کرتے ہوئے بھی اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہ
ہو اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، الا حواہ)
حاشیہ ۶۳۔

۱۶۰ وکیل اُس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اُس کے سپرد کر دے۔ قریب
قریب اسی معنی میں ہم اردو زبان میں وکیل کا لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالہ اپنا مقدمہ
کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ
لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی دعوت پیش کرنے پر تمہارے خلاف
مخالفوں کا جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور جو مشکلات تمہیں پیش آرہی ہیں اُن پر کوئی پریشانی تم کو لاحق
نہ ہونی چاہیے۔ تمہارا رب وہ ہے جو مشرق و مغرب، یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے
اعتیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ تم اپنا معاملہ اُس کے حوالے کر دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ اب تمہارا مقدمہ
وہ لڑے گا، تمہارے مخالفین سے وہ نمٹے گا اور تمہارے سارے کام وہ بنائے گا۔

۱۶۱ الگ ہو جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے مقاطعہ کر کے اپنی تبلیغ بند کر دو، بلکہ اس کا مطلب

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهَلَمْ قَلِيلًا ۝۱۱ إِنَّ لَدَيْنَا
 أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۝۱۲ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۳ يَوْمَ
 تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَهِيلًا ۝۱۴

ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے غمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر ایسی
 حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (ان کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور
 حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب۔ یہ اُس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے
 اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بھرے جا رہے ہیں۔

یہ ہے کہ ان کے منہ نہ لگو، ان کی بیہودگیوں کو یا شکل نظر انداز کر دو، اور ان کی کسی بد تمیزی کا جواب نہ دو۔ پھر یہ
 احتراز بھی کسی غم اور غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ نہ ہو، بلکہ اُس طرح کا احتراز ہو جس طرح ایک شریف آدمی
 کسی بازاری آدمی کی گالی سُن کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور دل پر میل تک نہیں آنے دیتا۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ
 ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کچھ اس سے مختلف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور کو یہ
 ہدایت فرمائی۔ اصل میں تو آپ پہلے ہی سے اسی طریقے پر عمل فرما رہے تھے، لیکن قرآن میں یہ ہدایت اس لیے
 دی گئی کہ کفار کو بتا دیا جائے کہ تم جو حرکتیں کر رہے ہو ان کا جواب نہ دینے کی وجہ کمزوری نہیں ہے بلکہ اللہ نے
 ایسی باتوں کے جواب میں اپنے رسول کو یہی شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

۱۱۔ ان الفاظ میں صاف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مکہ میں دراصل جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کو جھٹلا رہے تھے اور طرح طرح کے فریب دے کر اور تعصبات اُبھار کر عوام کو آپ کی مخالفت پر آمادہ کر رہے
 تھے وہ قوم کے کھاتے پیتے، پیٹ بھرے خوشحال لوگ تھے، کیونکہ انہی کے مفاد پر اسلام کی اس دعوت اصلاح
 کی زد پڑ رہی تھی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ معاملہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ
 ہمیشہ ہی گروہ اصلاح کی راہ روکنے کے لیے سنگ گراں بن کر کھڑا ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف،
 آیات ۶۰-۶۴-۷۵-۸۸-المومنون، ۳۳-سبا، ۳۴-۳۵-الزخرف، ۲۳۔

۱۲۔ جہنم میں بھاری بیڑیاں مجرموں کے پاؤں میں اس لیے نہیں ڈالی جائیں گی کہ وہ بھاگ نہ سکیں، بلکہ
 اس لیے ڈالی جائیں گی کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔ یہ فرار سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ عذاب کے لیے ہونگی۔

۱۳۔ چونکہ اُس وقت پہاڑوں کے اجزاء کو باندھ کر رکھنے والی کشش ختم ہو جائے، اس لیے

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا هُ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ
رَسُولًا ۝۱۵ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنَ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخَذًا وَبَيْلًا ۝۱۶ فَكَيْفَ
تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝۱۷ السَّمَاءُ مَنفُطْرًا ۝
كَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝۱۸ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ سَرِيٍّ

تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے
فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو کہ جب) فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو
ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے پتہ چاؤ گے
جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا، اللہ کا وعدہ تو پورا
ہو کر ہی رہتا ہے۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ
پہلے تو وہ باریک بھر بھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے، پھر جو زلزلہ زمین کو ہلا رہا ہو گا اس کی وجہ سے یہ
ریت بکھر جائے گی اور ساری زمین ایک چیل میدان بن جائے گی۔ اسی آخری کیفیت کو سورہ طہ آیات ۱۰۵ تا
۱۰۷ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا۔ کہو، میرا رب ان کو
دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کو ٹی بیل اور سلوٹ
نہ دیکھو گے۔“

۱۵ اب مکہ کے اُن کفار کو خطاب کیا جا رہا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھٹھا رہے تھے اور
آپ کی مخالفت میں سرگرم تھے۔

۱۶ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں پر گواہ بنا کر بھیجنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ دنیا میں اُن
کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دیں، اور یہ بھی کہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہوگی
اُس وقت آپ یہ گواہی دیں کہ میں نے ان لوگوں کے سامنے حق پیش کر دیا تھا (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو
تفسیر القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۲۴۔ النساء، حاشیہ ۶۲۔ جلد دوم، النمل، آیات ۸۲، ۸۳۔ جلد چہارم
الاحزاب، حاشیہ ۸۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۱۲)۔

۱۷ یعنی اول تو تمہیں ڈرنا چاہیے کہ اگر ہمارے بھیجے ہوئے رسول کی بات تم نے نہ مانی تو وہ بڑا انجام تمہیں
دُنیا ہی میں دیکھنا ہو گا جو فرعون اس سے پہلے اسی جرم کے نتیجے میں دیکھ چکا ہے۔ لیکن اگر فرض کر دو کہ دنیا میں تم

سَبِيلًا ۱۸) إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ
وَتُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ

اختیار کرے ۷

اٹھے نبی، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور
کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو، اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک
گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے، اُسے معلوم ہے

پر کوئی عذاب نہ بھی بھیجا گیا تو روزِ قیامت کے عذاب سے کیسے بچ نکلے گا؟

۱۸) یہ آیت جس کے اندر نماز تہجد کے حکم میں تخفیف کی گئی ہے، اس کے بارے میں روایات مختلف
ہیں۔ حضرت عائشہ سے مسند احمد، مسلم اور ابوداؤد میں یہ روایت منقول ہے کہ پہلے حکم کے بعد یہ دوسرا حکم
ایک سال کے بعد نازل ہوا اور رات کا قیام فرض سے نفل کر دیا گیا۔ دوسری روایت حضرت عائشہ ہی سے
ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے یہ نقل کی ہے کہ یہ حکم پہلے حکم کے ۸ مہینہ بعد آیا تھا، اور ایک تیسری روایت جو
ابن ابی حاتم نے انہی سے نقل کی ہے اس میں سولہ مہینے بیان کیے گئے ہیں۔ ابوداؤد، ابن جریر اور ابن ابی
حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک سال کی مدت نقل کی ہے۔ لیکن حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے
کہ اس کا نزول دس سال بعد ہوا ہے (ابن جریر اور ابن ابی حاتم)۔ ہمارے نزدیک یہ قول زیادہ صحیح ہے، اس
لیے کہ پہلے رکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے اور وہاں بھی اُس کا نزول ابتدائی
دور میں ہوا ہے جبکہ حضور کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اس
کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے جب کفار
سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آچکا تھا۔ اس بنا پر لا محالہ ان دونوں رکوعوں
کے زمانہ نزول میں کم از کم دس سال کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔

۱۹) اگرچہ ابتدائی حکم آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش کھڑے رہنے کا تھا، لیکن چونکہ نماز کی محویت میں
وقت کا اندازہ نہ رہتا تھا، اور گھڑیاں بھی موجود نہ تھیں کہ اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکیں، اس لیے کبھی دو تہائی
رات تک عبادت میں گزر جاتی تھی اور کبھی یہ مدت گھٹ کر ایک تہائی رہ جاتی تھی۔

۲۰) ابتدائی حکم میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کیا گیا تھا، اور آپ ہی کو قیام لیل کی ہدایت
فرمائی گئی تھی، لیکن مسلمانوں میں اُس وقت حضور کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا تھا اس کی

أَنْ لَّنْ تَخْصُوهُ فِتَابَ عَلَیْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ عَلِمَ
 أَنْ سَیَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَىٰ وَأَخْرُونَ یَضْرِبُونَ فِی الْأَرْضِ یَبْتَغُونَ
 مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَأَخْرُونَ یُقَاتِلُونَ فِی سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ

کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہونگے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس جتنا قرآن باسانی پڑھا جا سکے بنا پر اکثر صحابہ کرام بھی اس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

۵۱۵ چونکہ نماز میں طول زیادہ تر قرآن کی طویل قرأت ہی سے ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تہجد کی نماز میں جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اس سے نماز کی طوالت میں آپ سے آپ تخفیف ہو جائے گی۔ اس ارشاد کے الفاظ اگرچہ بظاہر حکم کے ہیں، لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا، کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا "نہیں، الا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو" (بخاری و مسلم)۔

اس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نماز میں جس طرح رکوع و سجود فرض ہے اسی طرح قرآن مجید کی قرأت بھی فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے، اسی طرح یہاں قرآن کی قرأت کا ذکر کیا ہے اور مراد اس سے نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس استنباط پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب نماز تہجد خود نفل ہے تو اس میں قرآن پڑھنا کیسے فرض ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفل نماز بھی جب آدمی پڑھے تو اس میں نماز کی تمام شرائط پوری کرنا اور اس کے تمام ارکان و قرائن ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نفل نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت، جسم کا پاک ہونا، وضو کرنا، اور ستر چھپانا واجب نہیں ہے اور اس میں قیام و قعود اور رکوع و سجود بھی نفل ہی ہیں۔

۵۱۶ جائز اور حلال طریقوں سے رزق کمانے کے لیے سفر کرنے کو قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ کا فضل تلاش کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۱۷ یہاں اللہ تعالیٰ نے پاک رزق کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر جس طرح ایک ساتھ کیا ہے اور بیماری کی مجبوری کے علاوہ ان دونوں کاموں کو نماز تہجد سے معافی یا اس میں تخفیف کا سبب قرار دیا ہے،

مِنْهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا
وَمَا تَقْدِرُوا مَوْلًا إِلَّا نَفْسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ يَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ
أَجْرًا ۖ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا مِنْ خَطِيئَتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٠﴾

پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے
آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔
اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

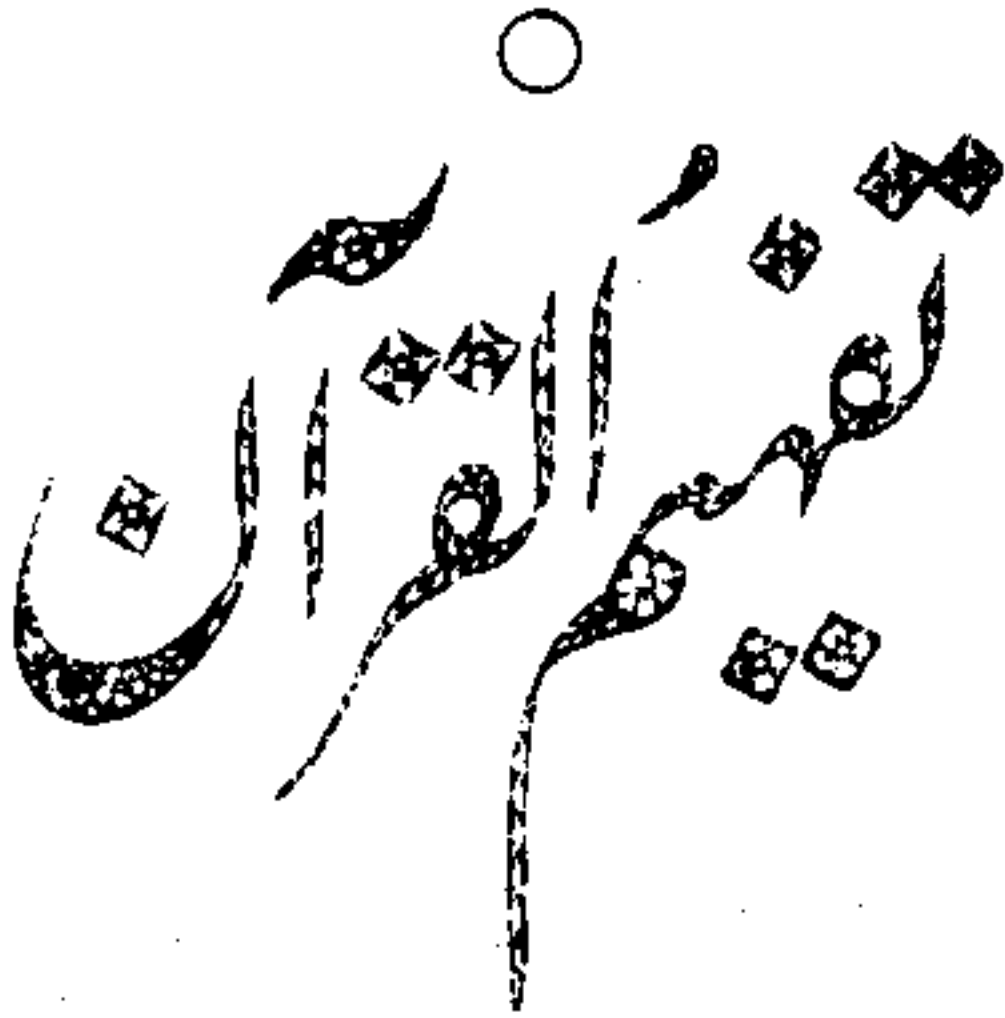
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقوں سے روزی کمانے کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں
حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما من جالب یجلب
طعاماً الی بلدی من بلدان المسلمین فیبیعه لیسیر یومہ الا کانت منزلتہ عند اللہ ثم قرأ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخرون یضربون فی الاسرض.... "جو شخص مسلمانوں
کے کسی شہر میں غلہ لے کر آیا اور اُس روز کے بھاؤ پر اسے بیچ دیا اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوگا، پھر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت پڑھی " (ابن مردؤیہ)۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا ما من
حال یتینی علیہ الموت بعد الجهاد فی سبیل اللہ احب الی من ان یتینی وانا بین
شعبتی جبل التمس من فضل اللہ وقرأ هذه الآية "جہاد فی سبیل اللہ کے بعد اگر کسی حالت
میں جان دینا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ یہ حالت ہے کہ میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے
کسی پہاڑی درے سے گزر رہا ہوں اور وہاں مجھ کو موت آجائے، پھر انہوں نے یہی آیت پڑھی " (تبیہتی
فی شعب الایمان)۔

۲۲ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد بنجوقتہ فرض نماز اور فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

۲۵ ابن زبید کہتے ہیں کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرنا ہے، خواہ وہ
جہاد فی سبیل اللہ ہو، یا بندگانِ خدا کی مدد ہو، یا رفاہ عام ہو، یا دوسرے بھلائی کے کام۔ اللہ کو قرض دینے
اور اچھا قرض دینے کے مطلب کی تشریح ہم اس سے پہلے متعدد مقامات پر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،
جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۶- المائدہ، حاشیہ ۳۳۔ جلد پنجم، السجدہ، حاشیہ ۱۶۔

۲۶ مطلب یہ ہے کہ تم نے آگے اپنی آخرت کے لیے جو کچھ بھیج دیا وہ تمہارے لیے اُس سے زیادہ

نافع ہے جو تم نے دنیا ہی میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ حدیث میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ایک مالہ احب الیہ من مال واساتہ؟ تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا اعلموا ما تقولون۔ سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا: انما مال احدکم ما قدم و مال واساتہ ما اتخر۔ تمہارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لئے آگے بھیج دیا۔ اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔ (بخاری۔ نسائی۔ مسند ابو یعلیٰ)۔



المذكر

(٤٢)

المدثر

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ المدثر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی صرف نام ہے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانہ نزول | اس کی پہلی سات آیات مکہ معظمہ کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ ہیں۔ بعض روایات جو بخاری، مسلم، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے منقول ہیں ان میں تو بیان تک کہا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی اولین آیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ لیکن امت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلم ہے کہ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی وہ اقرا یا سجد سبک الذی خلق سے مآلہ یعلمہ تک ہے۔ البتہ صحیح روایات سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اس پہلی وحی کے بعد کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، پھر اس وقفہ کے بعد جب از سر نو نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا آغاز سورہ مدثر کی انہی آیات سے ہوا تھا۔ امام زہری اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

”ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانہ میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے آپ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت دور ہو جاتی تھی۔“ ابن جریر،

اس کے بعد امام زہری خود حضرت جابر بن عبد اللہ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرۃ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا: ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا۔ یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، سراٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غار حراء میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف لیا کبیل، اڑھا دیا۔ اس وقت اللہ نے وحی نازل کی یٰٰٓأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا“ (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن جریر)۔

سورہ کا باقی ماندہ حصہ آیت ۸ سے آخر تک اس وقت نازل ہوا جب اسلام کی

غلامیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اس کا مفصل واقعہ سیرت ابن ہشام میں بیان کیا گیا ہے جسے آگے چل کر ہم نقل کریں گے۔

موضوع اور مضمون جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھی گئی تھی وہ سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

”پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، ایک نو نضرے سے انسان کی تخلیق

کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ

علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا“

یہ نزول وحی کا پہلا تجربہ تھا جو چنانک حضور کو پیش آیا تھا۔ اس پیغام میں آپ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ کو کرنا ہے، بلکہ صرف ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربے سے پڑا ہے اس کا اثر دور ہو جائے اور آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس سورہ کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلق خدا کو اس روش کے انجام سے ڈرا لیں جس پر وہ چل رہی ہے، اور اس دنیا میں، جہاں دوسروں کی بڑائی کے ڈنکے بج رہے ہیں، خلا کی بڑائی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اب جو کام آپ کو کرنا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زندگی ہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہو اور آپ تمام دنیوی فائدوں سے قطع نظر کر کے کامل اخلاص کے ساتھ خلق خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ پھر آخری نقرے میں آپ کو تلقین کی گئی کہ اس فریضہ کی انجام دہی میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان پر آپ اپنے رب کی خاطر صبر کریں۔

اس فرمانِ الہی کی تعمیل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآن مجید کی پے در پے نازل ہونے والی سورتوں کو آپ نے سنانا شروع کیا تو مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفینوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ چند مہینے اس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور موثر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ اس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان

کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا، نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم تے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی ڈور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے، انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی ہلکی ہلکی باتیں اور الٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دور سے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا، وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے، تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادو گردوں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمد پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی صلاحیت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی نرمدار ہیں۔ اس پر ابو جہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمد کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادو گر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادو گر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اُس سے ہوشیار رہنا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۲۸۸-۲۸۹)۔ اس فقرے کا یہ حصہ کہ ابو جہل کے اصرار پر ولید نے یہ بات کسی تھی بکرمہ کی روایت سے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصے میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُس کے مضامین

کی ترتیب یہ ہے:

آیت ۸ سے ۱۰ تک منکرین حق کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا بڑا انجام وہ قیامت کے روز دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مغیرہ کا نام لیے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور ان کا جواب اس نے کیسی حق دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دل میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان لانے سے باز رہا، بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخر کار یہ بات بنا کر لایا کہ خلق خدا کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اسے جادو قرار دینا چاہیے۔ اس کی اس صریح بد باطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اس کزوت کے بعد بھی یہ شخص چاہتا ہے کہ اسے مزید انعامات سے نوازا جائے۔ حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ دوزخ کا سزاوار ہو چکا ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۴۸ تک دوزخ کی ہوننا کیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس اخلاق اور کردار کے لوگ اس کے مستحق ہیں۔

بھر آیات ۴۹-۵۲ میں کفار کے مرض کی اصل جڑ بتادی گئی ہے کہ وہ چونکہ آخرت سے بے خوف ہیں اور اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ قرآن سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگے جا رہے ہوں، اور ایمان لانے کے لیے طرح طرح کی غیر معقول شرطیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ خواہ ان کی کوئی شرط بھی پوری کر دی جائے، انکارِ آخرت کے ساتھ وہ ایمان کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

آخر میں صاف صاف فرمادیا گیا ہے کہ خدا کو کسی کے ایمان کی کوئی ضرورت نہیں پڑ گئی ہے کہ وہ اس کی شرطیں پوری کرتا پھرے۔ قرآن ایک عام نصیحت ہے جو سب کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو قبول کر لے۔ خدا اس کا مستحق ہے کہ لوگ اس کی نافرمانی سے ڈریں، اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خدا ترسی کا رویہ اختیار کر لے اسے وہ معاف کر دیتا ہے خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو۔

آيَاتُهَا ۵۱

سُورَةُ الْمُدَّثِرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِرُ ۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۲ وَرَبِّكَ فَكْبِّرْ ۳ وَتَبٰیكَ فَطَهِّرْ ۴

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۵ وَلَا تَمَنَّ تُسْتَكْبِرُ ۶ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۷

اے اورٹھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

۵ اور پرویا چے میں ہم ان آیات کے نزول کا جو پس منظر بیان کر آئے ہیں اس پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے یٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِرُ کہہ کر کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ چونکہ حضور بیکایک جبریل علیہ السلام کو آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھبر پینچ کر آپ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِرُ کہہ کر خطاب فرمایا۔ اس لطیف طرز خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اُسے میرے پیارے بندے، تم اورٹھ لپیٹ کر لیٹ کھاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کے لیے تمہیں پورے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

۵۲ یہ اُسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّآئِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۱۰ اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔ (نوح-۱)۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اورٹھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور تمہارے گرد و پیش خدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کو بچو نکادو۔ انہیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہوں گے اگر اسی حالت میں مبتلا رہے۔ انہیں خبردار کرو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی باز پُرس نہ ہو۔

۵۳ یہ ایک نبی کا اولین کام ہے جسے اس دنیا میں اُسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے

کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کر دے اور ہانکے پکارے دیتا بھروسے یہ اعلان کر دے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرنا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس امت کے نبی نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جیسا کہ ان آیات کی شان نزول سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اٹھنے کا آپ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ مشرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکہ معظمہ مشرکین عرب کا سب سے بڑا تبرقہ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ اُس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تن تنہا اٹھنا اور مشرک کے مقابلے میں توحید کا علم بلند کر دینا بڑے جان بوجھوں کا کام تھا۔ اسی لیے ”اٹھو اور خبردار کرو“ کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ ”اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو“ اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھنا ہے کہ جو بڑی بڑی ہوناک طاقتیں اس کام میں تمہیں مزاحم نظر آتی ہیں ان کی ذرا پروا نہ کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جاسکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

۴۔ یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔

ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور نا پاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا، اور حضور کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضور نے نوع انسانی کو طہارت جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانہ جاہلیت کے اہل عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو ”طہارت“ کا ہم معنی ہو۔

بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچھلا ہوا نسا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُچلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی جس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اُس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریاء اور نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اقدار ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ دروں کے لباس، تکبر اور بر خود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بد تواریہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پنپنے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامن کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباس، ابراہیم شُعبی، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاقی پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاہر الثیاب و فلان طاہر الذیل، ”فلان شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے۔“ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فلانٌ دَنَس الثیاب، ”اس شخص کے کپڑے گندے ہیں“ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بد معاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

۱۵۵ گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرت نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

۱۵۶ اصل الفاظ ہیں **وَلَا تَمُنُّنَ تَسْتَكْبِرُوْا**۔ ان کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں ان کا ترجمہ کر کے پورا مطلب ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بیے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حسن سلوک محض اللہ کے لیے ہو اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلق خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی نامہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر، اور اس کام میں جان لٹا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

۱۵۷ یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جو کھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمہارے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہوگی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا۔

یہ یقین وہ اولین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس وقت دی تھیں جب اُس نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ اٹھ کر نبوت کے کام کا آغاز فرمادیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معافی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اس سے بہتر کوئی ہدایت نہیں دی جاسکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ اس کام کے لیے آپ کی زندگی اور آپ کے اخلاق اور معاملات کیسے ہونے چاہئیں، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام آپ کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرز فکر کے ساتھ انجام دیں، اور اس بات سے بھی خبردار

فَإِذَا نُفِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝ عَلَى الْكَافِرِينَ
غَيْرُ يَسِيرٍ ۝ ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۝

اچھا، جب صور میں پھونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی سخت دن ہوگا، کافروں کے لیے ہلکانہ ہوگا۔ چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا، بہت سا مال اُس کو دیا،

کر دیا گیا کہ اس کام میں آپ کو کون حالات سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کا مقابلہ آپ کو کس طرح کرنا ہوگا۔ آج جو لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ صرع کے دوروں میں یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا وہ ذرا آنکھیں کھول کر ان فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صرع کے کسی دورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے؟

۵۵ جیسا کہ ہم دیا چھے میں بیان کر آئے ہیں، اس سورہ کا یہ حصہ ابتدائی آیات کے چند مہینے بعد اُس وقت نازل ہوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے علانیہ تبلیغ اسلام شروع ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ حج کا زمانہ آیا اور سردارانِ قریش نے ایک کانفرنس کر کے بیٹے کیا کہ باہر سے آنے والے حاجیوں کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے پروپیگنڈا کی ایک زبردست ہم چلائی جائے۔ ان آیات میں کفار کی اسی کارروائی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس تبصرے کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ اچھا، یہ حرکتیں جو تم کرتا چاہتے ہو کرو، دنیا میں ان سے کوئی مقصد براری تم نے کر بھی لی تو اُس روز اپنے بڑے انجام سے کیسے بچ نکلو گے جب صور میں پھونک ماری جائے گی اور قیامت برپا ہوگی۔ (صور کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، الانعام، حاشیہ ۴۷۔ جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷۔ جلد سوم، طہ، حاشیہ ۷۸۔ الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یس، حواشی ۲۶۔ ۲۷۔ الزمر، حاشیہ ۷۹۔ جلد پنجم، ق، حاشیہ ۵۲۔)

۵۶ اس ارشاد سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دن ایمان لانے والوں کے لیے ہلکا ہوگا اور اس کی سختی صرف حق کا انکار کرنے والوں کے لیے مخصوص ہوگی۔ مزید برآں یہ ارشاد اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ اُس دن کی سختی کافروں کے لیے مستقل سختی ہوگی، وہ ایسی سختی نہ ہوگی جس کے بعد کبھی اُس کے نرمی سے بدل جانے کی امید کی جاسکتی ہو۔

۵۷ یہ خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے نبی، کفار کی اس کانفرنس میں جس شخص (دبید بن مغیرہ) نے تمہیں بدنام کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا ہے کہ تمام عرب سے آنے والے حاجیوں

وَبَيْنَ شُهُودًا ۱۳ وَهَدَّتْ لَهُ تَهْيِدًا ۱۴ ثُمَّ يَطْعَمُ أَنْ أَرِيدَ ۱۵
 كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۱۶ سَأَرْهِقُهُ صَعُودًا ۱۷ إِنَّهُ فَكَرَ
 وَقَدَّرَ ۱۸ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۱۹ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۲۰ ثُمَّ نَظَرَ ۲۱
 ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَ ۲۲ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۲۳ فَقَالَ إِنَّ هَذَا لِلْأَسْحَرِ

اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے ویسے اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیات سے غنا رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھاؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی پھر لوگوں کی طرف) دیکھا پھر پیشانی سکیر پی اور منہ بنایا پھر پٹیا اور تکبیریں بڑھ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں مگر ایک جادو

میں تمہیں جادوگر مشہور کیا جائے، اس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اس سے نمٹنا اب میرا کام ہے، تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۱۔ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ جب میں نے اسے پیدا کیا تھا اس وقت یہ کوئی مال اور اولاد اور وجاہت اور ریاست لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس کا پیدا کرنے والا اکیلا میں ہی تھا، وہ دوسرے مجھ سے، جن کی خدائی قائم رکھنے کے لیے یہ تمہاری دعوت توحید کی مخالفت میں اس قدر سرگرم ہے، اس کو پیدا کرنے میں میرے ساتھ شریک نہ تھے۔

۱۲۔ ولید بن مغیرہ کے دس بارہ لڑکے تھے جن میں سے حضرت خالد بن ولید تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان بیٹوں کے لیے شہود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو کہیں اپنی روزی کے لیے دوڑ دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی، ان کے گھر کھانے کو اتنا موجود ہے کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے سب بیٹے نامور اور بااثر ہیں، مجلسوں اور محفلوں میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ اس مرتبے کے لوگ ہیں کہ معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

۱۳۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس پر بھی اس کی حرص ختم نہیں ہوئی۔ اتنا کچھ پانے کے بعد بھی وہ

يَعْتَرُ ۲۳) اِنْ هَذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۲۵) سَاَصْلِيهِ سَقَرًا ۲۶) وَمَا
اَدْرَاكَ مَا سَقَرٌ ۲۷) لَا تُبْقَى وَلَا تَذَرُ ۲۸) لَوْ اَحَاةٌ لِّلْبَشَرِ ۲۹)

جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ کھال جھلس دینے والی۔

بس اسی فکر میں لگا ہوا ہے کہ اُسے دنیا بھر کی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔ دوسرا مطلب حضرت حسن بصری اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر نہ افعیٰ محمد کا یہ بیان سچا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی جنت بھی ہوگی تو وہ جنت میرے ہی لیے بنائی گئی ہے۔

آیہ ۲۷ یہ اُس واقعہ کا ذکر ہے جو کفار مکہ کی مذکورہ بالا کانفرنس میں پیش آیا تھا۔ اس کی جو تفصیلات ہم دیباچے میں نقل کر چکے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخص دل میں قرآن کے کلام الہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا۔ لیکن اپنی قوم میں محض اپنی وجاہت و ریاست برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے پر تیار نہ تھا۔ جب کفار کی اس کانفرنس میں پہلے اس نے خود ان تمام الزامات کو رد کر دیا جو قریش کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہے تھے تو اسے مجبور کیا گیا کہ وہ خود کوئی ایسا الزام تراشے جسے عرب کے لوگوں میں پھیلا کر حضور کو بدنام کیا جا سکا ہو۔ اس موقع پر جس طرح وہ اپنے ضمیر سے لڑا ہے اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر مبتلا رہ کر آخر کار اس نے ایک الزام گھڑا ہے اس کی پوری تصویر یہاں کھینچ دی گئی ہے۔

آیہ ۲۸ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص بھی اس میں ڈالا جائے گا اسے وہ جلا کر خاک کر دے گی مگر مگر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا بلکہ وہ پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر جلا یا جائے گا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ "وہ نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا" (الاعلیٰ-۱۳)۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عذاب کے مستحقین میں سے کسی کو باقی نہ رہنے دیگی جو اُس کی گرفت میں آئے بغیر رہ جائے، اور جو بھی اس کی گرفت میں آئے گا اسے عذاب دیے بغیر نہ چھوڑے گی۔

آیہ ۲۹ یہ کہنے کے بعد کہ وہ جسم میں سے کچھ جلائے بغیر نہ چھوڑے گی، کھال جھلس دینے کا الگ ذکر کرنا بظاہر کچھ غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن عذاب کی اس شکل کو خاص طور پر الگ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی چیز دراصل اس کے چہرے اور جسم کی کھال ہی ہوتی ہے جس کی بدنامی اُسے سب سے زیادہ کھلتی ہے۔ اندرونی اعضاء میں خواہ اسے کتنی ہی تکلیف ہو، وہ اس پر اتنا زیادہ رنجیدہ نہیں ہوتا جتنا اس بات پر رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ بدنام ہو جائے، یا اس کے جسم کے کھلے حصوں کی جلد پر ایسے داغ پڑ جائیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص اُس سے گھن کھانے لگے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ حسین چہرے اور بڑے بڑے شاندار جسم لیے

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا
عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّادَ

انیس کارکن اُس پر مقرر ہیں۔ ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں اور ان کی تعداد
کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے، تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا

ہوٹے جو لوگ آج دنیا میں اپنی شخصیت پر پھولے پھیر رہے ہیں، یہ اگر اللہ کی آیات کے ساتھ عناد کی وہ روش
برہنیں گے جو ولید بن مغیرہ برت رہا ہے تو ان کے منہ مجلس دیے جائیں گے اور ان کی کھال جلا کر کوئلے کی طرح
سیاہ کر دی جائے گی۔

۱۷۷ بیان سے لے کر ”تیرے رب کے شکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا“ تک کی پوری عبارت

ایک جملہ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں سلسلہ کلام کو توڑ کر ان معترضین کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے
جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سن کر کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد صرف ۱۹ ہوگی، اس کا
مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ اُن کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک طرف تو ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ آدم علیہ
السلام کے وقت سے لے کر قیامت تک دنیا میں جتنے انسانوں نے بھی کفر اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہے
وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اور دوسری طرف ہمیں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اتنی بڑی دوزخ میں اتنے
بے شمار انسانوں کو عذاب دینے کے لیے صرف ۱۹ کارکن مقرر ہوں گے۔ اس پر قریش کے سرداروں نے
بڑے زور کا ٹھٹھا مارا۔ ابو جہل بولا، ”بھاشو، کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے دس آدمی مل کر بھی دوزخ
کے ایک ایک سپاہی سے منٹ نہ لیں گے؟“ بنی جمح کے ایک پہلوان صاحب کہنے لگے، ”اے تو میں اکیلا
منٹ لوں گا، باقی دو کو تم سب مل کر سنبھال لینا“ انہی باتوں کے جواب میں یہ فقرے بطور جملہ معترضہ
ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۷۸ یعنی اُن کی قوتوں کو انسانی قوتوں پر قیاس کرنا تمہاری حماقت ہے۔ وہ آدمی نہیں، فرشتے ہونگے

اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی زبردست طاقتوں کے فرشتے پیدا کیے ہیں۔

۱۷۹ یعنی بظاہر تو اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کی جاتی۔ لیکن ہم نے

ان کی یہ تعداد اس لیے بیان کر دی ہے کہ یہ ہر اُس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کفر چھپائے بیٹھا
ہو۔ ایسا آدمی چاہے ایمان کی کتنی ہی نمائش کر رہا ہو، اگر وہ خدا کی خدائی اور اس کی عظیم قدرتوں کے بارے میں،
یا وحی و رسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں لیے بیٹھا ہو تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی

الَّذِينَ آمَنُوا إِيْمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلَيَقُولَ
الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا كَذَلِكَ

ایمان بڑھے، اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں اور دل کے بیمار اور
کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح
اتنی بڑی جیل میں بے حدود حساب مجرم جنوں اور انسانوں کو صرف ۱۹ سپاہی قابو میں بھی رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک
ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے، تو اس کا کفر فوراً کھل کر باہر آ جائے گا۔

۱۲ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں چونکہ ان کی اپنی
کتابوں میں بھی دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے، اس لیے یہ بات سن کر ان کو یقین آ جائے گا کہ یہ بات
فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے نزدیک دو وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اول یہ کہ یہود و
نصاریٰ کی جو مذہبی کتابیں دنیا میں پائی جاتی ہیں ان میں تلاش کے باوجود ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملی کہ دوزخ کے
فرشتوں کی تعداد ۱۹ ہے۔ دوسرے، قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہل کتاب کے ہاں ان کی مذہبی کتابوں
میں بھی بیان کی گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں ان کی کتابوں
سے نقل کر لی ہیں۔ ان وجوہ سے ہمارے نزدیک اس ارشاد کا صحیح مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح
معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے ۱۹ فرشتوں کا ذکر سن کر میرا خوب مذاق اڑایا جائے گا، لیکن اس کے باوجود
جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی اسے انہوں نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر
علی الا علان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی کے مذاق و استہزاء کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔ جملائے عرب تو
انبیاء کی شان سے ناواقف تھے، مگر اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاء کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو
کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کاتوں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے خواہ وہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔ اس
بنا پر اہل کتاب سے یہ بات زیادہ متوقع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دیکھ کر انہیں یقین
آ جائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک
نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرز عمل بارہا
ظاہر ہوا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال معراج کا واقعہ ہے جسے آپ نے کفار کے مجمع عام میں
بلا تکلف بیان کر دیا اور اس بات کی ذرہ برابر پروا نہ کی کہ اس حیرت انگیز فقے کو سن کر آپ کے مخالفین کیسی کبھی
باتیں بنائیں گے۔

۱۳ یہ بات اس سے پہلے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکی ہے کہ ہر آزمائش کے موقع پر جب

ایک مومن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور شک و انکار یا اطاعت سے فرار یا دین سے بے وفائی کی راہ چھوڑ کر یقین و اعتماد اور اطاعت و فرمانبرداری اور دین سے وفاداری کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، آل عمران، آیت ۷۳-۱- جلد دوم، الانفال، آیت ۲، حاشیہ ۲- التوبہ، آیات ۱۲۴-۱۲۵- حاشیہ ۱۲۵- جلد چہارم، الاحزاب، آیت ۲۲، حاشیہ ۳۸- جلد پنجم، الفتح، آیت ۲، حاشیہ ۷-)

۷۲ قرآن مجید میں چونکہ بالعموم ”دل کی بیماری“ سے مراد منافقت لی جاتی ہے، اس لیے یہاں اس لفظ کو دیکھ کر بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ منافقت کا ظہور مدینہ ہی میں ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال کئی وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ مکہ میں منافق موجود نہ تھے، اور اس کی غلطی ہم تفسیر القرآن، جلد سوم میں صفحہ ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، اور ۶۸۰ تا ۶۸۲ پر واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے یہ طرز تفسیر ہمارے نزدیک درست نہیں ہے کہ ایک سلسلہ کلام جو ایک خاص موقع پر خاص حالات میں ارشاد ہوا ہو، اس کے اندر یکا یک کسی ایک فقرے کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے موقع پر نازل ہوا تھا اور یہاں لا کر کسی مناسبت کے بغیر شامل کر دیا گیا۔ سورہ مدثر کے اس حصے کا تاریخی پس منظر ہمیں معتبر روایات سے معلوم ہے۔ یہ ابتدائی مکی دور کے ایک خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اس کا پورا سلسلہ کلام اس واقعہ کے ساتھ صریح مناسبت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں آخر کو نسا موقع تھا کہ اس ایک فقرے کو، اگر وہ کئی سال بعد مدینہ میں نازل ہوا تھا، اس جگہ لاکر چسپاں کر دیا جاتا؛ اب رہا یہ سوال کہ یہاں دل کی بیماری سے مراد کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد شک کی بیماری ہے۔ مکہ ہی میں نہیں، دنیا بھر میں پہلے بھی اور آج بھی کم لوگ ایسے تھے اور ہیں جو قطعیت کے ساتھ خدا، آخرت، وحی، رسالت، جنت، دوزخ وغیرہ کا انکار کرتے ہوں۔ اکثریت ہر زمانے میں انہی لوگوں کی رہی ہے جو اس شک میں مبتلا رہے ہیں کہ معلوم نہیں خدا ہے یا نہیں، آخرت ہوگی یا نہیں، فرشتوں اور جنت اور دوزخ کا واقعی کوئی وجود ہے یا یہ محض افسانے ہیں، اور رسول واقعی رسول تھے اور ان پر وحی آتی تھی یا نہیں۔ یہی شک اکثر لوگوں کو کفر کے مقام پر پہنچنے لے گیا ہے، ورنہ ایسے بے وقوف دنیا میں کبھی زیادہ نہیں رہے جنہوں نے بالکل قطعی طور پر ان حقائق کا انکار کر دیا ہو، کیونکہ جس آدمی میں ذرہ برابر بھی عقل کا مادہ موجود ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ان امور کے صحیح ہونے کا امکان بالکل رد کر دینے اور انہیں قطعاً خارج از امکان قرار دے دینے کے لیے ہرگز کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

۷۳ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اسے اللہ کا کلام تو مان رہے تھے مگر تعجب اس بات پر ظاہر کر رہے تھے کہ اللہ نے یہ بات کیوں فرمائی۔ بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جس کلام میں ایسی بعید از عقل و فہم بات کہی گئی ہے وہ بھلا اللہ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔

يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا
هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ ۚ كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ وَاللَّيْلِ إِذَا دُبِرَ ۚ

اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکر و
کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا
ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو۔ ہرگز نہیں، قسم ہے چاند کی، اور رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے،

۱۵۲۴ یعنی اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور اپنے احکام و فرامین میں وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ارشاد فرمادیتا
ہے جو لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ایک ہی بات ہوتی ہے جسے ایک راستی پسند
سلیم الطبع اور صحیح الفکر آدمی سنتا ہے اور سیدھے طریقے سے اُس کا سیدھا مطلب سمجھ کر سیدھی راہ اختیار کر
لیتا ہے۔ اسی بات کو ایک ہٹ دھرم، کج فہم اور راستی سے گریز کرنے والا آدمی سنتا ہے اور اُس کا ٹیڑھا مطلب
نکال کر اسے حق سے دُور بھاگ جانے کے لیے ایک نیا بانا بنا لیتا ہے۔ پہلا آدمی چونکہ خود حق پسند ہوتا ہے
اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت بخش دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت چاہنے والے کو
زبردستی گمراہ کرے۔ اور دوسرا آدمی چونکہ خود ہدایت نہیں چاہتا بلکہ گمراہی کو ہی اپنے لیے پسند کرتا ہے اس لیے اللہ
اسے ضلالت ہی کے راستوں پر دھکیل دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو حق سے نفرت رکھتا ہو وہ
اسے جبراً کھینچ کر حق کی راہ پر لائے۔ اللہ کے ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کے مسئلے پر تفہیم القرآن میں بکثرت
مقامات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: جلد اول،
البقرہ، حواشی ۱۰، ۱۶، ۱۹، ۲۰۔ النساء، حاشیہ ۱۴۳۔ الانعام، حواشی ۱، ۲۸، ۹۰۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ
۱۳۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵۴۔ القصص، حاشیہ ۷۱۔

۱۵۲۵ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کائنات میں کیسی کیسی اور کتنی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کو کیا
کیا طاقتیں اس نے بخشی ہیں، اور ان سے کیا کیا کام وہ لے رہا ہے، ان باتوں کو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا
ایک چھوٹے سے گڑے زمین پر رہنے والا انسان اپنی محدود نظر سے اپنے گرد و پیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر
اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے حواس یا اپنے آلات کی مدد
سے محسوس ہوتا ہے، تو یہ اس کی اپنی ہی نادانی ہے۔ ورنہ یہ خدائی کا کارخانہ اتنا وسیع و عظیم ہے کہ اس کی کسی
ایک چیز کا بھی پورا علم حاصل کر لینا انسان کے بس میں نہیں ہے، کجا کہ اس کی ساری وسعتوں کا تصور اس کے چھوٹے
سے دماغ میں سما سکے۔

وَالصُّبْحِ إِذَا اسْفَرَ ۗ إِنَّهَا إِحْدَى الْكُبْرَى ۗ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ ۗ
 لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۗ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ
 رَهِينَةٌ ۗ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۗ فِي جَنَّتِ ثَلَاثُ تَسَاءَلُونَ ۗ
 عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۗ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۗ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنْ

اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے، یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے، انسانوں کے لئے
 ڈراوا، تم میں سے ہر اس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔
 ہر منفس اپنے کسبے بدلے رہن ہے، دائیں بازو والوں کے سوا، جو صحتوں میں ہوں گے۔ وہاں
 وہ مجرموں سے پوچھیں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں

۵۲۶ یعنی لوگ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانے اور اس کے عذاب کا مزا چکھنے سے پہلے ہوش میں آجائیں
 اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔

۵۲۷ یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے جس کا اس طرح مذاق اڑایا جائے۔

۵۲۸ یعنی جس طرح چاند، اور رات اور دن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عظیم نشانات ہیں اسی طرح دوزخ
 بھی عظیم قدرت میں سے ایک چیز ہے۔ اگر چاند کا وجود غیر ممکن نہ تھا، اگر رات اور دن کا اس باقاعدگی کے ساتھ
 آنا غیر ممکن نہ تھا، تو دوزخ کا وجود، آخر کیوں تمہارے خیال میں غیر ممکن ہو گیا؟ ان چیزوں کو چونکہ تم رات دن
 دیکھ رہے ہو اس لیے تمہیں ان پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، ورنہ اپنی ذات میں یہ بھی اللہ کی قدرت کے نہایت حیرت انگیز
 معجزے ہیں، جو اگر تمہارے مشاہدے میں نہ آئے ہوتے، اور کوئی تمہیں خبر دیتا کہ چاند جیسی ایک چیز بھی دنیا
 میں موجود ہے، یا سورج ایک چیز ہے جس کے پھینپنے سے دنیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے، اور جس کے نکل آنے
 سے دنیا چمک اٹھتی ہے، تو تم جیسے لوگ اس بات کو سن کر بھی اسی طرح ٹھٹھے مارتے جس طرح دوزخ کا ذکر
 سن کر ٹھٹھے مارتے ہو۔

۵۲۹ مطلب یہ ہے کہ اس چیز سے لوگوں کو ڈرا دیا گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس سے ڈر کر بھلائی کے

راستے پر آگے بڑھے اور جس کا جی چاہے پیچھے ہٹ جائے۔

۵۳۰ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ طور، حاشیہ ۱۶۔

مع

الْمُصَلِّينَ ۝۳۲ وَ لَمْ نَكُ نَطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝۳۳ وَ كُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝۳۴
وَ كُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝۳۵ حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِينَ ۝۳۶ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے، اور روزِ جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں اُس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا، اُس وقت سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کسی کام

۱۱۱۱ بالفاظِ دیگر بائیں بازو والے تو اپنے کسب کے بدلے میں پکڑ لیے جائیں گے، لیکن دائیں بازو والے اپنا کتبہ رہن کرائیں گے۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۃ واقعہ، حواشی ۵-۶۔

۱۱۱۲ اس سے پہلے کئی مقامات پر قرآن مجید میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں میل دور ہونے کے باوجود جب چاہیں گے ایک دوسرے کو کسی آلے کی مدد کے بغیر دیکھ سکیں گے اور ایک دوسرے سے براہِ راست گفتگو کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم، الاعراف، آیات ۲۴ تا ۵۰، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، الصافات، آیات ۵۰ تا ۵۱، حاشیہ ۳۲۔

۱۱۱۳ مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنہوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو مان کر خدا کا وہ اولین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے، یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اُس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لاکر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔

۱۱۱۴ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھنا اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کو کھانا نہ کھلانا اسلام کی نگاہ میں کتنا بڑا گناہ ہے کہ آدمی کے دوزخی ہونے کے اسباب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۱۱۵ یعنی مرتے دم تک ہم اسی روش پر قائم رہے یہاں تک کہ وہ یقینی چیز ہمارے سامنے آگئی جس سے ہم غافل تھے۔ یقینی چیز سے مراد موت بھی ہے اور آخرت بھی۔

الشَّافِعِينَ ﴿۳۸﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿۳۹﴾ كَانَتْهُمْ حَمِي
مُسْتَنْفِرَةً ﴿۴۰﴾ فَزَتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۴۱﴾ بَلْ يَرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ
أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُنشَرَةً ﴿۴۲﴾ كَلَّا ط بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿۴۳﴾ كَلَّا

نہ آئے گی۔

آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے مُنہ موڑ رہے ہیں گو یا یہ جنگلی گدھے ہیں جو
شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔ بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کھلے
خط بھیجے جائیں۔ ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں،

۳۶ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے مرتے دم تک یہ روش اختیار کی ہے رکھی ہو ان کے حق میں اگر کوئی شفاعت
کرنے والا شفاعت کرے بھی تو اسے معافی نہیں مل سکتی۔ شفاعت کے مسئلے کو قرآن مجید میں بکثرت مقامات
پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی کہ شفاعت
کون کر سکتا ہے اور کون نہیں کر سکتا، کس حالت میں کی جا سکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جا سکتی، کس کے لیے کی
جا سکتی ہے اور کس کے لیے نہیں کی جا سکتی، اور کس کے حق میں وہ نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دنیا
میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط عقائد بھی ہیں، اس
لیے قرآن نے اس مسئلے کو اتنا کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ مثال کے
طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں: البقرہ، ۲۵۵۔ الانعام، ۹۴۔ الاعراف، ۵۳۔ یونس، ۳۔ ابراہیم، ۸۔ طہ،
۱۰۹۔ الانبیاء، ۲۸۔ سبا، ۲۳۔ الزمر، ۲۳۔ المؤمن، ۱۸۔ الدخان، ۸۶۔ النجم، ۲۶۔ النبیاء، ۳۷۔ ۳۸۔ تفسیر القرآن
میں جہاں جہاں یہ آیات آئی ہیں ہم نے ان کی اچھی طرح تشریح کر دی ہے۔

۳۷ یہ ایک عربی محاورہ ہے۔ جنگلی گدھوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ خطرہ جانتے ہی وہ اس قدر بدحواس ہو کر
بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا۔ اس لیے اہل عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہو کر بھاگنے والے کو
ان جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بویا شکار یوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے ہوں۔

۳۸ یعنی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکہ کے ایک
ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمد ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کر دو۔ اور یہ خط
ایسے ہوں جنہیں دیکھ کر انہیں یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید میں کفار

إِنَّهُ تَذَكُّرَةٌ ۝۵۳ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝۵۴ وَمَا يَذُكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝۵۵

یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کر لے۔ اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے، الایہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہ اس کا حق دار ہے کہ اُس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے۔

مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے“ (الانعام، ۱۲۴)۔ ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لاکر ہمیں دیں جسے ہم پڑھیں (بنی اسرائیل، ۹۳)۔

۵۳۹ یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے یہ مطالبے پورے نہیں کیے جاتے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔ یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنی سمجھتے ہیں، کیونکہ انہیں دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ لازماً دنیا میں اچھا ہی نکلتا ہو، اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور بُرا ہی نکلا کرتا ہو۔ اس لیے یہ اس مسئلے پر غور کرنا حاصل سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا۔ یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ قابل غور کر سکتا ہے تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اورابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں حق کا انجام لازماً اچھا اور باطل کا انجام لازماً بُرا ہوگا۔ ایسا شخص تو اُن معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے۔ لیکن آخرت کا منکر جو سرے سے تلاش حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے وہ ایمان نہ لانے کے لیے آٹے دن نئے نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے، وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانا ڈھونڈ نکالے گا۔ یہی بات ہے جو سورہ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ ”اے نبی، اگر ہم تمہارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے“ (الانعام، ۷)۔

۵۴۰ یعنی ان کا ایسا کوئی مطالبہ بر گز پورا نہ کیا جائے گا۔

۵۶۱ یعنی کسی شخص کا نصیحت حاصل کرنا سراسر اُس کی اپنی مشیت ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اُسے نصیحت اُسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ اللہ کی مشیت بھی یہ ہو کہ وہ اُسے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بندے کا کوئی فعل بھی تنہا بندے کی اپنی مشیت سے ظور میں نہیں آتا، بلکہ ہر فعل اُسی وقت پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے جب خدا کی مشیت بندے کی مشیت سے مل جائے۔ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے جسے نہ سمجھنے سے انسانی فکر بکثرت ٹھوکر میں کھاتی ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر اس دنیا میں ہر انسان کو یہ قدرت حاصل ہوتی کہ جو کچھ وہ کرنا چاہے کر گزرے تو ساری دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ جو نظم اس جہان میں قائم ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ اللہ کی مشیت ساری مشیتوں پر غالب ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرنا چاہے وہ اُسی وقت کر سکتا ہے جبکہ اللہ بھی یہ چاہے کہ انسان کو وہ کام کرنے دیا جائے۔ یہ معاملہ ہدایت اور ضلالت کا بھی ہے۔ انسان کا محض خود ہدایت چاہنا اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے ہدایت مل جائے، بلکہ اُسے ہدایت اُس وقت ملتی ہے جب اللہ اُس کی اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ فرمادیتا ہے۔ اسی طرح ضلالت کی خواہش بھی محض بندے کی طرف سے ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ جب اللہ اس کے اندر گمراہی کی طلب پا کر یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ اسے غلط راستوں میں بھٹکنے دیا جائے تب وہ اُن راہوں میں بھٹک نکلتا ہے جن پر اللہ اسے جانے کا موقع دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چور بنا چاہے تو محض اس کی یہ خواہش اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ جہاں جس کے گھر میں گھس کر وہ جو کچھ چاہے چرائے جائے، بلکہ اللہ اپنی عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کے مطابق اس کی اس خواہش کو جب اور جس قدر اور جس شکل میں پورا کرنے کا موقع دیتا ہے اسی حد تک وہ اسے پورا کر سکتا ہے۔

۵۶۲ یعنی تمہیں اللہ کی ناراضی سے بچنے کی جو نصیحت کی جا رہی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ کو اس کی ضرورت ہے اور اگر تم ایسا نہ کرو تو اُس سے اللہ کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ یہ نصیحت اس بنا پر کی جا رہی ہے کہ اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کے بندے اس کی رضا چاہیں اور اس کی مرضی کے خلاف نہ چلیں۔

۵۶۳ یعنی یہ اللہ ہی کو زیب دیتا ہے کہ کسی نے خواہ اس کی کتنی ہی نافرمانیاں کی ہوں، جس وقت بھی وہ اپنی اس روش سے باز آ جائے اللہ اپنا دامن رحمت اس کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔ اپنے بندوں کے لیے کوئی جذبہ انتقام وہ اپنے اندر نہیں رکھتا کہ ان کے قصوروں سے وہ کسی حال میں درگزر ہی نہ کرے اور انہیں سزا دیے بغیر نہ چھوڑے۔

صبر القوم

القيمة

(٤٥)

الْقِيَمَةُ

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الْقِيَمَةُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سورہ کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں قیامت ہی پر بحث کی گئی ہے۔

زمانہ نزول | اگرچہ کسی روایت سے اس کا زمانہ نزول معلوم نہیں ہوتا، لیکن اس کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ آیت ۵ کے بعد یکایک سلسلہ کلام توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ ”اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرادینا اور پڑھوادینا ہمارے ذمہ ہے، لہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے“ اس کے بعد آیت ۲۰ سے پھر وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے جو ابتدا سے آیت ۵ تک چلا آ رہا تھا۔ یہ جملہ معترضہ اپنے موقع و محل سے بھی اور روایات کی رو سے بھی اس بنا پر دوران کلام میں وارد ہوا ہے کہ جس وقت حضرت جبریلؑ یہ سورہ حضور کو سنارہے تھے اُس وقت آپ اس اندیشے سے کہ کہیں بعد میں بھول نہ جائیں، اس کے الفاظ اپنی زبان مبارک سے دہراتے جا رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ قرآن مجید میں اس کی دو مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ ایک سورہ طہ میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے وَلَا تَجِدُ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ، اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے“ (آیت ۱۱۴)۔ دوسرے سورہ اعلیٰ میں جہاں حضور کو اطمینان دلا گیا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى، ”ہم عنقریب تم کو پڑھوادینگے پھر تم بھولو گے نہیں“ (آیت ۶)۔ بعد میں جب حضور کو وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق ہو گئی تو اس طرح کی ہدایات دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی لیے قرآن میں ان تین مقامات کے سوا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

موضوع اور مضمون | یہاں سے آخر کلام اللہ تک جو سورتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر اپنے

مضمون اور انداز بیان سے اُس زمانہ کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں جب سورۃ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد نزول قرآن کا سلسلہ بارش کی طرح شروع ہوا اور پے در پے نازل ہونے والی سورتوں میں ایسے پُر زور اور مؤثر طریقہ سے نہایت جامع اور مختصر فقروں میں اسلام اور اس کے بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا اور اہل مکہ کو ان کی گمراہیوں پر متنبہ کیا گیا جس سے قریش کے سردار بُو کھلا گئے اور پہلا حج آنے سے پہلے حضور کو زک دینے کی تدبیریں سوچنے کے لیے انہوں نے وہ کانفرنس منعقد کی جس کا ذکر ہم سورۃ مدثر کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔

اس سورہ میں منکرینِ آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ قیامت اور آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کا ثبوت دیا گیا ہے، اور یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی آخرت کا انکار کرتے ہیں ان کے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اسے ناممکن سمجھتی ہے، بلکہ اس کا اصل محرک یہ ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس اسے ماننا نہیں چاہتیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کے آنے کا تم انکار کر رہے ہو وہ آکر رہے گا، تمہارا سب کیا دھرا تمہارے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا، اور حقیقت میں تو اپنا نامہ اعمال دیکھنے سے بھی پہلے تم میں سے ہر شخص کو خود معلوم ہو گا کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ سے ناواقف نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کو بہکانے اور اپنے ضمیر کو بہلانے کے لیے اپنی حرکات کے لیے کتنے ہی بہانے اور غدرا ت تراشتا رہے۔

رُكُوعًا ۲۱

سُورَةُ الْقِيَمَةِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا ۲۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۱ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۲

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔

۱۔ کلام کی ابتدا نہیں سے کرنا خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے سے کوئی بات چل رہی تھی جس کی تردید میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اور آگے کا مضمون آپ ہی ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ بات قیامت اور آخرت کی زندگی کے بارے میں تھی جس کا اہل مکہ انکار کر رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ مذاق بھی اڑا رہے تھے۔ اس طرز بیان کو اس مثال سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر آپ محض رسول کی صداقت کا اقرار کرنا چاہتے ہوں تو آپ کہیں گے "خدا کی قسم رسول برحق ہے" لیکن اگر کچھ لوگ رسول کی صداقت کا انکار کر رہے ہوں تو آپ جواب میں اپنی بات یوں شروع کریں گے کہ "نہیں، خدا کی قسم رسول برحق ہے" اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں نفس انسانی کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ نفس جو انسان کو برا بیٹوں پر اکساتا ہے۔ اس کا نام نفس اتارہ ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے یا غلط سوچنے یا بُری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام نفس لوامہ ہے اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس کا نام نفس مطمئنہ ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا ہے کیونکہ بعد کافقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کریگا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر بان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ اتر لی ہے نہ ابدی۔ اس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اس گمان سے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اس دنیا کے متعلق انسان

کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس ہنگامہ بہت دیر کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکی انسان کو جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روز قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ توامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی بُرائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اس بات کی مزید دلیل ہے کہ انسان نہ جانور نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس بُرائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دیا کر خوش بھی ہو لے، تو اس کے برعکس صورت میں جبکہ اُسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس زیادتی کا مز تکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اس طرح کے ایک نفسِ توامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ توامہ زندگی بعد موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم رہ جائے گا، اور اس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظام کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعد موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تنازع یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اس لامتناہی سلسلے میں

اَيْحَسِبُ الْاِنْسَانُ اَلَنْ نَجْمَعَهُ عِظَامَهُ ﴿۲﴾ بَلَىٰ قَدَرَسَيْنَ عَلٰى اَنْ

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی بجائے اس کے کہ اس کا حساب کبھی چیک سکے، اُنٹا اس کا حساب بڑھنا ہی پلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اسی صورت میں پورا ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی صرف ایک زندگی ہو، اور پھر پوری نوری نوع انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دے دی جائے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)۔

۳ اور یہی دو دلیلیں، جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں، صرف دو باتیں ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کا خاتمہ (یعنی قیامت کا پہلا مرحلہ) ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے، کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ اب یہ تیسری دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ زندگی بعد موت ممکن ہے۔ مکہ میں جو لوگ اس کا انکار کرتے تھے وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آفریہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرہ ذرہ خاک میں مل کر پر اگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، ان سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اٹھ کھڑا ہو جو وہس بیس ہزار برس پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پر زور جواب اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ ”کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟ یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اسی جسم کے ساتھ جی اٹھو گے، تو بلاشبہ تمہارا اس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالق کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اس وقت موجود ہو اس کے بے شمار اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا؟

نُسْوَىٰ بِنَانَةٍ ۝ بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝ يَسْأَلُ
 آيَانَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۝ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝

پورے پوز تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بد اعمالیاں کرتا رہے۔
 پوچھتا ہے آخر کب آتا ہے وہ قیامت کا دن؟ پھر جب دیدے پتھر جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائیگا

۵۴ یعنی بڑی بڑی بڈیوں کو جمع کر کے تمہارا ڈھا پنچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر
 بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتیٰ کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ
 پہلے تھیں۔

۵۵ اس چھوٹے سے فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی ہے۔
 ان لوگوں کو جو چیزِ آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو
 ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر کچھ اخلاقی پابندیاں
 عائد ہوتی ہیں، اور انہیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے تھے بیل کی طرح
 پھرتے رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بد کرداریاں وہ اب
 تک کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی ان کو اس کی کھلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے
 نہ روکنے پائے کہ ایک دن انہیں اپنے خلائق کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ان اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے
 دراصل اُن کی عقل انہیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفسِ اس میں
 مانع ہیں۔

۵۶ یہ سوال استفسار کے طور پر نہیں بلکہ انکار اور استہزاء کے طور پر تھا۔ یعنی وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتے
 تھے کہ قیامت کس روز آئے گی، بلکہ مذاق کے طور پر کہتے تھے کہ حضرت! جس دن کی آپ خبر دے رہے ہیں آخر وہ
 آتے آتے رہے کہاں گیا ہے؟

۵۷ اصل میں بَرِقَ الْبَصَرُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے لغوی معنی بجلی کی چمک سے آنکھوں
 کے چند جیبا جانے کے ہیں۔ لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اسی معنی کے لیے مخصوص نہیں ہیں بلکہ خوفِ زندگی ہجرت،
 یا کسی اچانک حادثہ سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ہلکے دک رہ جائے اور اس کی نگاہ اُس پریشان کن
 منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آ رہا ہو تو اس کے لیے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اسی مضمون کو قرآن مجید
 میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّمَا يُوَخَّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْاَبْصَارُ، "اللہ تو انہیں

وَجَمِيعَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ ۙ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْرُجُ ۙ كَلَّا لَا وَزَرَ ۙ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۙ يَنْبُؤُا إِلَىٰ نَسَاجِنَ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمُوا وَآخَرًا ۙ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۙ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۙ

اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے اُس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟ ہرگز نہیں، وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، اُس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پھچلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔

مال رہا ہے اُس دن کے لیے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی" (ابراہیم، ۴۲)

۵۸ یہ قیامت کے پہلے مرحلے میں نظام عالم کے درہم برہم ہو جانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہو جانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین بیکار اٹھی چل پڑے گی اور اُس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند کی سخت زمین کی گرفت سے چھوٹ کر نکل جائے گا اور سورج میں جا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔

۵۹ اصل الفاظ ہیں بِمَا قَدَّمُوا وَآخَرًا۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کیا کر اُس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اس کے بعد مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اُسے کرنا چاہیے تھا مگر اُس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اُس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اُس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا حساب تاریخ و آراء اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اُس نے کی وہ بھی اسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۚ (۱۷) إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ (۱۸)
فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ (۱۹) ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ (۲۰) كَلَّا بَلْ

اے نبی! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دینا تو پڑھو اور دینا ہمارے ذمہ ہے، لہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ ہرگز نہیں، اصل بات

اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

۱۷ یعنی آدمی کا نامہ اعمال اس کے سامنے رکھنے کی غرض درحقیقت یہ نہیں ہوگی کہ مجرم کو اس کا جرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے برسر عدالت جرم کا ثبوت پیش کیے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ چیلے اپنی چوری چھپانے کے لیے اختیار کر سکتا ہے، مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا دہریت یا شرک کا قائل ہے وہ درحقیقت اس کی ایماندارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ان عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور ان کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بددیانت، ایک بد کردار، ایک حرام خور، اپنی بد اعمالیوں کے لیے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آجائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریوں، کچھ مصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود اُس کو یہ علم تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن نا جائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہوگا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

۱۸ یہاں سے لے کر ”پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے“ تک کی پوری عبارت ایک

جملہ معترضہ ہے جو سلسلہ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے جیسا کہ ہم دیا چہ میں بیان کر آئے ہیں، نبوت کے ابتدائی دور میں، جبکہ حضور کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق

پوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ جبریل علیہ السلام جو کلام الہی آپ کو سنا رہے ہیں وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں، اس لیے آپ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ ایسی ہی صورت اُس وقت پیش آئی جب حضرت جبریل سورہ قیامہ کی یہ آیات آپ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلہ کلام توڑ کر آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں، اسے یاد کر ادینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپ سے پڑھوادینا ہمارے ذمہ ہے، آپ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپ نہ بھولیں گے نہ کبھی اسے ادا کرنے میں غلطی کر سکیں گے یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلہ کلام ”ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے“ سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اس مقام پر ان فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلہ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔ لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد درس دیتے دیتے یکایک یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ توڑ کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنا اور اس کے بعد آگے پھر اپنی تقریر شروع کر دے یہ درس اگر جوں جوں کاتوں نقل کر کے شائع کر دیا جائے تو جو لوگ اس واقعہ سے واقف نہ ہوں گے وہ اس سلسلہ تقریر میں اس فقرے کو بے جوڑ محسوس کریں گے۔ لیکن جو شخص اُس اصل واقعہ سے واقف ہو گا جس کی بنا پر یہ فقرہ درمیان میں آیا ہے وہ مطمئن ہو جائے گا کہ درس فی الحقیقت جوں جوں کاتوں نقل کیا گیا ہے، اُسے نقل کرنے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

اور پھر ان آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملہ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضور پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ اس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں، جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دہرانے لگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ لَا تَعْرَضْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ یہی بات شعبی، ابن زبیر، صفاک، حسن بصری، قتادہ، مجاہد اور دوسرے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔

۱۱۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل علیہ السلام قرآن پڑھ کر سناتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں“

۱۲۔ اس سے گمان ہوتا ہے، اور بعض اکابر مفسرین نے بھی اس گمان کا اظہار کیا ہے، کہ غالباً ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم

بھی جبریل علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے، اس لیے حضور کو نہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت آپ خاموشی سے اس کو سنیں، اور نہ صرف یہ اطمینان دلایا گیا کہ اُس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظہ میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپ ٹھیک اسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا منشا اور مدعا بھی پوری طرح آپ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔ اولاً، اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اُس کے اشارات، اُس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضور کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہر حال الفاظ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحی شفہی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے (قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ”سنت کی آئینی حیثیت“ میں صفحات ۹۲-۹۵-۹۶ اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیے ہیں)۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی آخر اسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائض نبوت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریحی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورہ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ، ”اور اے نبی، یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے“ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰)۔ اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سننا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ والبقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱- آل عمران، ۱۶۲-۱- الحجہ، ۲- ان سب آیات کی تشریح ہم ”سنت کی آئینی حیثیت“ میں صفحہ ۷۷

سے، تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔ اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو ماتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرمادی ہے، کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحب ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی داں آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوة ہی کو لے لیجیے۔ قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوة ہے۔ لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہل ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیننے والے نے اپنی طرف سے ایک معلم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اُسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوة کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکم صلوة پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اسی مطلب کی تعلیم آپ ان سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسول کو بتائی اور رسول نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضور کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضور کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے اگلی

تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۲۰ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۲۱ وَجُودًا يَوْمَئِذٍ
تَاضِرَةً ۲۲ إِلَىٰ سَرِيحٍ نَّاطِرَةٍ ۲۳ وَجُودًا يَوْمَئِذٍ بِأَسْرَةٍ ۲۴

یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ
دیتے ہو۔ اُس روز کچھ پھرے تو تازہ ہونگے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔ اور کچھ پھر اُداس ہوں گے

نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعہ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کتاب ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے تُحِبُّونَ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھانے کی جو ذمہ داری ملی تھی
اسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمہ داری محض رسول کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے
کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسول کے ذریعہ سے اُمت کو کتاب الہی کا مطلب
سمجھایا جائے، اور حدیث و سنت کے ماخذ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے
کہ اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے، اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْ ذَلِكَ۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ
کتاب ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تولی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود
اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغاز اسلام میں پوری اُمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال
کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟
جعل ساز لوگ وہی سکتے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون
بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس اُمت نے اَدَل رُوَد
سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاک کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی
غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا
گیا اُتنا ہی اس اُمت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے
تمیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی
قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بد نصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین
کے ہکاٹے میں آکر حدیث و سنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے
وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

۱۴۲ یہاں سے سلسلہ کلام پھر اُسی مضمون کے ساتھ جڑ جاتا ہے جو بیچ کے جملہ معترضہ سے پہلے چلا آ رہا تھا۔

ہرگز نہیں کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے انکارِ آخرت کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ تم خالق کائنات کو قیامت برپا کرنے

اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دینے سے عاجز سمجھتے ہو، بلکہ اصل وجہ یہ ہے۔

۱۵ یہ انکارِ آخرت کی دوسری وجہ ہے۔ پہلی وجہ آیت نمبر ۶ میں بیان کی گئی تھی کہ انسان چونکہ فحور کی کھلی چھوٹ چاہتا ہے اور اُن اخلاقی پابندیوں سے بچنا چاہتا ہے جو آخرت کو ماننے سے لازماً اُس پر عائد ہوتی ہیں، اس لیے دراصل خواہشاتِ نفس اُسے انکارِ آخرت پر ابھارتی ہیں اور پھر وہ عقلی دلیلیں بگھارتا ہے تاکہ اپنے اس انکار کو معقول ثابت کرے۔ اب دوسری وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے کہ منکرینِ آخرت چونکہ تنگ نظر اور کوتاہ ہیں اس لیے اُن کی نگاہ میں ساری اہمیت اُنہی نتائج کی ہے جو راسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں اور اُن نتائج کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے جو آخرت میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو فائدہ یا لذت یا خوشی یہاں حاصل ہو جائے اُسی کی طلب میں ساری محنتیں اور کوششیں کھپا دینی چاہیں کیونکہ اسے پایا تو گویا سب کچھ پایا، خواہ آخرت میں اس کا انجام کتنا ہی بُرا ہو۔ اسی طرح اُن کا خیال یہ ہے کہ جو نقصان یا تکلیف یا رنج و غم یہاں پہنچ جائے وہی دراصل بچنے کے قابل چیز ہے، قطع نظر اس سے کہ اُس کو برداشت کر لینے کا کتنا ہی بڑا اجرِ آخرت میں مل سکتا ہو۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں۔ آخرت جیسی دُور کی چیز کے لیے وہ نہ آج کے کسی نفع کو چھوڑ سکتے ہیں نہ کسی نقصان کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اس اندازِ فکر کے ساتھ جب وہ آخرت کے مسئلے پر عقلی بحثیں کرتے ہیں تو دراصل وہ خالص عقلیت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے یہ اندازِ فکر کام کر رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا فیصلہ بہر حال یہی ہوتا ہے کہ آخرت کو نہیں ماننا ہے، خواہ اندر سے ان کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ آخرت کے امکان وقوع اور وجوب کی جو دلیلیں قرآن میں دی گئی ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور اس کے خلاف جو استدلال وہ کر رہے ہیں وہ نہایت بوجہ ہے۔

۱۶ یعنی خوشی سے دمک رہے ہونگے، کیونکہ جس آخرت پر وہ ایمان لائے تھے وہ ٹھیک اُن کے یقین کے مطابق سامنے موجود ہوگی، اور جس آخرت پر ایمان لاکر انہوں نے دنیا کے ناجائز فائدے چھوڑے اور برحق نقصان برداشت کیے تھے اس کو فی الواقع اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے دیکھ کر انہیں یہ اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنے رویہ زندگی کے متعلق بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا، اب وہ وقت آگیا ہے جب وہ اس کا بہترین انجام دیکھیں گے۔

۱۷ مفسرین میں سے بعض نے اسے مجازی معنی میں لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی کی طرف دیکھنے کے الفاظ محاورے کے طور پر اُس سے توقعات وابستہ کرنے، اس کے فیصلے کا انتظار کرنے، اس کے کرم کا امیدوار ہونے کے معنی میں بولے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ایک اندھا بھی یہ کہتا ہے کہ میری نگاہیں تو فلاں شخص کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ میرے لیے کیا کرتا ہے۔ لیکن بکثرت احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی جو تفسیر منقول ہے وہ یہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے مکرّم بندوں کو اپنے رب کا دیدار نصیب ہوگا۔ بخاری کی روایت ہے کہ **اِنَّكُمْ سَتَرُونَ رَبَّكُمْ عِيَانًا**۔ تم اپنے رب کو علانیہ دیکھو گے۔ مسلم اور ترمذی میں حضرت صہیب کی روایت ہے کہ حضور نے

فرمایا جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائے گا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں مزید کچھ دوں؟ وہ عرض کریں گے کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کر دیا اور جہنم سے بچا نہیں لیا؟ اس پر اللہ تعالیٰ پر وہ ہٹا دے گا اور ان لوگوں کو جو کچھ انعامات ملے تھے ان میں سے کوئی انعام بھی انہیں اس سے زیادہ محبوب نہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کی دید سے مشرف ہوں، اور یہی وہ مزید انعام ہے جس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ یعنی جن لوگوں نے نیک عمل کیا ان کے لیے اچھا اجر ہے اور اس پر مزید بھی۔ (لوہس - ۲۶) بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ، کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کو دیکھیں گے؟ حضور نے فرمایا کیا تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے میں کوئی دقت ہوتی ہے جبکہ بیچ میں بادل بھی نہ ہو؟ لوگوں نے عرض کیا، نہیں۔ آپ نے فرمایا اسی طرح تم اپنے رب کو دیکھو گے۔ اسی مضمون سے بلیغی مجلتی ایک اور روایت بخاری و مسلم میں حضرت جریر بن عبداللہ سے مروی ہے۔ مسند احمد، ترمذی، دارقطنی، ابن جریر، ابن المنذر، طبرانی، بیہقی، ابن ابی شیبہ اور بعض دوسرے محدثین نے حضور سے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ اہل جنت میں کم سے کم درجے کا جو آدمی ہوگا وہ اپنی سلطنت کی وسعت دو ہزار سال کی مسافت تک دیکھے گا، اور ان میں سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگ ہر روز درتہ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ پھر حضور نے یہی آیت پڑھی کہ ”اُس روز کچھ چہرے تازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے“ ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف دیکھیں گے، پھر جب تک اللہ ان سے پردہ نہ فرمائے گا اس وقت تک وہ جنت کی کسی نعمت کی طرف توجہ نہ کریں گے اور اسی کی طرف دیکھنے رہیں گے۔ یہ اور دوسری بہت سی روایات ہیں جن کی بنا پر اہل سنت قریب قریب یا اتفاق اس آیت کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ آخرت میں اہل جنت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ اور اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ كَلَّا اَنْصَرُّوْا عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّا يَخْبِرُوْنَ ”ہرگز نہیں، وہ (یعنی فجار) اُس روز اپنے رب کی دید سے محروم ہوں گے“ (المطففين ۱۵) اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ محرومی فجار کے لیے ہوگی نہ کہ ابراہم کے لیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان خدا کو دیکھ کیسے سکتا ہے؟ دیکھنے کے لیے تو لازم ہے کہ کوئی چیز کسی خاص جہت، مقام، شکل اور رنگ میں سامنے موجود ہو، روشنی کی شعاعیں اُس سے منعکس ہو کر انسان کی آنکھ پر پڑیں اور آنکھ سے دماغ کے مرکزہ بینائی تک اس کی تصویر منتقل ہو۔ کیا اللہ رب العالمین کی ذات کے متعلق اس طرح قابل دید ہونے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ انسان اس کو دیکھ سکے؟ لیکن یہ سوال دراصل ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں دو چیزوں کے درمیان فرق نہیں کیا گیا ہے۔ ایک چیز ہے دیکھنے کی حقیقت اور دوسری چیز ہے دیکھنے کا فعل صادر ہونے کی وہ خاص صورت جس سے ہم اس دنیا میں آشنا ہیں۔ دیکھنے کی حقیقت

تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيلَ مَنْ سَكَّتِ
رَاقٍ ۝ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالتَّقَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ

اور سمجھ رہے ہوں گے کہ اُن کے ساتھ کمر توڑ بڑتاؤ ہونے والا ہے۔ ہرگز نہیں، جب جان
حلق تک پہنچ جائے گی، اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا، اور آدمی سمجھ لے گا
کہ یہ دنیا سے جُدائی کا وقت ہے، اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی، وہ دن ہوگا تیرے رب

یہ ہے کہ دیکھنے والے میں بینائی کی صفت موجود ہو، وہ نابینا نہ ہو، اور دیکھی جانے والی چیز اُس پر عیاں ہو، اس
سے مخفی نہ ہو۔ لیکن دنیا میں ہم کو جس چیز کا تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے وہ صرف دیکھنے کی وہ خاص صورت ہے جس
سے کوئی انسان یا حیوان بالفعل کسی چیز کو دیکھا کرتا ہے، اور اس کے لیے لامحالہ یہ ضروری ہے کہ دیکھنے والے
کے جسم میں آنکھ نامی ایک عضو موجود ہو، اُس عضو میں بینائی کی طاقت پائی جاتی ہو، اُس کے سامنے ایک ایسی
محدود مجسم رنگ دار چیز حاضر ہو جس سے روشنی کی شعاعیں منعکس ہو کر آنکھ پر پڑیں، اور آنکھ میں اس کی شکل ہمارے
اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے کی حقیقت کا عملی ظہور صرف اسی خاص صورت میں ہو سکتا ہے جس سے ہم
اس دنیا میں واقف ہیں تو یہ خود اُس کے اپنے دماغ کی تنگی ہے، ورنہ درحقیقت خدا کی خدائی میں دیکھنے کی ایسی بی شمار
صورتیں ممکن ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس مسئلے میں جو شخص الجھتا ہے وہ خود بتائے کہ اُس کا خدا بینا ہے یا نابینا؟
اگر وہ بینا ہے اور اپنی ساری کائنات اور اس کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے تو کیا وہ اسی طرح آنکھ نامی ایک عضو
سے دیکھ رہا ہے جس سے دنیا میں انسان و حیوان دیکھ رہے ہیں، اور اُس سے بینائی کے فعل کا صدور اسی طریقے سے
ہو رہا ہے جس طرح ہم سے ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، اور جب اس کا جواب نفی میں ہے تو آخر
کسی صاحب عقل و فہم انسان کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ آنحضرت میں اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار
اُس مخصوص شکل میں نہیں ہوگا جس میں انسان دنیا میں کسی چیز کو دیکھتا ہے، بلکہ وہاں دیکھنے کی حقیقت کچھ اور ہوگی
جس کا ہم یہاں ادراک نہیں کر سکتے، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت کے معاملات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ہمارے لیے اُس سے
زیادہ مشکل ہے جتنا ایک دو برس کے بچے کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ از دو اجی زندگی کیا ہوتی ہے، حالانکہ جو ان ہو
کر اُسے خود اُس سے سابقہ پیش آتا ہے۔

۱۷۸ اس ”ہرگز نہیں“ کا تعلق اسی سلسلہ کلام سے ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے، یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ

تمہیں مر کر فنا ہو جانا ہے اور اپنے رب کے حضور واپس جانا نہیں ہے۔

۱۷۹ اصل میں لفظ سَاقِ استعمال ہوا ہے جو رقیبہ سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے جس کے معنی نعویز گنڈے

يَوْمَ يَذِي الْمَسَاقُ ۳۰ فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّ ۳۱ وَلَكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۳۲
ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ آهْلِهِ يَمْتَسِطٌ ۳۳ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۳۴ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۳۵

کی طرف روانگی کا

مگر اُس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا، پھر اکرنا ہوا اپنے گھروالوں کی طرف چل دیا۔ یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔ ہاں یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔

اور جھاڑ پھونک کے ہیں، اور رتی سے بھی، جس کے معنی چڑھنے کے ہیں۔ اگر پہلے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ آخر وقت میں جب مریض کے تیمار دار ہر دو اداروں سے مایوس ہو جائیں گے تو کہیں گے کہ ارے کسی جھاڑ پھونک کرنے والے ہی کو تلاش کر دو جو اس کی جان بچا لے۔ اور اگر دوسرے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ اُس وقت فرشتے کہیں گے کہ اس روح کو کسے لے کر جانا ہے؟ ملائکہ عذاب کو یا ملائکہ رحمت کو؟ بالفاظ دیگر اُسی وقت یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ مرنے والا کس حیثیت میں عالم آخرت کی طرف جا رہا ہے۔ نیک انسان ہو گا تو ملائکہ رحمت اسے لے جائیں گے، اور بد انسان ہو گا تو رحمت کے فرشتے اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے اور عذاب کے فرشتے اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔

۳۰ مفسرین میں سے بعض نے لفظ ساق (نیپڈلی) کو عام لغوی معنی میں لیا ہے اور اس کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ مرنے کے وقت جب ٹانگیں سوجھ کر ایک دوسری سے جڑ جائیں گی۔ اور بعض نے عربی محاورے کے مطابق اسے شدت اور سختی اور مصیبت کے معنی میں لیا ہے، یعنی اُس وقت دو مصیبتیں ایک ساتھ جمع ہو جائیں گی، ایک دنیا اور اس کی ہر چیز سے جدا ہو جانے کی مصیبت اور دوسری عالم آخرت میں ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہو کر جانے کی مصیبت، جس سے ہر کافر و منافق اور ہر فاسق و فاجر کو سابقہ پیش آنے گا۔

۳۱ مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا اس نے وہ سب کچھ سنا جو اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے انکار ہی پر اڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد اکرنا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ مجاہد، قتادہ اور ابن زید کہتے ہیں کہ یہ شخص ابو جہل تھا۔ آیت کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص تھا جس نے سورہ قیامہ کی مذکورہ بالا آیات سننے کے بعد یہ طرز عمل اختیار کیا۔

اس آیت کے یہ الفاظ کہ ”اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی“ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی صداقت تسلیم کرنے کا اولین اور لازمی تقاضا یہ ہے

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۝۳۶ ۝ أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِّنْ

کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا لطفہ نہ تھا

کہ آدمی نماز پڑھے۔ شریعت الہی کے دوسرے احکام کی تعمیل کی نوبت تو بعد ہی میں آتی ہے، لیکن ایمان کے اقرار کے بعد کچھ زیادہ مدت نہیں گزرتی کہ نماز کا وقت آ جاتا ہے اور اسی وقت یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی نے زبان سے جس چیز کے ماننے کا اقرار کیا ہے وہ واقعی اس کے دل کی آواز ہے یا محض ایک ہوا ہے جو اُس نے چند الفاظ کی شکل میں منہ سے نکال دی ہے۔

۵۲۲ مفسرین نے اُوْنِ لَكَ کے متعدد معنی بیان کیے ہیں۔ نَفَس ہے تجھ پر۔ ہلاکت ہے تیرے بیٹے۔ خرابی، باتباہی، یا کبھتی ہے تیرے لیے۔ لیکن ہمارے نزدیک موقع و محل کے لحاظ سے اس کا مناسب ترین مفہوم وہ ہے جو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ”جب تو اپنے خالق سے کفر کرنے کی جرأت کر چکا ہے تو پھر تجھ جیسے آدمی کو یہی چال زیب دیتی ہے جو تو چل رہا ہے۔ یہ اسی طرح کا طنز یہ کلام ہے جیسے قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں عذاب دیتے ہوئے مجرم انسان سے کہا جائے گا کہ ذُنِّ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْكِرِيْمُ“ لے چکھ اس کا نزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو“ (الدرخان - ۴۹)

۵۲۳ اب کلام کو ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کا اعادہ کیا جا رہا ہے جس سے کلام کا آغاز کیا گیا تھا، یعنی زندگی بعد موت ضروری بھی ہے اور ممکن بھی۔

۵۲۴ عربی زبان میں اِبْنُ سُدًى اُس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو، جدھر چاہے چرتا پھرے، کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اسی معنی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا: اَفَحَسِبْتُمْ اَنْمَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَاَنْتُمْ اَلَيْسَا لَاتُرْجَعُونَ۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے؟ (المؤمنون - ۱۱۵)۔ ان دونوں مقامات پر زندگی بعد موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہیں اپنے اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم با اختیار، اس کے افعال میں اخلاقی حسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازمًا پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح

مِنِّي يَمْنَى ۳۷ ثُمَّ كَانَ عِلْقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى ۳۸ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَالْأُنثَى ۳۹ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۴۰

جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے، پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا
درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو
پھر سے زندہ کر دے؟

جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہے اسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھانے جانے کی معقول
وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے صرف اپنی جبلت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے
کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام
ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جاسکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سنت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل در نسل چلتے
رہیں اور وہ ان پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے
کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے
کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعد موت سے کیسے معاف کیے جاسکتے ہو جبکہ عین اپنی موت کے وقت تک تم
ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مستوجب ہونے کا تمہاری عقل خود حکم
لگاتی ہے؟ جس آدمی سے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی اچانک کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمہارے نزدیک اس
کو نلوہر (Scot free) چھوٹ جانا چاہیے اور اس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی
ایسے فساد کا بیج بویا جس کا خمیازہ اس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتی رہیں، کیا تمہاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن
ہے کہ اسے بھی کسی ٹھنکے یا ٹٹوسے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دہی نہیں
کرتی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور
خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی ہو اور جیتے جی مصیبتیں ہی بھگتتا رہا ہو کیا تمہارے خیال میں وہ بھی حسرت الارض
ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

۵۲۵ یہ حیات بعد موت کے امکان کی دلیل ہے۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ابتدائی
نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ
ہے ان کے لیے تو فی الحقیقت اس دلیل کا کوئی جواب ہے ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی برتیں، ان کی
عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جو خدا اس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے وہ دوبارہ بھی اسی انسان

کو وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اگر ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے نہیں ہیں تو آخر ان کے پاس اس بات کی کیا توجیہ ہے کہ آغاز آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصے اور برقوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اس تناسب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اُس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے؟ کیا یہ بھی اتفاقاً ہی ہوئے چلا جا رہا ہے؟ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم اتنا بے شرم ہونا چاہیے کہ وہ اٹھ کر بے تکلف ایک روزیہ دعویٰ کر بیٹھے کہ لندن اور نیویارک، ماسکو اور پکنگ اتفاقاً آپ سے آپ بن گئے ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الروم، حواشی ۲ تا ۳۔ جلد چہارم، الشوری، حاشیہ ۷۷)۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کو پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ کے اس سوال کے جواب میں کبھی بلی (کیوں نہیں)، کبھی سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ فَبَلٰی (پاک ہے تیری ذات، خداوند، کیوں نہیں)، اور کبھی سُبْحَانَكَ فَبَلٰی یا سُبْحَانَكَ وَبَلٰی فرمایا کرتے تھے (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابوداؤد) ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جب تم سورہ تین میں آیت اَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ (کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟) پڑھو تو کہو بَلٰی وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ (کیوں نہیں، میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں)۔ اور جب سورہ قیامہ کی یہ آیت پڑھو تو کہو بَلٰی، اور جب سورہ مرسلات کی آیت فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (اس قرآن کے بعد یہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟) پڑھو تو کہو اَمَّا يَا لَللَّهِ (ہم اللہ پر ایمان لائے)۔ اسی مضمون کی روایات امام احمد، ترمذی، ابن المنذر، ابن مردودہ، بیہقی اور حاکم نے بھی نقل کی ہیں۔

تفسير القرآن

الدَّهْرُ

(64)

الدَّهْرُ

نام | اس سُوْرۃ کا نام "الدَّهْرُ" بھی ہے اور "الانسان" بھی۔ دونوں نام پہلی نبی آیت کے الفاظ هَلْ اَتَىٰ عَلَى الْاِنْسَانِ اور حِينَ مِنَ الدَّهْرِ سے ماخوذ ہیں۔

نمائندہ نزول | اکثر مفسرین اس کو کئی قرار دیتے ہیں۔ علامہ زفحشری، امام رازی، قاضی بیضاوی، علامہ نظام الدین میسا بوری، حافظ ابن کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اسے کئی ہی لکھا ہے، اور علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ یہی جمہور کا قول ہے۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین نے پوری سُوْرۃ کو مدنی کہا ہے، اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ سُوْرۃ ہے تو کئی، مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔ جہاں تک اس سُوْرۃ کے مضامین اور انداز بیان کا تعلق ہے، وہ مدنی سُوْرتوں کے مضامین اور انداز بیان سے بہت مختلف ہے، بلکہ اس پر غور کرنے سے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف کئی ہے بلکہ مکہ معظمہ کے بھی اُس دور میں نازل ہوئی ہے جو سُوْرۃ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد شروع ہوا تھا۔ یہیں آیات ۸ تا ۱۰ (وَيَطْعَمُونَ الطَّعَامَ سے لے کر يَوْمًا عَمِيوسًا قَمَطًا نِيرًا تک) تو وہ پوری سُوْرۃ کے سلسلہ بیان میں اس طرح پیوست ہیں کہ سیاق و سباق کے ساتھ کوئی اُن کو پڑھے تو ہرگز یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ ان سے پہلے اور بعد کا مضمون تو ۱۵-۱۶ سال پہلے نازل ہوا تھا اور اُس کے کئی سال بعد نازل ہونے والی یہ تین آیتیں یہاں لا کر ثبت کر دی گئیں۔

در اصل جس بنا پر اس سُوْرۃ کے، یا اس کی بعض آیات کے مدنی ہونے کا خیال پیدا ہوا ہے وہ ایک روایت ہے جو عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعض صحابہ نے حضرت علیؑ کو مشورہ دیا کہ آپ دونوں بچوں کی شفا کے لیے اللہ تعالیٰ سے کوئی نذر مانیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور ان کی خادمہ قنصہؑ نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے دونوں بچوں کو شفا عطا فرمادی تو یہ سب شکرانے کے طور پر تین دن کے روزے رکھیں گے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ دونوں تندرست ہو گئے اور تینوں صاحبوں نے نذر کے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ حضرت علیؑ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔

انہوں نے تین صاع جو قرض لیے (اور ایک روایت میں ہے کہ محنت مزدوری کر کے حاصل کیے)۔ پہلا روزہ کھول کر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک مسکین نے کھانا مانگا۔ گھر والوں نے سارا کھانا اسے دے دیا اور خود پانی پی کر سو رہے۔ دوسرے دن پھر افطار کے بعد کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک یتیم آگیا اور اس نے سوال کیا۔ اُس روز بھی سارا کھانا انہوں نے اُس کو دے دیا اور پانی پی کر سو رہے۔ تیسرے دن روزہ کھول کر ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ایک قیدی نے آکر یہی سوال کر دیا اور اُس روز کا بھی پورا کھانا اسے دے دیا گیا۔ چوتھے روز حضرت علیؑ دونوں بچوں کو لیے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور نے دیکھا کہ بھوک کی شدت سے تینوں باپ بیٹوں کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپ اُٹھ کر اُن کے ساتھ حضرت فاطمہؑ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی ایک کونے میں بھوک سے بڑھال پڑی ہیں۔ یہ حال دیکھ کر حضور پر رقت طاری ہو گئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اہل بیت کے معاملہ میں آپ کو مبارکباد دی ہے حضور نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ پوری سورۃ آپ کو پڑھ کر سنائی راہن جہرا ان کی روایت میں ہے کہ آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ لَشَرٌّ بُوْنَ سے لے کر آخر تک کی آیات سنائیں۔ مگر ابن مردؤیہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ۔۔۔۔۔ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس قصے کا اُس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ پورا قصہ علی بن احمد الواجدی نے اپنی تفسیر البسيط میں بیان کیا ہے اور غالباً اُسی سے زنجشیری، ہارزی اور نسیابوری وغیرہم نے اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت اول تو سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے۔ پھر روایت کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی اگر کھانا مانگتا ہے تو گھر کے پانچوں افراد کا پورا کھانا اس کو دے دینے کی کیا مقبول وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک آدمی کا کھانا اس کو دے کر گھر کے پانچ افراد چار آدمیوں کے کھانے پر اکتفا کر سکتے تھے پھر یہ بھی باور کرنا مشکل ہے کہ دو بچے جو ابھی ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور کمزوری کی حالت میں تھے، انہیں بھی تین دن بھوکا رکھنے کو حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ جیسی کامل فہم دین رکھنے والی ہستیوں نے نیکی کا کام سمجھا ہو گا۔ اس کے علاوہ قیدیوں کے معاملہ میں یہ طریقہ اسلامی حکومت کے دور میں کبھی نہیں رہا کہ انہیں بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ وہ اگر حکومت کی قید میں ہوتے تو حکومت ان کی خوراک اور لباس کا انتظام کرتی تھی، اور کسی شخص کے سپرد کیے جاتے تو وہ شخص انہیں کھلانے پلانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس لیے مدینہ طیبہ میں یہ بات ممکن نہ تھی کہ کوئی قیدی بھیک

مانگنے کے لیے نکلتا۔ تاہم ان تمام نقل اور عقلی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اگر اس قصے کو بالکل صحیح ہی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نیک عمل کا صدور ہوا تو جبریلؑ نے آکر حضور کو خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے آپ کے اہل بیت کا یہ فعل بہت مقبول ہوا ہے، کیونکہ انہوں نے ٹھیک وہی پسندیدہ کام کیا ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے سورہ دہر کی ان آیات میں فرمائی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ آیات نازل بھی اسی موقع پر ہوئی تھیں۔ شان نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو دراصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس واقعہ پر ٹھیک چسپاں ہوتی ہے۔ امام سیوطی نے الاتقان میں حافظ ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے، اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو“ آگے چل کر وہ امام بدر الدین زُرکَنَشی کا قول ان کی کتاب البرہان فی علوم القرآن سے نقل کرتے ہیں کہ ”صحابہ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اس معاملہ پر چسپاں ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اس واقعہ کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے نہ کہ بیان واقعہ کی“ (الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول، صفحہ ۳۱، طبع ۱۹۲۹ء)۔

موضوع اور مضمون | اس سورہ کا موضوع انسان کو دنیا میں اُس کی حقیقی حیثیت سے آگاہ کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اگر وہ اپنی اس حیثیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر شکر کا رویہ اختیار کرے تو اس کا انجام کیا ہوگا اور کفر کی راہ چلے تو کس انجام سے وہ دوچار ہوگا۔ قرآن کی بڑی سورتوں میں تو یہ مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن ابتدائی کئی دور کی سورتوں کا یہ خاص انداز بیان ہے کہ جو باتیں بعد کے دور میں مفصل ارشاد ہوئی ہیں، وہی اس دور میں بڑے مختصر مگر انتہائی مؤثر طریقے سے ذہن نشین کرائی گئی ہیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت فقرے استعمال کیے گئے ہیں جو سننے والوں کی زبان پر خود بخود چڑھ جائیں۔

اس میں سب سے پہلے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب وہ کچھ نہ تھا، پھر ایک مخلوط نطفے سے اُس کی ایسی حقیر سی ابتدا کی گئی کہ اُس کی ماں تک کو خبر نہ تھی کہ اُس کے وجود کی بنا پڑ گئی ہے اور کوئی اُس خوردبینی وجود کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے

جو آگے چل کر اس زمین پر اشرف المخلوقات بننے والا ہے۔ اس کے بعد انسان کو خیر دار کیا گیا ہے کہ نیری تخلیق اس طرح کر کے تجھے یہ کچھ ہم نے اس لیے بنایا ہے کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش گوش رکھنے والا بنایا گیا اور تیرے سامنے شکر اور کفر کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے گئے تاکہ یہاں کام کرنے کا جو وقت تجھے دیا گیا ہے اس میں تو دکھا دے کہ اس امتحان سے تو شاگرد بن کر نکلا ہے یا کافر بندہ بن کر۔

پھر صرف ایک آیت میں دو ٹوک طریقہ سے بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ اس امتحان سے کافر بن کر نکلیں گے انہیں آخرت میں کیا انجام دیکھنا ہوگا۔

اس کے بعد آیت نمبر ۵ سے ۲۲ تک مسلسل اُن انعامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے وہ لوگ اپنے رب کے ہاں نوازے جائیں گے جنہوں نے یہاں بندگی کا حق ادا کیا ہے۔ ان آیات میں صرف اُن کی بہترین جزا بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اُن کے وہ کیا اعمال ہیں جن کی بنا پر وہ اس جزا کے مستحق ہوں گے۔ مکی دور کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصورات کا مختصر تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کہیں وہ اخلاقی اوصاف اور نیک اعمال بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کی نگاہ میں قابل قدر ہیں، اور کہیں اعمال و اخلاق کی اُن برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اسلام انسان کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اس لحاظ سے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ ان کا کیا اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں نکلتا ہے، بلکہ صرف اس حیثیت سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کی ابدی اور پائیدار زندگی میں اُن کا مستقل نتیجہ کیا ہوگا قطع نظر اس سے کہ دنیا میں کوئی بُری صفت مفید ہو یا کوئی اچھی صفت نقصان دہ ثابت ہو۔

یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔ اس کے بعد دوسرے رکوع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ دراصل یہ ہم ہی ہیں جو اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تم پر نازل کر رہے ہیں، اور اس سے متصور حضور کو نہیں بلکہ کفار کو خبردار کرنا ہے کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے ہیں بلکہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں اور ہماری حکمت ہی اس کی مقتضی ہے کہ اسے یک بارگی نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کریں۔ دوسری بات حضور سے یہ فرمائی گئی ہے کہ تمہارے رب کا فیصلہ صادر ہونے میں خواہ کتنی ہی دیر لگے، اور اس دوران میں تم پر خواہ کچھ ہی گزر جائے، بہر حال تم صبر کے ساتھ اپنا فریضہ رسالت انجام دینے چلے جاؤ اور کبھی ان بد عمل اور منکر حق لوگوں میں سے کسی کے دباؤ میں نہ آؤ۔ تیسری بات آپ سے یہ فرمائی گئی ہے کہ شب و روز اللہ کو یاد کرو، نماز پڑھو اور راتیں اللہ کی عبادت میں گزارو،

کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس سے کفر کی طغیانی کے مقابلہ میں اللہ کی طرف بلائے والوں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔

پھر ایک فقرے میں کفار کے غلط رویے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آخرت کو بھول کر دنیا پر فریفتہ ہو گئے ہیں، اور دوسرے فقرے میں ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم خود نہیں بن گئے ہو، ہم نے تمہیں بنایا ہے، یہ چوڑے چکلے سینے اور مضبوط ہاتھ پاؤں تم نے خود اپنے لیے نہیں بنائے ہیں، ان کے بنانے والے بھی ہم ہی ہیں، اور یہ بات ہر وقت ہماری قدرت میں ہے کہ جو کچھ ہم تمہارے ساتھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ تمہاری شکلیں بگاڑ سکتے ہیں۔ تمہیں ہلاک کر کے کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لاسکتے ہیں۔ تمہیں مار کر دوبارہ جس شکل میں چاہیں تمہیں پیدا کر سکتے ہیں۔

آخر میں کلام اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ یہ ایک کلمہ نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر کے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔ مگر دنیا میں انسان کی چاہت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کسی کی چاہت بھی پوری نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہے، اور اللہ کی چاہت اندھا دھند نہیں ہے، وہ جو کچھ بھی چاہتا ہے اپنے علم اور اپنی حکمت کی بنا پر چاہتا ہے۔ اس علم اور حکمت کی بنا پر جسے وہ اپنی رحمت کا مستحق سمجھتا ہے اسے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور جسے وہ ظالم پاتا ہے اس کے لیے دردناک عذاب کا انتظام اس نے کر رکھا ہے۔

بِآيَاتِهَا

سُورَةُ الدَّهْرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَلْ اَتٰی عَلٰی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا ①

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔

۱۔ پہلا فقرہ ہے "هَلْ اَتٰی عَلٰی الْاِنْسَانِ" اکثر مفسرین و مترجمین نے یہاں "هَلْ" کو "قَدْ" کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بے شک یا بلاشبہ انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ "هَلْ" عربی زبان میں "کیا" کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تو ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کسی سے پوچھتے ہیں "کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟" کبھی ہمارا مقصود سوال کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ انکار ہم اس انداز میں کرتے ہیں کہ "کیا یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے؟" کبھی ہم ایک شخص سے کسی بات کا اقرار کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے اس سے پوچھتے ہیں کہ "کیا میں نے تمہاری رقم ادا کر دی؟" اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرنا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ مخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کر دیں جو لازماً اُس کے اقرار سے بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں "کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کی ہے؟" اس سے مقصود صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اُن کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے، بلکہ اُسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی ہے اس کے ساتھ میں بُرائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقع اُس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اُس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کر کے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہو گا؟

دوسرا فقرہ ہے "حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ"۔ دھر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا، اور حین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ اس لامتناہی زمانے کے اندر ایک طویل مدت تو ایسی گزری ہے جب سرے سے نوع انسانی ہی موجود نہ تھی۔ پھر اُس میں ایک وقت ایسا آیا جب انسان نام کی ایک نوع کا آغاز کیا گیا۔ اور

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا
بَصِيرًا ① إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ②

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

اسی زمانے کے اندر ہر شخص پر ایک ایسا وقت آیا ہے جب اسے علم سے وجود میں لانے کی ابتدا کی گئی۔

میرا فقرہ ہے لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكَورًا، یعنی اُس وقت وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اُس کا ایک حصہ باپ کے نطفے میں ایک خوردبینی کیڑے کی شکل میں اور دوسرا حصہ ماں کے نطفے میں ایک خوردبینی بیضے کی شکل میں موجود تھا۔ مدتہائے دراز تک تو انسان یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دراصل وہ اس کیڑے اور بیضے کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ اب طاقت و خوردبینوں سے ان دونوں کو دیکھ تو لیا گیا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا انسان باپ کے اس کیڑے میں اور کتنا ماں کے اس بیضے میں موجود ہوتا ہے۔ پھر استقرارِ حمل کے وقت ان دونوں کے ملنے سے جو ابتدائی خلیہ ر Cell) وجود میں آتا ہے وہ ایک ایسا ذرہ بے مقدار ہوتا ہے کہ بہت طاقت و خوردبین ہی سے نظر آ سکتا ہے اور اسے دیکھ کر بھی بادی النظر میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی انسان بن رہا ہے، نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس حقیر سی ابتداء سے نشوونما پانچ کر کوئی انسان اگر بنے گا بھی تو وہ کس قدر قامت، کس شکل و صورت، کس قابلیت اور شخصیت کا انسان ہوگا۔ یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ اُس وقت وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا اگرچہ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کا آغاز ہو گیا تھا۔

۱۲ "ایک مخلوط نطفے" سے مراد یہ ہے کہ انسان کی پیدائش مرد اور عورت کے دو الگ الگ نطفوں سے نہیں ہوئی ہے بلکہ دونوں نطفے مل کر جب ایک ہو گئے تب اُس مرکب نطفے سے انسان پیدا ہوا۔

۱۳ یہ ہے دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصد تخلیق یہیں پورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حقے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دنیا اُس کے لیے نہ دار العذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دارالجزا ہے جیسا کہ تثنائخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رزم گاہ، جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ وہ جس چیز کو عمر سمجھتا ہے حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دنیا میں جو توتیں اور صلاحیتیں بھی اس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اس کو تصرف کے مواقع دیے گئے ہیں، جن

جینتیوں میں بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے، اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اُس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔ اور اُس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اس پر ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا، اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیسے جو اُسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بے خدایا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جوابدہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامہ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اُس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جوابدہی کو پیش نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن سب مقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اسے پوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفسیر القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات کے اندر لفظ ”آزمائش“ نکال کر وہ تمام مقامات دیکھ لیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔

۷۵ اصل میں فرمایا گیا ہے ”ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا“ اس کا مفہوم صحیح طور پر ”ہوش گوش رکھنے والا بنایا“ سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنی ”سننے والا“ اور بصیر کے معنی ”دیکھنے والا“ کیے ہیں۔ اگرچہ عربی زبان کے ان الفاظ کا لفظی ترجمہ یہی ہے مگر عربی داں جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے، حالانکہ وہ بھی سننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سننے اور دیکھنے سے مراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قیمتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذریعہ علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں اس لیے اختصار کے طور پر صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعہ سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے ہیں کیونکہ اس کے ہر حواس کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعہ سے آنے والی معلومات کو جمع کر کے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے، اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رویہ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کر کے ہم اس کا امتحان لینا چاہتے تھے یہ ارشاد فرمانا کہ اسی غرض کے لیے ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصود کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب

محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا ہی ہو تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم و عقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۵۵ یعنی ہم نے اسے محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر کا راستہ کونسا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سورہ بکہ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَهَدَيْنَاهُ الْجَدَيْنِ۔ اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیر و شر کے راستے) نمایاں کر کے بتا دیے اور سورہ شمس میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) استوار کیا، پھر اُس کا فُجور اور اُس کا تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیے۔ ان تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے، اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے ان تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں ”راستہ دکھانے“ سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صورت نہیں ہے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

(۱) ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی جس بھی دی گئی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور بُرائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو بُرا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود ان سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض و خواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی بُرائیوں کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، ان کا حال بھی یہ ہے کہ وہی بُرائیاں اگر کوئی دوسرا ان کے ساتھ کرے تو وہ اُس پر چیخ اُٹھتے ہیں اور اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ ان کو بُرا ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جہالت اور حماقت اور دنیا نویسیت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اُس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اُسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(۲) ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ توامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اسے ہر اُس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی بُرائی کرنے والا ہو یا کر رہا ہو یا کر چکا ہو۔ اس ضمیر کو خواہ انسان کتنی ہی تھکیاں دے کر سلائے، اور اس کو بے جس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کرے، لیکن وہ اسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ وہ دنیا میں ڈھیٹ بن کر اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے، وہ جتیں بگھار کر دنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے، وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے لیے بیشمار

عذرات تراش سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اللہ نے اس کی فطرت میں جو ٹھیک سب بٹھا رکھا ہے وہ اتنا جاندار ہے کہ کسی بُرے انسان سے یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کہا ہے۔ یہی بات ہے جو سورہ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ "انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے" (آیت ۱۵)۔

(۳) انسان کے اپنے وجود میں اور اُس کے گرد و پیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا، نہ بہت سے خدا اس کا رخائے ہستی کے بنانے والے اور چلانے والے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح آفاق اور انفس کی یہ نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر ان سے آنکھیں بند کر لے، یا اپنی عقل سے کام لے کر ان پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی کر رہی ہیں ان کو تسلیم کرنے سے جی چڑائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دیئے ہیں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

(۴) انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالائے حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے، اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجربات و مشاہدات صرف خارج ہی میں اس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالائے حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے جس کی بنا پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مشرک بھی سارے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

(۵) انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جرم کی سزا اور عمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے اسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے اور جن خدمات کو قابل تحسین سمجھا جاتا ہے ان کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے اب اگر یہ مسلم ہے کہ اس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پوری سزا تو درکنار سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جاسکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، الایہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کر لے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصور رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجاٹے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب اُس کے ذمہ رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کا اندر یہ انصاف کا تصور آخر کہاں سے گیا؟

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلْسِلًا وَأَغْلَالًا ۝ سَعِيرًا ۝ إِنَّ الْأَبْرَارَ
يَشْرَبُونَ ۝ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ
بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۝ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ ۝ وَ

کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔
نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش
ہوگی، یہ ایک بہتا چشمہ ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پیئیں گے اور جہاں
چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں اور

(۶) ان تمام ذرائع رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی مزاج اور واضح رہنمائی کے لیے دنیا میں انبیاء
بھیجے اور کتابیں نازل کیں جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے اور کفر کی راہ کونسی اور ان دونوں
راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات، بے شمار محسوس اور غیر محسوس
طریقوں سے اتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصور، آخرت کے
تصور، نیکی اور بدی کے فرق، اور ان کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی
ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اُسے انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی سے حاصل ہوا ہے۔ آج
جو لوگ انبیاء اور کتابوں کے منکر ہیں، یا ان سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی ان بہت سی چیزوں کی پیروی
کر رہے ہیں جو دراصل انہی کی تعلیمات سے چھین چھین کر ان تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ ان چیزوں کا
اصل ماخذ کونسا ہے۔

۵۶ اصل میں لفظ ابرار استعمال ہوا ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی اطاعت
کا حق ادا کیا ہو، اُس کے عائد کیے ہوئے فرائض بجالائے ہوں، اور اُس کے منع کیے ہوئے افعال سے
اجتناب کیا ہو۔

۵۷ یعنی وہ کافور ملا ہوا پانی نہ ہوگا بلکہ ایسا قدرتی چشمہ ہوگا جس کے پانی کی صفائی اور ٹھنڈک اور
خوشبو کافور سے ملتی جلتی ہوگی۔

۵۸ عباد اللہ (اللہ کے بندے) یا عباد الرحمن (رحمن کے بندے) کے الفاظ اگرچہ لغوی طور پر تمام
انسانوں کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب ہی خدا کے بندے ہیں، لیکن قرآن میں جہاں بھی یہ الفاظ

آئے ہیں ان سے نیک بندے ہی مراد ہیں۔ گو یا کہ بد لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو بندگی سے خارج کر رکھا ہو، اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ اپنے اسم گرامی کی طرف منسوب کرتے ہوئے عباد اللہ یا عباد الرحمن کے معزز خطاب سے نوازے۔

۵۹ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں وہ کدال پھاڑے لے کر نالیاں کھودیں گے اور اس طرح اس چشمے کا پانی جہاں لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے، بلکہ ان کا ایک حکم اور اشارہ اس کے لیے کافی ہوگا کہ جنت میں جہاں وہ چاہیں اسی جگہ وہ چشمہ پھوٹے۔ بسہولت نکال لینے کے الفاظ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۶۰ نذر پوری کرنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب کیا گیا ہو اسے وہ پورا کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے خود اپنے اوپر واجب کر لیا ہو، یا بالفاظ دیگر جس کام کے کرنے کا اس نے عہد کیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آدمی پر واجب ہو، خواہ وہ اُس پر واجب کیا گیا ہو یا اس نے خود اپنے اوپر واجب کر لیا ہو، اسے وہ پورا کرے۔ ان تینوں مفہومات میں سے زیادہ معروف مفہوم دوسرا ہے اور عام طور پر لفظ نذر سے وہی مراد لیا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں ان لوگوں کی تعریف یا تو اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ واجبات کو پورا کرتے ہیں، یا اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ وہ ایسے نیک لوگ ہیں کہ جو خیر اور بھلائی کے کام اللہ نے ان پر واجب نہیں کیے ہیں ان کو بھی انجام دینے کا جب وہ اللہ سے عہد کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، کجا کہ ان واجبات کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کرے جو اللہ نے ان پر عائد فرمائی ہے۔

جہاں تک نذر کے احکام کا تعلق ہے، ان کو مختصر طور پر ہم تفسیر القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۳۱ میں بیان کر چکے ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ لوگ نذر کے معاملہ میں جو غلطیاں کرنے میں یا جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان سے بچ سکیں اور نذر کے صحیح قواعد سے واقف ہو جائیں۔

(۱) فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اُس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔ ان دونوں قسم کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نذر تبرئہ کہتے ہیں اور اس پر اتفاق ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی واجب کام نہ کرنے کا عہد کرے۔ چوتھے یہ کہ آدمی کوئی مجاہد کام کرنے کو اپنے اوپر لازم کرے، یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا یا کوئی خلافِ اولیٰ کام کرنے کا عہد کرے۔ ان دونوں قسموں کی نذروں کو فقہاء کی اصطلاح میں نذر لجاج کہتے ہیں اور جگہ جگہ روپن اور ضد کی نذر، کہتے ہیں۔ ان میں سے تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ اور چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفارہ ادا کر دینا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کرے، یا کفارہ ادا کرے۔

شافعیوں اور مالکیوں کے نزدیک یہ نذر بھی سر سے سے منع نہیں ہوتی۔ اور خفیوں کے نزدیک دونوں قسموں کی نذروں پر کفارہ لازم آتا ہے۔ (عمدة القاری)۔

(۲) متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نذر ماننے سے منع فرمایا ہے جو یہ سمجھتے ہوئے مانی جائے کہ اس سے تقدیر بدل جائے گی، یا جس میں کوئی نیک کام اللہ کی رضا کے لیے بطور شکر کرنے کے بجائے آدمی اللہ تعالیٰ کو بطور معاوضہ پیشکش کرے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں تو میں آپ کے لیے فلاں نیک کام کروں گا۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عن النذر ویقول انه لا یرد شیئاً وانما یتخرج بہ من البخیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ نذر ماننے سے منع کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ وہ کسی ہونے والی چیز کو پھیر نہیں سکتی، البتہ اس کے ذریعہ سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے۔ (مسلم۔ ابوداؤد)۔ حدیث کے آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ بخیل یوں تو راہ خدا میں مال نکالنے والا نہ تھا، نذر کے ذریعہ سے اس لالچ میں وہ کچھ خیرات کر دیتا ہے کہ شاید یہ معاوضہ قبول کر کے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقدیر بدل دے۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ ہے کہ حضور نے فرمایا النذر لا یقیدم شیئاً ولا یؤخرک وانما یتخرج بہ من البخیل۔ نذر نہ کوئی کام پہلے کر سکتی ہے، نہ کسی ہوتے کام میں تاخیر کر سکتی ہے۔ البتہ اس کے ذریعہ سے کچھ مال بخیل کے ہاتھ سے نکلوا لیا جاتا ہے، (بخاری و مسلم) ایک اور روایت میں وہ کہتے ہیں کہ حضور نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا انہ لا یاتی بخیر وانما یتخرج بہ من البخیل۔ اس سے کوئی کام بنتا نہیں ہے، البتہ اس کے ذریعہ سے کچھ مال بخیل سے نکلوا لیا جاتا ہے (بخاری و مسلم) تقریباً اسی مضمون کی متعدد روایات مسلم نے حضرت ابومہریرہ سے نقل کی ہیں، اور ایک روایت بخاری و مسلم دونوں نے نقل کی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ان النذر لا یقرب من ابن آدم شیئاً لکن اللہ قدرا لہ ولکن النذر یوافق القدر فیخرج بذالك من البخیل ما لکن البخیل یرید ان یتخرج۔ ”در حقیقت نذر ابن آدم کو کوئی ایسی چیز نہیں دلو سکتی جو اللہ نے اس کے لیے مقدر نہ فرمائی ہو، لیکن نذر ہوتی تقدیر کے مطابق ہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تقدیر الہی وہ چیز بخیل کے پاس سے نکال لاتی ہے جسے وہ کسی اور طرح نکالنے والا نہ تھا۔ اسی مضمون پر مزید روشنی حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص کی اس روایت سے پڑتی ہے کہ حضور نے فرمایا انما النذر ما ابتغی بہ وجه اللہ۔ ”اصل نذر تو وہ ہے جس سے اللہ کی خوشنودی مقصود ہو۔“ (طحاوی)۔

(۳) نذر کے معاملہ میں ایک اور قاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ صرف وہ نذر پوری کرنی چاہیے جو اللہ کی اطاعت میں ہو۔ اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر ہرگز پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح ایسی چیز میں کوئی نذر نہیں ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو، یا ایسے کام میں کوئی نذر نہیں ہے جو انسان کے بس میں نہ ہو۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعص اللہ

فلا یعیصہ" جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہیے، اور جس نے یہ نذر مانی ہو کہ اللہ کی نافرمانی کرے گا تو اسے نافرمانی نہیں کرنی چاہیے" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی)۔ ثابت بن ضحاک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا دفاعا لندیر فی معصیۃ اللہ ولا فیہما لا یملک ابن آدم۔ "اللہ کی نافرمانی میں کسی نذر کے پورا کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، نہ کسی ایسی چیز میں جو آدمی کی ملکیت میں نہ ہو" (ابوداؤد)۔ مسلم نے اسی مضمون کی روایت حضرت عمران بن حصین سے نقل کی ہے اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت اس سے زیادہ مفصل ہے جس میں وہ حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ لا نذرو ولا یمین فی ما لا یملک ابن آدم، ولا فی معصیۃ اللہ، ولا فی قطعۃ سرحم "کوئی نذر اور کوئی قسم کسی ایسے کام میں نہیں ہے جو آدمی کے بس میں نہ ہو، یا اللہ کی نافرمانی میں ہو، یا قطع رحمی کے لیے ہو"۔

(۴) جس کام میں بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور آدمی نے خواہ مخواہ کسی فضول کام یا ناقابل برداشت مشقت یا محض تعذیب نفس کو نیکی سمجھ کر اپنے اوپر لازم کر لیا ہو اس کی نذر پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ نے دیکھا ایک صاحب دھوپ میں کھڑے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں اور کیسے کھڑے ہیں؟ عرض کیا گیا یہ ابوسرائیل ہیں، انہوں نے نذر مانی ہے کہ کھڑے رہیں گے، بیٹھیں گے نہیں، نہ سایہ کریں گے، نہ کسی سے بات کریں گے، اور روزہ رکھیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا مَرُوْا فلیکتمہ و لیسْتَظِلُّ و لیتقعد، و لیتتم صومہ۔ ان سے کہو بات کریں، سایہ میں آئیں، بیٹھیں، البتہ روزہ پورا کریں" (بخاری، ابوداؤد، ابن ماجہ، مؤطلہ)۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میری بہن نے ننگے پاؤں پیدل حج کرنے کی نذر مانی اور یہ غدہ بھی مانی کہ اس سفر میں سر نہ کپڑا بھی نہ ڈالیں گی۔ حضور نے فرمایا اس سے کہو کہ سواری پر جائے اور سر ڈھانکے (ابوداؤد)۔ مسلم نے اس مضمون کی متعدد روایات نقل کی ہیں جن میں کچھ لفظی اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن عباس نے عقبہ بن عامر کی بہن کا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے حضور کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ النَّذْرٰہَا، مَرُوْا فَلتَرَکَبْ۔ "اللہ کو اس کی اس نذر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ سواری پر جائے" (ابوداؤد)۔ ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا، میری بہن نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے۔ حضور نے فرمایا ان اللہ لا یصنع بشقاء اختک شیئا فلتحتم سراً کبۃ" تیری بہن کے مشقت میں پڑنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اسے سواری پر حج کرنا چاہیے" (ابوداؤد)۔ حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ حضور نے (غالباً سفر حج) میں دیکھا کہ ایک بڑے میاں کو ان کے دو بیٹے سنبھالے لیے چل رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا انہوں نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ النَّذْرٰہَا، و اھرا ان یرکب۔ "اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے کہ یہ شخص اپنے نفس

کو عذاب میں ڈالے۔ پھر آپ نے اسے حکم دیا کہ سوار ہو (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ مسلم میں اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوسہیرؓ سے بھی مروی ہے۔

(۵) اگر کسی نذر کو پورا کرنا عملاً ممکن نہ ہو تو اسے کسی دوسری صورت میں پورا کیا جاسکتا ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے روز ایک شخص نے اٹھ کر عرض کیا، یا رسول اللہ، میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے مکہ آپ کے ہاتھ پر فتح کر دیا تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ حضور نے فرمایا یہیں پڑھ لے۔ اس نے پھر پوچھا۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ آپ نے فرمایا شأناک اذا، اچھا تو تیری مرضی دوسری ایک روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا الذی بعث محمدًا بالحق، لو صلیت ہہنا لاجزأ عنک صلوة فی بیت المقدس۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے محمد کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر تو یہیں نماز پڑھ لے تو بیت المقدس میں نماز پڑھنے کے بدلے یہ تیرے لیے کافی ہوگی (ابوداؤد)۔

(۶) اگر کسی نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دے دینے کی نذر مان لی ہو تو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اسے ایک تنائی مال دے دینا چاہیے، اور مالکیہ میں سے سخیون کا قول ہے کہ اسے اتنا مال دے دینا چاہیے جسے دینے کے بعد وہ تکلیف میں نہ پڑ جائے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر یہ نذر تبرر کی نوعیت کی ہو تو اسے سارا مال دے دینا چاہیے، اور اگر یہ نذر نجاج ہو تو اسے اختیار ہے کہ نذر پوری کرے یا قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اسے اپنا وہ سب مال دے دینا چاہیے جس میں زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، لیکن جس مال میں زکوٰۃ نہیں ہے، مثلاً مکان یا ایسی ہی دوسری املاک، اس پر اس نذر کا اطلاق نہ ہوگا۔ حنفیہ میں سے امام زفرؒ کا قول ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لیے دو عینے کا نفقہ رکھ کر باقی سب صدقہ کر دے (عمدة القاری۔ شرح مؤطا و از شاہ ولی اللہ صاحب)۔ حدیث میں اس مسئلے کے متعلق جو روایات آئی ہیں وہ یہ ہیں: حضرت کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ جانے کی وجہ سے جو عتاب مجھ پر ہوا تھا اس کی جب معافی مل گئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری توبہ میں یہ بات بھی شامل تھی کہ میں اپنے سارے مال سے دست بردار ہو کر اسے اللہ اور رسول کی راہ میں صدقہ کر دوں گا۔ حضور نے فرمایا نہیں ایسا نہ کرو۔ میں نے عرض کیا، پھر آدھا مال؟ فرمایا، نہیں۔ میں نے عرض کیا، پھر ایک تنائی؟ فرمایا ہاں (ابوداؤد)۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا تم اپنا کچھ مال اپنے لیے روک رکھو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے (بخاری)۔ امام زہریؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت ابولہبؓ نے (جن پر اسی غزوہ تبوک کے معاملہ میں عتاب ہوا تھا، حضور سے عرض کیا، میں اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں صدقہ کے طور پر اپنے سارے مال سے دست بردار ہونا ہوں۔ حضور نے جواب دیا تمہارے لیے اُس میں سے صرف ایک تنائی دے دینا کافی ہے (موطا)۔

(۷) اسلام قبول کرنے سے پہلے اگر کسی شخص نے کسی نیک کام کی نذر مانی ہو تو کیا اسلام قبول کرنے کے بعد

اسے پورا کیا جائے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔ بخاری، ابوداؤد اور طحاوی میں حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے زماثہ جاہلیت میں نذرمانی تھی کہ ایک رات اور بروایت بعض ایک دن) مسجد حرام میں اغشکاف کریں گے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے حضور سے فتویٰ پوچھا تو آپ نے فرمایا ادب بندرک ”اپنی نذر پوری کرو۔ بعض فقہاء نے حضور کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ ایسا کرنا واجب ہے، اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ یہ مستحب ہے۔

(۸) میت کے ذمہ اگر کوئی نذر گئی ہو تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور اور ظاہر تہ کہتے ہیں کہ میت کے ذمہ اگر روزے یا نماز کی نذر گئی ہو تو وارثوں پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ نذر اگر بدنی عبادت (نماز یا روزہ) کی ہو تو وارثوں پر اس کا پورا کرنا واجب نہیں ہے، اور اگر مالی عبادت کی ہو اور مرنے والے نے اپنے وارثوں کو اسے پورا کرنے کی وصیت نہ کی ہو تو اسے بھی پورا کرنا واجب نہیں، البتہ اگر اس نے وصیت کی ہو تو اس کے ترکے میں سے ایک تہائی کی حد تک نذر پوری کرنی واجب ہوگی۔ مالکیہ کا مذہب بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ نذر اگر غیر مالی عبادت کی ہو، یا مالی عبادت کی ہو اور میت نے کوئی ترکہ نہ چھوڑا ہو، تو اسے پورا کرنا وارثوں پر واجب نہیں ہے۔ اور اگر میت نے ترکہ چھوڑا ہو تو وارثوں پر مالی عبادت کی نذر پوری کرنا واجب ہے، خواہ اس نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو (شرح مسلم للنووی۔ بدل المجہود شرح ابی داؤد)۔ حدیث میں اس مسئلے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے ذمہ ایک نذر تھی جو انہوں نے پوری نہیں کی تھی۔ حضور نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے پوری کرو (ابوداؤد۔ مسلم)۔ دوسری روایت ابن عباس سے یہ ہے کہ ایک عورت نے بحری سفر کیا اور نذرمانی کہ اگر میں زندہ سلامت واپس گھر پہنچ گئی تو ایک مہینے کے روزے رکھوں گی۔ واپس آنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور وہ مر گئی۔ اس کی بہن یا بیٹی نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا اور آپ نے فرمایا کہ اس کی طرف سے تو روزے رکھو (ابوداؤد)۔ ایسی ہی ایک روایت ابوداؤد نے حضرت بکر بن عبد ربیع سے نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضور سے اسی طرح کا مسئلہ پوچھا اور آپ نے اسے وہی جواب دیا جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ ان روایات میں چونکہ یہ بات صاف نہیں ہے کہ حضور کے یہ ارشادات و جواب کے معنی میں تھے یا استحباب کے معنی میں، اور حضرت سعد بن عبادہ کی والدہ کی نذر کے معاملہ میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ مالی عبادت کے بارے میں تھی یا بدنی عبادت کے بارے میں، اسی بنا پر فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلافات ہوئے ہیں۔

(۹) غلط اور ناجائز نوعیت کی نذر کے معاملہ میں یہ بات تو صاف ہے کہ اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اس پر کفارہ لازم آتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے میں چونکہ روایات مختلف ہیں اس لیے فقہاء

يَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ
مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ

اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی، اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے

کے مالک بھی مختلف ہیں۔ ایک قسم کی روایات میں یہ آیا ہے کہ حضور نے ایسی صورت میں کفارہ کا حکم دیا ہے۔ مثلاً، حضرت عائشہ کی یہ روایت کہ حضور نے فرمایا لا نذر فی معصیة و کفارتہ کفارة یمین، "معصیت میں کوئی نذر نہیں ہے اور اس کا کفارہ قسم توڑنے کا کفارہ ہے" (ابوداؤد)۔ عقبہ بن عامر جعفی کی بہن کے معاملہ میں (جس کا ذکر اوپر نمبر ۴ میں گزر چکا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ اپنی نذر توڑ دیں اور تین دن کے روزے رکھیں (مسلم۔ ابوداؤد)۔ ایک اور عورت کے معاملہ میں بھی جس نے پیدل حج کی نذر مانی تھی، حضور نے حکم دیا کہ وہ سواری پہنچ کے لیے جائے اور قسم کا کفارہ ادا کر دے (ابوداؤد)۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا من نذر نذراً لربیمہ فکفارتہ کفارة یمین، ومن نذر نذراً فی معصیة فکفارتہ کفارة یمین، ومن نذراً لا یطیقہ فکفارتہ کفارة یمین، ومن نذراً اطاقہ فلیف ید۔ "جس نے ایک نذر مان لی اور اس بات کا تعین نہ کیا کہ کس بات کی نذر مانی ہے وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے معصیت کی نذر مانی وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ قدرت نہ رکھتا ہو وہ قسم کا کفارہ دے۔ اور جس نے ایسی نذر مانی جسے وہ پورا کر سکتا ہو وہ اسے پورا کرے" (ابوداؤد)۔ دوسری طرف وہ احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں کفارہ نہیں ہے۔ اوپر نمبر ۴ میں جن صاحب کا ذکر آیا ہے کہ انہوں نے دھوپ میں کھڑے رہنے اور کسی سے بات نہ کرنے کی نذر مانی تھی، ان کا قصہ نقل کر کے امام مالک نے مؤطا میں لکھا ہے کہ مجھے کسی ذریعہ سے بھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ حضور نے ان کو نذر توڑنے کا حکم دینے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہو کہ وہ کفارہ ادا کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من حلف علی یمین فداہی غیرہا خیراً منها فلیدعہا ولیات الذی ہو خیر فان ترکہا کفارتہا، "جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں وہ دیکھے کہ اس سے بہتر بات دوسری ہے تو وہ اسے چھوڑ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہو اور اسے چھوڑ دینا ہی اس کا کفارہ ہے" (ابوداؤد بیہقی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اور حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت کہ "جو کام بہتر ہے وہ کرے اور یہی اس کا کفارہ ہے" ثابت نہیں ہے)۔ امام نووی ان احادیث پر بحث کرتے ہوئے شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ، داؤد ظاہری اور جمہور علماء کہتے ہیں کہ معصیت کی نذر باطل ہے اور اسے پورا نہ کرنے پر کفارہ لازم نہیں

جَزَاءً وَلَا سُكُورًا ۹ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۱۰
فَوْقَهُمْ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْم نَصْرَةً وَسُورًا ۱۱

نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر یہ ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اُس دن کے شر سے بچائے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا

آتا۔ اور امام احمد کہتے ہیں کہ کفارہ لازم آتا ہے۔

۱۱ اصل الفاظ ہیں عَلٰی حَيْثِهٖ۔ اکثر مفسرین نے حَيْثِهٖ کی ضمیر کا مرجع کھانے کو قرار دیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کھانے کے محبوب اور دل پسند ہونے اور خود اُس کے حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے عَلٰی حَيْثِ الْاِطْعَامِ، یعنی غریبوں کو کھانا کھلانے کے شوق میں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور حضرت فضیل بن عیاض اور ابو سلیمان الدارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعد کا یہ فقرہ کہ اِنَّمَا نَطْعِمُكُمْ لَوَجْهِ اللَّهِ (ہم تو اللہ کی خوشنوی کی خاطر تمہیں کھلا رہے ہیں) اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

۱۲ قدیم زمانے میں دستور یہ تھا کہ قیدیوں کو ہتھکڑی اور پٹریاں لگا کر روزانہ باہر نکالا جاتا تھا اور وہ سڑکوں پر یا محلوں میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے تھے۔ بعد میں اسلامی حکومت نے یہ طریقہ بند کیا اور کتاب الخراج، امام ابو یوسف، صفحہ ۱۵۰۔ طبع ۱۳۸۲ء)۔ اس آیت میں قیدی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قید میں ہو، خواہ کافر ہو یا مسلمان، خواہ جنگی قیدی ہو، یا کسی جرم میں قید کیا گیا ہو، خواہ اسے قید کی حالت میں کھانا دیا جاتا ہو یا بھیک منگوائی جاتی ہو، ہر حالت میں ایک بے بس آدمی کو جو اپنی روزی کے لیے خود کو ٹی کو شش نہ کر سکتا ہو، کھانا کھلانا ایک بڑی نیکی کا کام ہے۔

۱۳ اگر چہ بجائے خود کسی غریب کو کھانا کھلانا بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے، لیکن کسی حاجت مند کی دوسری حاجتیں پوری کرنا بھی ویسا ہی نیک کام ہے جیسا بھوکے کو کھانا کھلانا۔ مثلاً کوئی کپڑے کا محتاج ہے، یا کوئی بیمار ہے اور علاج کا محتاج ہے، یا کوئی قرضدار ہے اور قرض خواہ اسے پریشان کر رہا ہے، تو اس کی مدد کرنا کھانا کھلانے سے کم درجے کی نیکی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں نیکی کی ایک خاص صورت کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے بطور مثال پیش کیا گیا ہے، ورنہ اصل مقصود حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

۱۴ ضروری نہیں ہے کہ غریب کو کھانا کھلاتے ہوئے زبان ہی سے یہ بات کہی جائے۔ دل میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زبان سے کہنے کی ہے۔ لیکن زبان سے یہ بات کہنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جس کی مدد کی جائے اُس کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ ہم اس سے کسی قسم کا شکر یہ یا بدلہ

وَجَزَيْنَهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۝۱۲ مُتَكِينِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ
لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ۝۱۳ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا

اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کریگا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر یکے لگائے بیٹھے ہونگے۔ نہ انہیں دُھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی بھر جنت کی چھاؤں ان پر چھلکی ہوئی سایہ کر رہی گی نہیں چاہتے، تاکہ وہ بے فکر ہو کر کھائے۔

۱۵ یعنی چہروں کی تازگی اور دل کا سرور۔ دوسرے الفاظ میں روزِ قیامت کی ساری سختیاں اور ہولناکیاں صرف کفار و مجرمین کے لیے ہوں گی، نیک لوگ اُس دن ہر تکلیف سے محفوظ اور نہایت خوش و خرم ہوں گے۔ یہی بات سورہ انبیاء میں بیان کی گئی ہے کہ ”وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا“ (آیت ۱۰۳)۔ اور اسی کی صراحت سورہ نمل میں کی گئی ہے کہ ”جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اُسے اُس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اُس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے“ (آیت ۸۹)۔

۱۶ بیان صبر بڑے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری دنیوی زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرنے تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں دبانے، اللہ کی باندھی ہوئی حدود کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اُس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اُس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہِ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اُس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اُس نقصان اور رنج اور اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اس نیک رویے کے ثمرات اس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرز عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۶۰۔ آل عمران، حواشی ۱۳، ۱۰، ۱۱، ۱۳، الانعام، حاشیہ ۲۳۔ جلد دوم، الانفال، حواشی ۳، ۴، ۵، یونس، حاشیہ ۹۔ ہود، حاشیہ ۱۱۔ الرعد، حاشیہ ۳۹۔ النحل، حاشیہ ۹۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۴۰۔ الفرقان، حاشیہ ۴۰۔ القصص، حواشی ۵، ۱۰، ۱۱۔ العنکبوت، حاشیہ ۹۔ جلد چہارم، لقمان، حواشی ۲۹، ۵۶۔ الحجہ، حاشیہ ۲۷۔ الاحزاب، حاشیہ ۵۸۔ الزمر، حاشیہ ۲۲۔ عم السجدہ، حاشیہ ۳۸۔ الشوریٰ، حاشیہ ۵۳)۔

وَذَلَّلَتْ قُطُوفُهَا تَذَلُّيلًا ۱۳ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ
كَانَتْ قَوَارِيرًا ۱۴ قَوَارِيرًا مِّنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۱۵ وَيَسْقُونَ
فِيهَا كَأَسَاكَانَ مِزَاجَهَا زَبْحِيلًا ۱۶ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا ۱۷

اور اُس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں)۔ اُن کے آگے
چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرانے جارہے ہوں گے، شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے،
اور ان کو منتظمین جنت نے ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام
پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔

۱۷ سورۃ زُحْرُفِ آیت ۱۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے آگے سونے کے برتن گردش کرانے جارہے
ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی وہاں سونے کے برتن استعمال ہوں گے اور کبھی چاندی کے۔
۱۸ یعنی وہ ہوگی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ چاندی کی یہ قسم اس دنیا میں نہیں پائی
جاتی۔ یہ صرف جنت کی خصوصیت ہوگی کہ وہاں شیشے جیسی شفاف چاندی کے برتن اہل جنت کے دسترخوان
پر پیش کیے جائیں گے۔

۱۹ یعنی ہر شخص کے لیے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کر دیے جائیں گے۔
نہ وہ اُس کی خواہش سے کم ہوں گے نہ زیادہ۔ بالفاظ دیگر اہل جنت کے خدام اس قدر ہوشیار اور تیز دار ہوں گے
کہ وہ جس کی خدمت میں جام شراب پیش کریں گے اس کے متعلق ان کو پورا اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی شراب پینا
چاہتا ہے۔ (جنت کی شراب کی خصوصیات کے متعلق ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، الصافات، آیات
۲۵ تا ۲۷، حواشی ۲۷ تا ۲۷۔ جلد پنجم، سورۃ محمد، آیت ۱۵، حاشیہ ۲۲۔ الطور، آیت ۲۳، حاشیہ ۱۸۔
الواقعة، آیت ۱۹، حاشیہ ۱۰۔)

۲۰ اہل عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے، اس لیے
فرمایا گیا کہ وہاں اُن کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ لیکن اس آمیزش کی صورت یہ نہ
ہوگی کہ اس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے گا، بلکہ یہ ایک قدرتی چشمہ ہوگا جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی
مگر اس کی تلخی نہ ہوگی، اس لیے اُس کا نام سلسبیل ہوگا۔ سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا، ہلکا اور خوش ذائقہ
ہونے کی بنا پر طبع سے سہولت گزر جائے۔ مفسرین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہاں سلسبیل کا لفظ اُس چشمے کے لیے
بطور صفت استعمال ہوا ہے نہ کہ بطور اسم۔

قرء حفص بغیر
الالف فی الوصل
فیہما ووقف علی
الاول بالف رعلی
الثانی بغیر الالف

وَيُطَوِّفُ عَلَيْهِمْ وَلَدَانُ مَخْلُودُونَ إِذْ أَرَأَيْتُمْ حِسْبَتَهُمْ لَوْلَا مَنُورًا ۱۹
وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۲۰ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٍ
خَضِرٌ وَأَسْتَبْرَقٌ وَحُلُوفٌ أَسَاوِرُهُمْ مِنْ فِضَّةٍ وَسِقَاهُمْ رَبَّهُمْ شَرَابًا
طَهُورًا ۲۱ إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا ۲۲

ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں
دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیے گئے ہیں۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک
بڑی سلطنت کا سرو سامان تمہیں نظر آئے گا۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دریا
کے کپڑے ہوں گے، ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ
شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابل قدر ٹھہری ہے۔ ع

۱۹ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، الصفات، حاشیہ ۲۶۔ جلد پنجم، الطور، حاشیہ

۱۹، الواقعہ، حاشیہ ۹۔

۱۹ یعنی دنیا میں خواہ کوئی شخص فقیر بے نوا ہی کیوں نہ رہا ہو، جب وہ اپنے اعمال خیر کی بنا پر جنت میں
جائے گا تو وہاں اس شان سے رہے گا کہ گویا وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے۔

۲۰ یہی مضمون سورہ کہف آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے کہ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَ
اِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْاَرَائِكِ ”وہ (یعنی اہل جنت) باریک ریشم اور اطلس و دریا کے سبز کپڑے
پہنیں گے، اونچی مسندوں پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے“ اس بنا پر ان مفسرین کی رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی جنہوں
نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ان کی مسندوں یا مسہریوں کے اوپر لٹکے ہوئے ہوں گے،
یا یہ ان لڑکوں کا لباس ہو گا جو ان کی خدمت میں دوڑے پھر رہے ہوں گے۔

۲۱ سورہ کہف آیت ۳۱ میں فرمایا گیا ہے يُجَلِّونَ فِيهَا مِنْ اَسَاوِرٍ مِنْ ذَهَبٍ ”وہ وہاں سونے
کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے“ یہی مضمون سورہ حج آیت ۲۳، اور سورہ قاطر آیت ۳۳ میں بھی ارشاد
ہوا ہے۔ ان سب آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تین صورتیں ممکن محسوس ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کبھی وہ چاہیں گے تو
سونے کے کنگن پہنیں گے اور کبھی چاہیں گے تو چاندی کے کنگن پہن لیں گے۔ دونوں چیزیں ان کے حسبِ خواہش
موجود ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ سونے اور چاندی کے کنگن وہ بیک وقت پہنیں گے، کیونکہ دونوں کو ملا دینے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ﴿۲۳﴾ فَأَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ

اسے نبی ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے لہذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو

سے حسن دو بالا ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جس کا جی چاہے گا سونے کے کنگن پہنے گا اور جو چاہے گا چاندی کے کنگن استعمال کرے گا۔ رہا یہ سوال کہ زیور تو عورتیں پہنتی ہیں، مردوں کو زیور پہنانے کا کیا موقع ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدیم زمانے میں بادشاہوں اور رئیسوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہاتھوں اور گلے اور سر کے تاجوں میں طرح طرح کے زیورات استعمال کرتے تھے، بلکہ ہمارے زمانے میں برطانوی ہند کے راجاؤں اور نوابوں تک میں یہ دستور رائج رہا ہے۔ سورہ زخرف میں بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ جب اپنے سادہ لباس میں بس ایک لاکھی لیے ہوئے فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس سے کہا کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں تو اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ اچھا سفیر ہے جو اس حالت میں میرے سامنے آیا ہے، فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلِئِكَةُ مُقْتَرِنِينَ۔ (آیت ۵۳)۔ یعنی اگر یہ زمین و آسمان کے بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا ملائکہ کا کوئی لشکر ہی اس کی اردلی میں آتا۔

۵۲۵ پہلے دو شرابوں کا ذکر کر چکا ہے۔ ایک وہ جس میں آپ چشمہ کافور کی آمیزش ہوگی۔ دوسری وہ جس میں آپ چشمہ زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ ان دونوں شرابوں کے بعد اب پھر ایک شراب کا ذکر کرنا اور یہ فرمانا کہ ان کا رب انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا، یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ کوئی اور بہترین نوعیت کی شراب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل خاص کے طور پر انہیں پلائی جائے گی۔

۵۲۶ اصل الفاظ ہیں كَانَ سَعْيِكُمْ مَشْكُورًا۔ یعنی تمہاری سعی مشکور ہوئی۔ سعی سے مراد وہ پورا کارنامہ حیات ہے جو بندے نے دنیا میں انجام دیا۔ جن کاموں میں اس نے اپنی محنتیں اور جہن مقاصد کے لیے اس نے اپنی کوششیں صرف کیں ان سب کا مجموعہ اُس کی سعی ہے اور اس کے مشکور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قابل قدر قرار پائی۔ شکر یہ جب بندے کی طرف سے خدا کے لیے ہو تو اس سے مراد اس کی نعمتوں پر احسان مند ہوتی ہے، اور جب خدا کی طرف سے بندے کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمات کی قدر فرمائی۔ آقا کی یہ بہت بڑی عنایت ہے کہ بندہ جب اس کی مرضی کے مطابق اپنا فرض انجام دے تو وہ اس کا شکر یہ ادا کرے۔

۵۲۷ یہاں مخاطب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن دراصل رُونے سخن کفار کی طرف ہے۔ کفار مکہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکتھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآن مجید میں بعض مقامات پر ان کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا

وَلَا تُطَعُّ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝۲۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً
وَأَصِيلًا ۝۲۸ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝۲۹

اور ان میں سے کسی بد عمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یا دو کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو، اور رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو۔

گیا ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، النمل، حواشی ۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹، اور یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مصنف نہیں ہیں، اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں، یعنی یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کر دیں، بلکہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بھیجیں۔

۵۲۸ یعنی تمہارے رب نے جس کا عظیم پرہیز مامور کیا ہے اس کی سختیوں اور مشکلات پر صبر کرو، جو کچھ بھی تم پر گزر جائے اسے پامردی کے ساتھ برداشت کرنے چلے جاؤ اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دو۔
۵۲۹ یعنی ان میں سے کسی سے دُوب کر دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤ، اور کسی بد عمل کی خاطر دین کی اخلاقی تعلیمات میں، یا کسی منکر حق کی خاطر دین کے عقائد میں ذرہ برابر بھی ترمیم و تغیر کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ جو کچھ حرام و ناجائز ہے اسے بر ملاحظہ و ناجائز کہو، خواہ کوئی بد کار کتنا ہی زور لگائے کہ تم اس کی مذمت میں ذرا سی نرمی ہی برت لو، اور جو عقائد باطل ہیں انہیں کھلم کھلا باطل اور جو حق ہیں انہیں علانیہ حق کہو، چاہے کفار تمہارا منہ بند کرنے، یا اس معاملہ میں کچھ نرمی اختیار کر لینے کے لیے تم پر کتنا ہی دباؤ ڈالیں۔

۵۳۰ قرآن کا قاعدہ ہے کہ جہاں بھی کفار کے مقابلہ میں صبر و ثبات کی تلقین کی گئی ہے وہاں اُس کے معاً بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دین حق کی راہ میں دشمنانِ حق کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ اسی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے سے مراد ہمیشہ اللہ کو یاد کرنا بھی ہو سکتا ہے، مگر جب اللہ کی یاد کا حکم اوقات کے تعیین کے ساتھ دیا جائے تو پھر اس سے مراد نماز ہوتی ہے۔ اس آیت میں سب سے پہلے فرمایا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا۔ بکرہ عربی زبان میں صبح کو کہتے ہیں۔ اور اَصِيل کا لفظ زوال کے وقت سے غروب تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں ظہر اور عصر کے اوقات آجاتے ہیں۔ پھر فرمایا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ۔ رات کا وقت غروب آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے، اس لیے رات کو سجدہ کرنے کے حکم میں مغرب اور عشا، دونوں وقتوں کی نمازیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ رات کے طویل اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے رہو،

اِنَّ هُوَ لَآءِ يَجِبُوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذُرُوْنَ وَّرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾
 نَحْنُ خَلَقْنَهُمْ وَشَدَدْنَا آسْرَهُمْ وَاِذَا نَشِئْنَا بَدَلًا لَّنَا اَمْثَلَهُمْ
 تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ اِلٰى رَبِّهِ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾
 وَمَا نَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾
 يَدْخُلُ مَنْ يَّشَاءُ فِي رَحْمَتِيْهِ وَالظَّالِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے
 اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں اور ہم جب
 چاہیں ان کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں۔ یہ ایک نصیحت ہے اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف
 جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے یقیناً اللہ
 بڑا علیم و حکیم ہے، اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دروزاک
 عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ع

نماز تہجد کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل،
 حواشی ۲ تا ۹ - جلد ششم، المنزل، حاشیہ ۲)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے یہی اوقات ابتدا سے
 اسلام میں تھے، البتہ اوقات اور رکعتوں کے تعین کے ساتھ پنجوقتہ نماز کی فرضیت کا حکم معراج کے
 موقع پر دیا گیا۔

۵۳۱ یعنی یہ کفار قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مصر ہیں، اور جس بنا پر آپ کی دعوت
 حق کے لیے ان کے کان بھرے ہو گئے ہیں، وہ دراصل ان کی دنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی
 ہے۔ اس لیے ایک سچے خدا پرست انسان کا راستہ ان کے راستے سے اتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی
 مصالحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۳۲ اصل الفاظ ہیں اِذَا نَشِئْنَا بَدَلًا لَّنَا اَمْثَلَهُمْ تَبْدِيْلًا۔ اس فقرے کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔
 ایک یہ کہ ہم جب چاہیں انہیں ہلاک کر کے انہی کی جنس کے دوسرے لوگ ان کی جگہ لاسکتے ہیں جو اپنے کردار میں
 ان سے مختلف ہوں۔ دوسرے یہ کہ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں، یعنی جس طرح ہم کسی کو تندہ



اور سلیم الاعضاء بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں، کسی کو لقوہ مار جائے، اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر اپنا سچ ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد ان کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔

۵۳۳ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، المدثر، حاشیہ ۴۱۔ (نیز ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۵۷)

۵۳۴ اس کی تشریح ہم اسی سورۃ کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔ (نیز ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۲، صفحہ نمبر ۵۷)



تَبَيَّنَ الْفَرِيقَانِ

الْمُرْسَلَاتِ



المسئلت

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ والمسئلت کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زماشر نزول | اس کا پورا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کی دو سورتیں سورۃ قیامہ، اور سورۃ دہر، اور اس کے بعد کی دو سورتیں، سورۃ نبأ اور سورۃ تازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جس کو ان میں مختلف پیرایوں سے اہل مکہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع قیامت اور آخرت کا اثبات، اور ان نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو ان حقائق کے انکار اور اقرار سے آخر کار برآمد ہونگے۔

پہلی سات آیتوں میں ہواؤں کے انتظام کو اس حقیقت پر گواہ قرار دیا گیا ہے کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی۔ ان میں استدلال یہ ہے کہ جس قادر مطلق نے زمین پر یہ حیرت انگیز انتظام قائم کیا ہے اُس کی قدرت قیامت برپا کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی، اور جو مزین حکمت اس انتظام میں کارفرما نظر آ رہی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ حکیم کا کوئی فعل عبث اور بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور آخرت نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سارا کارخانہ ہستی سراسر فضول ہے۔

اہل مکہ بار بار کہتے تھے کہ جس قیامت سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو اسے لا کر دکھاؤ تب ہم اسے مانیں گے۔ آیت ۸ سے ۱۵ تک ان کے اس مطالبے کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ کوئی کیبیل یا نماشا تو نہیں ہے کہ جب کوئی مسخرا سے دکھانے کا مطالبہ کرے اسی وقت وہ فوراً دکھا دیا جائے۔ وہ تو تمام نوع انسانی، اور اس کے تمام افراد کے مقدمے کے فیصلے کا دن ہے۔ اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اسی وقت پر وہ آئے گا۔ اور جب آئے گا تو ایسی ہولناک شکل میں آئے گا کہ آج جو لوگ مذاق کے طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اس وقت ان کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت انہی رسولوں کی شہادت

پر ان کے مقدرے کا فیصلہ ہو گا جن کی دی ہوئی خبر کو یہ منکرین آج بڑی بے باکی کے ساتھ
ٹھٹھلا رہے ہیں، پھر انہیں خود پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی
کا سامان کیا ہے۔

آیت ۱۶ سے ۲۸ تک مسلسل قیامت اور آخرت کے وقوع اور وجوب کے دلائل دیے
گئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اپنی تاریخ، اس کی اپنی پیدائش، اور جس زمین پر وہ
زندگی بسر کر رہا ہے اس کی اپنی ساخت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ قیامت کا آنا اور عالم آخرت
کا برپا ہونا ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا بھی۔ انسانی تاریخ بتا رہی ہے کہ جن
قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ آخر کار بگڑیں اور تباہی سے دوچار ہوئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں
کہ آخرت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کا رویہ اگر متصادم ہو تو اُس کا انجام وہی
ہوتا ہے جو اُس اندھے کا انجام ہوتا ہے جو سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کے مقابلے میں بگ
ٹٹ چلا جا رہا ہو۔ اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کائنات کی سلطنت میں صرف قوانین طبعی
(Physical laws) ہی کارفرما نہیں ہیں بلکہ ایک قانون اخلاقی (Moral law) بھی
کام کر رہا ہے جس کے تحت خود اس دنیا میں بھی مکافات عمل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن
دنیا کی موجودہ زندگی میں یہ مکافات چونکہ اپنی کامل و مکمل صورت میں واقع نہیں ہو رہی ہے اس
لیے کائنات کا اخلاقی قانون لازماً یہ تقاضا کرتا ہے کہ کوئی وقت ایسا آئے جب یہ بھرپور
طریقے سے واقع ہو اور ان تمام بھلائیوں اور بُرائیوں کی پوری جزا و سزا دی جائے جو یہاں
جزا سے محروم رہ گئی ہیں یا سزا سے بچ نکلی ہیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ موت کے بعد دوسری
زندگی ہو، اور انسان کی پیدائش دنیا میں جس طرح ہوتی ہے اس پر اگر انسان غور کرے تو اس
کی عقل۔ بشرطیکہ وہ سلیم ہو۔ اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتی کہ جس خدا نے
ایک حقیر نطقہ سے ابتداء کر کے اُسے پورا آدمی بنایا ہے اُس کے لیے اُسی آدمی کو پھر پیدا کر
دینا یقیناً ممکن ہے۔ زندگی بھر انسان جس زمین پر رہتا ہے، مرنے کے بعد اس کے اجزائے
جسم کہیں غائب نہیں ہو جاتے، اسی زمین پر اُن کا ایک ایک ذرہ موجود رہتا ہے۔ اسی زمین
کے خزانوں سے وہ بنتا اور پھلتا پھرتا اور پرورش پاتا ہے، اور پھر اسی زمین کے خزانوں میں
واپس جمع ہو جاتا ہے۔ جس خدا نے اُسے پہلے زمین کے ان خزانوں سے نکالا تھا وہی اُن میں جمع
ہو جانے کے بعد اُسے پھر اُن سے نکال لاسکتا ہے۔ اُس کی قدرت پر غور کرو تو تم اس سے انکار
نہیں کر سکتے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اور اس کی حکمت پر غور کرو تو تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے
کہ زمین پر جو اختیارات اُس نے تمہیں دیے ہیں اُن کے صحیح اور غلط استعمال کا حساب لینا یقیناً

اُس کی حکمت کا تقاضا ہے اور بلا حساب چھوڑ دینا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد آیات ۲۸ سے ۴۰ تک آخرت کے منکرین کا، اور ۴۱ سے ۵۴ تک اُن لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اُس پر ایمان لا کر دنیا میں اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کی ہے، اور عقائد و افکار، اخلاق و اعمال، اور سیرت و کردار کی اُن برائیوں سے اجتناب کیا ہے جو چاہے آدمی کی دنیا بناتی ہوں مگر اس کی عاقبت خراب کر دینے والی ہوں۔

آخر میں منکرینِ آخرت اور خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں جو کچھ مزے اڑانے ہیں اڑالو، آخر کار تمہارا انجام سخت تباہ کن ہوگا۔ اور بات اس پر ختم کی گئی ہے کہ اس قرآن سے بھی جو شخص ہدایت نہ پائے اسے پھر دنیا میں کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی۔

آيَاتُهَا ۵

سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ۱) فَالْعِصْفَاتِ عَصْفًا ۲) وَالنَّشْرِاتِ نَشْرًا ۳) فَالْفِرْقَاتِ

فِرْقًا ۴) فَالْمُلْقَاتِ ذِكْرًا ۵) عُدْرًا أَوْ نُذْرًا ۶) إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعَ ۷)

قسم ہے اُن (ہوائوں) کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں، پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر اُن کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں، پھر دلوں میں خدا کی یاد ڈالتی ہیں، عُدْر کے طور پر یاد دہاؤں کے طور پر، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔

۱ یعنی کبھی تو ان کی آمد کے رُکنے اور قحط کا خطرہ پیدا ہونے سے دل گداز ہوتے ہیں اور لوگ اللہ سے توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں۔ کبھی اُن کے بارانِ رحمت لانے پر لوگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور کبھی ان کی طوفانی سختی دلوں میں خوف پیدا کرتی ہے اور تباہی کے ڈر سے لوگ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۳۔ صفحہ نمبر ۵۷۹)

۲ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”جس چیز کا تمیں خوف دلایا جا رہا ہے“ مراد ہے قیامت اور آخرت۔

۳ یہاں قیامت کے ضرور واقع ہونے پر پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ایک، الْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ”پے در پے، یا بھلائی کے طور پر بھیجی جانے والیاں“ دوسرے، الْعِصْفَاتِ عَصْفًا ”بہت تیزی اور شدت کے ساتھ چلنے والیاں“ تیسرے، النَّشْرِاتِ نَشْرًا ”خوب پھیلانے والیاں“ چوتھے، الْفَارِقَاتِ فِرْقًا ”الگ کرنے والیاں“ پانچویں، الْمُلْقَاتِ ذِكْرًا ”یاد کا القا کرنے والیاں“ چونکہ ان الفاظ میں صرف صفات بیان کی گئی ہیں، اور یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ کس چیز یا کُن چیزوں کی صفات ہیں، اس لیے مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ پانچوں صفات ایک ہی چیز کی ہیں، یا الگ الگ چیزوں کی، اور وہ چیز یا چیزیں کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ پانچوں سے مراد ہوائیں ہیں۔ دوسرا کہتا ہے پانچوں سے مراد فرشتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے پہلے تین سے مراد ہوائیں ہیں اور باقی دو سے مراد فرشتے۔ چوتھا کہتا ہے پہلے دو سے مراد ہوائیں اور باقی تین سے مراد فرشتے ہیں۔ اور ایک گروہ کی رائے یہ بھی ہے کہ پہلے سے مراد ملائکہ رحمت، دوسرے سے مراد ملائکہ عذاب اور باقی تین سے مراد قرآن مجید کی آیات ہیں۔

ہمارے نزدیک پہلی بات تو یہ قابل غور ہے کہ جب ایک ہی سلسلہ کلام میں پانچ صفات کا مسلسل ذکر کیا گیا ہے اور کوئی علامت بیچ میں ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ کہاں تک ایک چیز کی صفات کا ذکر ہے اور کہاں سے دوسری چیز کی صفات کا ذکر شروع ہوا ہے، تو یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ محض کسی بے بنیاد قیاس کی بنا پر ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں دو یا تین مختلف چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں، بلکہ اس صورت میں نظم کلام خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پوری عبارت کو کسی ایک ہی چیز کی صفات سے متعلق مانا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی شک یا انکار کرنے والوں کو کسی حقیقت غیر محسوس کا یقین دلانے کے لیے کسی چیز یا بعض چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہاں قسم دراصل استدلال کی ہم معنی ہوتی ہے، یعنی اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ چیز یا چیزیں اس حقیقت کے صحیح و برحق ہونے پر دلالت کر رہی ہیں۔ اس غرض کے لیے ظاہر ہے کہ ایک غیر محسوس شے کے حق میں کسی دوسری غیر محسوس شے کو بطور استدلال پیش کرنا درست نہیں ہو سکتا، بلکہ غیر محسوس پر محسوس سے دلیل لانا ہی موزوں اور مناسب ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں صحیح تفسیر یہی ہے کہ اس سے مراد ہوائیں ہیں، اور ان لوگوں کی تفسیر قابل قبول نہیں ہے جنہوں نے ان پانچوں چیزوں سے مراد فرشتے لیے ہیں، کیونکہ وہ بھی اسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح قیامت کا وقوع غیر محسوس ہے۔

اب غور کیجئے کہ قیامت کے وقوع پر ہواؤں کی یہ کیفیات کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ زمین پر جن اسباب سے حیوانی اور نباتی زندگی ممکن ہوتی ہے ان میں سے ایک نہایت اہم سبب ہوا ہے۔ ہر نوع کی زندگی سے اس کی صفات کا جو تعلق ہے وہ بجائے خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی قادر مطلق اور صانع حکیم ہے جس نے اس کڑھ خاک پر زندگی کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور اس غرض کے لیے یہاں ایک ایسی چیز پیدا کی جس کی صفات زندہ مخلوقات کے وجود کی ضروریات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھتی ہیں۔ پھر اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ زمین کو ہوا کا ایک بادل اڑھا کر چھوڑ دیا ہو، بلکہ اپنی قدرت اور حکمت سے اس ہوا میں اس نے بے شمار مختلف کیفیات پیدا کی ہیں جن کا انتظام لاکھوں کروڑوں برس سے اس طرح ہو رہا ہے کہ انہی کی بدولت موسم پیدا ہوتے ہیں، کبھی جلنس ہوتا ہے اور کبھی باد نسیم چلتی ہے، کبھی گرمی آتی ہے اور کبھی سردی، کبھی بادل آتے ہیں اور کبھی آتے ہوئے اڑ جاتے ہیں، کبھی نہایت خوشگوار جھونکے چلتے ہیں اور کبھی انتہائی تباہ کن طوفان آ جاتے ہیں، کبھی نہایت نفع بخش بارش ہوتی ہے اور کبھی کالی پڑ جاتا ہے۔ غرض ایک ہوا نہیں بلکہ طرح طرح کی ہوائیں ہیں جو اپنے اپنے وقت پر چلتی ہیں اور ہر ہوا کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔ یہ انتظام ایک غالب قدرت کا ثبوت ہے جس کے لیے نہ زندگی کو وجود میں لانا خارج از امکان ہو سکتا ہے، نہ اسے مٹا دینا، اور نہ مٹا کر دوبارہ وجود میں لے آنا۔ اسی طرح یہ انتظام کمال درجہ حکمت و دانائی کا ثبوت بھی ہے، جس سے صرف ایک نادان آدمی ہی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ یہ سارا کاروبار محض کھیل کے طور پر کیا جا رہا ہو اور اس کا کوئی عظیم تر مقصد نہ ہو۔ اس حیرت انگیز انتظام کے مقابلے میں انسان اتنا بے بس ہے کہ کبھی وہ نہ اپنے لیے مفید طلب ہوا چلا سکتا ہے نہ اپنے اوپر ہلاکت

فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ۙ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۙ وَإِذَا الْجِبَالُ سُفِفَتْ ۙ
 وَإِذَا الرَّسُلُ أَقْتَتَ ۙ لِأَنَّهُ يَوْمَ أُجِّلَتْ ۙ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۙ
 وَمَا آدْرَاكَ مَا يَوْمَ الْفَصْلِ ۙ وَيْلٌ لِّلْمُكذِّبِينَ ۙ

پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے، اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا، اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے، اور رسولوں کی حاضری کا وقت آپہنچے گا اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی۔ کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تب ہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

نیز ہوا کا طوفان آنے کو روک سکتا ہے۔ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی اور بے شعوری اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے، کبھی نہ کبھی یہی ہوا اُس کو یاد دلاتی ہے کہ اوپر کوئی زبردست اقتدار کار فرما ہے جو زندگی کے اس سب سے بڑے ذریعہ کو جب چاہے اُس کے لیے رحمت اور جیب چاہے بلاکت کا سبب بنا سکتا ہے، اور انسان اس کے کسی فیصلے کو بھی روک دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، الحاشیہ ۷۔ جلد پنجم، الذاریات، حواشی ۱ تا ۴)۔

۷۷ یعنی بے نور ہو جائیں گے اور ان کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

۷۸ یعنی عالم بالا کا وہ بندھا ہوا نظام، جس کی بدولت ہر ستارہ اور سیارہ اپنے مدار پر قائم ہے، اور جس کی بدولت کائنات کی ہر چیز اپنی اپنی حد میں رُک رہتی ہے، تو ٹوڑ ڈالا جائے گا اور اس کی ساری بندشیں کھول دی جائیں گی۔

۷۹ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں جب نوعِ انسانی کا مقدمہ پیش ہوگا تو ہر قوم کے رسول کو شہادت کے لیے پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اس امر کی گواہی دے کہ اُس نے اللہ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ گمراہوں اور مجرموں کے خلاف اللہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حجت ہوگی جس سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ وہ اپنی غلط روش کے خود ذمہ دار ہیں درنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، آیات ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴۔ حواشی ۱۳۲، ۱۳۵۔ جلد چہارم، الزمر، آیت ۶۹، حاشیہ ۸۰۔ جلد ششم، الملک، آیت ۸، حاشیہ ۱۴۔

۸۰ یعنی اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے اُس دن کے آنے کی خبر کو جھوٹ سمجھا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آنا ہے جب انہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کی

أَلَمْ تَهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ۝۱۷ ثُمَّ تَتَّبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ۝۱۸ كَذَلِكَ تَفْعَلُ
 بِالْمُجْرِمِينَ ۝۱۹ وَيَلُومُنَّ يَوْمَئِذٍ لِلْكُذِبِ ۝۱۹ أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ
 مَّهِينٍ ۝۲۰ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ۝۲۱ إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝۲۲
 فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ ۝۲۳ وَيَلُومُنَّ يَوْمَئِذٍ لِلْكُذِبِ ۝۲۳

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا، پھر انہی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے۔ مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا، تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔

جواب وہی کرنی ہوگی۔

۵۸ یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خود اسی دنیا میں اپنی تاریخ کو دیکھ لو۔ جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کو اصل زندگی سمجھا اور اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو خیر و شر کا معیار سمجھ کر اپنا اخلاقی رویہ متعین کیا، بلا استثناء وہ سب آخر کار تباہ ہو کر رہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز کر کے کام کرنے والا اسی طرح نقصان اٹھاتا ہے جس طرح ہر اس شخص کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے جو حقائق سے آنکھیں بند کر کے چلے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۲۔ جلد سوم، النمل، حاشیہ ۸۶۔ الترمذ، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سبأ، حاشیہ ۱۲۵۔

۵۹ یعنی یہ ہمارا مستقل قانون ہے۔ آخرت کا انکار جس طرح پہلے گزری ہوئی قوموں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے، اسی طرح آگے آنے والی قوموں کے لیے بھی یہ ہمیشہ تباہ کن ہی ثابت ہوگا۔ اس سے نہ کوئی قوم پہلے مشنٹی تھی نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

۶۰ یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ دنیا میں ان کا جو انجام ہوا ہے یا آئندہ ہوگا وہ ان کی اصل سزا نہیں ہے، بلکہ اصل تباہی تو ان پر فیصلے کے دن نازل ہوگی۔ یہاں کی پکڑ تو صرف یہ حیثیت رکھتی ہے کہ جب کوئی شخص مسلسل جرائم کرتا چلا جائے اور کسی طرح اپنی بگڑی ہوئی روش سے باز نہ آئے تو آخر کار اسے گرفتار کر لیا جائے۔ عدالت، جہاں اس کے مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے اور اسے اس کے تمام گرتوں کی سزا دی جاتی ہے،

الْمُجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝۲۵ أَحْيَاءٌ وَأَمْوَاتًا ۝۲۶ وَجَعَلْنَا فِيهَا رِوَاسِيَ
شِجَاتٍ وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً فُرَاتًا ۝۲۷ وَيْلٌ لِّمُكذِّبِينَ ۝۲۸

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے، اور تمہیں میٹھا پانی پلایا، تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔

اس دنیا میں قائم نہیں ہوگی بلکہ آخرت میں ہوگی، اور وہی اُس کی تباہی کا اصل دن ہوگا۔ رمزید شریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱۔

۱۱ اصل الفاظ ہیں قَدَّرَ مَعْلُومٌ اس کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ وہ مدت مقرر ہے، بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس کی مدت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ کسی بچے کے متعلق کسی ذریعہ سے بھی انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کتنے مہینے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور سکند ماں کے پیٹ میں رہے گا، اور اس کا ٹھیک وقت ولادت کیا ہوگا۔ اللہ ہی نے ہر بچے کے لیے ایک خاص مدت مقرر کی ہے اور وہی اس کو جانتا ہے۔

۱۲ یعنی رحم مادر، جس میں استقرار حمل ہوتے ہی بچے کو اتنی مضبوطی کے ساتھ جمایا جاتا ہے اور اتنے انتظامات اس کی حفاظت اور پرورش کے کیے جاتے ہیں کہ کسی شدید حادثے کے بغیر اس کا اسقاط نہیں ہو سکتا، اور مصنوعی اسقاط کے لیے بھی غیر معمولی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں جو فرق طب کی جدید ترقیات کے باوجود خطرے اور نقصان سے خالی نہیں ہیں۔

۱۳ یہ حیات بعد موت کے امکان کی صریح دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک حقیر نطفے سے تمہاری ابتدا کر کے تمہیں پورا انسان بنانے پر قادر تھے، تو آخر دوبارہ تمہیں کسی اور طرح پیدا کر دینے پر کیوں قادر نہ ہوں گے؟ ہماری یہ تخلیق، جس کے نتیجے میں تم آج زندہ موجود ہو، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں، ایسے عاجز نہیں ہیں کہ ایک دفعہ پیدا کر کے پھر تمہیں پیدا نہ کر سکیں۔

۱۴ یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ حیات بعد موت کے امکان کی یہ صریح دلیل سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی جو لوگ اُس کو جھٹلا رہے ہیں، وہ آج اُس کا جتنا چاہیں مذاق اڑالیں، اور جس قدر چاہیں اس کے ماننے والوں کو دقیا نوسی، تاریک خیال اور اودھام پرست قرار دیتے رہیں، مگر جب وہ دن آجائے گا جسے یہ جھٹلا رہے ہیں تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ ان کے لیے تباہی کا دن ہے۔

۱۵ یہ آخرت کے ممکن اور معقول ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔ یہی ایک کرۂ زمین ہے جو کہڑوں اور اربوں

انطلقوا الی ما کنتم بہ تکذِبُونَ ﴿۳۹﴾ انطلقوا الی ظلِّ ذی ثلثِ شعبٍ ﴿۴۰﴾

چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے،

سال سے بے حد حساب مخلوقات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، ہر قسم کی نباتات، ہر قسم کے حیوانات اور انسان اس پر جی رہے ہیں، اور سب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کے پیٹ میں سے طرح طرح کے اٹھانے نکلنے چلے آ رہے ہیں۔ پھر یہی زمین ہے جس پر ان تمام اقسام کی مخلوقات کے بے شمار افراد روز مرتے ہیں، مگر ایسا بے نظیر انتظام کر دیا گیا ہے کہ سب کے لاشے اسی زمین میں ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور یہ پھر ہر مخلوق کے نئے افراد کے جینے اور بننے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اس زمین کو سپاٹ گینڈ کی طرح بھی بنا کر نہیں رکھ دیا گیا ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ پہاڑی سلسلے اور فلک بوس پہاڑ قائم کیے گئے ہیں جن کا موسموں کے تغیرات میں، بارشوں کے برسنے میں، دریاؤں کی پیدائش میں، درختوں و ادویوں کے وجود میں، بڑے بڑے شہتیر فراہم کرنے والے درختوں کے اگنے میں، قسم قسم کی معدنیات اور طرح طرح کے پتھروں کی فراہمی میں بہت بڑا دخل ہے۔ پھر اس زمین کے پیٹ میں بھی میٹھا پانی پیدا کیا گیا ہے، اس کی پیٹھ پر بھی میٹھے پانی کی نہریں بہا دی گئی ہیں، اور سمندر کے کھاری پانی سے صاف ستھرے بخارات اٹھا کر بھی ہنظر اہوا پانی آسمان سے برسانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا یہ سب اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک قادر مطلق نے یہ سب کچھ بنایا ہے، اور وہ محض قادر ہی نہیں ہے بلکہ علیم و حکیم بھی ہے؟ اب اگر اس کی قدرت اور حکمت ہی سے یہ زمین اس سرور سامان کے ساتھ اور ان حکمتوں کے ساتھ بنی ہے تو ایک صاحب عقل آدمی کو یہ سمجھنے میں کیوں مشکل پیش آتی ہے کہ اسی کی قدرت اس دنیا کی بساط لپیٹ کر پھر ایک دوسری دنیا نئے طرز پر بنا سکتی ہے، اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے بعد ایک دوسری دنیا بنائے تاکہ انسان سے اُن اعمال کا حساب لے جو اُس نے اس دنیا میں کیے ہیں؟

۱۶۵ یہاں یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ خدا کی قدرت اور حکمت کے یہ کرشمے دیکھ کر بھی آخرت کے ممکن اور معقول ہونے کا انکار کر رہے ہیں اور اس بات کو جھٹلا رہے ہیں کہ خدا اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا پیدا کرے گا اور اُس میں انسان سے اُس کے اعمال کا حساب لے گا، وہ اپنی اس خام خیالی میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو رہیں۔ جس روز یہ سب کچھ اُن کی توقعات کے خلاف پیش آ جائے گا اس روز انہیں پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے یہ حماقت کر کے خود اپنے لیے تباہی مول لی ہے۔

۱۶۶ اب آخرت کے دلائل دینے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ واقع ہو جائے گی تو وہاں ان منکوبین کا حشر کیا ہوگا۔

۱۶۷ سائے سے مراد صوفیوں کا سایہ ہے۔ اور تین شاخوں کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بہت بڑا دھواں اٹھتا ہے تو اوپر جا کر وہ کئی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

لَا ظِلِيلٌ وَلَا نُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ۝۳۱ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرِّ كَالْقَصْرِ ۝
 كَأَنَّهُ جِمَلَتٌ صُفْرٌ ۝۳۲ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝۳۳ هَذَا يَوْمٌ
 لَا يَنْطِقُونَ ۝۳۴ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۝۳۵ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ
 لِلْمُكَذِّبِينَ ۝۳۶ هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعَكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ۝۳۷ فَإِنْ كَانَ

نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں
 پھینکے گی (جو اچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ تباہی ہے اس روز
 جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انہیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں۔
 تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر

۱۹ یعنی ہر چنگاری ایک قصر جیسی بڑی ہوگی، اور جب یہ بڑی بڑی چنگاریاں اٹھ کر بھٹیں گی اور چاروں
 طرف اُڑنے لگیں گی تو یوں محسوس ہوگا جیسے زرد رنگ کے اونٹ اچھل کود کر رہے ہیں۔

۲۰ یہ ان کی آخری حالت ہوگی جو جہنم میں داخلہ کے وقت ان پر طاری ہوگی۔ اس سے پہلے میدانِ حشر
 میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈالی کر
 خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے، حتیٰ کہ
 بعض لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے، جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر
 بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے ان کا مجرم ہونا پوری طرح ثابت کر دیا جائے گا، اور جب ان کے اپنے ہاتھ
 پاؤں اور ان کے اعضاء تک ان کے خلاف گواہی دے کر ثبوتِ جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے، اور جب بالکل سچا
 اور برحق طریقے سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے انہیں سزا سنائی جائے گی تو وہ دم بخود رہ جائیں گے
 اور ان کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کا موقع نہ دینے یا اس کی اجازت نہ
 دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے
 کہ ان کا جرم اس طرح قطعی ناقابلِ انکار حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ وہ اپنی معذرت میں کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ یہ ایسا

لَكُمْ كَيْدًا فَيَكِيدُونَ ﴿٣٩﴾ وَيَلُومُنَ الْيَوْمَئِذٍ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٠﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي
 ظِلِّ وَعُيُونٍ ﴿٤١﴾ وَقَوَائِكَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٤٢﴾ كَلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا
 كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّكَ كَذَلِكَ بِنُحْرَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٤٤﴾ وَيَلُومُنَ
 لِمُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾ كَلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ فَجْرُمُونَ ﴿٤٦﴾ وَيَلُومُنَ

کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو۔ تباہی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔
 متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (اُن کے لیے حاضر ہیں)۔ کھاؤ
 اور پیو مزے سے اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے
 ہیں۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔

کھاؤ اور مزے کر لو تھوڑے دن۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اُس روز

ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں نے اُس کو بولنے نہیں دیا، یا میں نے اس کی زبان بند کر دی، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے
 کہ میں نے اس پر ایسی حجت تمام کی کہ اُس کے لیے زبان کھولنے یا کچھ بولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔
 ۵۲۱ یعنی دنیا میں تو تم بہت مکاریاں اور چال بازی کرتے رہے، اب یہاں کوئی چال چل کر میری پکڑ
 سے بچ سکتے ہو تو ذرا بچ دکھاؤ۔

۵۲۲ چونکہ یہ لفظ یہاں مُکَذِّبِينَ (جھٹلانے والوں) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لیے متقیوں سے مراد
 اس جگہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو جھٹلانے سے پرہیز کیا اور اُس کو مان کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی
 کہ میں آخرت میں اپنے اقوال و افعال اور اپنے اخلاق و کردار کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

۵۲۳ یہ فقرہ اس معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ اُن کے لیے ایک مصیبت تو وہ ہوگی جو اوپر بیان ہو چکی ہے
 کہ میدانِ حشر میں وہ مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے، علی الاطلاق ان کے جرائم اس طرح ثابت کر دیے
 جائیں گے کہ ان کے لیے زبان کھولنے تک کا یا راند رہے گا، اور آخر کار جہنم کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ دوسری
 مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوگی کہ وہی ایمان لانے والے جن سے اُن کی عمر بھر لڑائی رہی، جنہیں وہ بیوقوف
 اور تنگ خیال اور رجحت پسند کہتے رہے، جن کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور جنہیں اپنے نزدیک حقیر و ذلیل سمجھتے
 رہے، انہی کو وہ جنت میں مزے اڑاتے دیکھیں گے۔

۵۲۴ اب کلام ختم کرتے ہوئے نہ صرف کفارِ مکہ کو بلکہ دنیا کے تمام کفار کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کلمات

لِّلْمُكذِّبِينَ ﴿۳۷﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴿۳۸﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ
لِّلْمُكذِّبِينَ ﴿۳۹﴾ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿۴۰﴾

جھٹلانے والوں کے لیے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھک کر تو نہیں جھکتے۔ نباہی
ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے۔ اب اس (قرآن) کے بعد اور کونسا کلام ایسا ہو سکتا ہے
جس پر یہ ایمان لائیں ۹ ۷

ارشاد فرمائے جا رہے ہیں۔

۵۲۵ یعنی دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں۔

۵۲۶ اللہ کے آگے جھکنے سے مراد صرف اس کی عبادت کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے صحیح ہونے رسول
اور اس کی نازل کردہ کتاب کو ماننا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

۵۲۷ یعنی جو بڑی سے بڑی چیز انسان کو حق و باطل کا فرق سمجھانے والی اور ہدایت کا راستہ دکھانے
والی ہو سکتی تھی وہ قرآن کی صورت میں نازل کر دی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر یا سن کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا تو
اس کے بعد پھر اور کیا چیز ایسی ہو سکتی ہے جو اس کو راہِ راست پر لاسکے ؟

نصير المومنين

الشكا

(٦٨)

النَّبَا

نام | دوسری آیت کے فقرے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ کے لفظ النَّبَا کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس سورۃ کے مضامین کا عنوان بھی ہے، کیونکہ نبأ سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے اور سورۃ میں ساری بحث اسی پر کی گئی ہے۔

زماثہ نزول | جیسا کہ ہم سورۃ مُرْسَلَات کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سورۃ قیامت سے سورۃ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور یہ سب مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔

موضوع اور مضمون | اس کا مضمون بھی وہی ہے جو سورۃ مُرْسَلَات کا ہے، یعنی قیامت اور آخرت کا اثبات، اور اُس کو ماننے یا نہ ماننے کے نتائج سے لوگوں کو خبردار کرنا۔

مکہ معظمہ میں جب اول اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہو گا جس میں تمام اولین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے دنیا میں کام کیا تھا، پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

ان تینوں باتوں میں سے پہلی بات اگرچہ اہل مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے، اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اِس لیے جھگڑا صرف اِس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات میں اور الوہیت کی ذات میں اُن کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو کتے کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اِس امر سے انکار کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضور نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنہی کے درمیان

گزاری تھی، اس میں انہوں نے کبھی آپ کو مجھوٹا یا فریب کار، یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بتندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانا تو دور گزار اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی کہ حضور سارے معاملات میں تو راستباز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہل مکہ کے لیے دراصل اتنی زیادہ الجھن کی موجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اڑایا، اُسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا، اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اتارا جائے، کیونکہ اس عقیدے کو ماننے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں اُن کا طرزِ فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں اُن کا معیارِ اقدار بدل سکتا، اور وہ دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام اُن کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جن سے توحید کا تصور بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے، اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصر اُدے دیے گئے ہیں۔

اس دور کی سورتوں میں آخرت کے مضمون کی اس تکرار کا سبب اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب اس سورۃ کے مضامین پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ اس میں سب سے پہلے اُن چہرچوں اور چہرچہ مگوئیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو قیامت کی خبر سن کر مکہ کے ہر کو چہ و بازار اور اہل مکہ کی ہر محفل میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد انکار کرنے والوں سے پوچھا گیا ہے کہ کیا تمہیں یہ زمین نظر نہیں آتی جسے ہم نے تمہارے لیے فرش بنا رکھا ہے؟ کیا یہ بلند و بالا پہاڑ تمہیں نظر نہیں آتے جنہیں ہم نے زمین میں گاڑ رکھا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہم نے تمہیں مردوں اور عورتوں کے بوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے؟ کیا تم اپنی نیند کو نہیں دیکھتے جس کے ذریعہ سے ہم نے تم کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنائے رکھنے کے لیے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد ہر چند گھنٹے آرام لینے پر مجبور کر رکھا ہے؟ کیا تم رات اور دن کی آمد و رفت کو نہیں دیکھتے جسے ٹھیک تمہاری ضرورت کے مطابق ہم باقاعدگی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں؟ کیا تم اپنے اوپر آسمانوں کے مضبوط

بندھے ہوئے نظام کو نہیں دیکھتے، کیا یہ سورج تمہیں نظر نہیں آتا جس کی بدولت تمہیں روشنی اور حرارت میسر آرہی ہے؟ کیا تم اُن بارشوں کو نہیں دیکھتے جو بادلوں سے برس رہی ہیں اور اُن کے ذریعہ سے غلے اور سبزیاں اور گھنے باغ اگ رہے ہیں؟ یہ ساری چیزیں کیا تمہیں یہی بتا رہی ہیں کہ جس قادرِ مطلق نے ان کو پیدا کیا ہے اُس کی قدرت قیامت لانے اور آخرت برپا کرنے سے عاجز ہے؟ اور اس پورے کارخانے میں جو کمال درجے کی حکمت و دانائی صریحاً کارفرما ہے کیا اس کو دیکھتے ہوئے تمہاری سمجھ میں ہی آتا ہے کہ اس کارخانے کا ایک ایک جز اور ایک ایک فعل تو بامقصد ہے مگر بجائے خود پورا کارخانہ بے مقصد ہے؟ آخر اس سے زیادہ لغو اور بے معنی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کارخانے میں انسان کو پیش دست (Foreman) کے منصب پر مامور کر کے اسے یہاں بٹھے وسیع اختیارات تو دے دیے جائیں مگر جب وہ اپنا کام پورا کر کے یہاں سے رخصت ہو تو اسے یونہی چھوڑ دیا جائے؟ نہ کام بنانے پر نیشن اور انعام، نہ کام بگاڑنے پر باز پرس اور سزا؟

یہ دلائل دینے کے بعد پورے زور کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ فیصلے کا دن یقیناً اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گا۔ صور میں بس ایک پھونک مارنے کی دیر ہے، وہ سب کچھ جس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے سامنے آ جائے گا اور تم آج چلے مانویا نہ مانو، اُس وقت جہاں جہاں بھی تم مرے پڑے ہو گے وہاں سے فوج در فوج اپنا حساب دینے کے لیے نکل آؤ گے۔ تمہارا انکار اس واقعہ کو پیش آنے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے بعد آیت ۲۱ سے ۲۰ تک بتایا گیا ہے کہ جو لوگ حساب کتاب کی توقع نہیں رکھتے اور جنہوں نے ہماری آیات کو ٹھٹھا دیا ہے، ان کا ایک ایک کرتوت گن گن کر ہمارے ہاں لکھا ہوا ہے، اور اُن کی خبر لینے کے لیے جہنم گھات لگائے ہوئے تیار ہے جہاں ان کے اعمال کا بھروسہ بدلہ انہیں دے دیا جائے گا۔ پھر آیت ۳۱ سے ۲۶ تک اُن لوگوں کی بہترین جزا بتائی گئی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو ذمہ دار و جواب دہ سمجھ کر دنیا میں اپنی آخرت درست کرنے کی پہلے ہی فکر کر لی ہے، اور انہیں اطمینان دلایا گیا ہے کہ انہیں ان کی خدمات کا صرف اجر ہی نہیں دیا جائے گا بلکہ اس سے زائد کافی انعام بھی دیا جائے گا۔

آخر میں خدا کی عدالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہاں کسی کے اڑ کر بیٹھ جانے اور اپنے منوسلین کو بخشوا کر چھوڑنے کا کیا سوال، کوئی بلا اجازت زبان تک نہ کھول سکے گا، اور اجازت بھی اس شرط کے ساتھ ملے گی کہ جس کے حق میں سفارش کا اذن ہو صرف اسی کے لیے سفارش کرے اور سفارش میں کوئی بے جا بات نہ کہے۔ نیز سفارش کی اجازت صرف اُن لوگوں کے حق میں دی

جانے گی جو دنیا میں کلمہ حق کے قائل رہے ہیں اور محض گناہ گار ہیں۔ خدا کے باغی اور حق کے منکر کسی سفارش کے مستحق نہ ہوں گے۔

پھر کلام کو اس تشبیہ پر ختم کیا گیا ہے کہ جس دن کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُس کا آنا برحق ہے، اُسے دُور نہ سمجھو، وہ قریب ہی آنگا ہے، اب جس کا جی چاہے اسے مان کر اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔ لیکن اس تشبیہ کے باوجود جو اُس کا انکار کرے گا اس کا سارا کیا دھرا اُس کے سامنے آ جائے گا اور پھر وہ پچھتا پچھتا کر کہے گا کہ کاش میں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اُس وقت اُس کا یہ احساس اُسی دنیا کے بارے میں ہو گا جس پر وہ آج لٹو ہو رہا ہے۔



سُورَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ

اياتها ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِي هُمْ فِيْهِ

مُخْتَلِفُونَ ۝۳ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝۵

یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں، کیا اُس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائیگا۔ ہاں ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

۱۔ بڑی خبر سے مراد قیامت اور آخرت کی خبر ہے جس کو اہل مکہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سنتے تھے، پھر ہر محفل میں اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ پوچھ گچھ سے مراد یہی چہ میگوئیاں ہیں۔ لوگ جب ایک دوسرے سے ملنے ملنے تو کہتے تھے کہ بھائی، کبھی پہلے بھی تم نے سنا ہے کہ مر کے کوئی دوبارہ زندہ ہوگا؟ کیا یہ ماننے کے قابل بات ہے کہ گل سڑ کر جو ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں ان میں نئے سرے سے جان پڑے گی؟ کیا عقل میں یہ بات سماتی ہے کہ اگلی پھلی ساری نسلیں اٹھ کر ایک جگہ جمع ہوں گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بڑے بڑے جھے ہوٹے پھاڑ پھاڑیوں میں روٹی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ چاند سورج اور تارے سب بچھ کر رہ جائیں اور دنیا کا یہ سارا جہاں نظام الٹ پلٹ ہو جائے؟ یہ صاحب جو کل تک اچھے خاصے دانا آدمی تھے آج انہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں ایسی عجیب انہونی خبریں سنارہے ہیں۔ یہ جنت اور یہ دوزخ آخر پہلے کہاں تھیں جن کا ذکر ہم نے کبھی ان کی زبان سے نہ سنا تھا؟ اب یہ ایک دم کہاں سے نکل آئی ہیں کہ انہوں نے ان کے عجیب و غریب نقشے ہمارے سامنے کھینچنے شروع کر دیے ہیں؟

هُم فِيْهِ مُخْتَلِفُونَ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ”وہ اس کے بارے میں مختلف چہ میگوئیاں کر رہے ہیں“ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کے انجام کے بارے میں یہ لوگ خود بھی کوئی ایک متفق علیہ عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ ان کے درمیان اس کے متعلق مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی عیسائیوں کے خیالات سے متاثر تھا اور زندگی بعد موت کو ماننا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ وہ دوسری زندگی جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوگی۔ کوئی آخرت کا قطعی منکر نہ تھا مگر اسے شک تھا کہ وہ ہو سکتی ہے یا نہیں، چنانچہ قرآن مجید ہی میں اس خیال کے لوگوں کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِيْنَ، ”ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں یقین ہم کو نہیں ہے“ (الباقیہ آیت ۲۳۱)

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهْدًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ
أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَكُمْ سُبُلًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لَيْسًا ۝

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا، اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا، اور تمہیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا، اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا، اور رات کو پروردہ پوش

اور کوئی بالکل صاف کتنا تھا کہ ان ہی الْأَحْيَاءُ تَنَا الدُّنْيَا وَمَا فَخْنُ بِمَبْعُوثِينَ، ”جو کچھ بھی ہے بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم ہرگز مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے“ (الانعام - آیت ۲۹)۔ پھر کچھ لوگ ان میں سے دہریے تھے اور کہتے تھے کہ مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ”زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہمیں ہم مرتے اور جیتتے ہیں اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو“ (الحجاشیہ - ۲۲)۔ اور کچھ دوسرے لوگ دہریے تھے مگر دوسری زندگی کو ناممکن قرار دیتے تھے، یعنی ان کے نزدیک یہ خدا کی قدرت سے خارج تھا کہ وہ مرے ہوئے انسانوں کو پھر سے زندہ کر سکے۔ ان کا قول تھا مَنْ يُحْيِي الْعِظَاةَ وَهِيَ رَمِيمٌ، ”کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟“ (یس - ۷۸)۔ یہ ان کے مختلف اقوال خود ہی اس بات کا ثبوت تھے کہ ان کے پاس اس مسئلے میں کوئی علم نہ تھا، بلکہ وہ محض گمان و قیاس کے تیرتکے چل رہے تھے، ورنہ علم ہوتا تو سب کسی ایک بات کے قائل ہوتے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد پنجم، الذاریات، حاشیہ ۶)۔

۱۷ یعنی آخرت کے متعلق جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں سب غلط ہیں۔ جو کچھ انہوں نے سمجھ رکھا ہے

وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۱۸ یعنی وہ وقت دور نہیں ہے جب وہی چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آ جائے گی جس کے بارے میں یہ

فضول چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ اُس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ رسول نے جو خبر ان کو دی تھی وہی صحیح تھی اور قیاس و گمان سے جو باتیں یہ بنا رہے تھے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

۱۹ زمین کو انسان کے لیے فرش، یعنی ایک پُر سکون قیام گاہ بنانے میں قدرت و حکمت کے جو کمالات کار فرما

ہیں ان پر اس سے پہلے تفسیر القرآن میں متعدد مقامات پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر مقامات ذیل

ملاحظہ ہوں: تفسیر القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱ وَبَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲
وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَاجًا ۝۱۳ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً
ثَجَّاجًا ۝۱۴ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝۱۵ وَجَعَلْنَا الْفَاكَا ۝۱۶

اور دن کو معاش کا وقت بنایا، اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے، اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا، اور بادلوں سے لگاتار بارش برساتی تاکہ اس کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گھنے باغ اگائیں؟

۱۵ انسان کو مردوں اور عورتوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا اپنے اندر جو عظیم حکمتیں رکھتا ہے ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۶۹، الروم، حواشی ۲ تا ۳۸۔ جلد چہارم، یس، حاشیہ ۳۱۔ الشوری، حاشیہ ۷۷۔ الزخرف، حاشیہ ۱۲۔ جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۲۵۔

۱۶ انسان کو دنیا میں کام کرنے کے قابل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس حکمت کے ساتھ اس کی فطرت میں منید کا ایک ایسا داعیہ رکھ دیا ہے جو ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے چند گھنٹے سونے پر مجبور کر دیتا ہے اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد سوم۔ الروم، حاشیہ ۳۳ میں کر چکے ہیں۔

۱۷ یعنی رات کو اس غرض کے لیے تاریک بنا دیا کہ اس میں تم روشنی سے محفوظ رہ کر زیادہ آسانی کے ساتھ نیند کا سکون حاصل کر سکو، اور دن کو اس مقصد سے روشن بنایا کہ اس میں تم زیادہ سہولت کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کام کر سکو۔ زمین پر باقاعدگی کے ساتھ مسلسل رات اور دن کا الٹ پھیر کرتے رہنے کے بے شمار فوائد میں سے صرف اس ایک فائدے کی طرف اشارہ یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ بے مقصد، یا اتفاقاً نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک بڑی حکمت کام کر رہی ہے جس کا براہ راست تمہارے اپنے مفاد سے گہرا تعلق ہے۔ تمہارے وجود کی ساخت اپنے سکون و راحت کے لیے جس تاریکی کی طالب تھی وہ رات کو، اور اپنی معیشت کے لیے جس روشنی کی طالب تھی وہ دن کو مینا کی گئی ہے۔ تمہاری ضروریات کے عین مطابق یہ انتظام خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ کسی حکیم کی حکمت کے بغیر نہیں ہوا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۶۵۔ جلد چہارم، یس، حاشیہ ۳۲۔ المؤمن، حاشیہ ۸۵۔ الزخرف، حاشیہ ۴۲)۔

۱۸ مضبوط کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ ان کی سرحدیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان میں ذرہ برابر تغیر و تبدل نہیں ہونے پاتا اور ان سرحدوں کو پار کر کے عالم بالا کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کوئی نہ ایک دوسرے سے ٹکرانا ہے نہ تمہاری زمین پر آگرتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۲)۔

جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حواشی ۸ و ۱۲۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۱۳۔ یس، حاشیہ ۳۷۔ الصافات، حواشی ۵۔ ۶۔ المؤمن، حاشیہ ۹۔ جلد پنجم، ق، حواشی ۷۔ ۸۔

نلہ مراد ہے سورج۔ اصل میں لفظ **وہا** ج استعمال ہوا ہے جس کے معنی نہایت گرم کے بھی ہیں اور نہایت روشن کے بھی، اس لیے ترجمہ میں ہم نے دونوں معنی درج کر دیے ہیں۔ اس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے جس غلیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور اس کا حجم زمین کے حجم سے ۲ لاکھ ۲۲ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جملانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے، اور اس کی گرمی کا حال یہ ہے کہ زمین کے بعض حصوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجہ حرارت ۴۰ ڈگری فابرن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک ایسے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد، اسی وجہ سے ہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں جو ہمارے لیے سبب حیات بنے ہوئے ہیں۔ اسی سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے۔ اسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظام شمسی میں پھینکے چلی جا رہی ہے۔

اللہ زمین پر بارش کے انتظام اور نباتات کی روئیدگی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کے جو جو حیرت انگیز کمالات کار فرما ہیں ان پر تفصیل کے ساتھ تفسیر القرآن کے حسب ذیل مقامات پر روشنی ڈالی گئی ہے: جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳ الف۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۷۱۔ الشعراء، حاشیہ ۵۔ الروم، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، قاطر، حاشیہ ۱۹۔ یس، حاشیہ ۲۹۔ المؤمن، حاشیہ ۲۰۔ الزخرف، حواشی ۱۰۔ ۱۱۔ جلد پنجم، الواقعة، حواشی ۲۸ تا ۳۰۔

ان آیات میں پے درپے بہت سے آثار و شواہد کو پیش کر کے قیامت اور آخرت کے منکرین کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم آنکھیں کھول کر زمین اور پہاڑوں اور خود اپنی پیدائش اور اپنی نیند اور بیداری اور روز و شب کے اس نظام کو دیکھو، کائنات کے بندھے ہوئے نظام اور آسمان کے چمکتے ہوئے سورج کو دیکھو، بادلوں سے برسنے والی بارش اور اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھو، تو تمہیں دو باتیں ان میں نمایاں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ یہ سب کچھ ایک زبردست قدرت کے بغیر نہ وجود میں آسکتا ہے، نہ اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر ایک عظیم حکمت کام کر رہی ہے اور کوئی کام بھی بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ اب یہ بات صرف ایک نادان ہی کہہ سکتا ہے کہ جو قدرت ان ساری چیزوں کو وجود میں لانے پر قادر ہے وہ انہیں فنا کر دینے اور

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ قَتَاوُنٌ أُنْوَاجًا ۝
وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝

بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے جس روز صور میں پھونک مار دی جائے گی،
تم فوج در فوج نکل آؤ گے۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر
رہ جائے گا، اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے۔

دوبارہ کسی اور صورت میں پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی صرف ایک بے عقل ہی کہہ سکتا ہے کہ
جس حکیم نے اس کائنات میں کوئی کام بھی بے مقصد نہیں کیا ہے اس نے اپنی دنیا میں انسان کو سمجھ بوجھ، خیر و شر
کی تمیز، ملاحظت و عصبان کی آزادی، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے اختیارات بے مقصد ہی دے ڈالے
ہیں، انسان اُس کی دی ہوئی ان چیزوں کو اچھی طرح استعمال کرے یا بری طرح، دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ
نہیں نکلتا، کوئی بھلائیاں کرتے کرتے مر جائے تو بھی مٹی میں مل کر ختم ہو جائے گا اور بُرائیاں کرتے کرتے مر جائے
تو بھی مٹی ہی میں مل کر ختم ہو جائے گا، نہ بھلے کو اس کی بھلائی کا کوئی اجر ملے گا، نہ بُرے سے اس کی بُرائی پر کوئی باز پرس
ہوگی نہ زندگی بعد موت اور قیامت و آخرت پر یہی دلائل ہیں جو جگہ جگہ قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور
پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفسیر القرآن، جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۔ الروم، حاشیہ ۶۔
جلد چہارم، سبأ، حواشی ۱۰-۱۲۔ الصافات، حواشی ۸-۹۔

۱۵ اس سے مراد وہ آخری نَفخِ صور ہے جس کا آواز بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان یکایک جی اٹھیں گے،
اور تم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اُس وقت مخاطب تھے، بلکہ وہ تمام انسان ہیں جو آغازاً فریض سے قیامت
تک پیدا ہوئے ہوں (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۔
جلد چہارم، یس، حواشی ۶-۷۔ الزمر، حاشیہ ۷۹)۔

۱۶ اس مقام پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں بھی قرآن کے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح قیامت
کے مختلف مراحل کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں اُس کیفیت کا ذکر ہے جو آخری نَفخِ صور کے وقت پیش
آئے گی، اور بعد کی دو آیتوں میں وہ حالت بیان کی گئی ہے جو دوسرے نَفخِ صور کے موقع پر رونما ہوگی۔ اس کی وضاحت
ہم تفسیر القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۃ الحاقہ، حاشیہ ۱۰ میں کر چکے ہیں۔ آسمان کھول دیا جائے گا“ سے مراد یہ ہے کہ
عالم بالا میں کوئی بندش اور رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور ہر طرف سے ہر آفتِ سماوی اس طرح ٹوٹی پڑے گی کہ معلوم
ہوگا گویا اس کے آنے کے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور اس کو روکنے کے لیے کوئی دروازہ بھی بند نہیں رہا ہے۔
پہاڑوں کے چلنے اور سراب بن کر رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اڑیں گے

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۚ لِلظَّالِمِينَ مَابًا ۚ لَبِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝۳۳

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے، سرکشوں کا ٹھکانا، جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔

اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر اس طرح پھیل جائیں گے کہ جہاں پہلے کبھی پہاڑ تھے وہاں ریت کے وسیع میدانوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی کیفیت کو سورہ ظہر میں یوں بیان کیا گیا ہے: ”یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر اُس دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے؟ ان سے کہو میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چھیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ تک نہ دیکھو گے“ (آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ مع حاشیہ ۸۳)۔

۱۴ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جو شکار کو پھانسنے کے لیے بنائی جاتی ہے تاکہ وہ بے خبری کی حالت میں آئے اور اچانک اس میں پھنس جائے۔ جہنم کے لیے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خدا کے باغی اُس سے بے خوف ہو کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے اچھل کود کرتے پھر رہے ہیں کہ خدا کی خدائی اُن کے لیے ایک کھلی آماجگاہ ہے، اور یہاں کسی پکڑ کا خطرہ نہیں ہے، لیکن جہنم اُن کے لیے ایک ایسی چھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ یکایک پھنسیں گے اور بس پھنس کر ہی رہ جائیں گے۔

۱۵ اصل میں لفظ اُحْقَاب استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں پے در پے آنے والے طویل زمانے، ایسے مسلسل ادوار کہ ایک دور ختم ہوتے ہی دوسرا دور شروع ہو جائے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہوگی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہوگی، کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں، بہر حال جب مدتوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے یہی تصور ہوتا ہے کہ وہ لامتناہی نہ ہونگی بلکہ کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے اُحْقَاب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو، اس لیے اُحْقَاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائیگا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دور نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہوتا ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہل جہنم کے لیے خلود ہمیشگی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تین جگہ صرف لفظ اُحْقَاب ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس پر ابداً ہمیشہ ہمیشہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، اور ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ ”وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں، مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے“ (المائدہ، آیت ۳۷)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ ”اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے“ اور یہی بات اہل جنت کے متعلق بھی فرمائی گئی ہے کہ ”جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے“ (دہود، آیات ۱۰۷-۱۰۸)۔ ان تصریحات کے بعد لفظ اُحْقَاب کی بنیاد پر یہ

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝۲۷ إِلَّا حِيمًا وَغَسَاقًا ۝۲۸ جَزَاءً
وَفَاقًا ۝۲۹ إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝۳۰ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَابًا ۝۳۱
وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۝۳۲ فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۝۳۳
إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝۳۴ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ۝۳۵ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝۳۶

اُس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ چکھیں گے، کچھ لے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون (اُن کے کرتوتوں) کا بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلایا تھا، اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔

یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے، باغ اور انگور، اور فوخیز ہم سن رکھیں

کننے کی آخر کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا بلکہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا۔

۱۷۷ اصل میں لفظ غساق استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق پیپ، لہو، کچ لہو، اور آنکھوں اور کھالوں سے بننے والی اُن تمام رطوبتوں پر ہوتا ہے جو شدید تعدی کی وجہ سے بہ نکلتی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ لفظ ایسی چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس میں سخت تعفن اور سڑا ہوا ہو۔

۱۷۸ یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر وہ جہنم کے اس خوفناک عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ایک یہ کہ دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے کہ کبھی وہ وقت نہیں آتا ہے جب انہیں خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے اُن کی ہدایت کے لیے جو آیات بھیجی تھیں انہیں ماننے سے انہوں نے قطعی انکار کر دیا اور ان کو جھوٹ قرار دیا۔

۱۷۹ یعنی اُن کے اقوال و افعال، ان کی حرکات و سکنات، حتیٰ کہ ان کی نیتوں اور خیالات اور مقاصد تک کا کھل ریکارڈ ہم تیار کرتے جا رہے تھے جس سے کوئی چیز چھوٹی ہوئی نہ تھی، اور وہ بے وقوف اس سے بے خبر اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ کسی اندھیر نگری میں جی رہے ہیں جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہش سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، اُس کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

۱۸۰ یہاں متقیوں کا لفظ اُن لوگوں کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جو کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے

وَكَا سَادِهَا قَاتًا ۝ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذْبًا ۝ جَزَاءً مِمَّنْ
 رَبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا ۝ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا
 الرَّحْمَنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَ
 الْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۝ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ

اور ٹھہکتے ہوئے جام۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سُنیں گے۔ جزاء اور کافی انعام تمہارے
 رب کی طرف سے اُس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں کا اور ان کے درمیان
 کی ہر چیز کا مالک ہے جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یا رانہیں۔

جس روز رُوح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہونگے کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جسے رحمن اجازت دے

اور جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا۔ اس لیے لامحالہ اس لفظ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی آیات
 کو مانا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ انہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

۵۱۷ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں ہم سن ہوں گی، اور یہ بھی کہ وہ اُن لوگوں کی ہم سن ہوں گی
 جن کی زندگی میں وہ دی جائیں گی۔ سورہ ص، آیت ۵۲، اور سورہ واقعه آیت ۳۷ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔

۵۱۸ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس بات کو جنت کی بڑی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے کہ آدمی کے کان ہاں
 بیہودہ اور جھوٹی اور گندی باتیں سننے سے محفوظ رہیں گے۔ وہاں کوئی یا دہ گوئی اور فضول گپ بازی نہ ہوگی، کوئی
 کسی سے نہ جھوٹ بولے گا نہ کسی کو جھٹلائے گا، دنیا میں کالم گلوچ، ہتھان، افزا، ٹمٹ اور الزام تراشیوں کا جو
 طوفان برپا ہے، اس کا کوئی نام و نشان وہاں نہ ہوگا (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، ہریم
 حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۱۳-۱۴)۔

۵۱۹ جزاء کے بعد کافی انعام دینے کا ذکر یہ معنی رکھتا ہے کہ اُن کو صرف وہی جزا نہیں دی جائے گی جس کے
 وہ اپنے نیک اعمال کی بنا پر مستحق ہوں گے، بلکہ اس پر مزید انعام اور کافی انعام بھی انہیں دیا جائے گا۔ اس کے
 برعکس اہل جہنم کے بارے میں صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ انہیں ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ دے دیا جائے گا، یعنی
 نہ ان کے جرائم سے کم سزا دی جائے گی، نہ اس سے زیادہ۔ یہ بات قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر وضاحت
 کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثلاً یونس، آیات ۲۶-۲۷۔ النمل، آیات ۸۹-۹۰۔ القصص، آیت ۸۴۔ سبا،
 آیات ۳۳ تا ۳۸۔ المؤمن، آیت ۴۰۔

وَقَالَ صَوَابًا ۝۳۸ ذَلِكِ الْيَوْمِ الْحَقُّ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ
مَا بَا ۝۳۹ إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا هُوَ يُنظَرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ
يَدُهُ وَيَقُولُ الْكِفْرُ يُلَيِّتُنِي كُنْتُ تُرَابًا ۝۴۰

اور جو ٹھیک بات کہئے۔ وہ دن برحق ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا
راستہ اختیار کرے۔

ہم نے تم لوگوں کو اُس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آگاہ ہے جس روز آدمی وہ
سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور کافر پکاراٹھے گا کہ کاش
میں خاک ہوتا۔ ۷

۵۲۳ یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الہی کے رعب کا یہ عالم ہو گا کہ اہل زمین ہوں یا اہل آسمان، کسی کی بھی یہ مجال
نہ ہوگی کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حضور زبان کھول سکے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔

۵۲۴ اہل تفسیر کی اکثریت کا خیال یہی ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ان کا جو بلند مرتبہ اللہ
تعالیٰ کے ہاں ہے اس کی وجہ سے ملائکہ سے الگ ان کا ذکر کیا گیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،
جلد ششم، المعارج، حاشیہ ۳)۔

۵۲۵ بولنے سے مراد شفاعت ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک
شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُس
کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور درست بات کہے، بے جا نوعیت
کی سفارش نہ کرے، اور جس کے معاملہ میں وہ سفارش کر رہا ہو وہ دنیا میں کم از کم کلمہ حق کا قائل رہا ہو، یعنی
محض گناہ کار ہو، کافر نہ ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۸۱۔
جلد دوم، یونس، حاشیہ ۵۔ ہود، حاشیہ ۱۰۶۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۲۔ طہ، حواشی ۸۵-۸۶۔ الانبیاء،
حاشیہ ۲۷۔ جلد چہارم، سبا، حواشی ۴۰-۴۱۔ المؤمن، حاشیہ ۳۲۔ الزخرف، حاشیہ ۶۸۔ جلد پنجم، النجم،
حاشیہ ۲۱۔ جلد ششم، المدثر، حاشیہ ۳۶)۔

۵۲۶ بظاہر ایک آدمی یہ خیال کر سکتا ہے کہ جن لوگوں کو خطاب کر کے یہ بات کہی گئی تھی ان کو مرے ہوئے
اب ۱۲ سو سال گزر چکے ہیں، اور اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیامت آئندہ کتنے سو، یا کتنے ہزار، یا کتنے لاکھ برس

بعد آئے گی۔ پھر یہ بات کس معنی میں کہی گئی ہے کہ جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ قریب آگاہ ہے اور سورۃ کے آغاز میں یہ کیسے کہا گیا ہے کہ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو وقت کا احساس صرف اسی وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اس دنیا میں زمان و مکان کی حدود کے اندر جسمانی طور پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ مرنے کے بعد جب صرف روح باقی رہ جائے گی، وقت کا احساس و شعور باقی نہ رہے گا، اور قیامت کے روز جب انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا اس وقت اسے یوں محسوس ہوگا کہ ابھی سوتے سوتے اسے کسی نے جگا دیا ہے۔ اس کو یہ احساس بالکل نہیں ہوگا کہ وہ ہزار ہا سال کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طہ، حاشیہ ۸۰۔ جلد چہارم، یس، حاشیہ ۴۸)۔

۵۲۷ یعنی دنیا میں پیدا ہی نہ ہوتا، یا سرکرمی میں مل جاتا اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کی نوبت نہ آتی۔

تفسير القرآن

التزعت

(69)

التَّارِعَاتُ

نام | پہلے ہی لفظ وَالتَّارِعَاتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ یہ سورہ نباء (عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ) کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع قیامت اور زندگی بعد موت کا اثبات ہے اور ساتھ ساتھ اس بات پر تشبیہ بھی کہ خدا کے رسول کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

آغاز کلام میں موت کے وقت جان نکالنے والے، اور اللہ کے احکام کو بلا تاخیر بجالانے والے، اور حکم الہی کے مطابق ساری کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتوں کی قسم کھا کر یہ یقین دلا یا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور پیش آکر رہے گی۔ کیونکہ جن فرشتوں کے ہاتھوں آج جان نکالی جاتی ہے، انہی کے ہاتھوں دوبارہ جان ڈالی بھی جاسکتی ہے، اور جو فرشتے آج اللہ کے حکم کی تعمیل بلا تاخیر بجالاتے اور کائنات کا انتظام چلاتے ہیں، وہی فرشتے کل اسی خدا کے حکم سے کائنات کا یہ نظام درہم برہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرا نظام قائم بھی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام، جسے تم بالکل ناممکن سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے کوئی دشوار کام ہی نہیں ہے جس کے لیے کسی بڑی نیاری کی ضرورت ہو۔ بس ایک جھٹکا دنیا کے اس نظام کو درہم برہم کر دے گا، اور ایک دوسرا جھٹکا اس کے لیے بالکل کافی ہوگا کہ دوسری دنیا میں یکایک تم اپنے آپ کو زندہ موجود پاؤ۔ اُس وقت وہی لوگ جو اس کا انکار کر رہے تھے، خوف سے کانپ رہے ہوں گے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہوں گے جس کو وہ اپنے نزدیک ناممکن سمجھتے تھے۔

پھر حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ رسول کو جھٹلانے اور اس کی ہدایت و رہنمائی کو رد کرنے اور چالبازیوں سے اس کو شکست دینے کی کوشش کا کیا انجام فرعون دیکھ چکا ہے۔ اُس سے عبرت حاصل کر کے اس روش سے باز نہ آؤ گے تو وہی انجام تمہیں بھی دیکھنا پڑے گا۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۳۳ تک آخرت اور حیات بعد الموت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے منکرین سے پوچھا گیا ہے کہ تمہیں دوبارہ پیدا کر دینا زیادہ سخت کام ہے یا اس عظیم کائنات کو پیدا کرنا جو عالم بالا میں اپنے بے حد حساب ستاروں اور سیاروں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے؟ جس خدا

کے لیے یہ کام مشکل نہ تھا اس کے لیے تمہاری بارگاہِ تخلیقِ آخر کیوں مشکل ہوگی؟ صرف ایک فقرے میں امکانِ آخرت کی یہ تمسکِ دلیل پیش کرنے کے بعد زمین اور اُس سرور سامان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین میں انسان اور حیوان کی نسبت کے لیے فراہم کیا گیا ہے اور جس کی ہر چیز اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ بڑی حکمت کے ساتھ کسی کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ اشارہ کر کے اس سوال کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ سوچ کر رائے قائم کرے کہ آیا اس حکیمانہ نظام میں انسان جیسی مخلوق کو اختیارات اور ذمہ داریاں سونپ کر اُس کا محاسبہ کرنا زیادہ مقتضائے حکمت نظر آتا ہے، یا یہ کہ وہ زمین میں ہر طرح کے کام کر کے مر جائے اور خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے اور کبھی اُس سے حساب نہ لیا جائے کہ ان اختیارات کو اس نے کیسے استعمال کیا اور ان ذمہ داریوں کو کس طرح ادا کیا؟ اس سوال پر بحث کرنے کے بجائے آیات ۳۴-۴۱ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آخرت برپا ہوگی تو انسان کے دائمی اور ابدی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس نے دنیا میں حدِ بندگی سے تجاوز کر کے اپنے خدا سے سرکشی کی اور دنیا ہی کے فائدوں اور لذتوں کو مقصود بنالیا، اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کی ناجائز خواہشات کو پورا کرنے سے احتراز کیا۔ یہ بات خود بخود اوپر کے سوال کا صحیح جواب ہر اُس شخص کو بتا دیتی ہے جو خدا اور مہذب دھرمی سے پاک ہو کر ایمان داری کے ساتھ اُس پر غور کرے۔ کیونکہ انسان کو دنیا میں اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے کا بالکل عقلی، منطقی اور اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ اسی بنیاد پر آخر کار اُس کا محاسبہ کیا جائے اور اسے جزا یا سزا دی جائے۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ قیامت آئے گی کب؟ یہ سوال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کرتے تھے۔ جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اُس کے وقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ رسول کا کام صرف خبردار کر دینا ہے کہ وہ وقت آئے گا ضرور۔ اب جس کا جی چاہے اس کے آنے کا خوف کر کے اپنا رویہ درست کر لے، اور جس کا جی چاہے بے خوف ہو کر شتر بے ہمار کی طرح چلتا رہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تو وہی لوگ جو اس دنیا کی زندگی پر مرسے ٹٹتے تھے اور اسی کو سب کچھ سمجھتے تھے، یہ محسوس کریں گے کہ دنیا میں وہ صرف گھڑی بھر بیٹھے تھے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ اس چند روزہ زندگی کی خاطر انہوں نے کس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل برباد کر لیا۔

اِنَّا نَا ۲۶

سُورَةُ الذُّرُعَاتِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعَانِهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالذُّرُعَاتِ غَرَقًا ۱ وَالنُّشِطَاتِ نَشْطًا ۲ وَالسَّيِّحَاتِ سَبًّا ۳
فَالسَّيِّقَاتِ سَبًّا ۴ فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا ۵ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۶

قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو ڈوب کر کھیلتے ہیں اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں، اور
اُن فرشتوں کی جو کائنات میں تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں، پھر حکم بجالانے میں سبقت کرتے
ہیں، پھر احکام الہی کے مطابق معاملات کا انتظام چلاتے ہیں۔ جس روز ہلانا ریگا زلزلے کا جھسکا

۱۔ یہاں پانچ اوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن بعد
کا مضمون اس امر پر خود دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے
انسان ضرور از سر نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے
ہیں، لیکن صحابہ اور تابعین کی بڑی تعداد نے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود
حضرت عبداللہ بن عباس، مسروق، سعید بن جبیر، ابو صالح، ابو لہٰیج اور سدی کہتے ہیں کہ ڈوب کر کھیلتے والوں اور
آہستگی سے نکال لے جانے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو موت کے وقت انسان کی جان کو اس کے جسم کی گہرائیوں
تک اتر کر اور اس کی رگ رگ سے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ تیزی سے تیرنے والوں سے مراد بھی حضرت علی، حضرت ابن مسعود
مجاہد، سعید بن جبیر اور ابو صالح نے فرشتے ہی لیے ہیں جو احکام الہی کی تعمیل میں اس طرح تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں
جیسے کہ وہ فضا میں تیر رہے ہوں۔ یہی مفہوم ”سبقت کرنے والوں“ کا حضرت علی، مجاہد، مسروق، ابو صالح اور حسن بصری
نے لیا ہے اور سبقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ حکم الہی کا اشارہ پاتے ہی اُن میں سے ہر ایک اس کی تعمیل کے لیے دوڑ
پڑتا ہے۔ معاملات کا انتظام چلانے والوں سے مراد بھی فرشتے ہیں، جیسا کہ حضرت علی، مجاہد، عطاء، ابو صالح، حسن
بصری، قتادہ، ربیع بن انس، اور سدی سے منقول ہے۔ بالفاظ دیگر یہ سلطنت کائنات کے وہ کارکن ہیں جن کے
ہاتھوں دنیا کا سارا انتظام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ ان آیات کے یہ معنی اگرچہ کسی صحیح حدیث میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہوئے ہیں، لیکن چندا کا بر صحابہ نے، اور ان تابعین نے جو صحابہ ہی کے شاگرد تھے، جب
ان کا یہ مطلب بیان کیا ہے تو گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ علم حضور ہی سے حاصل کیا گیا ہوگا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقوع قیامت اور حیات بعد الموت پر ان فرشتوں کی قسم کس بنا پر کھائی گئی ہے جبکہ

وقف لازم

تَتَّبِعَهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ ۹

اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا، کچھ دل ہوں گے جو اُس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔
نگاہیں اُن کی سہمی ہوئی ہوں گی۔

یہ خود بھی اسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطور شہادت اور بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے، واللہ اعلم، کہ اہل عرب فرشتوں کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ موت کے وقت انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے، زمین سے آسمان تک اُن کا فائدہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اور ہر کام جس کا انہیں حکم دیا جائے بلاناخیر انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ یہ فرشتے حکم الہی کے تابع ہیں اور کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے امر سے چلاتے ہیں، خود مختار اور اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ جہالت کی بنا پر وہ اُن کو اللہ کی بیٹیاں ضرور کہتے تھے اور اُن کو معبود بھی بناٹے ہوئے تھے، لیکن اُن کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اصل اختیارات انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے یہاں وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر اُن کے مذکورہ بالا اوصاف سے استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جس خدا کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں۔ اور جس خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں اسی کے حکم سے، جب بھی اُس کا حکم ہو، اس کائنات کو وہ درہم برہم بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسری دنیا بنا بھی سکتے ہیں۔ اُس کے حکم کی تعمیل میں ان کی طرف سے ذرہ برابر بھی سُستی یا لمحہ بھر کی تاخیر بھی نہیں ہو سکتی۔

۱۲ پہلے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جو زمین اور اس کی ہر چیز کو تباہ کر دے گا اور دوسرے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جس کے بعد تمام مُردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اسی کیفیت کو سورہ زمر میں یوں بیان کیا گیا ہے "اور صور پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں وہ سب مرکز گرد جائیں گے سوائے اُن کے جنہیں اللہ (زندہ رکھنا) چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا تو بیکار وہ سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے" (آیت ۶۸)۔

۱۳ "کچھ دل" کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ قرآن مجید کی رُو سے صرف کفار و مجار اور منافقین ہی پر قیامت کے روز ہول طاری ہوگا۔ مومنین صالحین اُس ہول سے محفوظ ہوں گے۔ سورہ انبیاء میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ "وہ انتہائی گھبراہٹ کا وقت اُن کو ذرا پریشان نہ کرے گا اور ملائکہ بڑھ کر اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا" (آیت ۱۰۳)۔

يَقُولُونَ إِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَاغِرَةِ ۝۱۰ عَازَاكُنَّا عِظَامًا
تَخِرَّةً ۝۱۱ قَالُوا تِلْكَ إِذَا كَرَّرَهُ خَاسِرَةٌ ۝۱۲ فَإِنَّمَا هِيَ
زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝۱۳ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴ هَلْ أَتَاكَ
حَدِيثُ مُوسَى ۝۱۵ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶

یہ لوگ کہتے ہیں "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ
ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟" کہنے لگے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی؟" حالانکہ یہ بس اتنا
کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے۔

کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اُسے طُوًی کی مقدس وادی میں پکارا تھا

۵۴ یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے
کہنے لگے کہ یارو، اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑتا تب تو ہم مارے گئے، اس کے بعد
تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔

۵۵ یعنی یہ لوگ اسے ایک امر محال سمجھ کر اس کی ہنسی اڑا رہے ہیں، حالانکہ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام
نہیں ہے جس کو انجام دینے کے لیے کچھ بڑی لمبی چوڑی تیاریوں کی ضرورت ہو۔ اس کے لیے صرف ایک ڈانٹ یا
جھڑکی کافی ہے جس کے ساتھ ہی تمہاری خاک ببارا کہ، خواہ کہیں پڑی ہو، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائے گی
اور تم یکایک اپنے آپ کو زمین کی پیٹھ پر زندہ موجود پاؤ گے۔ اس واپسی کو گھاٹے کی واپسی سمجھ کر چاہے تم اس سے
کتنا ہی فرار کرنے کی کوشش کرو، یہ تو ہو کر رہنی ہے، تمہارے انکار یا فرار یا تمسخر سے یہ رُک نہیں سکتی۔

۵۶ چونکہ کفار مکہ کا قیامت اور آخرت کو نہ ماننا اور اس کا مذاق اڑانا دراصل کسی فلسفے کو رد کرنا نہیں تھا بلکہ
اللہ کے رسول کو جھٹلانا تھا، اور جو چاہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چل رہے تھے وہ کسی عام آدمی کے خلاف
نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی دعوت کو زک دینے کے لیے تھے، اس لیے وقوعِ آخرت کے مزید دلائل دینے سے پہلے اُن
کو حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ سنایا جا رہا ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائیں کہ رسالت سے ٹکرانے اور رسول کے صحیحے والے
خدا کے مقابلے میں سراسر ٹھٹھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۵۷ وادی مقدس طُوًی کے معنی بالعموم مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ مقدس وادی جس کا نام طُوًی تھا"

لیکن اس کے علاوہ اس کے دو معنی اور بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ "وہ وادی جو دو مرتبہ مقدس کی گنتی ہے کیونکہ ایک

اِذْهَبْ اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَكَ اِلٰى اَنْ تَزْكٰى ﴿۱۸﴾ وَ
 اِهْدِيْكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَ

کہ ”فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی
 اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو اُس (کا) خوف تیرے اندر پیدا ہوگا؟“
 پھر موسیٰ نے (فرعون کے پاس جا کر) اُس کو بڑی نشانی دکھائی، مگر اُس نے جھٹلادیا اور

دفعہ اُس وقت مقدس کیا گیا جب پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰ کو مخاطب فرمایا، اور دوسری دفعہ اسے
 تقدیس کا شرف اُس وقت بخشا گیا جب حضرت موسیٰ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر اس وادی میں لائے۔ دوسرے یہ کہ
 ”رات کے وقت وادئ مقدس میں پکارا، عربی میں محاورہ ہے جاء بعد طوی، یعنی فلاں شخص میرے پاس رات کا کچھ حصہ
 گزرنے کے بعد آیا۔“

۵۵۔ بیان چند باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیں:

(۱) حضرت موسیٰ کو منصب نبوت پر مقرر کرتے وقت جو باتیں اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئی تھیں اُن کو
 قرآن مجید میں حسبِ موقع کہیں مختصراً در کہیں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں موقع اختصار کا طالب تھا، اس لیے اُن کا صرف
 خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ طہ، آیات ۹ تا ۲۸، سورہ شعراء، آیات ۱۰ تا ۱۷، سورہ نمل، آیات ۱۲ تا ۱۴، اور سورہ
 قصص، آیات ۲۹ تا ۳۵ میں ان کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

(۲) فرعون کی جس سرکشی کا بیان ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خالق اور خلق، دونوں کے
 مقابلے میں سرکشی کرنا ہے۔ خالق کے مقابلے میں اُس کی سرکشی کا ذکر تو آگے آ رہا ہے کہ اس نے اپنی رعیت کو جمع کر کے اعلان
 کیا کہ ”میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں“ اور خلق کے مقابلے میں اس کی سرکشی یہ تھی کہ اس نے اپنی مملکت کے باشندوں
 کو مختلف گروہوں اور طبقوں میں بانٹ رکھا تھا، کوزر طبقوں پر وہ سخت ظلم و ستم ڈھا رہا تھا، اور اپنی پوری قوم کو
 بیوقوف بنا کر اس نے غلام بنا رکھا تھا، جیسا کہ سورہ قصص آیت ۲ اور سورہ زمر آیت ۵۴ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت موسیٰ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيْنَا لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى تم اور ہارون
 دونوں بھائی اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خلا سے ڈرے (ظہ، آیت ۴۴)
 اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو ان آیات میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی
 ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔ دوسرے نمونے سورہ طہ، آیات ۴۹ تا ۵۲، الشعراء،
 ۲۲ تا ۲۸، اور القصص، آیت ۳۷ میں دیے گئے ہیں۔ یہ منجملہ اُن آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید
 میں حکمت تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔

عَصَى ۲۱) ثُمَّ ادْبَرِيسْعَى ۲۲) فَحَشَرَ فَنَادَى ۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمْ

نہ مانا، پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پٹیا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا "میں تمہارا رب

(۲۱) حضرت موسیٰ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست دکھانا تھا، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اصل میں ایک مسلمان قوم تھے) اُس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔ یہ بات ان آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ ان میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ان مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں حضرت موسیٰ نے تبلیغ اسلام بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو الرافات، آیات ۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶، طہ، آیات ۴۷ تا ۵۲- الشعراء، آیات ۱۶-۱۷، اور ۲۳ تا ۲۸- مزہزج کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۷۴)۔

(۵) یہاں پاکیزگی (تزکی) اختیار کرنے کا مطلب عقیدے اور اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کرنا یا دوسرے

الفاظ میں اسلام قبول کر لینا ہے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تزکی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآن مجید کی حسب ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں۔ وَذَلِكْ جَزَاؤُ مَنْ تَزَكَّى، "اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے" یعنی اسلام لے آئے۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَتَزَكَّى، "اور تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے"، یعنی مسلمان ہو جائے۔ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَتَزَكَّى، "اور تم پر کیا ذمہ دار ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے" یعنی مسلمان نہ ہو (ابن جریر)۔

(۶) یہ ارشاد کہ "میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا خوف) تیرے دل میں پیدا ہوگا" اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تو اپنے رب کو پہچان لے گا اور تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو اُس کا بندہ ہے، مرد آزاد نہیں ہے، تو لازماً تیرے دل میں اُس کا خوف پیدا ہوگا، اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا میں آدمی کے رویے کے صحیح ہونے کا انحصار ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے بغیر کسی پاکیزگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

۱۹ بڑی نشانی سے مراد عصا کا اتر دیا جانا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بیجان لاکھی سب دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے علانیہ اتر دیا بن جائے، جادوگر اُس کے مقابلے میں لاکھیوں اور ریتوں کے جو مصنوعی اثر دے بنا کر دکھائیں ان سب کو وہ نکل جائے، اور پھر حضرت موسیٰ جب اس کو پکڑ کر اٹھالیں تو وہ پھر لاکھی کی لاکھی بن کر رہ جائے۔ یہ اس بات کی صریح علامت تھی کہ وہ الشرب العالمین ہی ہے جس کی طرف سے حضرت موسیٰ بھیجے گئے ہیں۔

۲۰ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس نے تمام مصر سے ماہر جادوگروں

الْأَعْلَى ۲۳) فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى ۲۴) إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَعِبْرَةً لِمَن يَخْشَى ۲۵) أَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بِنَاهَا ۲۶) دَقِيقَةٌ

بزارب ہوں۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں

بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرتے۔ ع

کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا،

کو بلوایا اور ایک صحیح عام میں ان سے لاطھیوں اور رستیوں کے اثر ہے بنوا کر دکھائے تاکہ لوگوں کو یقین آجائے
کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی نبی نہیں بلکہ ایک جادوگر ہے، اور لاطھی کا اثر دہانے کا جو کرشمہ انہوں نے دکھایا ہے
وہ دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی یہ چال اٹھی پڑھی اور جادوگروں نے شکست کھا کر خود تسلیم کر لیا
کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دکھایا ہے وہ جادو نہیں بلکہ معجزہ ہے۔

۱۵ فرعون کا یہ دعویٰ کئی مقامات پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک موقع پر اس نے حضرت موسیٰ

سے کہا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو خدا بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا (الشعراء، آیت ۲۹)۔ ایک اور موقع پر

اس نے اپنے دربار میں لوگوں کو خطاب کر کے کہا "اے سرداران قوم، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا

بھی ہے" (القصص، آیت ۲۸)۔ ان ساری باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہی کائنات کا

خالق ہے اور اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی

تھا۔ یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔ قرآن مجید ہی میں اس بات

کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے

اہل دربار ایک موقع پر اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ "کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے

کہ وہ ملک میں نسا و پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (الاعراف، آیت ۱۲۷)۔ اور قرآن میں

فرعون کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اگر موسیٰ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو کیوں نہ اس پر سونے کے گنگن اتارے گئے؟ یا

اس کے ساتھ ملائکہ اس کی اردنی میں کیوں نہ آئے؟ (الزخرف، آیت ۵۳)۔ پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں

بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو الہ اور رب اعلیٰ کہتا تھا، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک میں ہوں،

میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے، اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان

بیاں جاری ہو سکتا ہو (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۸۵۔ جلد سوم، طہ،

حاشیہ ۲۱۔ الشعراء، حواشی ۲۲ و ۲۶۔ القصص، حواشی ۵۲-۵۳۔ جلد چہارم، الزخرف، حاشیہ ۲۹)۔

۱۶ یعنی خدا کے رسول کو جھٹلانے کے اُس انجام سے ڈرے جو فرعون دیکھ چکا ہے۔

رَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّهَا ۳۸ وَأَعْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ۳۹
وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۴۰ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ۴۱

اُس کی چھت خوب اونچی اٹھائی پھر اُس کا توازن قائم کیا، اور اُس کی رات ڈھانکی اور اُس کا دن نکالا۔ اِس کے بعد زمین کو اِس نے بچھایا، اُس کے اندر سے اُس کا پانی اور چارہ نکالا،

۳۸ اب قیامت اور حیات بعد الموت کے ممکن اور مقضائے حکمت ہونے کے دلائل بیان کیے جا رہے ہیں۔
۳۹ تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالم بالا ہے جس میں بے شمار ستارے اور سیارے، بے عدد حساب شمسی نظام اور ان گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امر محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں گی اُس حالت میں ہمارے پر اگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اِس عظیم کائنات کا بنا تا زیادہ سخت کام ہے یا تمہیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا اِس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اِس پر قادر نہ ہو سکے؟ حیات بعد الموت پر ہی دلیل قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دی گئی ہے۔ مثلاً سورہ نیس میں ہے "اور کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اِس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو (پھر سے) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں، وہ تو بڑا زبردست خالق ہے، تخلیق کے کام کو خوب جانتا ہے" (آیت ۸۱)۔ اور سورہ مؤمن میں فرمایا "یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں" (آیت ۵)۔

۴۰ رات اور دن کو آسمان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیونکہ آسمان کا سورج غروب ہونے سے ہی رات آتی ہے اور اِس کے طلوع ہونے سے دن نکلتا ہے۔ رات کے لیے ڈھانکنے کا لفظ اِس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد رات کی تاریکی اِس طرح زمین پر چھا جاتی ہے جیسے اوپر سے اِس پر پردہ ڈال کر ڈھانک دیا گیا ہو۔

۴۱ "اِس کے بعد زمین کو بچھانے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی، بلکہ یہ ایسا ہی طرز بیان ہے جیسے ہم ایک بات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں "پھر یہ بات غور طلب ہے"۔ اِس سے مقصود ان دونوں باتوں کے درمیان واقعاتی ترتیب بیان کرنا نہیں ہوتا کہ پہلے یہ بات ہوئی اور اِس کے بعد دوسری بات، بلکہ مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔ اِس طرز بیان کی متعدد نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورہ قلم میں فرمایا عَطِشَ بَعْدَ ذَلِكَ رَنِيمٌ "جفا کار ہے اور اِس کے بعد بداصل"۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ جفا کار بنا اور اِس کے بعد بداصل ہوا، بلکہ

وَالْجِبَالِ أَرْسُهَا ۝۳۲ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَا تَعْمَلُمْ ۝۳۳

اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے سامانِ تربیت کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے کوششوں کے لیے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفا کار ہے اور اس پر مزید یہ کہ بداصل بھی ہے۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں فرمایا فَذُوقُوا قَبْرًا... تَذَرَّكَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا غُلَامًا آزاد کرے... پھر ایمان لانے والوں میں سے ہوگا اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ نیک اعمال کرے، پھر ایمان لائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان نیک اعمال کے ساتھ ساتھ اس میں مومن ہونے کی صفت بھی ہو۔ اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن میں کہیں زمین کی پیدائش کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور آسمانوں کی پیدائش کا ذکر بعد میں، جیسے سورۃ بقرہ آیت ۲۹ میں ہے، اور کسی جگہ آسمان کی پیدائش کا ذکر پہلے اور زمین کی پیدائش کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے، جیسے ان آیات میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ دراصل تضاد نہیں ہے۔ ان مقامات میں سے کسی جگہ بھی مقصود کلام یہ بتانا نہیں ہے کہ کسے پہلے بنایا گیا اور کسے بعد میں، بلکہ جہاں موقع و محل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات کو نمایاں کیا جائے وہاں آسمانوں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور زمین کا بعد میں، اور جہاں سلسلہ کلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لوگوں کو ان نعمتوں کا احساس دلایا جائے جو انہیں زمین پر حاصل ہو رہی ہیں وہاں زمین کے ذکر کو آسمانوں کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد چہارم، طم الاستجدہ، حواشی ۱۲-۱۳)۔

کلمہ چارہ سے مراد اس جگہ صرف جانوروں کا چارہ نہیں ہے بلکہ وہ تمام نباتات مراد ہیں جو انسان اور حیوان دونوں کی غذا کے کام آتے ہیں۔ رعی اور رُئِج اگرچہ بالعموم عربی زبان میں جانور کے چرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی انسان کے لیے بھی استعمال کر لیے جاتے ہیں، مثلاً سورۃ یوسف میں آیا ہے کہ حضرت یوسف کے بھائیوں نے اپنے والد ماجد سے کہا اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَمِعْ وَيَلْعَبْ، ”آپ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیں کہ کچھ چر چگ لے اور کھیلے“ (آیت ۱۲)۔ یہاں بچے کے لیے چرنے (رُئِج) کا لفظ جنگل میں چل پھر کر پھل توڑنے اور کھانے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۱۵۱۸ ان آیات میں قیامت اور حیات بعد الموت کے لیے دو حیثیتوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اس خدا کی قدرت سے ان کا برپا کرنا برگزیدہ نہیں ہے جس نے یہ وسیع و عظیم کائنات اس حیرت انگیز توازن کے ساتھ اور یہ زمین اس سرد سامان کے ساتھ بنائی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے کمالِ حکمت کے جو آثار اس کائنات اور اس زمین میں صریحاً نظر آ رہے ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بے مقصد نہیں ہو رہا ہے۔ عالم بالا میں بے شمار ستاروں اور سیاروں اور کہکشاؤں کے درمیان جو توازن قائم ہے وہ شہادت دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ الٰہی نصاب نہیں ہو گیا ہے بلکہ کوئی بہت سوچا سمجھا منصوبہ اس کے پیچھے کار فرما ہے۔ یہ بات اور دن کا باقاعدگی سے آنا اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کو آباد کرنے کے لیے یہ نظم کمال درجہ دانائی کے ساتھ قائم کیا گیا

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۖ يَوْمَ تَذُكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ ۝۳۵

پھر جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہوگا، جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا،

ہے۔ خود اسی زمین پر وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں ۲۴ گھنٹے کے اندر دن اور رات کا الٹ پھیر ہو جاتا ہے اور وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں بہت لمبے دن اور بہت لمبی راتیں ہوتی ہیں۔ زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصہ پہلی قسم کے خطوں میں ہے، اور جہاں رات اور دن جتنے زیادہ لمبے ہوتے جاتے ہیں وہاں زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار اور آبادی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ۶ مہینے کے دن اور ۶ مہینے کی راتیں رکھنے والے علاقے آبادی کے بالکل قابل نہیں ہیں۔ یہ دونوں نمونے اسی زمین پر دکھا کر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی شہادت پیش کر دی ہے کہ رات اور دن کی آمد و رفت کا یہ باقاعدہ انتظام کچھ اتفاقاً نہیں ہو گیا ہے بلکہ یہ زمین کو آبادی کے قابل بنانے کے لیے بڑی حکمت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ایک انداز سے کے مطابق کیا گیا ہے۔ اسی طرح زمین کو اس طرح بچھانا کہ وہ قابل سکونت بن سکے، اس میں وہ پانی پیدا کرنا جو انسان اور حیوان کے لیے پینے کے قابل اور نباتات کے لیے رشدیگی کے قابل ہو، اس میں پہاڑوں کا جمانا اور وہ تمام چیزیں پیدا کرنا جو انسان اور ہر قسم کے حیوانات کے لیے زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بن سکیں، یہ سارے کام اس بات کی صریح علامت ہیں کہ یہ اتفاقی حوادث یا کسی کھنڈر کے بے مقصد کام نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے ہر کام ایک بہت بڑی حکیم و داناستی نے بامقصد کیا ہے۔ اب یہ ہر صاحب عقل آدمی کے خود سوچنے کی بات ہے کہ آیا آ حضرت کا ہونا حکمت کا تقاضا ہے یا نہ ہونا؟ جو شخص ان ساری چیزوں کو دیکھنے کے باوجود یہ کہتا ہے کہ آ حضرت نہیں ہوگی وہ گویا یہ کہتا ہے کہ یہاں اور سب کچھ تو حکمت اور مقصدیت کے ساتھ ہو رہا ہے، مگر زمین پر انسان کو ذی ہوش اور با اختیار بنا کر پیدا کرنا بے مقصد اور بے حکمت ہے۔ کیونکہ اس سے بڑی کوئی بے مقصد اور بے حکمت بات نہیں ہو سکتی کہ اس زمین میں تصرف کے وسیع اختیارات دے کر انسان کو یہاں ہر طرح کے اچھے اور برے کام کرنے کا موقع تو دے دیا جائے مگر کبھی اس کا محاسبہ نہ کیا جائے۔

۱۹ اس سے مراد ہے قیامت اور اس کے لیے الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

طامہ بچائے خود کسی ایسی بڑی آفت کو کہتے ہیں جو سب پر چھا جائے۔ اس کے بعد اس کے لیے کُبْرَىٰ کا لفظ مزید استعمال کیا گیا ہے جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شدت کا تصور دلانے کے لیے محض لفظ طامہ بھی کافی نہیں ہے۔

۲۰ یعنی جب انسان دیکھ لے گا کہ وہی محاسبہ کا دن آ گیا ہے جس کی اُسے دنیا میں خبر دی جا رہی تھی، تو

قبل اس کے کہ اُس کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے، اسے ایک ایک کر کے اپنی وہ سب حرکتیں یاد آنے لگیں گی جو وہ دنیا میں کر کے آیا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ تجربہ خود اس دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ اگر یہ کیا کسی وقت وہ

وَبَرَّسَاتِ الْجَحِيمِ لِمَنْ يَرَى ۝۳۶ فَاَمَّا مَنْ طَغَى ۝۳۷ وَاتَّارَ الْجَبْوَةَ
 الدُّنْيَا ۝۳۸ فَانَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَاوَى ۝۳۹ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ
 رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى ۝۴۰ فَانَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاوَى ۝۴۱
 يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مَرْسُهَا ۝۴۲ فَيَمَّ آنتَ مِنْ ذِكْرِهَا ۝۴۳
 اِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَاهَا ۝۴۴ اِنَّمَا آنتَ مُنْذِرٌ مَّنْ يَخْشَاهَا ۝۴۵

اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی
 زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے
 ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔
 یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ”آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھیرے گی؟“ تمہارا کیا کام کہ اس کا وقت
 بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرتے والے ہو، اس شخص کو جو اس کا خوف کرے۔

کسی ایسے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں جس میں موت ان کو بالکل قریب کھڑی نظر آتے لگتی ہے تو اپنی پوری
 زندگی کی فلم ان کی چشم تصور کے سامنے یک لخت پھر جاتی ہے۔

۱۱۷۰ بیان چند مختصر الفاظ میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آخرت میں اصل فیصلہ کس چیز پر ہونا ہے۔ دنیا میں زندگی کا
 ایک روٹیہ یہ ہے کہ آدمی بندگی کی حد سے تجاوز کر کے اپنے خدا کے مقابلے میں سرکشی کرے اور یہ طے کر لے کہ اسی دنیا کے
 فائدے اور لذتیں اُسے مطلوب ہیں خواہ کسی طرح بھی وہ حاصل ہوں۔ دوسرا روٹیہ یہ ہے کہ یہاں زندگی بسر کرتے ہوئے
 آدمی اس بات کو پیش نظر رکھے کہ آخر کار ایک دن اسے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور نفس کی بری خواہشات
 کو پورا کرنے سے اس لیے باز رہے کہ اگر یہاں اُس نے اپنے نفس کا کہا مان کر کوئی ناجائز فائدہ کمایا یا کوئی ناروا لذت
 حاصل کر لی تو اپنے رب کو کیا جواب دے گا۔ آخرت میں فیصلہ اسی بات پر ہونا ہے کہ انسان نے ان دونوں میں سے
 کونسا روٹیہ دنیا میں اختیار کیا۔ پہلا روٹیہ اختیار کیا ہو تو اس کا مستقل ٹھکانا دوزخ ہے، اور دوسرا روٹیہ اختیار کیا ہو تو
 اس کی مستقل جائے قیام جنت۔

۱۱۷۱ کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال بار بار کرتے تھے اور اس سے مقصود قیامت کی آمد

کا وقت اور اس کی تاریخ معلوم کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن

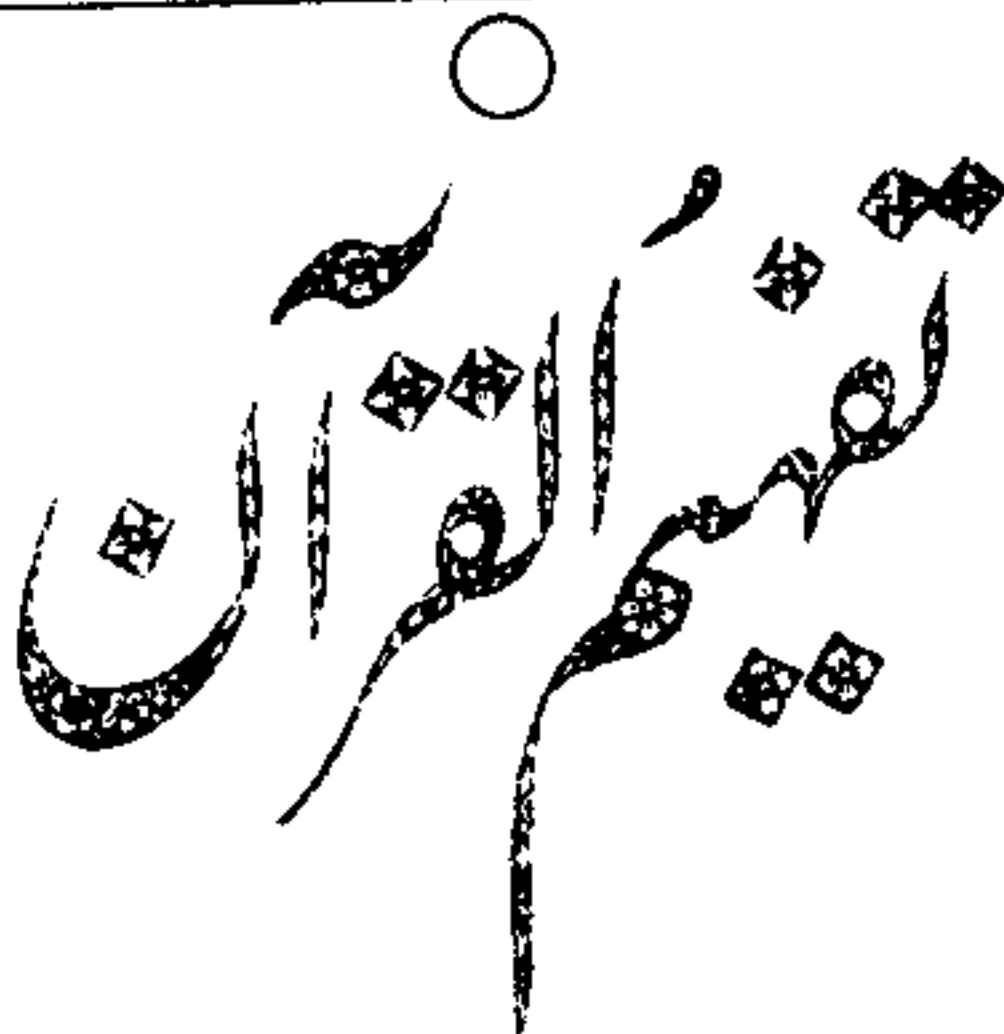
كَانَ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا ۝

جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہو گا کہ (یہ دنیا میں یا حالت موت میں) بس ایک دن کے پچھلے پیر یا اگلے پرتک ٹھہرے ہیں۔ ۷

جلد ششم، تفسیر سورہ ملک، حاشیہ ۲۵۔

۵۲۲ اس کی تشریح بھی ہم تفسیر سورہ ملک، حاشیہ ۳۶ میں کر چکے ہیں۔ رہا یہ ارشاد کہ تم ہر اس شخص کو خبردار کر دینے والے ہو جو اس کا خوف کرے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوف نہ کرنے والوں کو خبردار کرنا تمہارا کام نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے خبردار کرنے کا فائدہ اسی کو پہنچے گا جو اس دن کے آنے کا خوف کرے۔

۵۲۲ یہ مضمون اس سے پہلے کئی جگہ قرآن میں بیان ہو چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۵۲۔ نبی اسرائیل، حاشیہ ۵۶۔ جلد سوم، طہ، حاشیہ ۸۰۔ المؤمنون، حاشیہ ۱۰۱۔ الروم، حاشیہ ۸۱-۸۲۔ جلد چہارم، یس، حاشیہ ۴۸۔ اس کے علاوہ یہ مضمون سورہ احقاف آیت ۳۵ میں بھی گزر چکا ہے جس کی تشریح ہم نے وہاں نہیں کی کیونکہ پہلے کئی جگہ تشریح ہو چکی تھی۔



عَبَسَ

(۸۰)

عَبَسَ

نام | پہلے ہی لفظ عَبَسَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | مفسرین و محدثین نے بالاتفاق اس سورہ کا سبب نزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکہ معظمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضور اُن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابن ام مکتوم نامی ایک نابینا حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضور کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس تاریخی واقعہ سے اس سورہ کا زمانہ نزول باسانی متعین ہو جاتا ہے۔

اولیٰ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم بالکل ابتدائی دور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اسلم بمکة قديما، اور هو ممن اسلم قديما، یعنی یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مکہ معظمہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔

ثانیاً حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اُن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اسلام لائے تھے اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے اور تلاشِ حق میں حضور کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ اُنہوں نے اگر عرض کیا تھا: یا رسول اللہ ارشدنی، یا رسول اللہ مجھے سیدھا راستہ بتائیے، تو نبی، حاکم، ابن جہان، ابن جریر، ابو یعلیٰ۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ وہ اگر قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضور سے عرض کیا یا رسول اللہ علمنی متا علمک اللہ، یا رسول اللہ مجھے وہ علم سکھائیے جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے، (ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ابن زبیر آیت ۳ کے الفاظ لَعَلَّكَ يَتَوَكَّىٰ كَمَا مَلَبَّ لَعَلَّكَ يُسَلِّمُ، شاید کہ وہ اسلام قبول کر لے، بیان کرتے ہیں (ابن جریر)۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدھ جاتے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو، اور یہ کہ جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے اندر طلبِ حق

کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، وہ حضور ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ ان کی یہ طلب یہیں سے پوری ہوگی، اور یہ بات ان کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انہیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثالثاً حضور کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں ان کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہمیں عثیمہ، ثنیبہ، ابو جہل، امیہ بن خلف، ابی بن خلف جیسے بدترین دشمنان اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ کے ہاں ان کی آمد و رفت اور آپ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ یہ سب امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورۃ بہت ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | بظاہر کلام کے آغاز کا اندازہ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سورۃ پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضور کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتداء میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ نہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو معزز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خلقی آپ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعیِ جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُحمانِ اس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے با اثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس دعوت کے نقطہ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور یا بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے

اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فرزندِ نبی ہے کہ آپ اسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔

یہ آغازِ سُورۃ سے آیت ۶ تک کا مضمون ہے۔ اس کے بعد آیت ۷ سے براہِ راست عقابِ کائنات کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ اس میں پہلے اُس رویتے پر اُنہیں ملامت کی گئی ہے جو وہ اپنے خالقِ درازِ قیوم پر دغا دہی کے مقابلے میں برت رہے تھے، اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز وہ اپنی اس روش کا کیسا ہولناک انجام دیکھنے والے ہیں۔

آیاتھا ۲۲

سُورَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلَّى ۱ اَنْ جَاءَهُ الْاَغْنَى ۲ وَمَا يَدْرِيكَ لَعَلَّهٗ

ترش رو ہوا اور بے رُخی برقی اس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر شاید

اس پہلے فقرے کا اندازہ بیان عجیب لطف اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ بعد کے فقروں میں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے کہ ترش روئی اور بے رُخی برتنے کا یہ فعل حضور ہی سے صادر ہوا تھا، لیکن کلام کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضور نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے اس فعل کا صدور ہوا ہے۔ اس طرز بیان سے ایک نہایت لطیف طریقے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپ کے اخلاقِ عالیہ کو جاننے والا اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رویے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

جن نابینا کا بیان ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، جیسا کہ ہم دیا چھے میں بیان کر آئے ہیں، مشہور صحابی حضرت ابن ام مکتوم ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے اَلْاَسْتِیْعَاب میں اور حافظ ابن حجر نے اَلْاَصَابہ میں بیان کیا ہے کہ ایم المؤمنین حضرت خدیجہ کے چھوٹی زاد بھائی تھے، ان کی ماں ام مکتوم اور حضرت خدیجہ کے والد خویلد آپس میں بہن بھائی تھے حضور کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ نے ان کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رُخی برقی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضور کے اپنے برادر نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گریہ سے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا، لفظ اعنی (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضور کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے۔ یعنی حضور کا خیال یہ تھا کہ میں اس وقت جن لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پائے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، بخلاف اس کے ابن مکتوم ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر ان سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اس لیے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

يَزْكِي ۛ اَوْ يَذْكُرْ فَنُفَعَهُ الزِّكْرَى ۛ اَمَّا مَنِ اسْتَعْنَى ۛ
فَإِنَّ لَهُ تَصَدَّى ۛ وَمَا عَلَيْكَ اَلَا يَزْكِي ۛ وَاَمَّا مَنِ جَاءَكَ
لَيْسَى ۛ وَهُوَ يَخْتَصِي ۛ فَإِنَّ عَنْهُ تَلَتْهَا ۛ كَلَّا إِنَّهَا

وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو، جو شخص بے پروائی برتنا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارا پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے سخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک

۱۷ یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن ام مکتوم کے ساتھ آپ کے طرز عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپ کو بتایا کہ داعی حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صحت بنا رہی ہے کہ وہ طالب حق ہے، اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے وہ راہ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود جل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اسے راہ راست بتانی جائے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کرے کہ سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اس تنازع گراں آقا کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، ٹولا ہو، فقیر ہے، نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعی حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے، اور اُس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرے گا۔ دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بااثر ہو، اُس کے پیچھے پڑنے کی داعی حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سُدھرنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعی حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

۱۸ یعنی ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر بھولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو۔ نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے اُس کے سامنے اسے بالکھاج پیش کیا جائے،

تَذِكْرَةٌ ۱۱ ۱۱ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۱۲ فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۱۳
مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۱۴ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۱۵ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۱۶

نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ
ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کتابوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔

اور نہ تمہاری یہ شان ہے کہ ان مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کر جس سے
یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمہاری کوئی غرض ان سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمہاری دعوت فروغ پائے گی
ورنہ ناکام ہو جائے گی۔ حق ان سے اتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔
۱۴ مراد ہے قرآن۔

۱۵ یعنی ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں۔ ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے۔ کسی نوعیت کے باطل
اور فاسد افکار و نظریات ان میں راہ نہیں پاسکے ہیں۔ جن گندگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کر دی
گئی ہیں ان کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہو سکا ہے۔ انسانی تخیلات ہوں، یا شیطانی وساوس،
ان سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

۱۶ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کے ان صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہدایت کے مطابق لکھ
رہے تھے، ان کی حفاظت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انہیں جنوں کا توں پہنچا رہے تھے۔ ان
کی تعریف میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک کرام، یعنی معزز۔ دوسرے بآء یعنی نیک۔ پہلے لفظ سے یہ بتانا
مقصود ہے کہ وہ اتنے ذی عزت ہیں کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں ذرہ برابر خیانت کا صدور بھی ان
جیسی بلند پایہ ہستیوں سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان صحیفوں
کو لکھنے، ان کی حفاظت کرنے اور رسول تک ان کو پہنچانے کی جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اس کا حق وہ پوری دیانت
کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

۱۷ جس سلسلہ بیان میں یہ آیات ارشاد ہوئی ہیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ قرآن مجید کی
تعریف محض اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل مقصود ان تمام منکبر لوگوں کو جو حقارت کے ساتھ
اس کی دعوت سے مُنہ موڑ رہے ہیں، صاف صاف بتا دینا ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب اس سے بدرجہا بلند مرتبہ ہے
کہ تمہاری حضوری میں اسے پیش کیا جائے اور تم سے یہ چاہا جائے کہ تم اسے شرف قبولیت عطا کرو۔ یہ تمہاری محتاج نہیں
ہے بلکہ تم اس کے محتاج ہو۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو جو خناس تمہارے دماغ میں بھرا ہوا ہے اسے نکال کر سیدھی طرح
اس کی دعوت کے آگے سر تسلیم خم کر دو۔ ورنہ جس قدر تم اس سے بے نیاز بنتے ہو اس سے بہت زیادہ یہ تم سے بے نیاز

قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۚ ۱۴ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۚ ۱۵
مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۚ ۱۶ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۚ ۱۷

لعنت ہو انسان پر، کیسا سخت منکر حق ہے یہ کہ کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفہ کی ایک بوند سے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی، پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی،

ہے۔ تمہاری تحقیر سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا، البتہ تمہاری بڑائی کا سارا گھنٹہ خاک میں ملا کر رکھ دیا جائے گا۔

۵۵ بیان سے عتاب کا رخ براہ راست ان کفار کی طرف پھرتا ہے جو حق سے بے نیازی برت رہے تھے۔ اس سے پہلے آغاز سورہ سے آیت ۶۱ تک خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور عتاب درپردہ کفار پر فرمایا جا رہا تھا۔ اس کا انداز بیان یہ تھا کہ اے نبی، ایک طالب حق کو چھوڑ کر آپ یہ کن لوگوں پر اپنی توجہ صرف کر رہے ہیں جو دعوت حق کے نقطہ نظر سے بالکل بے قدر و قیمت ہیں اور جن کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جیسا عظیم القدر پیغمبر قرآن جیسی بلند مرتبہ چیز کو ان کے آگے پیش کرے۔

۵۹ قرآن مجید میں ایسے تمام مقامات پر انسان سے مراد نوع انسانی کا ہر فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی ناپسندیدہ صفات کی مذمت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ انسان، کالفاظ کیس تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ نوع انسانی کے اکثر افراد میں وہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں، اور کیس اس کے استعمال کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعین کے ساتھ اگر ملامت کی جائے تو ان میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے نصیحت کا یہ طریقہ نہ زیادہ موثر ہوتا ہے کہ عمومی انداز میں بات کہی جائے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، حم السجدہ، حاشیہ ۶۵- الشوری، حاشیہ ۷۵)۔

۶۵ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کس چیز نے اسے کفر پر آمادہ کیا؟ یعنی بالفاظ دیگر کس بل بوتے پر یہ کفر کرتا ہے؟ کفر سے مراد اس جگہ حق کا انکار بھی ہے، اپنے عُسن کے احسانات کی ناشکری بھی، اور اپنے خالق درازق اور مالک کے مقابلہ میں باغیانہ روش بھی۔

۷۱ یعنی پہلے تو ذرا اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا؟ کس جگہ اس نے پرورش پائی؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا؟ اور کس بے بسی کی حالت سے دنیا میں اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی؟ اپنی اس اصل کو بھول کر یہ ہچھو مادہ گیر سے نیست کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے اور کہاں سے اس کے دماغ میں یہ ہوا بھرتی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آٹے؟ (یہی بات ہے جو سورہ لیس، آیات ۷۷-۷۸ میں فرمائی گئی ہے)۔

۷۳ یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر بڑھ کر دی گئی۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ

ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝۳۱ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۝۳۲ كَلَّا لَمَّا

پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔ ہرگز نہیں، اس نے

کیا ہوگا۔ اس کا قد کتنا ہوگا۔ اس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضاء کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے۔ اس کی شکل صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اٹھے گا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار۔ یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اسے زمین پر کام کرنے کے لئے دیا جائے گا۔ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا، نہ اس میں ذرہ برابر رد و بدل کر سکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اس کی یہ حیرت انگیز حالت کہ جس خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے اس کے مقابلہ میں کفر کرتا ہے۔

۳۱ یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیے ہوتے۔ مزید براں خالق نے اس کو یہ موقع بھی دے دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا عصیان کی جو راہ بھی یہ اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی یہ چلنا چاہے چلے۔

۳۲ یعنی اپنی پیدائش اور اپنی تقدیر کے معاملہ میں میں نہیں بلکہ اپنی موت کے معاملہ میں بھی یہ اپنے خالق کے آگے بالکل بے بس ہے۔ نہ اپنے اختیار سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ اپنے اختیار سے مر سکتا ہے، اور نہ اپنی موت کو ایک لمحہ کے لیے بھی ٹال سکتا ہے۔ جس وقت، جہاں، جس حال میں بھی اس کی موت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اسی وقت، اسی جگہ اور اسی حال میں یہ مر کر رہتا ہے، اور جس نوعیت کی قبر بھی اس کے لیے طے کر دی گئی ہے اسی نوعیت کی قبر میں ودیعت ہو جاتا ہے، خواہ وہ زمین کا پیٹ ہو، یا سمندر کی گہرائیاں، یا آگ کا لاڈ، یا کسی دزدے کا معدنہ انسان خود تو درکنار، ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو کسی شخص کے معاملہ میں خالق کے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

۳۳ یعنی اس کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ خالق جب اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا چاہے تو یہ اٹھنے سے انکار کر سکے۔ پہلے جب اسے پیدا کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اس سے رائے نہیں لی گئی تھی کہ تو پیدا ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار بھی کر دیتا تو پیدا ہو کر رہتا۔ اسی طرح اب دوبارہ پیدائش بھی اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے کہ یہ مر کر اٹھنا چاہے تو اٹھے اور اٹھنے سے انکار کر دے تو نہ اٹھے۔ خالق کی مرضی کے آگے اس معاملہ میں بھی یہ قطعی بے بس ہے۔ جب بھی وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کو اٹھنا ہوگا، خواہ یہ راضی ہو یا نہ ہو۔

يَقْضِ مَا أَمَرَ ۖ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ﴿۲۴﴾ أَتَا صَبَبْنَا
 الْمَاءَ صَبًّا ۖ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۖ ﴿۲۶﴾ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۖ ﴿۲۷﴾
 وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۖ ﴿۲۸﴾ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۖ ﴿۲۹﴾ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۖ ﴿۳۰﴾
 وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۖ ﴿۳۱﴾ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۖ ﴿۳۲﴾

وہ فرض اور نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے
 خوب پانی نڈھایا، پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا، پھر اُس کے اندر گائے غلے اور انگور اور زراکار
 اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے
 مویشیوں کے لیے سامان زریست کے طور پر۔

۱۶ حکم سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ودیعت
 کر دیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرہ اور قدرت
 الہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے، اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ
 سے بھیجا اور ہر دور کے صالحین کے ذریعہ سے پھیلا یا ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر
 سورہ دہر، حاشیہ ۵)۔ اس سلسلہ بیان میں یہ بات اس معنی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اور ہرہ کی آیتوں میں
 بیان ہوئے ہیں ان کی بنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرمانبرداری کرتا، مگر اس نے الٹی نافرمانی کی راہ اختیار
 کی اور بندہ مخلوق ہونے کا جو تقاضا تھا اسے پورا نہ کیا۔

۱۷ یعنی جس خوراک کو وہ ایک معمولی چیز سمجھتا ہے، اُس پر ذرا غور تو کرے کہ یہ آخر پیدا کیسے ہوتی ہے۔ اگر
 خدا نے اس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو کیا انسان کے بس میں یہ تھا کہ زمین پر یہ غذا وہ خود پیدا کر لیتا؟
 ۱۸ اس سے مراد بارش ہے۔ سورج کی حرارت سے بے حد حساب مقدار میں سمندروں سے پانی بھاپ
 بنا کر اٹھایا جاتا ہے، پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر ہوا میں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلاتی ہیں،
 پھر عالم بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں اتر کر پانی کی شکل اختیار کرتی اور ہر علاقے میں ایک خاص حساب سے برستی
 ہیں، پھر وہ پانی براہ راست بھی زمین پر برستا ہے، زریزہ میں کنوؤں اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں
 اور ندی نالوں کی شکل میں بھی بہتا ہے، اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر پگھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے
 موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں ہوتا ہے۔ کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں؟ اُس کا خالق اُس

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَقْرَأُ الْمُرءُومِنَ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾ وَ
 أُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِيهِ وَبَيْنِهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ

آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی۔ اُس روز آدمی اپنے بھائی
 اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر

کی رزق رسائی کے لیے یہ انتظام نہ کرنا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا؟

۱۹۔ زمین کو پھاٹنے سے مراد اُس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی پیڑیاں انسان
 اُس کے اندر بوٹے، یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعہ سے، یا کسی اور طریقے سے اُس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کو نیلیں
 نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے، اور جو تخم خدا نے پیدا کر دیے
 ہیں، انہیں زمین کے اندر اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اُسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے
 تخم پیدا کیے ہیں۔ اُسی نے ان تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر تخم سے اُسی کی جنس کی
 نباتات اُگے۔ اور اُسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی
 نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشوونما دے۔ یہ تخم ان خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ
 بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی پیاں پاسکتا تھا؟

۲۰۔ یعنی تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ اُن جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، کھن
 وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمہاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے
 ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اس سر و سامان سے مستمیع ہو اور جس خدا کے رزق پر پل رہے ہو اُسی
 سے کفر کرو؟

۲۱۔ مراد ہے آخری نفعِ صورت کی قیامت خیز آواز جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی
 اٹھیں گے۔

۲۲۔ اس سے ملتا جلتا مضمون سورۃ معارج آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی
 ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ان عزیزوں کو، جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ
 کر بچائے اس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور
 یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی
 خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آنے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک
 دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ کاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی

يَوْمِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝۳۴ وَجُودَةٌ يَوْمِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸ ضَاحِكَةٌ
 مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹ وَجُودَةٌ يَوْمِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱
 أُولَٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرَةُ الْفَجَرَةُ ۝۴۲

اس دن ایسا وقت آئے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے
 ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور کلوٹس
 پھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔

سے، اولاد کو ماں یا پ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے
 غلام مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔

۱۱۲ احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نے فرمایا "قیامت کے روز سب لوگ ننگے نچتے اٹھیں گے" آپ کی اندواج مطہرات میں سے کسی نے (بہر روایت
 بعض حضرت عائشہؓ نے، اور بروایت بعض حضرت سوادہؓ نے اور بروایت بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا،
 یا رسول اللہ کیا ہمارے ستر اس روز سب کے سامنے کھلے ہوں گے؟ حضور نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا
 کہ اس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا (نسائی، ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، طبرانی، ابن
 مردودہ، بیہقی، حاکم)۔

تفسير القرآن

الكبير

(٨١)

التکویر

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ کُوْرَتْ سے ماخوذ ہے۔ کُوْدَتْ تکویر سے صیغہ ماضی مجہول ہے جس کے معنی ہیں لپیٹی گئی۔ اس نام سے مراد یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لپیٹنے کا ذکر آیا ہے۔
 زمانہ نزول | مضمون اور انداز بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کے دو موضوع ہیں۔ ایک آخرت، دوسرے رسالت۔

پہلی چھ آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے جب سورج بے نور ہو جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، پہاڑ زمین سے اکٹھا کر اڑنے لگیں گے، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہیگا، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر بھڑک اٹھیں گے۔ پھر سات آیتوں میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جب روحیں از سر نو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی، نامہ اعمال کھولے جائیں گے، جرائم کی باز پرس ہوگی، آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور دوزخ جنت سب چیزیں نکاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ آخرت کا یہ سارا نقشہ کھینچنے کے بعد یہ کہہ کر انسان کو سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اُس وقت ہر شخص کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اس کے بعد رسالت کا مضمون لیا گیا ہے۔ اس میں اہل مکہ سے کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کسی دیوانے کی بڑ نہیں ہے، نہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا دوسرہ ہے، بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے ایک بزرگ، عالی مقام اور امانت دار پیغام بر کا بیان ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے آسمان کے اُفق پر دن کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس تعلیم سے منہ موڑ کر آخر تم کہہ

چلے جا رہے ہو؟

آیاتھا ۲۹

سُورَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۱؎ وَاِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۲؎ وَاِذَا الْجِبَالُ
 سُوِّدَتْ ۳؎ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۴؎ وَاِذَا الْوُحُوْشُ خُسِفَتْ ۵؎

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب
 دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے،

۱ سورج کے بے نور کر دیے جانے کے لیے یہ ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ عربی زبان میں تکویر کے معنی لپیٹنے
 کے ہیں۔ سر پہ عمامہ باندھنے کے لیے تکویر العمامہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد
 اسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اُس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے نظام شمسی میں پھیلتی ہے عمامہ سے تشبیہ دی گئی
 ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا، یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند
 ہو جائے گا۔

۲ یعنی وہ بندش جس نے اُن کو اپنے اپنے مدار اور مقام پر باندھ رکھا ہے، کھل جائے گی اور سب تارے
 اور ستارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ انکدار میں کدورت کا مفہوم بھی شامل ہے جس سے یہ ظاہر
 ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔

۳ دوسرے الفاظ میں زمین کی وہ کشش بھی ختم ہو جائے گی جس کی بدولت پہاڑ زمین پر اور جسے ہوتے ہیں۔
 پس جب وہ باقی نہ رہے گی تو سارے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور بے وزن ہو کر زمین پر اس طرح چلنے
 لگیں گے جیسے فضا میں بادل چلتے ہیں۔

۴ عربوں کو قیامت کی سختی کا تصور دلانے کے لیے یہ بہترین طرز بیان تھا۔ موجودہ زمانہ کے ٹرک اور
 بیس چلنے سے پہلے اہل عرب کے لیے اُس اونٹنی سے زیادہ قیمتی مال اور کوئی نہ تھا جو بچہ چلنے کے قریب ہو۔ اس حالت
 میں اس کی بہت زیادہ حفاظت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی تاکہ وہ کھوٹی نہ جائے، کوئی اسے چرانہ لے، یا اور کسی طرح وہ
 ضائع نہ ہو جائے۔ ایسی اونٹنیوں سے لوگوں کا غافل ہو جانا گویا یہ معنی رکھتا تھا کہ اُس وقت کچھ ایسی سخت افتاد
 لوگوں پر پڑے گی کہ انہیں اپنے اس عزیز ترین مال کی حفاظت کا بھی ہوش نہ رہے گا۔

۵ دنیا میں جب کوئی عام مصیبت کا موقع آتا ہے تو ہر قسم کے جانور بھاگ کر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اُس

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۖ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۖ وَإِذَا
 الْمَوَدَّةُ سُيِّئَتْ ۖ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۖ وَإِذَا الصُّحُفُ

اور جب سمندر بھر کا دیے جائیں گے، اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی، اور جب
 زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی ہے اور جب اعمال نامے
 وقت نہ سانپ ڈستا ہے، نہ شیر بھاڑتا ہے۔

۱۵ اصل میں لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عربی زبان میں تنور
 کے اندر آگ دہکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک
 اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابل تعجب محسوس نہ ہوگی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا
 معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور حائیڈروجن، دو ایسی گیسوں کو باہم ملا یا جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری
 بھڑک اٹھنے والی ہے، اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ کی قدرت کا
 ایک اشارہ اس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسوں ایک دوسرے
 سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔
 ۱۶ یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

۱۷ یعنی انسان از سر نو اسی طرح زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ دنیا میں مرنے سے پہلے جسم و روح کے
 ساتھ زندہ تھے۔

۱۸ اس آیت کے انداز بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصور
 نہیں کیا جاسکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابل نفرت ہوں گے کہ ان کو
 مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا
 جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی، اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے
 ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ
 دیے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحوی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہل عرب کو یہ
 احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ
 درگور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اسی جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو
 محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے
 ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا، آخر اس کی کہیں تو داوری ہوئی چاہیے

اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب ان سے اس بے دردانہ ظلم کی باز پرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سنتے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اس پر کوئی شرم آتی تھی۔ نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا۔ نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلم عظیم بالکل ہی بے دائرہ جانا چاہیے؟

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا۔ ایک، معاشی خستہ حالی جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پر سنے کا بار اُن پر نہ پڑے۔ بیٹیوں کو تو اس امید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے، مگر بیٹیوں کو اس بیٹے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے، عام بدامنی جس کی وجہ سے بیٹیوں کو اس لیے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں الٹی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آ سکتی تھیں۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے جا کر وہ یا تو لوندیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ رانی وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زرعی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادل ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملہ میں جو شقاوت برتی جاتی تھی اس کا قصہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سُن کر میری کہنے سے پہلے ہی باپ میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضور سے اپنے عہد جاہلیت کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستہ میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی ہائے اتا، ہائے اتا۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رو دیے اور آپ کے آنسو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا اے شخص تو نے حضور کو غلبین کر دیا۔ حضور نے فرمایا اسے مت روکو، جس چیز کا اسے سخت احساس ہے اُس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کر۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپ سن کر اس قدر روئے کہ آپ کی ڈارھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا اللہ نے اسے معاف کر دیا، اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اہل عرب اس انتہائی غیر انسانی فعل کی قیامت کا سرے سے کوئی احساس ہی نہ رکھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی بگڑ چکا ہو، وہ ایسے ظالمانہ افعال کی برائی کے احساس سے بالکل خالی

نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں اس فعل کی قباحت پر کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی گئی ہے، بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے الفاظ میں صرف اتنی بات کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصور میں ماری گئی۔ عرب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانہ جاہلیت میں اس رسم کی قباحت کا احساس تھا۔ طبرانی کی روایت ہے کہ فرزدق شاعر کے دادا صخر بن ناجیہ الجاشعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ، میں نے جاہلیت کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال بھی کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے ۲۶ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر ایک کی جان بچانے کے لیے دو دو اونٹ فدیے میں دیے۔ کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ حضور نے فرمایا ہاں تیرے لیے اجر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

در حقیقت یہ اسلام کی برکتوں میں سے ایک بڑی برکت ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ عرب سے اس انتہائی سنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا، بلکہ اس تخیل کو مٹایا کہ بیٹی کی پیدائش کوئی مادہ اور مصیبت ہے جسے بادل ناخواستہ برداشت کیا جائے۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ تعلیم دی کہ بیٹیوں کو پرورش کرنا، انہیں عمدہ تعلیم و تربیت دینا اور انہیں اس قابل بنانا کہ وہ ایک اچھی گھر والی بن سکیں، بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں لڑکیوں کے متعلق لوگوں کے عام تصور کو جس طرح بدلا ہے اس کا اندازہ آپ کے ان بہت سے ارشادات سے ہو سکتا ہے جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ہم آپ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں:

مَنْ ابْتُلِيَ مِنْ هَذِهِ الْبَنَاتِ بَشِيءٍ
فَاحْسِنَ إِلَيْهِنَّ كُنْ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّاسِ۔
(بخاری۔ مسلم)

جو شخص ان لڑکیوں کی پیدائش سے آزمائش میں ڈالا جائے اور پھر وہ ان سے نیکی سلوک کرے تو یہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی۔

مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتَّى تَبْلُغَا
جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهَكَذَا وَضَعُ
أَصَابِعَهُ (مسلم)

جس نے دو لڑکیوں کو پرورش کیا یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو قیامت کے روز میرے ساتھ وہ اس طرح آئے گا، یہ فرما کر حضور نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا۔

مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ أَوْ مِثْلَهُنَّ
مِنَ الْأَنْوَاعِ فَأَدَّبَهُنَّ وَرَحَمَهُنَّ حَتَّى
يَغْنِيَهُنَّ اللَّهُ أَوْ جَبَّ اللَّهُ لَهُ الْجَنَّةُ۔
نَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَوْ اثْنَتَيْنِ؟
قَالَ أَوْ اثْنَتَيْنِ حَتَّى لَوْ قَالَ أَوْ وَاحِدَةً

جس شخص نے تین بیٹیوں، یا بہنوں کو پرورش کیا، ان کو اچھا ادب سکھایا اور ان سے شفقت کا برتاؤ کیا یہاں تک کہ وہ اس کی مدد کی محتاج نہ رہیں تو اللہ اس کے لیے جنت واجب کر دیگا۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اور دو حضور

نُشِرَتْ ۱۰ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۱۱ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ ۱۲
وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۱۳ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۱۴

کھولے جائیں گے، اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا، اور جب جہنم دہکائی جائے گی، اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی، اُس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

لَقَالَ وَاحِدَةٌ۔

نے فرمایا اور وہ بھی۔ حدیث کے راوی ابن عباس کہتے ہیں کہ اگر لوگ اس وقت ایک کے متعلق پوچھتے تو حضور اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔

(شرح السنة)

جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے، نہ بیٹے کو اُس پر ترجیح دے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ ان پر صبر کرے اور اپنی وسعت کے مطابق ان کو اچھے کپڑے پہنائے وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ نہیں گی۔

مَنْ كَانَتْ لَهَا انثى فلم يبيدها ولم يعنها ولم يوثر ولداً عليها ادخله الله الجنة. (ابوداؤد)

مَنْ كَانَ لَهُ ثَلَاثُ بَنَاتٍ وَصَبِرَ عَلَيْهِنَّ وَكَسَاهُنَّ مِنْ جَدَّتَيْهِ كَنْ لَهَا جِجَابًا مِنَ النَّارِ

(بخاری فی الادب المفرد۔ ابن ماجہ)

جس مسلمان کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کو اچھی طرح رکھے وہ اسے جنت میں پہنچائیں گی۔

مَا مِنْ مُسْلِمٍ تَدْرَكَهُ ابْنَتَانِ فَيُحْسِنُ مَهَبَتَهُمَا إِلَّا ادْخَلْتَاهُ الْجَنَّةَ۔ (بخاری، ادب المفرد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن جحشم سے فرمایا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ دینا فرمایا بڑے صدقوں میں سے ایک کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا ضرورت بتائیے یا رسول اللہ فرمایا تیری وہ بیٹی جو رطلاق پا کر یا بیوہ ہو کر تیری طرف پلٹ آئے اور تیرے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو۔

اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِسُرَاقَةَ بِنْتِ جِحْشَمٍ اَلَا اِدْلُكَ عَلٰى اَعْظَمِ الصَّدَقَةِ اَوْ مِنْ اَعْظَمِ الصَّدَقَةِ قَالَ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِبْنَتُكَ الْمُرْدُوْدَةُ اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَا سَبْ غَيْرِكَ۔

(ابن ماجہ۔ بخاری فی الادب المفرد)

یہی وہ تعلیم ہے جس نے لڑکیوں کے متعلق لوگوں کا نقطہ نظر صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی ان تمام قوموں

فَلَا أَقِيمُ بِالْخُنُثِيِّ ۝۱۵ الْجَوَارِ الْكُنُثِيِّ ۝ وَالْبَيْلِ إِذَا عَسَسَ ۝
وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝۱۸ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝۱۹ ذِي قُوَّةٍ

پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے اور چھپ جانے والے تاروں کی اور رات کی جبکہ وہ نخت ہوئی اور صبح کی جبکہ اس نے سانس لیا یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے جو بڑی توانائی رکھتا ہے

میں بدل دیا جو اسلام کی نعمت سے فیض یاب ہوتی چلی گئیں۔

۱۵ یعنی جو کچھ اب نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہ اب عیاں ہو جائے گا۔ اب تو صرت خلا نظر آتا ہے یا پھر بادل، گرد و غبار، چاند، سورج اور تارے۔ لیکن اُس وقت خدا کی خدائی اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب کے سامنے ہے پردہ ہو جائے گی۔

۱۸ یعنی میدان حشر میں جب لوگوں کے مقدمات کی سماعت ہو رہی ہوگی اُس وقت جہنم کی دھکتی ہوئی آگ بھی سب کو نظر آ رہی ہوگی اور جنت بھی اپنی ساری نعمتوں کے ساتھ سب کے سامنے موجود ہوگی تاکہ بد بھی جان لیں کہ وہ کس چیز سے محروم ہو کر کہاں جانے والے ہیں، اور نیک بھی جان لیں کہ وہ کس چیز سے بچ کر کین نعمتوں سے سرفراز ہونے والے ہیں۔

۱۹ یعنی تم لوگوں کا یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ کسی دیوانے کی بڑبڑ ہے یا کوئی شیطانی دوسوہ ہے۔

۲۰ یہ قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ آگے کی آیات میں بیان کی گئی ہے۔ مطلب اس قسم کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا ہے بلکہ جب تارے چھپ گئے تھے، رات رخصت ہو گئی تھی اور صبح روشن نمودار ہو گئی تھی، اُس وقت کھلے آسمان پر انہوں نے خدا کے فرشتے کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ اُن کے آنکھوں دیکھے مشاہدے اور پورے ہوش گوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے۔

۲۱ اس مقام پر بزرگ پیغامبر (رسول کریم) سے مراد وحی لانے والا فرشتہ ہے جیسا کہ آگے کی آیات سے بصراحت معلوم ہو رہا ہے۔ اور قرآن کو پیغام بر کا قول کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اس فرشتے کا اپنا کلام ہے، بلکہ "قول پیغامبر" کے الفاظ خود ہی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ اُس ہستی کا کلام ہے جس نے اسے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ سورہ الحاقہ آیت ۴۰ میں اسی طرح قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہا گیا ہے اور وہاں بھی مراد یہ نہیں ہے کہ یہ حضور کا اپنا تصنیف کردہ ہے بلکہ اسے "رسول کریم" کا قول کہہ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس چیز کو حضور خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں نہ کہ محمد بن عبد اللہ کی حیثیت سے۔ دونوں جگہ قول کو

عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿۲۰﴾ مُطَاعٍ ثُمَّ أَمِينٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا
صَاحِبِكُمْ بِمَجْنُونٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَأَاهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴿۲۳﴾

عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اُس کا حکم مانا جاتا ہے، وہ با اعتماد ہے۔ اور اہل اہل مکہ، تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے، اُس نے اُس پیغام پر کوروشن اُفق پر دیکھا ہے۔

فرشتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اللہ کا پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیغام لانے والے فرشتے کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد ششم، الحاقہ، حاشیہ ۲۲۔

۱۵ سورہ نجم آیات ۴-۵ میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ ان هُوَ الَّذِي يُوحِي سِرَّهُ وَيَكْفِيهِ الْقَوِي
یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے، اُس کو زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے، یہ بات درحقیقت
مشابہات میں سے ہے کہ جبریل علیہ السلام کی ان زبردست قوتوں اور ان کی اس عظیم توانائی سے کیا مراد ہے۔
بہر حال اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں میں بھی وہ اپنی غیر معمولی طاقتوں کے اعتبار سے ممتاز
ہیں۔ مسلم، کتاب الایمان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے دو مرتبہ جبریل
کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، ان کی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ بخاری،
مسلم، ترمذی اور مشن احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ان کو اس شان میں دیکھا کہ ان کے چہرے سو پر تھے۔ اس سے کچھ ان کی زبردست طاقت کا اندازہ کیا
جاسکتا ہے۔

۱۶ یعنی وہ فرشتوں کا افسر ہے۔ تمام فرشتے اُس کے حکم کے تحت کام کرتے ہیں۔

۱۷ یعنی وہ اپنی طرف سے کوئی بات خدا کی وحی میں ملا دینے والا نہیں ہے، بلکہ ایسا امانت دار ہے کہ جو کچھ
خدا کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے اُسے جوں کا توں پہنچا دیتا ہے۔

۱۸ رفیق سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور آپ کو اہل مکہ کا رفیق کہہ کر دراصل انہیں اس بات
کا احساس دلایا گیا ہے کہ آپ اُن کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں بلکہ انہی کے ہم قوم اور ہم قبیلہ ہیں۔ انہی کے درمیان
آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی ہے، اور اُن کے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ آپ کس قدر توانا اور موٹے انداز میں ہیں۔
ایسے شخص کو جانتے بوجھنے مجنون کہتے ہوئے انہیں کچھ تو شرم آتی چاہیے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،
جلد پنجم، النجم، حواشی ۲-۳)۔

۱۹ سورہ نجم آیات ۹ تا ۱۱ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشاہدے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۚ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿٢٥﴾
 فَاَيْنَ تَذٰهُبُوْنَ ۗ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۗ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَاءَ
 مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۗ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ
 رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۗ ﴿٢٩﴾

اور وہ غیب (کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطانِ مرؤد کا قول نہیں ہے۔ پھر تم لوگ کہہ رہے جا رہے ہو، یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے، تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو راہِ راست پر چلنا چاہتا ہو۔ اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔ ع

کیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، انجم، حواشی، ۷-۸)۔

۱۷ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتے۔ غیب کے جو حقائق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کھولے گئے ہیں، خواہ وہ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں ہوں، یا فرشتوں کے بارے میں، یا زندگی بعد موت اور قیامت اور آخرت اور جنت اور دوزخ کے بارے میں، سب کچھ تمہارے سامنے بے کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔

۱۸ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے۔ شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بت پرستی اور دہریت و الحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شرک سے ہٹانے کے بجائے خدا کے حضور ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس دلائے۔ جاہلانہ رسموں اور ظلم اور بد اخلاقی اور بد کرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، آیات ۲۱۰ تا ۲۱۲ مع حواشی ۱۳۰ تا ۱۳۳، اور آیات ۲۲۱ تا ۲۲۳ مع حواشی ۱۴۱ تا ۱۴۳)۔

۱۹ بالفاظِ دیگر یہ کلام نصیحت ہے تو ساری نوعِ انسانی کے لیے مگر اس سے فائدہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو خود راست روی اختیار کرنا چاہتا ہو۔ انسان کا طالبِ حق اور راستی پسند ہونا اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے شرطِ اول ہے۔

۲۰ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ مدثر آیت ۵۶، اور سورۃ ذہر آیت ۳۰ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، المدثر، حاشیہ ۲۱۔

تفصيل

الانقطاع

(٨٢)

الانقطار

نام اپنی ہی آیت کے لفظ **انْقَطَرَتْ** سے ماخوذ ہے۔ انقطار مصدر ہے جس کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔
زمانہ نزول اس کا اور سورہ تکویر کا مضمون ایک دوسرے سے نہایت مشابہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع آخرت ہے۔ مسند احمد، ترمذی، ابن المنذر، طبرانی، حاکم اور ابن مژدہ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا: **مَنْ سَأَهُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُ رَأَى عَيْنٍ فَلْيَقْرَأْ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ، وَإِذَا السَّمَاءُ انْقَطَرَتْ، وَإِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ۔** جو شخص چاہتا ہو کہ روز قیامت کو اس طرح دیکھے جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ سورہ تکویر اور سورہ انقطار اور سورہ انشقاق کو پڑھے۔

اس میں سب سے پہلے روز قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آجائے گا تو ہر شخص کے سامنے اس کا کیا دھرا سب آجائے گا۔ اس کے بعد انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس رب نے تجھ کو وجود بخشا اور جس کے فضل و کرم کی وجہ سے آج تو سب مخلوقات سے بہتر جسم اور اعضاء بے پھرتا ہے، اس کے بارے میں یہ دھوکا تجھے کہاں سے لگ گیا کہ وہ صرف کرم ہی کرنے والا ہے، انصاف کرنے والا نہیں ہے؟ اُس کے کرم کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ تو اس کے انصاف سے بے خوف ہو جائے۔ پھر انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہ، تیرا پورا نامہ اعمال تیار کیا جا رہا ہے۔ اور نہایت معتبر کتاب ہر وقت تیری تمام حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہے ہیں۔ آخر میں پورے زور کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یقیناً روز جزا برپا ہونے والا ہے جس میں نیک لوگوں کو جنت کا عیش اور بد لوگوں کو جہنم کا عذاب نصیب ہوگا۔ اس روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، فیصلے کے اختیارات بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔

آيَاتُهَا ۱۹

سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا السَّمَاءُ اِنْفَطَرَتْ ۱ وَاِذَا الْكُوَاكِبُ اُنْتَثَرَتْ ۲ وَاِذَا الْبِحَارُ

فُجِّرَتْ ۳ وَاِذَا الْقُبُورُ بُعِثَتْ ۴ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۵

جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب تارے بکھر جائیں گے، اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے، اور جب قبریں کھول دی جائیں گی، اُس وقت ہر شخص کو اُس کا اگلا پھپھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا۔

۱۵ سورۃ تکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکادی جائے گی، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقے تک محدود نہ ہوگا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اُس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اُس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے اُن دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک، یعنی آکسیجن جلانے والی، اور دوسری، یعنی ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے، اور یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل رد عمل (Chain reaction) شروع ہو جائے گا جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے، باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

۱۶ پہلی تین آیتوں میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے اور اس آیت میں دوسرا مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ قبروں کے کھولے جانے سے مراد لوگوں کا از سر نو زندہ کر کے اٹھایا جانا ہے۔

۱۷ اصل الفاظ ہیں مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ۔ ان الفاظ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی یہاں مراد ہیں: (۱) جو اچھا یا بُرا عمل آدمی نے کر کے آگے بھیج دیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے اور جس کے کرنے سے وہ باز رہا وہ مَا اَخَّرَتْ۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ تقریباً انگریزی زبان کے الفاظ Commission اور Omission کے ہم معنی ہیں۔

(۲) جو کچھ پہلے کیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے اور جو کچھ بعد میں کیا وہ مَا اَخَّرَتْ، یعنی آدمی کا پورا نامہ اعمال ترتیباً

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝۶ الَّذِي خَلَقَكَ
فَسَوَّكَ فَعَدَلَكَ ۝۷ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝۸ كَلَّا
بَلْ تُكْذِبُونَ بِاللَّيِّنِ ۝۹ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝۱۰ كِرَامًا

اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے اُس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے
تجھے پیدا کیا، تجھے نیک سُک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار
کیا، ہرگز نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں ایسے معزز
اور تازہ بخ و آرا اس کے سامنے آ جائے گا۔

(۳) جو اپنے اور بُرے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے وہ مآقداً ممت ہیں اور ان اعمال کے جو آثار و نتائج
وہ انسانی معاشرے میں اپنے پیچھے چھوڑ گیا وہ مآ آخراً۔

۷ یعنی اول تو اُس محسن پروردگار کے احسان و کرم کا تقاضا یہ تھا کہ تو شکر گزار اور احسان مند ہو کر اس
کافر مانبردار بننا اور اُس کی نافرمانی کرتے ہوئے تجھے شرم آتی، مگر تو اس دھوکے میں پڑ گیا کہ تو جو کچھ بھی بنا ہے خود
ہی بن گیا ہے اور یہ خیال تجھے کبھی نہ آیا کہ اس وجود کے بخشنے والے کا احسان مانے۔ دوسرے تیرے رب کا یہ کرم
ہے کہ دنیا میں جو کچھ تو چاہتا ہے کہ گزرتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا کہ جو نہیں تجھ سے کوئی خطا سرزد ہو وہ تجھ پر فالج گرا دے
یا تیری آنکھیں اندھی کر دے یا تجھ پر بجلی گرا دے۔ لیکن تو نے اس کرم کو کمزوری سمجھ لیا اور اس دھوکے میں پڑ گیا
کہ تیرے خدا کی خدائی میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

۸ یعنی کوئی معقول وجہ اس دھوکے میں پڑنے کی نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں
بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو
انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدا نے حکیم و توانا نے تجھے اس مکمل انسانی شکل میں ترکیب دیا ہے
تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہتر بن ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف
نمایاں ہیں۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ اس کو دیکھ کر تیرا سر بار احسان سے جھک جاتا اور اُس ربِّ کریم کے مقابلے میں
تو کبھی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ تو یہ بھی جانتا ہے کہ تیرا رب صرف رحیم و کریم ہی نہیں ہے، جبار و قہار بھی ہے۔ جب
اس کی طرف سے کوئی زلزلہ یا طوفان یا سیلاب آجاتا ہے تو تیری ساری تدبیریں اس کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتی
ہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا رب جاہل و نادان نہیں بلکہ حکیم و دانایا ہے، اور حکمت و دانائی کا لازمی تقاضا یہ ہے
کہ جسے عقل دی جائے اُسے اُس کے اعمال کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا جائے، جسے اختیارات دیے جائیں اس سے حساب

كَاتِبِينَ ۱۱ ۷ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۱۲ ۷ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۱۳ ۷
 وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۱۴ ۷ يَصَلُّونَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۱۵ ۷ وَمَا هُمْ
 عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۱۶ ۷ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۱۷ ۷ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ
 مَا يَوْمَ الدِّينِ ۱۸ ۷ يَوْمَ لَا تَبْلُغُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا
 وَالْأَهْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۱۹ ۷

کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔

یقیناً نیک لوگ مرے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے جزا کے دن
 وہ اس میں داخل ہوں گے اور اُس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن
 کیا ہے؟ ہاں، تمہیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی
 بس میں نہ ہوگا، فیصلہ اُس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

بھی لیا جائے کہ اس نے اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کیا، اور جسے اپنی ذمہ داری پر نیکی اور بدی کرنے کی طاقت
 دی جائے اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا بھی دی جائے۔ یہ سب حقیقتیں تیرے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں
 ہیں، اس لیے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنے ربِّ کریم کی طرف سے جس دھوکے میں تو پڑ گیا ہے اس کی کوئی معقول وجہ موجود
 ہے۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اُس ماتحت کو کیسے سمجھتا ہے جو تیری شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ
 کر تیرے سر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اس کا
 موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اُس کے مقابلے میں جبری ہو جائے اور اس غلط فہمی میں پڑ جائے کہ میں جو کچھ چاہوں
 کروں، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

۱۵ یعنی دراصل جس چیز نے تم لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے وہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے بلکہ محض تمہارا
 یہ احمقانہ خیال ہے کہ دنیا کے اس دارِ العمل کے پیچھے کوئی دارِ الحجاز نہیں ہے۔ اسی غلط اور بے بنیاد گمان نے
 تمہیں خدا سے غافل، اُس کے انصاف سے بے خوف، اور اپنے اخلاقی رویے میں غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔

۱۷ یعنی تم لوگ چاہے دارِ الحجاز کا انکار کرو یا اُس کو جھٹلادیا اُس کا مذاق اڑاؤ، اس سے حقیقت نہیں
 بدلتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں دنیا میں شتر بے مار بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے تمہیں سے



ایک ایک آدمی پر نہایت راستباز نگراں مقرر کر رکھے ہیں جو بالکل بے لاگ طریقے سے تمہارے تمام اچھے اور برے اعمال کو ریکارڈ کر رہے ہیں، اور ان سے تمہارا کوئی کام چھپا ہوا نہیں ہے، خواہ تم اندھیرے میں، ظلمتوں میں، سنسان جنگلوں میں، یا اور کسی ایسی حالت میں اُس کا از نکاب کرو جہاں تمہیں پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ نگاہِ خلق سے مخفی رہ گیا ہے۔ ان نگراں فرشتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کہا: اِنَّا كَاتِبِينَ كَمَا تَعْمَلُ فَرَمَاتے ہیں، یعنی ایسے کاتب جو کریم (نہایت بزرگ اور معزز) ہیں۔ کسی سے نہ ذاتی محبت رکھتے ہیں نہ عداوت کہ ایک کی بے جا رعایت اور دوسرے کی ناروا مخالفت کر کے خلافتِ واقعہ ریکارڈ تیار کریں۔ خائن بھی نہیں ہیں کہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوئے بغیر بطور خود غلط سلط اندرا جات کر لیں۔ رشوت خوار بھی نہیں ہیں کہ کچھ سے دسہ کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جھوٹی رپورٹیں کر دیں۔ ان کا مقام ان ساری اخلاقی کمزوریوں سے بلند ہے، اس لیے نیک و بد دونوں قسم کے انسانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر ایک کی نیکی بے کم و کاست ریکارڈ ہوگی، اور کسی کے ذمہ کوئی ایسی بدی نہ ڈال دی جائے گی جو اس نے نہ کی ہو۔ پھر ان فرشتوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ”جو کچھ تم کرتے ہو اُسے وہ جانتے ہیں“ یعنی ان کا حال دنیا کی سی آئی ڈی اور اطلاعات (Intelligence) کی ایجنسیوں جیسا نہیں ہے کہ ساری تنگ و ود کے باوجود بت سی باتیں ان سے چھپی رہ جاتی ہیں۔ وہ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہیں، ہر جگہ ہر حال میں ہر شخص کے ساتھ اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اُسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کی نگرانی کر رہا ہے، اور انہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص نے کس نیت سے کوئی کام کیا ہے۔ اس لیے اُن کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔ اسی کے متعلق سورہ کہف آیت ۶۹ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامہ اعمال پیش کیا جا رہا ہے اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی ہے، جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب جوں کا توں اُن کے سامنے حاضر ہے۔

۵۸ یعنی کسی کی وہاں یہ طاقت نہ ہوگی کہ وہ کسی شخص کو اس کے اعمال کے نتائج بھگتنے سے بچا سکے۔ کوئی وہاں ایسا با اثر یا زور آور یا اللہ کا چہیتا نہ ہوگا کہ عدالتِ خداوندی میں اُٹ کر بیٹھ جائے اور یہ کہہ سکے کہ فلاں شخص میرا عزیز یا متوسل ہے، اسے تو بخشنا ہی ہوگا، خواہ یہ دنیا میں کیسے ہی بُرے افعال کر کے آیا ہو۔

تفسير القرآن

المطّفين

(٨٣)

الْمُطَفِّفِينَ

نام اپنی ہی آیت **وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ** سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | اس کے انداز بیان اور مضامین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اہل مکہ کے ذہن میں آخرت کا عقیدہ بٹھانے کے لیے درپے درپے نازل ہو رہی تھیں، اور اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب اہل مکہ نے سڑکوں پر، بازاروں میں اور مجلسوں میں مسلمانوں پر آواز سے کہنے اور ان کی توہین و ذلیل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، مگر ظلم و ستم اور مار پیٹ کا دورا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ دراصل ابن عباس کی یہ روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں کے لوگوں میں کم ناپنے اور تولنے کا مرض بُری طرح پھیلا ہوا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے **وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ** نازل کی اور لوگ بہت اچھی طرح ناپنے تولنے لگے (نسائی، ابن ماجہ، ابن مژذبیہ، ابن جریر، بیہقی فی شعب الایمان)۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے ہم سورہ دہر کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، صحابہ اور تابعین کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک آیت جس معاملہ پر چسپاں ہوتی ہو اس کے متعلق وہ یوں کہا کرتے تھے کہ یہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے ابن عباس کی روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لوگوں میں یہ بُری عادت پھیلی ہوئی پائی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے یہ سورت ان کو سنائی اور اس سے ان کے معاملات درست ہو گئے۔

موضوع اور مضامین | اس کا موضوع بھی آخرت ہے۔

پہلی چھ آیتوں میں اُس عام بے ایمانی پر گرفت کی گئی ہے جو کاروباری لوگوں میں بکثرت پھیلی ہوئی تھی کہ دوسروں سے لینا ہوتا تھا تو پورا ناپ کرا اور تول کر لیتے تھے، مگر جب دوسروں کو دینا ہوتا تو ناپ تول میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ گھٹا مانتے تھے۔ معاشرے کی بے شمار خرابیوں میں سے اس ایک خرابی کو، جس کی قباحت سے کوئی انکار نہ کر سکتا تھا، بطور مثال لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آخرت سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ایک روز خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے اُس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کامل راستبازی اختیار کر سکیں۔ کوئی شخص دیانت داری کو "اچھی پالیسی" سمجھ کر بعض چھوٹے چھوٹے معاملات

میں دیانت برت بھی لے تو ایسے مواقع پر وہ کبھی دیانت نہیں برت سکتا جہاں بے ایمانی ایک "مفید" پالیسی ثابت ہوتی ہو۔ آدمی کے اندر سچی اور مستقل دیانت داری اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف خدا کے خوف اور آخرت پر یقین ہی سے ہو سکتی ہے، کیونکہ اس صورت میں دیانت ایک "پالیسی" نہیں بلکہ "فریضہ" قرار پاتی ہے اور آدمی کے اُس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کا انحصار دنیا میں اس کے مفید یا غیر مفید ہونے پر نہیں رہتا۔

اس طرح اخلاق کے ساتھ عقیدہ آخرت کا تعلق نہایت مؤثر اور دل نشین طریقہ سے واضح کرنے کے بعد آیت ۷ سے ۷ تک بتایا گیا ہے کہ بدکار لوگوں کے نامہ اعمال پہلے ہی جرائم پیشہ لوگوں کے رجسٹر Black list میں درج ہو رہے ہیں اور آخرت میں ان کو سخت تباہی سے دوچار ہونا ہے۔ پھر آیت ۸ سے ۸ تک نیک لوگوں کا بہترین انجام بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اعمال نامے بلند پایہ لوگوں کے رجسٹر میں درج ہو رہے ہیں جس پر مقرب فرشتے مامور ہیں۔

آخر میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کفار کو خبردار بھی کیا گیا ہے کہ آج جو لوگ ایمان لانے والوں کی تہلیل کر رہے ہیں، قیامت کے روز یہی مجرم لوگ اپنی اس روش کا بہت بُرا انجام دیکھیں گے اور یہی ایمان لانے والے ان مجرموں کا بُرا انجام دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں گے۔

آيَاتُهَا ۳۶

سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۱ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۲
وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۳ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ
أَنَّهُمْ مَّبْعُوثُونَ ۴ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۵ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ ۶ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَارِ لَفِي سِجِّينٍ ۷ وَمَا أَدْرَاكَ

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں، اُس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

ہرگز نہیں، یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قیدخانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم

۱۔ اصل میں لفظ مُطَفِّفِينَ استعمال کیا گیا ہے جو تَطْفِيف سے مشتق ہے۔ عربی زبان میں طَفِيف چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے بولتے ہیں اور تَطْفِيف کا لفظ اصلاً حانپ تول میں چوری چھپے کی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے سحتے میں سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تاجر اُسے کیا اور کتنا گھاٹا دے گیا ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مذمت اور صحیح ناپنے اور تولنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ سورۃ انعام میں فرمایا "انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو، ہم کسی شخص کو اس کی قدرت سے زیادہ کا مکلف نہیں ٹھیراتے" (آیت ۱۵۲)۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا "جب ناپو تولو پورا ناپو اور صحیح نرازو سے تولو" (آیت ۳۵)۔ سورۃ رحمان میں تاکید کی گئی کہ "تولنے میں زیادتی نہ کرو، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ وزن

مَا سِجِّينٌ ۝ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝ وَيَلُوكُ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝
 الَّذِينَ يُكذِّبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ وَمَا يُكذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ
 أَثِيمٍ ۝ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ كَلَّا
 بَلْ سَكَّتْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ
 سَرَاتِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّحَاجُّو بُونَ ۝ ثُمَّ لَنُحِثُّنَّ لَهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ

کہ وہ قید خانے کا دفتر کیا ہے؛ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اُس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں۔ اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بد عمل ہے۔ اُسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں، بالیقین اُس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے، پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے پھر ان سے

کرو اور ترانہ دو، (آیات ۸-۹)۔ قوم نعیب پر جس جرم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا وہ یہی تھا کہ اُس کے اندر ناپ تول میں کمی کرنے کا مرض عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور حضرت شعیب کی پے در پے نصیحتوں کے باوجود یہ قوم اس جرم سے باز نہ آتی تھی۔

۱۳ روز قیامت کو بڑا دن اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس میں تمام انسانوں اور جنوں کا حساب خدا کی عدالت میں بیک وقت لیا جائے گا اور عذاب و ثواب کے اہم ترین فیصلے کیے جائیں گے۔

۱۴ یعنی ان لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ دنیا میں ان جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد یہ بونہی چھوٹ جائیں گے اور کبھی ان کو اپنے خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر نہ ہونا پڑے گا۔

۱۵ اصل میں لفظ سِجِّین استعمال ہوا ہے جو سجن (جیل یا قید خانے) سے ماخوذ ہے اور آگے اُس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ رجسٹر ہے جس میں سزا کے مستحق لوگوں کے اعمال نامے درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۶ یعنی وہ آیات جن میں روز جزا کی خبر دی گئی ہے۔

۱۷ یعنی جزا و سزا کو افسانہ قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن جس وجہ سے یہ لوگ اسے افسانہ سمجھتے

يَقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿۱۷﴾ كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْإِبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ﴿۱۸﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿۱۹﴾ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ﴿۲۰﴾ يُشْرَهُهُ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۱﴾ إِنَّ الْإِبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يُنظُرُونَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقُونَ مِنْ شَرَابٍ مَخْتُومٍ ﴿۲۵﴾ خِتْمُهُ مِسْكٌَ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

کما جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

ہرگز نہیں، بے شک نیک آدمیوں کا نامہ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر، ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے، اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سر بند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لیجاتا چاہتے

ہیں وہ یہ ہے کہ جن گناہوں کا یہ ارتکاب کرتے رہے ہیں ان کا رنگ ان کے دلوں پر پوری طرح چڑھ گیا ہے اس لیے جو بات سراسر معقول ہے وہ ان کو افسانہ نظر آتی ہے۔ اس رنگ کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے تو وہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہی چلا جائے تو پورے دل پر وہ چھا جاتا ہے (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، حاکم، ابن ابی حاتم، ابن حبان وغیرہ)۔

۵۵ یعنی دیدار الہی کا جو شرف نیک لوگوں کو نصیب ہوگا اس سے یہ لوگ محروم رہیں گے (مزید تشریح کے

لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۷)۔

۵۶ یعنی ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی جتنا وسر ا واقع ہونے والی نہیں ہے۔

۵۷ اصل الفاظ ہیں خِتْمُهُ مِسْكٌَ۔ اس کا ایک مفہوم توبہ ہے کہ جن برتنوں میں وہ شراب رکھی ہوگی ان پر مٹی یا موم کے بجائے مشک کی مہر ہوگی۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ شراب کی ایک نفیس ترین

الْمُنَافِسُونَ ﴿۲۷﴾ وَهَذَا جَهَنَّمُ مِنْ تَسْتَبِيهِ ﴿۲۸﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا
 الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا
 يَضْحَكُونَ ﴿۳۰﴾ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ﴿۳۱﴾ وَإِذَا انْقَلَبُوا
 إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿۳۲﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَؤُلَاءِ
 لَضَالُّونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ﴿۳۴﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ
 آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿۳۵﴾ عَلَىٰ الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ﴿۳۶﴾
 هَلْ يُؤِيبُ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۷﴾

ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اس شراب میں تینیم
 کی آمیزش ہوگی، یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پیئیں گے۔
 مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے، جب ان کے پاس سے گزرتے
 تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے، اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے
 ہوئے پلٹتے تھے، اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بھکے ہوئے لوگ ہیں، حالانکہ وہ ان پر
 نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ آج ایمان لانے والے کفار پر نہیں رہے ہیں، مسندوں پر
 بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں، بل گیا نا کافروں کو ان حرکتوں کا ثواب جو وہ کیسا
 کرتے تھے۔

قسم ہوگی جو نہروں میں بہنے والی شراب سے اشرف و اعلیٰ ہوگی اور اسے جنت کے خدام مشک کی مہر لگے ہوئے برتنوں میں
 لاکر اہل جنت کو پلائیں گے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شراب جیب پینے والوں کے حلق سے اترے گی تو آخر میں ان
 کو مشک کی خوشبو محسوس ہوگی یہ کیفیت دنیا کی شرابوں کے بالکل برعکس ہے جن کی بوتل کھلتے ہی بوجھ کا ایک بھپکا ناک میں آتا
 ہے، پیتے ہوئے بھی ان کی بدبو محسوس ہوتی ہے، اور حلق سے جب وہ اترتی ہے تو دماغ تک اس کی سڑا نڈ پینچ جاتی ہے

جس کی وجہ سے بد مزگی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۱۱۔ تسنیم کے معنی بلندی کے ہیں، اور کسی چشے کو تسنیم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بلندی سے بہتا ہوا

نیچے آ رہا ہو۔

۱۱۲۔ یعنی یہ سوچتے ہوئے پلٹتے تھے کہ آج تو مزا آگیا، میں نے فلاں مسلمان کا مذاق اڑا کر اس پر آواز سے

اور صحبتیاں کس کر خوب لطف اٹھایا اور لوگوں میں بھی اس کی اچھی گت بنی۔

۱۱۳۔ یعنی ان کی عقل ماری گئی ہے، اپنے آپ کو دنیا کے فائدوں اور لذتوں سے صرف اس لیے محروم کر لیا

ہے اور ہر طرح کے خطرات اور مصائب صرف اس لیے مول لے لیے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آخرت

اور جنت اور دوزخ کے چکر میں ڈال دیا ہے۔ جو کچھ حاضر ہے اُسے اس موهوم امید پر چھوڑ رہے ہیں کہ موت کے بعد

کسی جنت کے ملنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، اور جو تکلیفیں آج پہنچ رہی ہیں انہیں اس خیالِ خام کی بنا پر اگیز کر رہے

ہیں کہ دوسری دنیا میں کوئی جہنم ہوگی جس کے عذاب سے انہیں ڈرایا گیا ہے۔

۱۱۴۔ اس مختصر فقرے میں ان مذاق اڑانے والوں کو بڑی سبق آموز تندی کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض

وہ سب کچھ غلط ہے جس پر مسلمان ایمان لائے ہیں۔ لیکن وہ تمہارا تو کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ جس چیز کو انہوں نے حق

سمجھا ہے اُس کے مطابق وہ اپنی جگہ خود ہی ایک خاص اخلاقی رویہ اختیار کر رہے ہیں۔ اب کیا خدا نے تمہیں کوئی

فوجدار بنا کر بھیجا ہے کہ جو تمہیں نہیں چھیڑ رہا ہے اس کو تم چھیڑو، اور جو تمہیں کوئی تکلیف نہیں دے رہا ہے اسے تم

خواہ مخواہ تکلیف دو؟

۱۱۵۔ اس فقرے میں ایک لطیف طنز ہے۔ چونکہ وہ کفار کا رِثواب سمجھ کر مومنوں کو تنگ کرتے تھے، اس

لیے فرمایا گیا کہ آخرت میں مومن جنت میں مزے سے بیٹھے ہوئے جہنم میں ملنے والے ان کافروں کا حال دیکھیں گے

اور اپنے دلوں میں کہیں گے کہ خوب ثواب انہیں ان کے اعمال کا مل گیا۔

تصنيف
الفران

الإشفاق

(٨٢)

الانشقاق

نام اپنی ہی آیت کے لفظ انشقت سے ماخوذ ہے۔ انشقاق مصدر ہے جس کے معنی پھٹ جانے کے ہیں اور اس نام کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر آیا ہے۔

زمانہ نزول | یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ اس کے مضمون کی داخلی شہادت یہ بتا رہی ہے کہ ابھی ظلم و ستم کا دور شروع نہیں ہوا تھا، البتہ قرآن کی دعوت کو مکہ میں بر ملا ٹھٹھایا جا رہا تھا اور لوگ یہ ماننے سے انکار کر رہے تھے کہ کبھی قیامت برپا ہوگی اور انہیں اپنے خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا پڑے گا۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع قیامت اور آخرت ہے۔

پہلی پانچ آیتوں میں نہ صرف قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے بلکہ اس کے برحق ہونے کی دلیل بھی دے دی گئی ہے۔ اُس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس روز آسمان پھٹ جائے گا، زمین پھیلا کر ہموار میدان بنا دی جائے گی، جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہے (یعنی مردہ انسانوں کے اجزائے بدن اور اُن کے اعمال کی شہادتیں) سب کو نکال کر وہ باہر پھینک دے گی، حتیٰ کہ اس کے اندر کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ آسمان و زمین کے لیے اُن کے رب کا حکم ہی ہوگا اور چونکہ دونوں اُس کی مخلوق ہیں اس لیے وہ اس کے حکم سے سزتا بی نہیں کر سکتے، اُن کے لیے حق یہی ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کریں۔

اس کے بعد آیت ۶ سے ۱۹ تک بتایا گیا ہے کہ انسان کو خواہ اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ اُس منزل کی طرف چاروں طرف چلا جا رہا ہے جہاں اُسے اپنے رب کے آگے پیش ہونا ہے۔ پھر سب انسان دو حصوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک، وہ جن کا نامہ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ کسی سخت حسابِ نبی کے بغیر معاف کر دیے جائیں گے۔ دوسرے وہ جن کا نامہ اعمال پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ کسی طرح انہیں موت آجائے، مگر مرنے کے بجائے وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ ان کا یہ انجام اس لیے ہوگا کہ وہ دنیا میں اس غلط فہمی پر گمن رہے کہ کبھی خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے حاضر ہونا نہیں ہے۔ حالانکہ ان کا رب ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا تھا اور کوئی دھیر نہ تھی کہ

وہ ان اعمال کی باز پرس سے چھوٹ جائیں۔ اُن کا دنیا کی زندگی سے آخرت کی جزا و سزا تک درجہ بدرجہ پہنچنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج ڈوبنے کے بعد شفق کا نمودار ہونا، دن کے بعد رات کا آنا اور اس میں انسان اور حیوانات کا اپنے اپنے بسیروں کی طرف پلٹنا، اور چاند کا ہلال سے بڑھ کر ماہِ کامل بننا یقینی ہے۔

آخر میں اُن کفار کو دردناک سزا کی خبر دے دی گئی ہے جو قرآن کو سن کر خدا کے آگے جھکنے کے بجائے الٹی تکذیب کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کو بے حساب اجر کا مشرکہ سزا دیا گیا ہے جو ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں۔



ایاتھا ۲۵

سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا السَّمَاءُ اَنْشَقَّتْ ۱ وَاِذْ اَنْتَ لِرَبِّهَا وَّحَقَّتْ ۲ وَاِذَا الْاَرْضُ
 مُدَّتْ ۳ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۴ وَاِذْ اَنْتَ لِرَبِّهَا وَّ
 حَقَّتْ ۵ يَا أَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلَىٰ سَرِيكَ كَدْحًا

جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اُس کے لیے حق
 یہی ہے (کہ اپنے رب کا حکم مانے)۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے
 اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اُس کے لیے حق
 یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)۔ اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے

۱۔ اصل میں اِذْ اَنْتَ لِرَبِّهَا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے لفظی معنی ہیں "وہ اپنے رب کا حکم سننے
 گا" لیکن عربی زبان میں محاورے کے طور پر اِذْ اَنْتَ لِرَبِّهَا کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے کہ اس نے حکم سنا بلکہ اس کا مطلب
 یہ ہوتا ہے کہ اُس نے حکم سن کر ایک تابع فرمان کی طرح اس کی تعمیل کی اور ذرا ستر تابی نہ کی۔

۲۔ زمین کے پھیلا دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیے جائیں گے، پہاڑ ریزہ
 ریزہ کر کے بکھیر دیے جائیں گے، اور زمین کی ساری اونچ نیچ برابر کر کے اسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ سورہ
 ظہر میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ "اُسے ایک چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تم کو ٹی بل اور سلوٹ
 نہ پاؤ گے" (آیات ۱۰۶-۱۰۷)۔ حاکم نے سننڈرک میں عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ کے حوالہ سے رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "قیامت کے روز زمین ایک دسترخوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی،
 پھر انسانوں کے لیے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی" اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے
 کہ اُس دن تمام انسانوں کو جو اول روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے، بیک وقت زندہ کر کے
 عدالت الہی میں پیش کیا جائے گا۔ اتنی بڑی آبادی کو جمع کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں
 اور لہست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے پورے کرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے تاکہ اس پر ساری
 نوع انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پاسکیں۔

فَلْيُقِیْهِ ۝۶۱ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهُ بِیَمِیْنِهِ ۝۶۲ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ
حِسَابًا یَسِیْرًا ۝۶۳ وَیُنْقَلَبُ اِلٰی اٰهْلِہٖ مَسْرُوْرًا ۝۶۴ وَاَمَّا مَنْ

اور اُس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامہ اعمال اُس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا، اُس سے
ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا

۵۳ مطلب یہ ہے کہ جتنے مرے ہوئے انسان اس کے اندر پڑے ہوں گے سب کو نکال کر وہ باہر ڈال
دے گی، اور اسی طرح اُن کے اعمال کی جو شہادتیں اُس کے اندر موجود ہوں گی وہ سب بھی پوری کی پوری باہر آجائیں گی
کوئی چیز بھی اُس میں چھپی اور دبی ہوئی نہ رہ جائے گی۔

۵۴ یہ صراحت نہیں کی گئی کہ جب یہ اور یہ واقعات ہوں گے تو کیا ہوگا، کیونکہ بعد کا یہ مضمون اُس کو آپ
سے آپ ظاہر کر دیتا ہے کہ اسے انسان تو اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے، اُس کے سامنے حاضر ہونے والا ہے، تیرا
نامہ اعمال تجھے دیا جانے والا ہے، اور جیسا تیرا نامہ اعمال ہوگا اس کے مطابق تجھے جزا یا سزا ملنے والی ہے۔

۵۵ یعنی وہ ساری تنگ و دُور و دُور و دُور دھوپ جو تو دنیا میں کر رہا ہے، اُس کے متعلق چاہے تو ہی سمجھتا رہے
کہ یہ صرف دنیا کی زندگی تک ہے اور دنیوی اغراض کے لیے ہے، لیکن درحقیقت تو شعوری یا غیر شعوری طور پر جا
رہا ہے اپنے رب ہی کی طرف اور آخر کار وہیں تجھے پہنچ کر رہنا ہے۔

۵۶ یعنی اُس سے سخت حساب فہمی نہ کی جائے گی۔ اُس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں فلاں کام تو نے
کیوں کیے تھے اور تیرے پاس اُن کاموں کے لیے کیا عذر ہے۔ اُس کی بھلائیوں کے ساتھ اُس کی برائیاں بھی اُس کے
نامہ اعمال میں موجود ضرور ہوں گی، مگر بس یہ دیکھ کر کہ بھلائیوں کا پلڑا برائٹیوں سے بھاری ہے، اس کے قصوروں سے
درگزر کیا جائے گا اور اسے معاف کر دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں بد اعمال لوگوں سے سخت حساب فہمی کے لیے
سُوْرَةُ الْحَسَابِ (برسی طرح حساب لینے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں (الزُّمَرُ، آیت ۱۸)، اور نیک لوگوں کے بارے
میں فرمایا گیا ہے کہ ”یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم ان کے بہتر اعمال قبول کر لیں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے“
رَاٰلِ اَحْقَافٍ، آیت ۱۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو تشریح فرمائی ہے اُسے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی،
نسائی، ابوداؤد، حاکم، ابن جریر، عبد بن حمید اور ابن مرددویہ نے مختلف الفاظ میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ ایک
روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا ”جس سے بھی حساب لیا گیا وہ مارا گیا“ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ، کیا
اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ ”جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا“؟
حضور نے جواب دیا ”وہ تو صرف اعمال کی پیشی ہے، لیکن جس سے پوچھ گچھ کی گئی وہ مارا گیا“ ایک اور روایت میں حضرت
عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضور کو نماز میں یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ ”خدا یا مجھ سے ہلکا حساب لے“

أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝
 وَيَصِلُ سَعِيرًا ۝ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ إِنَّهُ
 ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ۝ بَلَىٰ ۚ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِبَصِيرًا ۝

تعمیر

نامہ اعمال اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اُس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا، اُس کا رب اُس کے کرتوت دیکھ رہا تھا۔

آپ نے جب سلام پھیرا تو میں نے اس کا مطلب پوچھا۔ آپ نے فرمایا ”ہلکے حساب سے مراد یہ ہے کہ بندے کے نامہ اعمال کو دیکھا جائے گا اور اُس سے درگزر کیا جائے گا۔ اسے عانشہ، اُس روز جس سے حساب فہمی کی گئی وہ مارا گیا۔“

۵۷ اپنے لوگوں سے مراد آدمی کے وہ اہل و عیال، رشتہ دار اور ساتھی ہیں جو اُسی کی طرح معاف کیے گئے ہوں گے۔

۵۸ سورۃ النہاۃ میں فرمایا گیا ہے کہ جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور بیاں ارشاد ہوا ہے اُس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا۔ غالباً اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ شخص اس بات سے تو پہلے ہی مایوس ہو گا کہ اُسے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال ملے گا، کیونکہ اپنے کرتوتوں سے وہ خوب واقف ہو گا اور اسے یقین ہو گا کہ مجھے نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملنے والا ہے۔ البتہ ساری خلقت کے سامنے بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال لیئے ہوئے اُسے خفت محسوس ہوگی، اس لیے وہ اپنا ہاتھ پیچھے کر لے گا۔ مگر اس تدبیر سے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ اپنا کچا چٹھا اپنے ہاتھ میں لینے سے بچ جائے۔ وہ تو بہر حال اسے پکڑ لیا ہی جائے گا خواہ وہ ہاتھ آگے بڑھا کر لے یا پیٹھ کے پیچھے چھپا لے۔

۵۹ یعنی اُس کا حال خدا کے صالح بندوں سے مختلف تھا جن کے متعلق سورۃ طور (آیت ۲۶) میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے، یعنی بروقت اُنہیں یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں بال بچوں کی محبت میں گرفتار ہو کہ ہم اُن کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد نہ کر لیں۔ اس کے برعکس اُس شخص کا حال یہ تھا کہ اپنے گھر میں وہ چین کی بنسری بجا رہا تھا اور خوب بال بچوں کو عیش کرایا کرتا تھا، خواہ وہ کتنی ہی حرام خوریاں کر کے اور کتنے ہی لوگوں کے حق مار کر یہ سامان عیش فراہم کرے، اور اس لطف و لذت کے لیے خدا کی باندھی ہوئی حدوں کو کتنا ہی پامال کرتا رہے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۱۱ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۱۲ وَالْقَمْرِ إِذَا انْتَقَ ۱۳
 لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبِقٍ ۱۴ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۱۵ وَإِذَا قُرِئَ
 عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ۱۶ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيُكْذِبُونَ ۱۷
 وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ۱۸ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۱۹ إِلَّا
 الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۲۰

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جاتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ یہ منکرین تو اٹا بٹھلاتے ہیں، حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامہ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ لہذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے یا

۱۱ یعنی یہ خدا کے انعام اور اس کی حکمت کے خلاف تھا کہ جو کرتوت وہ کر رہا تھا ان کو وہ نظر انداز کر دیتا اور اسے اپنے سامنے بلا کر کوئی باز نہ پرس اس سے نہ کرتا۔
 ۱۲ یعنی تمہیں ایک حالت پر نہیں رہنا ہے بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے بڑھاپے، بڑھاپے سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدانِ حشر، پھر حساب و کتاب اور پھر جزا و سزا کی بے شمار منزلوں سے لازماتم کو گزرنا ہوگا۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سُرخ، دن کے بعد رات کی تاریکی اور اُس میں اُن بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے رہتے ہیں، اور چاند کا بلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدر کامل بننا۔ یہ گویا چند وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی علامتِ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے اس کے اندر کہیں ٹھیراؤ نہیں ہے، ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے، لہذا کفار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موت کی آخری بجلی کے ساتھ

معاملہ ختم ہو جائے گا۔

۱۲ یعنی ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا اور یہ اُس کے آگے نہیں جھکتے۔ اس مقام پر سجدہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔ امام مالک، مسلم اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے نماز میں یہ سورۃ پڑھ کر اس مقام پر سجدہ کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سجدہ کیا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے ابورافع کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے عشا کی نماز میں یہ سورۃ پڑھی اور سجدہ کیا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور حضور نے اس مقام پر سجدہ کیا ہے، اس لیے میں مرتے دم تک یہ سجدہ کرتا رہوں گا۔ مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہم نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اس سورۃ میں اور اقرا یا سیر رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ میں سجدہ کیا ہے۔

۱۳ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے سینوں میں کفر اور عناد اور عداوتِ حق اور برے ارادوں اور فاسد نیتوں کی جو گندگی انہوں نے بھر رکھی ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

تصنيف
الفران

البروج

(٨٥)

الْبُرُوجِ

نام | پہلی آیت کے لفظ البروج کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کا مضمون خود یہ بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ مکہ معظمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی ہے جب ظلم و ستم پوری شدت کے ساتھ برپا تھا اور کفار مکہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع کفار کو اُس ظلم و ستم کے برے انجام سے خبردار کرنا ہے جو وہ ایمان لانے والوں پر توڑ رہے تھے، اور اہل ایمان کو یہ تسلی دینا ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ لے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اصحاب الأعداء کا قصہ سنایا گیا ہے جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک پھینک کر جلا دیا تھا۔ اور اس قصے کے پیرائے میں چند باتیں مومنوں اور کافروں کے ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح اصحاب الأعداء خدا کی لعنت اور اس کی مار کے مستحق ہوئے اُسی طرح سردارانِ مکہ بھی اُس کے مستحق بن رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان لانے والوں نے اُس وقت آگ کے گڑھوں میں گر کر جان دے دینا قبول کر لیا تھا اور ایمان سے پھرنا قبول نہیں کیا تھا، اُسی طرح اب بھی اہل ایمان کو چاہیے کہ ہر سخت سے سخت عذاب بھگت لیں مگر ایمان کی راہ سے نہ ہٹیں۔ تیسرے یہ کہ جس خدا کے ماننے پر کافر بگڑتے اور اہل ایمان اصرار کرتے ہیں وہ سب پر غالب ہے، زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک ہے، اپنی ذات میں آپ حمد کا مستحق ہے، اور وہ دونوں گروہوں کے حال کو دیکھ رہا ہے، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ کافروں کو نہ صرف اُن کے کفر کی سزا جہنم کی صورت میں ملے، بلکہ اُس پر مزید اُن کے ظلم کی سزا بھی اُن کو آگ کے چر کے دینے کی شکل میں بھگتنی پڑے۔ اس طرح یہ امر بھی یقینی ہے کہ ایمان لا کر نیک عمل کرنے والے جنت میں جائیں، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ پھر کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے، اگر تم اپنے جتنے کی طاقت کے زعم میں مبتلا ہو تو تم سے بڑے جتنے فرعون اور ثمود کے پاس تھے، ان کے لشکروں کا جو انجام ہوا ہے اس سے سبق حاصل کرو۔ خدا کی قدرت تم پر اس طرح محیط ہے کہ اُس کے گھیرے سے تم نکل نہیں سکتے، اور قرآن، جس کی تکتہ بیب پر تم تکیے ہوئے ہو، اُس کی ہر بات اٹل ہے، وہ اُس لوح محفوظ میں ثبت ہے جس کا لکھا کسی کے بدلے نہیں بدلی سکتا۔

آيَاتُهَا ۲۲

سُورَةُ الْبُرُوجِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۲ وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ ۳
 قِيلَ اصْحَبِ الْاِخْذُودِ ۴ التَّارِذَاتِ الْوَقُودِ ۵ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا
 قُعُودٌ ۶ وَهُمْ عَلٰی مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۷ وَمَنْقَبُوا مِنْهُمْ

قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی اور اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی کہ ماے گئے گڑھے والے (اُس گڑھے والے) جس میں خوب بھرکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی جبکہ وہ اُس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اور اُن اہل ایمان سے اُن کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے

۱۵ اصل الفاظ ہیں ذَاتِ الْبُرُوجِ یعنی بُرجوں والے آسمان کی۔ مفسرین میں سے بعض نے اس سے مراد قدیم علم طبیعت کے مطابق آسمان کے ۱۲ بُرج لیے ہیں۔ اور ابن عباس، مجاہد، قتادہ، حسن بصری، ضحاک اور سُدی کے نزدیک اس سے مراد آسمان کے عظیم الشان تارے اور ستارے ہیں۔

۱۶ یعنی روز قیامت۔

۱۷ دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کے بارے میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں، مگر ہمارے نزدیک سلسلہ کلام سے جو بات مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ دیکھنے والے سے مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے روز حاضر ہوگا اور دیکھی جانے والی چیز سے مراد خود قیامت ہے جس کے ہولناک احوال کو سب دیکھنے والے دیکھیں گے۔ یہ مجاہد، عکرمہ، ضحاک، ابن بُجیح اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے۔

۱۸ گڑھے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ بھڑکا کر ایمان لانے والے لوگوں کو اُن میں پینکا اور اپنی آنکھوں سے اُن کے جلنے کا تماشا دیکھا تھا۔ مارے گئے کا مطلب یہ ہے کہ اُن پر خدا کی لعنت پڑی اور وہ عذاب الہی کے مستحق ہو گئے۔ اور اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایک برجوں والے آسمان کی۔ دوسرے، روز قیامت کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تیسرے، قیامت کے ہولناک مناظر کی اور اُس ساری مخلوق کی جو اُن مناظر کو دیکھے گی۔ پہلی چیز اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو قادر مطلق ہستی کائنات کے عظیم الشان ستاروں اور

ستاروں پر حکمرانی کر رہی ہے اس کی گرفت سے یہ حقیر و ذلیل انسان کہاں بچ کر جاسکتے ہیں۔ دوسری چیز کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ دنیا میں اُن لوگوں نے جو ظلم کرنا چاہا کر لیا، مگر وہ دن بہر حال آنے والا ہے جس سے انسانوں کو خبردار کیا جا چکا ہے کہ اُس میں ہر مظلوم کی داد رسی اور ہر ظالم کی پکڑ ہوگی۔ تیسری چیز کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ جس طرح ان ظالموں نے اُن بے بس اہل ایمان کے جلنے کا تماشا دیکھا اُسی طرح قیامت کے روز ساری خلق دیکھے گی کہ ان کی خبر کس طرح لی جاتی ہے۔

گزشتہ حصوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو ان میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی کو بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیر و انبیاء علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا، مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اُس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو جمع عام میں یا سَمِ رِبِّ الْعَلَامِ (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیرا میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکاراٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اُس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو بھڑکرا کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھکوا دیا اور احمد، مسلم، نسائی، ترمذی، ابن جریر، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، طبرانی، عبد بن حمید۔

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اہل ان کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات اُستوار ہو گئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کر لیا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علی کا بیان ہے کہ اُسی وقت سے مجوسیوں میں محرمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے (ابن جریر)۔

تیسرا واقعہ ابن عباس نے غالباً اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دین موسیٰ علیہ

السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا بیان تک کہ انہوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ان لوگوں کو پھینک دیا جو اس سے انکار کرتے تھے (ابن جریر، عبد بن حمید)۔

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے جسے ابن ہشام، طبری، ابن خلدون اور صاحب مفتح البلدان وغیرہ اسلامی مورخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جمیز دین (کا بادشاہ تیان اسعد البوکر ب ایک مرتبہ یثرب گیا جہاں یہودیوں سے متاثر ہو کر اس نے دیہی یہود قبول کر لیا اور بنی قریظہ کے دو یہودی مالموں کو اپنے ساتھ لینے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذونواس اس کا جانشین ہوا اور اس نے نجران پر جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یزید اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابن ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دین یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، بیان تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہل نجران میں سے ایک شخص ذونوٹلیان بھاگ نکلا اور ایک روایت کی رو سے اُس نے قبصر روم کے پاس جا کر، اور دوسری روایت کی رو سے حبش کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رو سے قبصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا، اور دوسری روایت کی رو سے نجاشی نے قبصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہر حال آخر کار حبش کی ۱۰ ہزار فوج آریا ط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی، ذونواس مارا گیا، یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

اسلامی مورخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۲۵ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا تھا۔ اُس زمانے میں عیسائی مشنری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اُسی کے قریب دور میں ایک زابدو مجاہد اور صاحب کشف و کرامت عیسائی ستیاج فیمیون (Paymiyun) نامی نجران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بت پرستی کی برائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہل نجران عیسائی ہو گئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سید، جو قبائلی شیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگران تھا۔ اور تیسرا اسقف (بشپ) جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ سُرا، چمڑے اور اسلحہ کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور محلہ یانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی وجوہ سے بھی ذونواس نے اس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سید عاریثہ کو جسے سُریانی مورخین Arethas لکھتے ہیں، قتل کیا، اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خون پینے پر مجبور کیا، پھر اسے بھی قتل کر دیا۔ اسقف پال (Paul) کی بیٹیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے

ہوئے گڑھوں میں عورت، مرد بچے، بوڑھے، پادری، راہب سب کو بچھو ادا کیا۔ مجموعی طور پر ۲۰ سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخر کار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذونواس اور اس کی حمیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی تصدیق حصن غراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجود زمانہ کے محققین آثار قدیمہ کو ملا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض عین زمانہ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف

اس واقعہ کے ہم عصر ہیں۔ ایک پروکوپیوس۔ دوسرا کوسماس انڈیکوپلیسٹس (Cosmos Indicopleustis)

یونجاشی ایلیسیوریان (Elesboan) کے حکم سے اُس زمانے میں بطلمیوس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور

حبش کے ساحلی شہر ادولیس (Adolis) میں مقیم تھا۔ تیسرا یوحنا مالالا (Johannes Malala) جس سے

بعد کے متعدد مورخین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحنا افسوسی (Johannes of Ephesus)

متوفی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخ کنیسہ میں نصاریٰ نجران کی تعدیب کا قصہ اس واقعہ کے معاصر راوی اسقف مارشمعون

(Simeon) کے ایک خط سے نقل کیا ہے جو اُس نے ڈیبرجبلہ کے رئیس (Abbot von Gabula) کے

نام لکھا تھا، اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہل یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے روایت کیا ہے جو اس

موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۸۸ء میں روم سے اور ۸۹ء میں شہدائے مسیحیت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔

یعقوبی بطریق ڈالیو نیسیوس (Patriarch Dionysius) اور زکریا مڈلی (Zacharia of Mitylene) نے

اپنی سریانی تاریخوں میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سروری کی کتاب درباب نصاریٰ نجران میں بھی یہ ذکر

موجود ہے۔ الزحار (Edessa) کے اسقف پولس (Pulus) نے نجران کے ہلاک شدگان کا مرثیہ لکھا جو اب

بھی دستیاب ہے۔ سریانی زبان کی تصنیف کتاب الحُمیر ہیں کا انگریزی ترجمہ (Book of the Himyarites)

۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور وہ مسلمان مورخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اُس عہد اور اس

سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اس قصے کی تائید کرتے ہیں۔ فلیس نے اپنے سفر نامے (Arabian

Highlands) میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش

آیا تھا۔ اُم خرق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کعبہ نجران جس جگہ واقع

تھا اس کو بھی آج کل کے اہل نجران جانتے ہیں۔

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکہ کے کعبہ کی

جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اسقف عمادے باندھتے تھے اور اُس کو حرم قرار دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت

بھی اس کعبہ کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اسی کعبہ نجران کے پادری اپنے سید اور عاقب اور اسقف کی قیادت میں مناظر

کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورہ

إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝۸ الَّذِي لَهُ مُلْكُ
 السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝۹ إِنَّ الَّذِينَ
 فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابٌ
 جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
 الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ جَرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ
 الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝۱۱ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۲ إِنَّهُ هُوَ بَدِيعُ
 السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۝۱۳ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۵ فَعَالٌ

نہ تھی کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے، جو
 آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے
 یقیناً اُن کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے
 اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً اُن کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،
 یہ ہے بڑی کامیابی۔

درحقیقت تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ
 پیدا کرے گا۔ اور وہ بخشنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے، عرش کا مالک ہے، بزرگ بزرگ ہے اور جو

آل عمران آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، آل عمران حاشیہ ۲۹ و حاشیہ ۵۵)۔

۵۵ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اُن اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بنا پر وہی اس کا مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا

جائے، اور وہ لوگ ظالم ہیں جو اس بات پر بگڑتے ہیں کہ کوئی اس پر ایمان لائے۔

۵۶ جہنم کے عذاب سے الگ جلائے جانے کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اُنہوں نے مظلوم لوگوں کو آگ

کے گڑھے میں پھینک کر زندہ جلایا تھا۔ غالباً یہ جہنم کی عام آگ سے مختلف اور اس سے زیادہ سخت کوئی اور آگ ہوگی

لَمَّا يَرِيدُ ۱۶ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۱۷ فِرْعَوْنُ وَنَمُودُ ۱۸
بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ۱۹ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ۲۰
بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۲۱ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ۲۲

چاہے کر ڈالنے والا ہے۔ کیا تمہیں شکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور نمود (کے شکروں) کی
مگر جنہوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا
ہے۔ (اُن کے جھٹلانے سے اس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا، بلکہ یہ قرآن بند پایہ ہے، اُس لوح میں
(نقش ہے) جو محفوظ ہے۔ ۲۲

جس میں وہ جلائے جائیں گے۔

۱۶ "بگڑنے والا ہے" کہہ کر یہ امید دلائی گئی ہے کہ کوئی اگر اپنے گناہوں سے باز آ کر توبہ کرے تو اس کے دامن
رحمت میں جگہ پاسکتا ہے۔ "محبت کرنے والا" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کو اپنی خلق سے عداوت نہیں ہے کہ خواہ مخواہ
اس کو مبتلانے عذاب کرے، بلکہ جس مخلوق کو اس نے پیدا کیا ہے اُس سے وہ محبت رکھتا ہے اور سزا صرف اُس وقت
دیتا ہے جب وہ سرکشی سے باز نہ آئے۔ "مالک عرش" کہہ کر انسان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ سلطنت کائنات
کا فرمانروا وہی ہے، اُس سے سرکشی کرنے والا اس کی پکڑ سے بچ کر کبیں نہیں جاسکتا۔ "بزرگ و برتر" کہہ کر انسان کو
اس کیسے پن پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسی ہستی کے مقابلہ میں گستاخی کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اور آخری صفت یہ
بیان کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے، یعنی پوری کائنات میں کسی کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ
جس کام کا ارادہ کرے اس میں وہ مانع و مزاحم ہو سکے۔

۱۷ روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اپنے طاقت و جتنوں کے زعم میں خدا کی زمین پر سرکشیاں کر
رہے ہیں۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ کچھ تمہیں خبر بھی ہے کہ اس سے پہلے جن لوگوں نے اپنے جتنوں کی طاقت کے
بل پر یہی سرکشیاں کی تھیں وہ کس انجام سے دوچار ہو چکے ہیں۔

۱۸ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا لکھا امٹ ہے، اٹل ہے، خدا کی اُس لوح محفوظ میں ثبت ہے جس کے
اند کوئی رو و بدل نہیں ہو سکتا، جو بات اس میں لکھ دی گئی ہے وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے، تمام دنیا مل کر بھی
اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

تفسير القرآن

الطَّارِق

(١٩٦)

الطارق

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الطارق کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مضمون کا انداز بیان مکہ معظمہ کی ابتدائی سورتوں سے متاثر ہے، مگر یہ اس زمانہ کی نازل شدہ ہے جب کفار مکہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ترک دینے کے لیے ہر طرح کی چالیں چل رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن ایک قول فیصل ہے جسے کفار کی کوئی چال اور تدبیر ترک نہیں دے سکتی۔

سب سے پہلے آسمان کے تاروں کو اس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک ہستی کی نگہبانی کے بغیر اپنی جگہ قائم اور باقی رہ سکتی ہو۔ پھر انسان کو خود اس کی اپنی ذات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کس طرح نطفے کی ایک بوند سے اُس کو وجود میں لایا گیا اور جیتا جاگتا انسان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو خدا اس طرح اُسے وجود میں لایا ہے وہ یقیناً اُس کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور یہ دوبارہ پیدائش اس غرض کے لیے ہوگی کہ انسان کے اُن تمام رازوں کی جانچ پڑتال کی جائے جن پر دنیا میں پردہ پڑا رہ گیا تھا۔ اُس وقت اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے سے انسان نہ اپنے بل بوتے پر بچ سکے گا اور نہ کوئی اُس کی مدد کوا سکے گا۔

خاتمہ کلام پر ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح آسمان سے بارش کا برسنا اور زمین سے درختوں اور فصلوں کا اُگنا کوئی کھیل نہیں بلکہ ایک سنجیدہ کام ہے، اُسی طرح قرآن میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں وہ بھی کوئی ہنسی مذاق نہیں ہیں بلکہ پختہ اور اٹل باتیں ہیں۔ کفار اس غلط فہمی میں ہیں کہ اُن کی چالیں اس قرآن کی دعوت کو ترک دے دیں گی، مگر انہیں خبر نہیں ہے کہ اللہ بھی ایک تدبیر میں لگا ہوا ہے اور اس کی تدبیر کے آگے کفار کی چالیں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ پھر ایک فقرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی اور درپردہ کفار کو یہ دھمکی دے کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ آپ ذرا صبر سے کام لیں اور کچھ مدت کفار کو اپنی سی کر لینے دیں، زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی چالیں قرآن کو ترک دیتی ہیں یا قرآن اُسی جگہ غالب آکر رہتا ہے جہاں یہ اُسے ترک دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

رُكُوعُهَا

سُورَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝
 إِنَّ كُلَّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارا۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو۔ پھر ذرا انسان ہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

۱۔ نگہبان سے مراد خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی دیکھ بھال اور حفاظت کر رہی ہے، جس کے وجود میں لانے سے ہر شے وجود میں آتی ہے، جس کے باقی رکھنے سے ہر شے باقی ہے، جس کے سنبھالنے سے ہر شے اپنی جگہ سنبھلی ہوئی ہے، اور جس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات ہم پہنچانے اور اُسے ایک مدت مقررہ تک آفات سے بچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اس بات پر آسمان کی اور رات کی تاریکی میں نمودار ہونے والے ہزارے اور ستیاریے کی قسم کھائی گئی ہے (النجم الثاقب کا لفظ اگرچہ لغت کے اعتبار سے واحد ہے، لیکن مراد اُس سے ایک ہی تارا نہیں بلکہ تاروں کی جنس ہے)۔ یہ قسم اس معنی میں ہے کہ رات کو آسمان میں یہ بے حدو حساب تارے اور ستیاریے جو چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا وجود اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ کوئی ہے جس نے اُسے بنایا ہے، روشن کیا ہے، فضا میں معلق رکھ چھوڑا ہے، اور اس طرح اس کی حفاظت و نگہبانی کر رہا ہے کہ نہ وہ اپنے مقام سے گرتا ہے، نہ بے شمار تاروں کی گردش کے دوران میں وہ کسی سے ٹکراتا ہے اور نہ کوئی دوسرا تارا اس سے ٹکراتا ہے۔

۲۔ عالم بالا کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب انسان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ خود ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کر لے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ کون ہے جو باپ کے جسم سے خارج ہوئے والے اربوں جراثیموں میں سے ایک جراثیم اور ماں کے اندر سے نکلنے والے بکثرت بیضوں میں سے ایک بیضے کا انتخاب کر کے دونوں کو کسی وقت جوڑ دیتا ہے اور اس سے ایک خاص انسان کا استقرارِ حمل واقع ہو جاتا ہے؟ پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ اُسے نشوونما دے کر اسے اس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہوتا، پھر کون ہے جو رحم مادر ہی میں اس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں

خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۖ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝
 إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝ فَمَا لَهُ مِنْ

ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے
 یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اُس وقت

کا تناسب قائم کرتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا
 ہے؟ اسے بیماریوں سے بچاتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اس کے لیے
 زندگی کے اتنے ذرائع ہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ
 مواقع فراہم کرتا ہے جن میں سے اکثر کا اُسے شعور تک نہیں ہوتا کجا کہ وہ انہیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو۔ کیا یہ سب کچھ
 ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟

۳۔ اصل میں صُلب اور تَرَائِب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صُلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں، اور تَرَائِب
 کے معنی ہیں سینے کی ہڈیاں، یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادہ تولید انسان کے اُس دھڑ سے خارج ہوتے
 ہیں جو صُلب اور سینے کے درمیان واقع ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اُس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے
 درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادہ اُس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں، اس لیے یہ کہنا صحیح
 نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضاء رئیسہ اس کے ماخذ ہیں، اور
 وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ صُلب دماغ کا وہ حصہ ہے جس کی بدولت
 ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۴، صفحہ نمبر ۵۸۳)

۴۔ یعنی جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرارِ محل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی
 کرتا ہے، یہی اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پٹا کر پھر وجود میں لاسکتا ہے۔ اگر وہ پہلی
 چیز پر قادر تھا اور اُس قدرت کی بدولت انسان دنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے
 کے لیے پیش کی جاسکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے
 اس بات ہی کا انکار کرنا ہو گا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اس کا انکار کرے اُس سے کچھ بعید نہیں کہ
 ایک روز اُس کے دماغ کی خوابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرادے کہ دنیا کی تمام کتابیں ایک حادثہ کے طور پر چھپ گئی ہیں،
 دنیا کے تمام شہر ایک حادثہ کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے
 بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی
 قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا ان تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ

قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۱۰ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۱۱ وَالْأَرْضِ ذَاتِ
الْصَّدْعِ ۱۲ إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ۱۳ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۱۴ إِنَّهُمْ
يَكِيدُونَ كَيْدًا ۱۵ وَآكِيدُ كَيْدًا ۱۶ فَهَلِ الْكٰفِرِينَ
أَمْهَلُمْ رَوِيْدًا ۱۷

انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔ قسم سے بارش
برسانے والے آسمان کی اور (نباتات اُگنے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی یہ ایک جھجکی تلی
بات ہے، ہنسی مذاق نہیں ہے۔ یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا
ہوں۔ پس چھوڑ دو اسے نبی! ان کافروں کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ع

پچھیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہونے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پچھیدہ عمل اس حکمت اور تناسب
اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثہ کے طور پر ہو سکتا ہو تو پھر کونسی چیز ہے جسے ایک دائمی مرض حادثہ نہ کہہ سکے؟
۱۵ پوشیدہ اسرار سے مراد ہر شخص کے وہ اعمال بھی ہیں جو دنیا میں ایک راز بن کر رہ گئے، اور وہ معاملہ
بھی ہیں جو اپنی ظاہری صورت میں تو دنیا کے سامنے آئے مگر ان کے پیچھے جو بنیادیں اور اغراض اور خواہشات کام
کر رہی ہیں، اور ان کے جو باطنی محرکات تھے ان کا حال لوگوں سے چھپا رہ گیا۔ قیامت کے روز یہ سب کچھ کھل
کر سامنے آ جائے گا اور جانچ پڑتال صرف اسی بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی
ہوگی کہ کس وجہ سے کیا، کس غرض اور کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اسی طرح یہ بات بھی ساری دنیا سے، حتیٰ کہ
خود ایک فعل کرنے والے انسان سے بھی مخفی رہ گئی ہے کہ جو فعل اس نے کیا اس کے کیا اثرات دنیا میں ہوئے، کہاں
کہاں پہنچے، اور کتنی مدت تک چلتے رہے۔ یہ راز بھی قیامت ہی کے روز کھلے گا اور اس کی پوری جانچ پڑتال
ہوگی کہ جو بیج کوئی شخص دنیا میں بو گیا تھا اس کی فصل کس کس شکل میں کب تک کھٹی رہی اور کون کون اسے
کاٹتا رہا۔

۱۶ آسمان کے لیے ذات الرجیع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رجیع کے لغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں،
مگر مجازاً عربی زبان میں یہ لفظ بارش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بس ایک ہی دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی
بلکہ بار بار اپنے موسم میں اور کبھی خلافت موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے۔ ایک اور وجہ بارش
کو رجیع کہنے کی یہ بھی ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین ہی پر برستا ہے۔

۷۷ یعنی جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمین کا شوق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اگلنا کوئی مذاق نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، اسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے خدا کی طرف پلٹنا ہے، یہ بھی کوئی جنس مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ ایک دو ٹوک بات ہے، ایک سنجیدہ حقیقت ہے، ایک اٹل قولِ حق ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

۷۸ یعنی یہ کفار اس قرآن کی دعوت کو شکست دینے کے لیے طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں۔ اپنی پھونکوں سے اس چراغ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ ہر قسم کے شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں۔ ایک سے ایک جھوٹا الزام تراش کر اس کے پیش کرنے والے نبی پر لگا رہے ہیں تاکہ دنیا میں اُس کی بات چلنے نہ پائے اور کفر و جاہلیت کی وہی تاریخ کی چھائی رہے جسے چھانٹنے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔

۷۹ یعنی میں یہ تدبیر کر رہا ہوں کہ ان کی کوئی چال کامیاب نہ ہونے پائے، اور یہ آخر کار منہ کی کھا کر رہیں، اور وہ نور پھیل کر رہے جسے یہ بھگانے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

۸۰ یعنی انہیں ذرا مدت دو کہ جو کچھ یہ کرنا چاہیں کر دیکھیں۔ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ نتیجہ ان کے سامنے خود آ جائے گا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تدبیر کے مقابلہ میں ان کی چالیں کتنی کارگر ہوئیں۔

نصير الممران

الأعلى

الاعلیٰ

نام | پہلی ہی آیت سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ کے لفظ الْأَعْلَىٰ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔
 زمانہ نزول | اس کے مضمون سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، اور آیت نمبر ۶ کے یہ الفاظ بھی کہ ”ہم تمہیں پر دھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے“ یہ بتاتے ہیں کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح شوق نہیں ہوئی تھی اور نزول وحی کے وقت آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں اس کے الفاظ بھول نہ جاؤں۔ اس آیت کے ساتھ اگر سورہ طہ کی آیت ۴۱ اور سورہ قیامہ کی آیات ۱۶-۱۹ کو ملا کر دیکھا جائے، اور تینوں آیتوں کے اندازہ بیان اور موقع و محل پر بھی غور کیا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس سورہ میں حضور کو اطمینان دلایا گیا کہ آپ فکر نہ کریں، ہم یہ کلام آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپ اسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد، دوسرے موقع پر جب سورہ قیامہ نازل ہو رہی تھی، حضور بلے فنیاً الفاظ وحی کو دہرانے لگے اس وقت فرمایا گیا کہ ”اسے نبی، اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اس کو یاد کرا دیتا اور پڑھوا دیتا ہمارے ذمہ ہے، لہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سننے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔“ آخری مرتبہ سورہ طہ کے نزول کے موقع پر حضور کو پھر بتا دیا کہ بشریت اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ ۱۱۳ آیتیں جو متواتر نازل ہوئی ہیں ان میں سے کوئی چیز میرے حافظے سے نکل نہ جائے اور آپ ان کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر فرمایا گیا ”اور قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔“ اس کے بعد پھر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ حضور کو ایسا کوئی خطرہ لاحق ہوتا، کیونکہ ان تین مقامات کے سوا کوئی چوتھا مقام قرآن میں ایسا نہیں ہے جہاں اس معاملہ کی طرف کوئی اشارہ پایا جاتا ہو۔

موضوع اور مضمون | اس چھوٹی سی سورہ کے تین موضوع ہیں۔ توحید۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات اور آخرت۔

پہلی آیت میں توحید کی تعلیم کو اس ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کی جائے، یعنی اس کو کسی ایسے نام سے یاد نہ کیا جائے جو اپنے اندر کسی قسم کے نقص، عیب، کمزوری یا

خلوقات سے تشبیہ کا کوئی پہلو رکھتا ہو۔ کیونکہ دنیا میں جتنے بھی فاسد عقائد پیدا ہوئے ہیں ان سب کی جڑ اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی نہ کوئی غلط تصور ہے جس نے اُس فاسد پاک کے لیے کسی غلط نام کی شکل اختیار کی ہے۔ لہذا عقیدے کی تصحیح کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو صرف ان اسماء حسنیٰ ہی سے یاد کیا جائے جو اُس کے لیے موزوں اور مناسب ہیں۔

اس کے بعد تین آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ ہمارا رب، جس کے نام کی تسبیح کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اُس کا تناسب قائم کیا، اُس کی تقدیر بتائی، اُسے وہ کام انجام دینے کی راہ بتائی جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے، اور تم اپنی آنکھوں سے اُس کی قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ رہے ہو کہ وہ زمین پر نباتات کو پیدا بھی کرتا ہے اور پھر انہیں خش و خاشاک بھی بنا دیتا ہے۔ کوئی ہستی نہ ہمارا لانے پر قادر ہے نہ خزاں کو آنے سے روک سکتی ہے۔

پھر دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ قرآن جو آپ پر نازل کیا جا رہا ہے، یہ لفظ بلفظ آپ کو یاد کیسے رہے گا۔ اس کو آپ کے حافظے میں محفوظ کر دینا ہمارا کام ہے، اور اس کا محفوظ رہنا آپ کے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے فضل کا نتیجہ ہے، ورنہ ہم چاہیں تو اسے جھلا دیں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کے سپرد ہر ایک کو راہِ راست پر لے آنے کا کام نہیں کیا گیا ہے بلکہ آپ کا کام بس حق کی تبلیغ کر دینا ہے، اور تبلیغ کا سیدھا سا دھما طریقہ یہ ہے کہ جو نصیحت سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہوا سے نصیحت کی جائے اور جو اُس کے لیے تیار نہ ہو اُس کے پیچھے نہ پڑنا جائے۔ جس کے دل میں گمراہی کے انجامِ بد کا خوف ہو گا وہ حق بات کو سن کر قبول کرے گا اور جو بد بخت اُسے سننے اور قبول کرنے سے گریز کرے گا وہ اپنا بُرا انجام خود دیکھ لے گا۔

آخر میں کلام کو اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ فلاح صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کریں، اور اپنے رب کا نام یاد کر کے نماز پڑھیں۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہیں ساری فکر بس اسی دنیا کے آرام و آسائش اور فائدوں اور لذتوں کی ہے، حالانکہ اصل فکر آخرت کی ہونی چاہیے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ یہ حقیقت صرف قرآن ہی میں نہیں بتائی جا رہی ہے، بلکہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں بھی انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کیا گیا تھا۔

آيَاتُهَا ۱۹

سُورَةُ الْأَعْلَىٰ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ① الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ② وَالَّذِي قَدَّرَ
فَهَدَىٰ ③ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ ④ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَىٰ ⑤

(اسے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی، جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا۔

۱۔ لفظی ترجمہ ہوگا "اپنے رب برتر کے نام کو پاک کرو" اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی مراد ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے یاد کیا جائے جو اُس کے لائق ہیں اور ایسے نام اُس کی ذات برتر کے لیے استعمال نہ کیے جائیں جو اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے اُس کے لیے موزوں نہیں ہیں، یا جن میں اس کے لیے نقص یا گستاخی یا شرک کا کوئی پہلو نکلتا ہے، یا جن میں اُس کی ذات یا صفات یا افعال کے بارے میں کوئی غلط عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے محفوظ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو اس نے خود قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں، یا جو دوسری زبان میں اُن کا صحیح ترجمہ ہوں۔ (۲) اللہ کے لیے مخلوقات کے سے نام، یا مخلوقات کے لیے اللہ کے ناموں جیسے نام استعمال نہ کیے جائیں۔ اور اگر کچھ صفاتی نام ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ بندوں کے لیے بھی ان کا استعمال جائز ہے، مثلاً رؤف، رحیم، کریم، سمیع، بصیر وغیرہ، تو ان میں یہ احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے کہ بندے کے لیے ان کا استعمال اُس طریقے پر نہ ہو جس طرح اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ (۳) اللہ کا نام ادب اور احترام کے ساتھ لیا جائے کسی ایسے طریقے پر یا ایسی حالت میں نہ لیا جائے جو اس کے احترام کے منافی ہو، مثلاً ہنسی مذاق میں یا بیت الخلاء میں یا کوئی گناہ کرنے ہوئے اس کا نام لینا، یا ایسے لوگوں کے سامنے اس کا ذکر نہ کرنا جو اسے سن کر گستاخی پر آمرا آئیں، یا ایسی مجلسوں میں اُس کا نام لینا جہاں لوگ بیہودگیوں میں مشغول ہوں اور اس کا ذکر سن کر مذاق میں اڑا دیں، یا ایسے موقع پر اس کا نام پاک زبان پر لانا جہاں اندیشہ ہو کہ سننے والا اسے ناگواری کے ساتھ سنے گا۔ امام مالک کے حالات میں منقول ہے کہ جب کوئی سائل ان سے کچھ مانگتا اور وہ اس وقت اُسے کچھ نہ دے سکتے تو عام لوگوں کی طرح اللہ سے گناہ کہتے بلکہ کسی اور طرح معذرت کر دیتے تھے۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ سائل کو جب کچھ نہ دیا جائے اور اس سے معذرت کر دی جائے تو لا محالہ اسے ناگوار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر میں اللہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اسے ناگواری کے ساتھ سنے۔

احادیث میں حضرت عقبہ بن عامرؓ جہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کا حکم اسی آیت کی بنا پر دیا تھا، اور رکوع میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کا جو طریقہ حضور نے مقرر فرمایا تھا وہ سورہ واقعہ کی آخری آیت فسبح یا سحر ربک العظیم پر مبنی تھا (مسند احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابن المنذر)۔

۱۷ یعنی زمین سے آسمانوں تک کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا، اور جو چیز بھی پیدا کی اُسے بالکل راست اور درست بنایا، اس کا توازن اور تناسب ٹھیک ٹھیک قائم کیا، اُس کو ایسی صورت پر پیدا کیا کہ اُس جیسی چیز کے لیے اُس سے بہتر صورت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہی بات ہے جو سورہ سجدہ میں یوں فرمائی گئی ہے کہ الذی احسن کل شیء و خلقہ (آیت ۷) جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی اس طرح دنیا کی تمام اشیاء کا موزوں اور متناسب پیدا ہونا خود اس امر کی صریح علامت ہے کہ کوئی صانع حکیم ان سب کا خالق ہے۔ کسی اتفاقی حادثے سے، یا بہت سے خالقوں کے عمل سے کائنات کے ان بے شمار اجزاء کی تخلیق میں یہ سلیقہ، اور مجموعی طور پر ان سب اجزاء کے اجتماع سے کائنات میں یہ حسن و جمال پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

۱۸ یعنی ہر چیز کے پیدا کرنے سے پہلے یہ طے کر دیا کہ اسے دنیا میں کیا کام کرنا ہے اور اُس کام کے لیے اُس کی مقدار کیا ہو، اُس کی شکل کیا ہو، اس کی صفات کیا ہوں، اس کا مقام کس جگہ ہو، اس کے لیے بقاء اور قیام اور فعل کے لیے کیا مواقع اور ذرائع فراہم کیے جائیں، کس وقت وہ وجود میں آئے، کب تک اپنے حصے کا کام کرے اور کب کس طرح ختم ہو جائے۔ اس پوری اسکیم کا مجموعی نام اُس کی "تقدیر" ہے، اور یہ تقدیر اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے لیے اور مجموعی طور پر پوری کائنات کے لیے بنائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تخلیق کسی پیشگی منصوبے کے بغیر کچھ یونہی الاٹاپ نہیں ہو گئی ہے بلکہ اس کے لیے ایک پورا منصوبہ خالق کے پیش نظر تھا اور سب کچھ اس منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی ۱۳-۱۴۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۸۔ جلد پنجم، القمر، حاشیہ ۲۵۔ جلد ششم، عبس، حاشیہ ۱۲)۔

۱۹ یعنی کسی چیز کو بھی محض پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ جو چیز بھی جس کام کے لیے پیدا کی اُسے اُس کام کے انجام دینے کا طریقہ بتایا۔ بالفاظ دیگر وہ محض خالق ہی نہیں ہے، حادی بھی ہے۔ اس نے یہ ذمہ لیا ہے کہ جو چیز جس حیثیت میں اس نے پیدا کی ہے اس کو ویسی ہی ہدایت دے جس کے وہ لائق ہے اور اُسی طریقہ سے ہدایت دے جو اُس کے لیے موزوں ہے۔ ایک قسم کی ہدایت زمین اور چاند اور سورج اور تاروں اور سیاروں کے لیے ہے جس پر وہ سب چل رہے ہیں اور اپنے حصے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک اور قسم کی ہدایت پانی اور ہوا اور روشنی اور جہاد است و معدنیات کے لیے ہے جس کے مطابق وہ ٹھیک ٹھیک وہی خدمات بجالا رہے ہیں جن کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت نباتات کے لیے ہے جس کی پیروی میں وہ زمین کے اندر اپنی جڑوں نکالتے اور پھیلاتے ہیں اس کی تہوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں، جہاں جہاں اللہ نے ان کے لیے غذا پیدا کی ہے وہاں سے اس کو حاصل کرتے ہیں تنے

شاخیں، پتیاں، پھل پھول لاتے ہیں اور وہ کام پورا کرتے ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ ایک اور قسم کی ہدایت خشکی، تری اور ہوا کے حیوانات کی بے شمار انواع اور ان کے ہر فرد کے لیے ہے جس کے حیرت انگیز مظاہر جانوروں کی زندگی اور ان کے کاموں میں علانیہ نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ ایک دہریہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مختلف قسم کے جانوروں کو کوئی ایسا الہامی علم حاصل ہے جو انسان کو اپنے حواس نویرکنار، اپنے آلات کے ذریعہ سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر انسان کے لیے دو الگ الگ نوعیتوں کی ہدایتیں ہیں جو اس کی دو الگ حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ایک وہ ہدایت جو اس کی حیوانی زندگی کے لیے ہے، جس کی بدولت ہر بچہ پیدا ہونے ہی دودھ پینا سیکھ لیتا ہے، جس کے مطابق انسان کی آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ، پھیپھڑے، گردے، جگر، معدہ، آنتیں، اعصاب، رگیں اور شریانیں، سب اپنا اپنا کام کیے جا رہے ہیں، بغیر اس کے کہ انسان کو اس کا شعور ہو یا اس کے ارادے کا ان اعضاء کے کاموں میں کوئی دخل ہو۔ یہی ہدایت ہے جس کے تحت انسان کے اندر بچپن، بوج، جوانی، کسوت اور بڑھاپے کے وہ سب جسمانی اور ذہنی تغیرات ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس کے ارادے اور مرضی، بلکہ شعور کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ دوسری ہدایت انسان کی عقلی اور شعوری زندگی کے لیے ہے جس کی نوعیت غیر شعوری زندگی کی ہدایت سے قطعاً مختلف ہے، کیونکہ اس شعبہ حیات میں انسان کی طرف ایک قسم کا اختیار منتقل کیا گیا ہے جس کے لیے ہدایت کا وہ طریقہ موزوں نہیں ہے جو بے اختیارانہ زندگی کے لیے موزوں ہے۔ انسان اس آخری قسم کی ہدایت سے منہ موڑنے کے لیے خواہ کتنی ہی حجت بازیاں کرے، لیکن یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے کہ جس خالق نے اس ساری کائنات میں ہر چیز کے لیے اس کی ساخت اور حیثیت کے مطابق ہدایت کا انتظام کیا ہے اس نے انسان کے لیے یہ تقدیر تو بنا دی ہوگی کہ وہ اس کی دنیا میں اپنے اختیار سے تہفرفات کرے مگر اس کو یہ بتانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہوگا کہ اس اختیار کے استعمال کی صحیح صورت کیا ہے اور غلط صورت کیا، مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، النحل، حواشی ۹-۱۰-۱۲-۵۶۔ جلد سوم، طہ، حاشیہ ۲۳۔ جلد پنجم، الرحمن، حواشی ۲-۳۔ جلد ششم، الدھر، حاشیہ ۵۔

۵۵ اصل میں لفظ ہستی استعمال ہوا ہے جو جانوروں کے چارے کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اُگتی ہیں۔

۵۶ یعنی وہ صرف بہار ہی لانے والا نہیں ہے، خزاں بھی لانے والا ہے۔ تمہاری آنکھیں اس کی قدرت کے دونوں کرشمے دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف وہ ایسی بری بھری نباتات اُگاتا ہے جن کی تازگی و شادابی دیکھ کر دل خوش ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف اسی نباتات کو وہ زرد، خشک اور سیاہ کر کے ایسا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلابِ خس و خاشاک کی صورت میں بہا لے جاتے ہیں۔ اس لیے کسی کو بھی بیان اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ وہ دنیا میں صرف بہار ہی دیکھے گا، خزاں سے اس کو سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ یہی مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو سورۃ یونس، آیت ۲۴۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى ۖ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ
وَمَا يَخْفَى ۖ وَنُيِّسُكَ لِلْيُسْرَى ۗ ۘ فذَكَرْنَا إِنْ نَفَعْتَ الذِّكْرَى ۙ
سَيَذَكِّرُ مَنْ يَخْتَى ۙ ۙ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۙ ۙ الَّذِي
يَصِلَى النَّارَ الْكُبْرَى ۙ ۙ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۙ ۙ ۙ

ہم تمہیں پڑھوادیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے سوائے اُس کے جو اللہ چاہے، وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اُس کو بھی۔

اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، لہذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔ جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کرے گا، اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بد بخت جو بڑی آگ میں جائے گا، پھر نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا۔

سورۃ کہف، آیت ۲۵۔ سورۃ حدید، آیت ۲۰۔

۵۷ حاکم نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے اور ابن مردودیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو اس خوف سے دہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مجاہد اور کلبی کہتے ہیں کہ جب ربیل وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضور بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دہرانے لگتے تھے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا کہ وحی کے نزول کے وقت آپ خاموشی سے سنتے رہیں، ہم آپ کو اُسے پڑھوادیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپ کو یاد ہو جائے گی، اس بات کا کوئی اندیشہ آپ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپ بھول جائیں گے۔ یہ تیسرا موقع ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے دو مواقع سورۃ طہ آیت ۱۱۲ اور سورۃ قیامہ آیات ۶ تا ۱۹ میں گزر چکے ہیں۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح مجزے کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا اسی طرح مجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں، یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو جائے۔

۵۸ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔

یہ وہی مضمون ہے جو دوسری جگہ قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنذَهِبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (بنی اسرائیل، ۸۶)۔ اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعہ سے تمہیں عطا کیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبی بن کعب نے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضور نے فرمایا نہیں، میں بھول گیا تھا۔

۹ ویسے تو یہ الفاظ عام ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے خواہ وہ ظاہر ہو یا مخفی۔ لیکن جس سلسلہ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو قرآن کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جا رہے ہیں اس کا بھی اللہ کو علم ہے، اور بھول جانے کے جس خوف کی بنا پر آپ ایسا کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے علم میں ہے۔ اس لیے آپ کو یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپ اسے بھولیں گے نہیں۔

۱۰ عام طور پر مفسرین نے ان دو فقروں کو الگ الگ سمجھا ہے۔ پہلے فقرے کا مطلب انہوں نے یہ لیا ہے کہ ہم تمہیں ایک آسان شریعت دے رہے ہیں جس پر عمل کرنا سہل ہے، اور دوسرے فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ نصیحت کرو اگر وہ نافع ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک قَدْ كُنْمْ كَالْفِظِ دُونَ فِقْرٍ كَوْبَاهِم مَرْبُوطٌ كَرْتَاہ ہے اور بعد کے فقرے کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مترتب ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اس ارشاد الہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبی، ہم تبلیغ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ، بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لیے میسر کیے دیتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اُس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، مگر اس سے تمہارا مقصد دیکھنا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے اُن لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہ راست اختیار کر لیں۔ یہی لوگ تمہاری نگاہ التفات کے مستحق ہیں اور انہی کی تعلیم و تہذیب پر تمہیں توجہ صرف کرنا چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجربے سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ یہ قریب قریب وہی مضمون ہے جو سورہ عَبَس میں دوسرے طریقے سے یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ جو شخص یے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے اُس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے (آیات ۵ تا ۱۲)۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۝۱۳ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝۱۵ بَلْ
تُؤَثِّرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝۱۲ وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ وَأَبْقَى ۝۱۴ إِنَّ
هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۝۱۸ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ۝۱۹

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔ مگر
تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی
بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اللہ یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف اور انجام بد کا اندیشہ ہو گا اسی کو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میں غلط راستے
پر تو نہیں جا رہا ہوں، اور وہی اللہ کے اُس بندے کی نصیحت کو توجہ سے سنے گا جو اسے ہدایت اور گمراہی کا فرق
اور فلاح و سعادت کا راستہ بتا رہا ہو۔

۱۳ یعنی نہ اُسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے، اور نہ جینے کی طرح جیسے گا کہ زندگی کا کوئی
لطف اسے حاصل ہو۔ یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول ہی نہ
کریں اور مرتے دم تک کفر و شرک یا دہریت پر قائم رہیں۔ رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے
برے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو
اللہ تعالیٰ انہیں موت دے دے گا، پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی
تہوں پر لاکر ڈالی جائیں گی اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اور اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے
جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔ یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلم میں حضرت ابو سعید خدری
اور بکرہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے منقول ہوا ہے۔

۱۴ پاکیزگی سے مراد ہے کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، برے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور
برے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا۔ فلاح سے مراد دنیوی خوشحالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیابی ہے، خواہ دنیا کی خوشحالی
اس کے ساتھ میسر ہو یا نہ ہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۲۔ جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ
۱-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴)۔

۱۵ یاد سے مراد دل میں بھی اللہ کو یاد کرنا ہے اور زبان سے بھی اُس کا ذکر کرنا ہے۔ دونوں چیزیں ذکر الہی
کی تعریف میں آتی ہیں۔

۱۶ یعنی صرف یاد کر کے رہ نہیں گیا بلکہ نماز کی پابندی اختیار کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ جس خدا کو وہ اپنا

خدا مان رہا ہے اس کی اطاعت کے لیے وہ عملاً تیار ہے اور اس کو ہمیشہ یاد کرتے رہنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ اس آیت میں علی الترتیب دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے اللہ کو یاد کرنا، پھر نماز پڑھنا۔ اسی کے مطابق یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ اکبر کہہ کر نماز کی ابتدا کی جائے۔ یہ من جملہ ان شواہد کے ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اُس کے تمام اجزاء قرآنی اشارات پر مبنی ہیں۔ مگر اللہ کے رسول کے سوا ان اشارات کو جمع کر کے کوئی شخص بھی نماز کی یہ ہیئت ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔

۱۶ یعنی تم لوگوں کی ساری فکر بس دنیا اور اس کی راحت و آسائش اور اس کے فائدوں اور لذتوں کے لیے ہے۔ یہاں جو کچھ حاصل ہو جائے تم سمجھتے ہو کہ بس وہی اصل فائدہ ہے جو تمہیں حاصل ہو گیا، اور یہاں جس چیز سے محروم رہے تمہارا خیال ہے کہ بس وہی اصل نقصان ہے جو تمہیں پہنچ گیا۔

۱۷ یعنی آخرت دو حیثیتوں سے دنیا کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔ ایک یہ کہ اس کی راحتیں اور لذتیں دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہیں اور دوسرے یہ کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی۔

۱۸ یہ دوسرا مقام ہے جہاں قرآن میں حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں کی تعلیم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورہ نجم رکوع ۳ میں ایک حوالہ گزر چکا ہے۔

نعم ان

الغاشية

الغاشیة

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ الغاشیة کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | سورہ کا پورا مضمون اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بھی ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، مگر وہ زمانہ تھا جب حضور تبلیغ عام شروع کر چکے تھے اور مکہ کے لوگ بالعموم اُسے سن کر نظر انداز کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس کے موضوع کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ زیادہ تر دو ہی باتیں لوگوں کے ذہن نشین کرنے پر مرکوز تھی۔ ایک توحید، دوسرے آخرت۔ اور اہل مکہ ان دونوں باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب اس سورہ کے مضمون اور اندازہ بیان پر غور کیجیے۔

اس میں سب سے پہلے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے اچانک ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ تمہیں اُس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب سارے عالم پر چھا جانے والی ایک آفت نازل ہوگی؟ اس کے بعد فوراً ہی یہ تفصیل بیان کرنی شروع کر دی گئی ہے کہ اُس وقت سارے انسان دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر دو مختلف انجام دیکھیں گے۔ ایک وہ جو جہنم میں جائیں گے اور انہیں ایسے اور ایسے سخت عذاب بھیلنے ہوں گے۔ دوسرے وہ جو عالی مقام جنت میں جائیں گے اور ان کو ایسی اور ایسی نعمتیں میسر ہوں گی۔

اس طرح لوگوں کو چونکانے کے بعد بکلی غفلت مضمون تبدیل ہوتا ہے اور سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ لوگ جو قرآن کی تعلیم توحید اور خبر آخرت کو سن کر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں، اپنے سامنے کی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے جن سے ہر وقت انہیں سابقہ پیش آتا ہے؟ عرب کے صحرا میں جن اونٹوں پر ان کی ساری زندگی کا انحصار ہے، کبھی یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ کیسے ٹھیک انہی خصوصیات کے مطابق بن گئے جیسی خصوصیات کے جانور کی ضرورت ان کی صحرائی زندگی کے لیے تھی؟ اپنے سفروں میں جب یہ چلتے ہیں تو انہیں یا آسمان نظر آتا ہے، یا پہاڑ، یا زمین۔ انہی تین چیزوں پر یہ غور کریں۔ اوپر یہ آسمان کیسے چھا گیا؟ سامنے یہ پہاڑ کیسے کھڑے ہو گئے؟ نیچے یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادر مطلق صانع حکیم کی کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ اگر یہ مانتے ہیں کہ ایک خالق نے بڑی حکمت اور بڑی

قدرت کے ساتھ ان چیزوں کو بنایا ہے، اور کوئی دوسرا ان کی تخلیق میں شریک نہیں ہے، تو اسی کو اکیلا رب مانتے سے انہیں کیوں انکار ہے؟ اور اگر یہ مانتے ہیں کہ وہ خدا یہ سب کچھ پیدا کرنے پر قادر تھا، تو آخر کس معقول دلیل سے انہیں یہ ماننے میں تاثر ہے کہ وہی خدا قیامت لانے پر بھی قادر ہے؟ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے؟ جنت اور دوزخ بنانے پر بھی قادر ہے؟

اس مختصر اور نہایت معقول استدلال سے بات سمجھانے کے بعد کفار کی طرف سے رخ پھیر کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا جاتا ہے اور آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، تم ان پر جبار بنا کر تو مسلط کیے نہیں گئے ہو کہ زبردستی ان سے منوا کر ہی چھوڑو۔ تمہارا کام نصیحت کرنا ہے، سو تم نصیحت کیے جاؤ۔ آخر کار انہیں آنا ہمارے ہی پاس ہے۔ اُس وقت ہم ان سے پورا پورا حساب لے لیں گے اور نہ ماننے والوں کو بھاری سزا دیں گے۔



سُورَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ ۲۶ آيَاتُهَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 هَلْ اَتٰكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۱ وَجُوْهُ یَوْمَیْذٍ خَاشِعَةٌ ۲
 عَامِلَةٌ تَاْصِیَةٌ ۳ تَصْلٰ نَارًا حَامِیَةً ۴ تَسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اَنْبِیَءٍ ۵
 لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۶ لَا یَسْمِنُ وَلَا یَغْنٰی مِنْ
 جُوْعٍ ۷ وَجُوْهُ یَوْمَیْذٍ نَّاعِمَةٌ ۸ لِّسَعِیْهَا سَاْخِیَةٌ ۹

کیا تمہیں اُس چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے، کچھ چہرے اُس روز خوف زدہ ہونگے سخت مشقت کر رہے ہونگے، تھکے جاتے ہونگے، شدید آگ میں مجلس رہے ہونگے، کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا، خاردار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لیے نہ ہوگا، جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے، کچھ چہرے اُس روز بارونق ہوں گے، اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے،

۱۔ مراد ہے قیامت، یعنی وہ آفت جو سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اس مقام پر یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ بیان بحیثیت مجموعی پورے عالم آخرت کا ذکر ہو رہا ہے جو نظام عالم کے درہم برہم ہونے سے شروع ہو کر تمام انسانوں کے دوبارہ اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزا و سزا پانے تک تمام مراحل پر جاری ہے۔

۲۔ چہروں کا لفظ یہاں اشخاص کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ انسان کے جسم کی نمایاں ترین چیز اُس کا چہرہ ہے جس سے اس کی شخصیت پہچانی جاتی ہے، اور انسان پر اچھی یا بری جو کیفیات بھی گزرتی ہیں ان کا اظہار اس کے چہرے سے ہی ہوتا ہے، اس لیے ”کچھ لوگ“ کہنے کے بجائے ”کچھ چہرے“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۳۔ قرآن مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے لوگوں کو زقوم کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے لیے غسلین (زرخون کے دھوون) کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا، اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ انہیں خاردار سوکھی گھاس کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا۔ ان بیانات میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیے جائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زقوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غسلین ان کو ملے گا، اُس سے بھی

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۱۰ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لِأَعْيُنٍ ۱۱ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۱۲
 فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۱۳ وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۱۴ وَنَمَارِقُ
 مَصْفُوفَةٌ ۱۵ وَزَرَائِبٌ مُّبْتَثَثَةٌ ۱۶ أَفْلا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ
 كَيْفَ خُلِقَتْ ۱۷ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۱۸ وَإِلَى
 الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۱۹ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۲۰

عالی مقام جنت میں ہوں گے، کوئی بیہودہ بات وہاں نہ سنیں گے، اُس میں چشمے رواں ہونگے،
 اُس کے اندر اونچی مسدیں ہوں گی، ساغر رکھے ہوئے ہوں گے، گاؤں ٹیکوں کی قطاریں لگی
 ہوں گی اور نفیس فرش پچھے ہوئے ہوں گے۔

(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے
 کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ
 کیسے بچھالی گئی؟

بچنا چاہیں گے تو خاردار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے، غرض کوئی مرغوب غذا بہر حال انہیں نصیب نہ ہوگی۔

۵۴ یعنی دنیا میں جو سعی و عمل کر کے وہ آٹے ہوں گے اُس کے بہترین نتائج آخرت میں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے
 انہیں اطمینان ہو جائے گا کہ دنیا میں ایمان اور صلاح و تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے انہوں نے نفس اور اس کی خواہشات
 کی جو قربانیاں کیں، فرائض کو ادا کرنے میں جو تکلیفیں اٹھائیں، احکام الہی کی اطاعت میں جو زحماتیں برداشت کیں،
 معصیتوں سے بچنے کی کوشش میں جو نقصانات اٹھائے اور جن فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا،
 یہ سب کچھ فی الواقع بڑے نفع کا سودا تھا۔

۵۵ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن مجید میں جگہ جگہ جنت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کی حیثیت سے بیان
 کیا گیا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الطور، حاشیہ ۸۔ الوا
 حاشیہ ۱۳۔ جلد ششم، النباء، حاشیہ ۲۱۔

۵۶ یعنی ساغر بھرے ہوئے ہر وقت اُن کے سامنے موجود ہوں گے۔ اس کی حاجت ہی نہ ہوگی کہ
 وہ طلب کر کے انہیں منگوائیں۔

فَذَكِّرْهُ ۙ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۚ ۝۳۱ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۖ إِلَّا
 مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۚ ۝۳۲ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۚ ۝۳۳ إِنَّ
 إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۖ ۝۳۴ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۖ ۝۳۵

اچھا تو (اے نبی) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر حیر کرنے
 والے نہیں ہو۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔
 ان لوگوں کو بلنا ہماری طرف ہی ہے، پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔

۳۱ یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے تو کیا خود اپنے گرد و پیش
 کی دنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟
 یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی ان کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں
 آسکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور
 بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اس نے موجود پایا ہے ان کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے
 کہ ان کا وجود میں آنا تو ممکن ہے کیونکہ یہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اس کے مشاہدہ اور تجربے میں ابھی نہیں آئی
 ہیں ان کے بارے میں وہ بے تکلف یہ فیصلہ کر دے کہ ان کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اُسے سوچنا
 چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آ گیا؟ یہ اونٹ ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خصوصیات
 کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا
 بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش لے کر آتے ہیں، جس کا سورج دن کو روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور
 تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی جس پر انسان رہتا اور بتا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات
 پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کندوں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے ابھرائے جو زنگ بزرگ
 کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جسے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادر مطلق صانع حکیم کی کارگیری کے
 بغیر ہو گیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر رضی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اسے سنا کر بیجا
 کہ ان میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دنیا
 کی ان چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آئندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے ان کو بعد از امکان سمجھا جائے۔
 ۳۲ یعنی اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ ماننے ہمارے سپرد یہ کام تو نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی
 منواؤ۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا فرق بنا دو اور غلط راہ پر چلنے کے انجام سے خبردار کرو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو۔

تفسير القرآن

الفجر

(٨٩)

الفجر

نام | پہلے ہی لفظ **وَالْفَجْرِ** کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکہ معظمہ میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف ظلم کی چکی چلنی شروع ہو چکی تھی۔ اسی بنا پر اہل مکہ کو عداوت نمود اور فرعون کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع آخرت کی جزا اور سزا کا اثبات ہے جس کا اہل مکہ انکار کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے جس طرح ترتیب و راستہ لال کیا گیا ہے، اس کو اُسی ترتیب کے ساتھ غور سے دیکھیے۔

سب سے پہلے فجر اور دس راتوں اور بھفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر سامعین سے سوال کیا گیا ہے کہ جس بات کا تم انکار کر رہے ہو اُس کے برحق ہونے کی شہادت دینے کے لیے کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آگے حواشی میں ان چاروں چیزوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے اُس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اُس باقاعدگی کی علامت ہیں جو شب و روز کے نظام میں پائی جاتی ہے، اور ان کی قسم کھا کر یہ سوال اس معنی میں کیا گیا ہے کہ خدا کے قائم کیے ہوئے اس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اس امر کی شہادت دینے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام جس خدا نے قائم کیا ہے اُس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے، اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی بازپرس کرے؟

اس کے بعد انسانی تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے بطور مثال عداوت نمود اور فرعون کے انجام کو پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ حد سے گزر گئے اور زمین میں انہوں نے بہت فساد مچایا تو اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر برس گیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھ سی بہری طاقتیں نہیں چلا رہی ہیں، نہ یہ دنیا کسی سچو پیٹ لہجہ کی اندھیرنگری ہے، بلکہ ایک فرمانروائے حکیم و دانائے اس پر حکمرانی کر رہا ہے جس کی حکمت اور عدل کا یہ تقاضا خود اس دنیا میں انسانی تاریخ کے اندر مسلسل نظر آتا ہے۔ کہ عقل اور اخلاقی جس دسے کر جس مخلوق کو اس نے یہاں تصرف کے اختیارات دیے ہیں اس کا

محاسبہ کرے اور اسے جزا اور سزا دے۔

اس کے بعد انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں عرب جاہلیت کی حالت تو اُس وقت سب کے سامنے عملاً نمایاں تھی، اور خصوصیت کے ساتھ اُس کے دو پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے۔ ایک، لوگوں کا مادہ پرستانہ نقطہ نظر جس کی بنا پر وہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کو نظر انداز کر کے محض دنیا کی دولت اور جاہ و منزلت کے حصول یا فقدان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دے بیٹھے تھے اور اس بات کو بھول گئے تھے کہ نہ دولت مندی کوئی انعام ہے، نہ رزق کی تنگی کوئی سزا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حالتوں میں انسان کا امتحان لے رہا ہے کہ دولت پا کر وہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر کس روش پر چل پڑتا ہے۔ دوسرے، لوگوں کا یہ طرز عمل کہ پیغمبر باپ کے مرتے ہی اُن کے ہاں کس پیرسی میں مبتلا ہو جاتا ہے، غریبوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا جس کا بس چلتا ہے مُردے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمزور حق داروں کو دھتلاتا دیتا ہے، اور مال کی حسد میں لوگوں کو ایک ایسی نہ بچھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مل جائے ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مقصود لوگوں کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں کا یہ طرز عمل ہے اُن کا محاسبہ آخر کیوں نہ ہو۔

پھر کلام کو اس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ محاسبہ ہو گا اور ضرور ہو گا اور وہ اُس روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔ اُس وقت جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کی سمجھ میں وہ بات آجائے گی جسے آج وہ سمجھانے سے نہیں مان رہے ہیں، مگر اُس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ منکر انسان ہاتھ متارہ جا بگا کہ کاش میں نے دنیا میں اس دن کے لیے کوئی سامان کیا ہوتا۔ مگر یہ ندامت اُسے خدا کی سزا سے نہ بچا سکے گی۔ البتہ جن انسانوں نے دنیا میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اُس حق کو قبول کر لیا ہوگا جسے آسمانی صحیفے اور خدا کے انبیاء پیش کر رہے تھے، خدا اُن سے راضی ہوگا اور وہ خدا کے عطا کردہ اجر سے راضی ہوں گے، انہیں دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوں اور جنت میں داخل ہو جائیں۔

آيَاتُهَا ۳۰

سُورَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوتُهَا ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْفَجْرِ ۱) وَكَيَالٍ عَشِيرٍ ۲) وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۳) وَاللَّيْلِ
إِذَا يَسِرُّ ۴) هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِذِي حَجْرِ ۵)

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور حُجَّت اور طاق کی، اور رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو۔ کیا اس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟

۱۔ ان آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے، حتیٰ کہ ”حُجَّت اور طاق“ کے بارے میں تو ۲۶ اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایات ہیں ان کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی تفسیر حضور سے ثابت نہیں ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ صحابہ اور تابعین اور بعد کے مفسرین میں سے کوئی بھی آپ کی تفسیر کے بعد خود ان آیات کے معنی متعین کرنے کی جرأت کرتا۔

انداز بیان پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے کوئی بحث چل رہی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات پیش فرما رہے تھے اور منکرین اُس کا انکار کر رہے تھے۔ اس پر حضور کے قول کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ قسم ہے فلاں اور فلاں چیزوں کی۔ مطلب یہ تھا کہ ان چیزوں کی قسم، جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں وہ برحق ہے۔ پھر بات کو اس سوال پر ختم کر دیا گیا کہ کیا کسی صاحب عقل کے لیے اس میں کوئی قسم ہے؟ یعنی کیا اس حق بات پر شہادت دینے کے لیے اس کے بوج کسی اور قسم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا یہ قسم اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک ہوشمند انسان اُس بات کو مان لے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ بحث نفی کیا جس پر ان چار چیزوں کی قسم کھائی گئی۔ اس کے لیے ہمیں اُس پورے مضمون پر غور کرنا ہو گا جو بعد کی آیتوں میں ”تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا“ سے شروع ہو کر سورۃ کے آخر تک چلتا ہے۔ اُس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بحث جزا و سزا کے بارے میں تھی جس کو ماننے سے اہل مکہ انکار کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کا قائل کرنے کے لیے مسلسل تبلیغ و تلقین فرما رہے تھے۔ اس پر فجر، اور دس راتوں اور حُجَّت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اس بات کو باور کرنے کے لیے کیا یہ چار چیزیں کافی نہیں ہیں کہ کسی صاحب عقل آدمی کے سامنے اور کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہو؟

ان قسموں کا یہ موقع و محل متعین ہو جانے کے بعد لامحالہ ہمیں ان میں سے ہر ایک کے وہ معنی لینے ہوں گے جو

بعد کے مضمون پر دلالت کرتے ہوں۔ سب سے پہلے فرمایا "فجر کی قسم"۔ فجر کو بھٹنے کو کہتے ہیں، یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر فرمایا "دس راتوں کی قسم"۔ سلسلہ بیان کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتیں وہ جن میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ جن میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک نہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ مہینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا "بُحُفَتِ اُوْر طَاقِ كِي قِسْمِ"۔ بُحُفَتِ اُس عدد کو کہتے ہیں جو دو برابر کے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، جیسے ۲-۴-۶-۸۔ اور طَاقِ اُس عدد کو کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوتا، جیسے ۱-۳-۵۔ عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر چیز یا تو بڑا جوڑا ہے یا تنہا۔ لیکن چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہو رہی ہے، اس لیے سلسلہ مضمون کی مناسبت سے بُحُفَتِ اور طَاقِ کا مطلب تغیر ایام ہے کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے۔ آخر میں فرمایا "رَاتِ كِي قِسْمِ جِكِدِهٖ نَحْصَتِ ہو رہی ہو"۔ یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی ہوئی تھی، خاتمے پر آگلی ہو اور پُہ بھٹنے والی ہو۔

اب ان چاروں چیزوں پر ایک مجموعی نگاہ ڈالیں۔ جن کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جزا و سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے۔ یہ سب چیزیں اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک ربِ قدیر اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے، اور وہ جو کام بھی کر رہا ہے بے نیک، بے مقصد، بے حکمت، بے مصلحت نہیں کر رہا ہے بلکہ اُس کے ہر کام میں صریحاً ایک حکیمانہ منصوبہ کار فرما ہے۔ اُس کی دنیا میں تم یہ کبھی نہ دیکھو گے کہ ابھی رات ہے اور یکا یک سورج نصف النہار پر آکھڑا ہوا۔ یا ایک روز چاند ہلال کی شکل میں طلوع ہو اور دوسرے روز چودھویں رات کا پورا چاند نمودار ہو جائے۔ یا رات آئی ہو تو کسی طرح اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور وہ مستقل طور پر پھیر کر رہ جائے۔ یا تغیر ایام کا سرے سے کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہ ہو کہ آدمی نارنجوں کا کوئی حساب رکھ سکے اور یہ جان سکے کہ یہ کونسا مہینہ ہے، اس کی کونسی تاریخ ہے، اس تاریخ سے اُس کا کونسا کام شروع اور کب ختم ہوتا ہے، گرمی کے موسم کی تاریخیں کونسی ہیں اور برسات یا سردی کے موسم کی تاریخیں کونسی۔ کائنات کی دوسری بے شمار چیزوں کو چھوڑ کر اگر آدمی شب و روز کی اس باقاعدگی ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور کچھ دماغ کو سوچنے کی تکلیف بھی دے تو اسے اس امر کی شہادت ملے گی کہ یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادر مطلق کا قائم کیا ہوا ہے اور اس کے قیام سے اُس مخلوق کی بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں جسے اُس نے اس زمین پر پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایسے حکیم و دانا اور قادر و توانا خالق کی دنیا میں رہنے والا کوئی شخص آخرت کی جزا و سزا کا انکار کرتا ہے تو وہ دو جہانتوں میں سے کسی ایک حماقت میں لامحالہ مبتلا ہے۔ یا تو وہ اُس کی قدرت کا منکر ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کائنات کو

الْمَزَكِيفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ ﴿٦﴾ إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۗ الَّتِي

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عمارم کے ساتھ جن کے

ایسے بے نظیر نظم کے ساتھ پیدا کر دینے پر تو قادر ہے مگر انسان کو دوبارہ پیدا کر کے اُسے جزا دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا وہ اس کی حکمت و دانائی کا منکر ہے اور اس کے بارے میں یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اُس نے دنیا میں انسان کو عقل اور اختیارات دے کر پیدا تو کر دیا مگر وہ نہ تو اُس سے کبھی یہ حساب لے گا کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے اختیارات سے کام کیا لیا، اور نہ اچھے کام کی جزا دے گا نہ برے کام کی سزا۔ ان دونوں باتوں میں جس بات کا بھی کوئی شخص قائل ہے وہ پرے درجے کا احمق ہے۔

۶ جزا دینا پر شب و روز کے نظام سے استدلال کرنے کے بعد اب اُس کے ایک یقینی حقیقت ہونے پر انسانی تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرز عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے برے قانونِ فطرت پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے اور اُس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانونِ کار فرما نہیں ہے جسے تم قانونِ فطرت سمجھتے ہو، بلکہ ایک قانونِ اخلاق بھی کار فرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا ہے۔ اس قانون کی کار فرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کیا ہے۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر اور خدا کی جزا و سزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار فاسد و مُفسد بن کر رہیں، اور جو قوم بھی اس راستے پر چلی اُس پر کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسایا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دینے کا موجب ہوا ہے اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہر حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے، کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا اُن سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اُس فساد کے بیچ لو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور اُن پر کوئی عذاب نہ آیا تھا۔ خدا کے انعام کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت اُن سب کی باز پرس بھی ہو اور وہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں (قرآن مجید میں آخرت پر یہ تاریخی اور اخلاقی استدلال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷۷-۱۴۷۸-۱۴۷۹-۱۴۸۰-۱۴۸۱-۱۴۸۲-۱۴۸۳-۱۴۸۴-۱۴۸۵-۱۴۸۶-۱۴۸۷-۱۴۸۸-۱۴۸۹-۱۴۹۰-۱۴۹۱-۱۴۹۲-۱۴۹۳-۱۴۹۴-۱۴۹۵-۱۴۹۶-۱۴۹۷-۱۴۹۸-۱۴۹

لَمْ يَخْلُقْ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ ۝۸ وَتَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَةَ بِالْوَادِ ۝۹
 وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝۱۰ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝۱۱ فَكَثُرُوا فِيهَا
 الْفَسَادَ ۝۱۲ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝۱۳ إِنَّ رَبَّكَ لِبِالْمُرْصَادِ ۝۱۴

مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؛ اور تمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؛ اور فرعون کے ساتھ؛ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کورا برسایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔

۱۵ عَادِ ارم سے مراد وہ قدیم قوم عاد ہے جسے قرآن مجید اور تاریخ عرب میں عادِ اولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ سورہ نجم میں فرمایا گیا ہے کہ وَانَّهُ اَهْلَكَ عَادًا الْاُولٰٓئِ (آیت ۵۰) اور یہ کہ اُس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کیا، یعنی اُس قوم عاد کو جس کی طرف حضرت ہود بھیجے گئے تھے اور جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔ اُس کے مقابلہ میں تاریخ عرب اس قوم کے اُن لوگوں کو جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھلے پھولے تھے عادِ آخریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ قدیم قوم عاد کو عادِ ارم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ اسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں جن میں سے ایک تمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور دوسرے آرامی (Aramaeans) ہیں جو ابتداءً شام کے شمالی علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی (Aramaic) سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

عاد کے لیے ذات العمد (اوپر نچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے اُنہی نے شروع کیا تھا۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ اُن کی اس خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ہود نے اُن سے منسوباً اَتَبْنُوْنَ يَكْبَلُ رِيْعَ اَيَّةٍ نَّعْبَتُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۔ ”یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے“ (الشعراء، آیات ۱۲۸-۱۲۹)۔

۱۶ یعنی وہ اپنے زمانے کی ایک بے نظیر قوم تھے، اپنی توت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اُس وقت دنیا میں اُن کی ٹکڑ کی نہ تھی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے وَذَاذِ كُهْرٍ فِي الْخَلْقِ بَصِيْطَةٌ، تم کو جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا“ (الاعراف، آیت ۶۹)۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا

فَمَا لِلْإِنْسَانِ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ دَفِيقُولُ رَبِّي أَكْرَمِن
وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانِن ۝

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور
نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُس کو آزمائش میں
ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔

فی الارضِ بغيرِ الحقِّ وبقالوا من اشدِّ هتاكفةً، ”رہے ماد تو انہوں نے زمین میں کسی حق کے بغیر
اپنی بڑائی کا گھنڈ کیا اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟“ (طہ السجدہ، آیت ۱۵)۔ وَاِذَا بَطَشْتُمْ
جَبَّ كَرِينًا ۖ اور تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا جبار بن کر ڈالا“ (الشعراء، آیت ۱۳)۔

۵۵ وادی سے مراد وادی القریٰ ہے جہاں اس قوم نے پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر عمارتیں بنائی
تھیں اور غالباً تاریخ میں وہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا (تفصیل
کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراب، حواشی ۵۷-۵۹-۵۹-۵۹، حاشیہ ۲۵-۲۵، الشعراء، حواشی
۹۵-۹۹ مع تصاویر)۔

۵۶ فرعون کے لیے ذوالاوتاد (میخوں والا) کے الفاظ اس سے پہلے سورہ ص آیت ۱۲ میں بھی استعمال ہوئے
ہیں۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کی فوجوں کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو اور میخوں والا کا مطلب
فوجوں والا ہو، کیونکہ انہی کی بدولت اُس کی سلطنت اس طرح جی ہوئی تھی جیسے نیمہ میخوں کے ذریعہ سے مضبوطی کے
ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد فوجوں کی کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ اس کے لشکر جہاں بھی جا کر
ٹھہرتے تھے وہاں ہر طرف ان کے خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ میخیں
ہوں جن سے ٹھونک کر وہ لوگوں کو عذاب دیتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابراہم مسک کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو کیونکہ
وہ فرعون کی عظمت و شوکت کے وہ آثار ہیں جو صدیوں سے زمین پر چھے کھڑے ہیں۔

۵۷ ظالموں اور مفسدوں کی حرکات پر نگاہ رکھنے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہونے کے الفاظ تشبیہی استعارے
کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کے انتظار میں اس غرض کے لیے چھپا
بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ زور پائے اسی وقت اُس پر حملہ کر دے۔ وہ جس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے اُسے کچھ پتہ نہیں
ہوتا کہ اُس کی خبر لینے کے لیے کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ انجام سے غافل، بے فکری کے ساتھ وہ اُس مقام سے گزرتا
ہے اور اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اُن ظالموں کی ہے جو دنیا میں فساد کا طوفان
برپا کیے رکھتے ہیں۔ انہیں اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ خدا بھی کوئی ہے جو اُن کی حرکات کو دیکھ رہا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَا تَكْرُمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۝
وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اگساتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو۔

وہ پوری بے خوفی کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ شرارتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ حد آجاتی ہے جس سے آگے اللہ تعالیٰ انہیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا اسی وقت ان پر اچانک اُس کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔

۵۷ اب لوگوں کی عام اخلاقی حالت پر تنقید کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ رویہ جن انسانوں نے اختیار کر رکھا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ ان سے کبھی باز پرس نہ ہو، اور اس بات کو عقل و اخلاق کا تقاضا کیسے مانا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ کر کے جب انسان دنیا سے نخصت ہو جائے تو اُسے کسی جزا اور سزا سے سابقہ پیش نہ آئے۔

۵۸ یعنی یہ ہے انسان کا مادہ پرستانہ نظریہ حیات۔ اسی دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ چیز ملے تو پھول جاتا ہے اور کتنا ہے کہ خدا نے مجھے عزت دار بنا دیا، اور یہ نہ ملے تو کتنا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا۔ گویا عزت اور ذلت کا معیار اُس کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و اقتدار کا ملنا یا نہ ملنا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت جسے وہ نہیں سمجھتا یہ ہے کہ اللہ نے جس کو دنیا میں جو کچھ بھی دیا ہے آزمائش کے لیے دیا ہے۔ دولت اور طاقت دی ہے تو امتحان کے لیے دی ہے کہ وہ اُسے پا کر شکر گزار بنتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ مفلس اور تنگ حال بنایا ہے تو اس میں بھی اُس کا امتحان ہے کہ صبر اور قناعت کے ساتھ راضی برضا رہتا ہے اور جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے، یا اخلاق و دیانت کی ہر حد کو پھاند جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے خدا کو سنے لگتا ہے۔

۵۹ یعنی یہ عزت اور ذلت کا معیار ہرگز نہیں ہے۔ تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اخلاق کی بھلائی اور برائی کے بجائے تم نے اسے معیار عزت و ذلت بنا رکھا ہے۔

۶۰ یعنی جب تک اُس کا باپ زندہ رہتا ہے، اُس کے ساتھ تمہارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے اور جب اُس کا باپ مرجاتا ہے تو ہمسایے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

۶۱ یعنی تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۚ ﴿٢١﴾ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ ﴿٢٢﴾ وَجِئْنَا بِبُحْبُوحَةٍ ۚ يَوْمَ يَدْعُ الْأَنْسَانَ بِأُذُنَيْهِ ۚ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۚ ﴿٢٣﴾ فَيَوْمَ يَدْعُ الْأَنْسَانَ عَذَابُهُ أَحَدًا ۚ ﴿٢٤﴾ وَلَا يُؤْتِيهِمْ فِي ذَلِكَ فَتَةً ۚ ﴿٢٥﴾ وَلَا يُؤْتِيهِمْ فِي ذَلِكَ فَتَةً ۚ ﴿٢٦﴾

ہرگز نہیں، جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی، اور تمہارا رب جلوہ فرما ہوگا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے، اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔

دوسرے کو اُس کا انتظام کرنے پر آکسائیں۔

۱۳ عرب میں عورتوں اور بچوں کو تو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظر یہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف اُن مردوں کو پہنچتا ہے جو بڑھنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور اُن سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتہ نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایماندار ہی کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

۱۴ یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمہیں کوئی فکر نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جاسکتا ہو اسے حاصل کرنے میں تمہیں کوئی تامل نہیں ہونا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے تمہاری حرص و طمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

۱۵ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم دنیا میں جیتے جی یہ سب کچھ کرتے رہو اور اس کی باز پرس کا وقت کبھی نہ آئے۔ جس جزا و سزا کا انکار کر کے تم نے زندگی کا یہ ہنجا را اختیار کر رکھا ہے وہ کوئی انہونی اور خیالی بات نہیں ہے بلکہ وہ پیش آتی ہے اور اُس وقت آتی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطُّبَيِّئَةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ سَرَابِكِ سَرَاضِيَةً
مَرْضِيَةً ۚ فَادْخُلِي فِي عِبْدِي ۙ وَأَدْخُلِي جَنَّتِي ۙ

(دوسری طرف ارشاد ہوگا) اے نفس مطمئنہ! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اپنے انجام نیکے (خوش) اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

۱۶ اصل الفاظ ہیں جَاءَ سَرَابِكِ جن کا لفظی ترجمہ ہے "تیرا رب آئے گا" لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے لامحالہ اس کو ایک تشبیہی اندازہ بیان ہی سمجھنا ہوگا جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی و قہاری کے آثار اُس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں اور اعیان سلطنت کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے بنفس نفیس خود دربار میں آ جانے سے طاری ہوتا ہے۔

۱۷ اصل الفاظ ہیں يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اُس پر نادم ہوگا، مگر اس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو بوش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہوگی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاء نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت بوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ۔

۱۸ نفس مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ و وحدہ لا شریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دین حق کو اپنا دین قرار دیا، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اُسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اُس سے بادل ناخواستہ نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ ٹک گیا کہ فی الواقع وہ بری چیز ہے، جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی بے دریغ اسے پیش کر دیا، جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ درپیش ہوا انہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا، اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد اور منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آ رہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اُسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دین حق کی پیروی نے اُسے ان گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اسی کیفیت کو دوسری جگہ قرآن میں شرح صدر سے تعبیر کیا گیا ہے (الانعام، آیت ۱۲۵)۔

۱۹ یہ بات اُس سے موت کے وقت بھی کہی جائے گی، قیامت کے روز جب وہ دوبارہ اٹھ کر میدانِ حشر کی طرف چلے گا اس وقت بھی کہی جائے گی، اور حبیب اللہ کی عدالت میں پیشی کا موقع آئے گا اس وقت بھی کہی جائے گی۔ ہر مرحلے پر اُسے اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جا رہا ہے۔





البكيد

البلد

نام | پہلی ہی آیت لَا اُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ کے لفظ البلد کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔
زمانہ نزول | اس کا مضمون اور انداز بیان مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں کا سا ہے، مگر ایک اشارہ اس میں ایسا موجود ہے جو پتہ دیتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ وہ تھا جب کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر تل گئے تھے اور آپ کے خلاف ہر ظلم و زیادتی کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔

موضوع اور مضمون | اس سورے میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے اور یہ قرآن کا کمالِ ابجاز ہے کہ ایک پورا نظریہ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جاسکتا تھا، اس چھوٹی سی سورہ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں، ان کو دیکھنے اور ان پر چلنے کے وسائل بھی اُسے فراہم کر دیے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے شہر مکہ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنے والے مصائب اور پوری اولادِ آدم کی حالت کو اس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ مزے اڑانے کے لیے پیدا کیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس کی پیدائش ہی مشقت کی حالت میں ہوئی ہے۔ اس مضمون کو اگر سورہ نجم کی آیت ۳۹ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَىٰ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا رگاہ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت پر ہے۔

اس کے بعد انسان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے کہ یہاں بس وہی وہ ہے اور اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جو اُس کے کام کی نگرانی کرنے والی اور اُس پر مواخذہ کرنے والی ہو۔

پھر انسان کے بہت سے جاہلانہ اخلاقی تصورات میں سے ایک چیز کو بطور مثال لے کر بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اُس نے بڑائی اور فضیلت کے کیسے غلط معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ جو شخص اپنی کبر بانی کی نمائش کے لیے ڈھیروں مال لٹاتا ہے وہ خود بھی اپنی ان شاہِ خمر چیروں پر فخر کرتا ہے اور لوگ بھی اسے خوب داد

دیتے ہیں، حالانکہ جو ہستی اُس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُس نے یہ مال کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں کس نیت اور کن اغراض کے لیے خرچ کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے بگھننے کی صلاحیتیں دے کر اُس کے سامنے بھلائی اور برائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور اُس پر جانے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی بلکہ نفس کو خوب لذت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ اخلاق کی بلند یوں کی طرف جاتا ہے جو ایک دشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اُس پر چلنے کے لیے آدمی کو اپنے نفس پر عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی یہ نسبت کھڑی نہیں کر سکتے کہ توجیح دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے جس سے گزر کر آدمی بلندیوں کی طرف جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ریا اور فخر اور نمائش کے خرچ چھوڑ کر آدمی اپنا مال یتیموں اور مسکینوں کی مدد پر خرچ کرے، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لائے، اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں حصہ لے جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور خلق پر رحم کھانے والا ہو۔ اس راستے پر چلنے والوں کا انجام یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو، اور اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس سے نکلنے کے سارے دروازے بند ہیں۔

سُورَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا ۲۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۱ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۲ وَوَالِدٍ
وَمَا وَلَدٌ ۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۴ أَيَحْسَبُ
أَنْ لَّنْ يَفْقِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۵ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَا لَا لُبَدًا ۶

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور حال یہ ہے کہ (اسے نبی) اس شہر میں تم کو حلال کر لیا گیا ہے اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی اور حقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا؟ کتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔

۱۔ اس سے پہلے ہم سورۃ قیامہ حاشیہ نمبر ۱ میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کلام کا آغاز ”نہیں“ سے کرنا اور پھر قسم کھا کر آگے کی بات شروع کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ لوگ کوئی غلط بات کہہ رہے تھے جس کی تردید کرنے ہوئے فرمایا گیا کہ نہیں، بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ میں فلاں فلاں چیزوں کی قسم کھاتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ بات کیا تھی جس کی تردید میں یہ کلام نازل ہوا، تو اُس پر بعد کا مضمون خود دلالت کر رہا ہے۔ کفار مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم جس طرز زندگی پر چل رہے ہیں اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، دنیا کی زندگی بس یہی کچھ ہے کہ کھاؤ پیو، مزرے اڑاؤ اور جب وقت آئے تو مر جاؤ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خواہ مخواہ ہمارے اس طرز زندگی کو غلط ٹھہرا رہے ہیں اور ہمیں ڈرا رہے ہیں کہ اس پر کبھی ہم سے باز پرس ہوگی اور ہمیں جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

۲۔ یعنی شہر مکہ کی۔ اس مقام پر یہ بات کھولنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس شہر کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔ اہل مکہ اپنے شہر کا پس منظر خود جانتے تھے کہ کس طرح ایک بے آب دگیاہ وادی میں سُنسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیم نے اپنی ایک بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو یہاں لاکر بے سہارا چھوڑا، کس طرح یہاں ایک گھر بنا کر ایسی حالت میں حج کی منادی کی جب کہ دور دور تک کوئی اُس منادی کا سننے والا نہ تھا، اور پھر کس طرح یہ شہر آخر کار تمام عرب کا مرکز بنا اور ایسا حرم قرار پایا کہ صد ہا برس تک عرب کی سرزمین بے آئین میں اس کے سوا امن کا کوئی مقام نہ تھا۔

۳۔ اصل الفاظ ہیں أَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ۔ اس کے تین معنی مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں اور آپ کے مقیم ہونے سے اس کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ شہر

حرم ہے مگر ایک وقت اٹے کا جب کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دشمنانِ دین کو قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہو جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اس شہر میں جنگل کے جانوروں تک کو مارنا اور درختوں تک کو کاٹنا اہل عرب کے نزدیک حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن میسر ہے، لیکن حال یہ ہو گیا ہے کہ اسے نبی، تمہیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں تمہیں ستانا اور تمہارے قتل کی تدبیریں کرنا حلال کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں تینوں معنوں کی گنجائش ہے، لیکن جب ہم آگے کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دو معنی اُس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور تیسرا مفہوم ہی اُس سے میل کھاتا ہے۔

۱۷ چونکہ مطلقاً باپ اور اُس سے پیدا ہونے والی اولاد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور آگے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے باپ سے مراد آدم علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو دنیا میں پائے گئے ہیں، اب پائے جاتے ہیں اور آئندہ پائے جائیں گے۔

۱۸ یہ ہے وہ بات جس پر وہ قسمیں کھائی گئی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ انسان کے حشقت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بنسری بجانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُس کے لیے یہ دنیا محنت اور مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی نبی یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر اُن کے لیے نہیں ہے۔ اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اُس کو قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو تم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جائے یا اس کا اسقاط ہو جائے۔ نہ چلنے کے وقت اُس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی اگر غلط سمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اس اندیشے سے اُس کو چین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے۔ وہ اگر فاتح عالم بھی ہے تو کسی وقت اس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غل و غش چین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے، کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔

۱۹ یعنی کیا یہ انسان جو ان حالات میں گھرا ہوا ہے، اس غم سے بین مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے،

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهُ اَحَدٌ اَلَمْ يَجْعَلْ لَهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا

کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اُس کو نہیں دیکھا، کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو

کوئی بالآخر اقتدار اُس کو کپڑنے اور اس کا سر نیچے کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اُس کی تقدیر پر کسی اور کی فرمانروائی قائم ہے جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طغیانی اُسے یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بوتہ رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو اپاہج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پٹا بڑے سے بڑے بااقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا گراتا ہے۔ عروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمیں جب بدلتی ہیں تو وہ اُسی دنیا میں ذلیل خوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی کا اس پر یس نہیں چل سکتا؟

۷۵ اَنْفَقْتُ مَالًا لَّيْسًا "میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا" نہیں کہا بلکہ اَهْلَكْتُ مَالًا لَّيْسًا کہا جس کے لفظی معنی ہیں "میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا" یعنی ٹھادیا، بیا اثر دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ کینے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر تھا کہ جو ڈھیر سا مال اُس نے خرچ کیا وہ اُس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہی تھا کہ اس کے ٹھادینے یا اثر دینے کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ مال اثر دینا تھا کس مدینے؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں۔ قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا۔ جو بے میں ڈھیروں دولت ہار دینا۔ جو اجیت جانے پر اونٹ پر اونٹ کاٹنا اور خوب بار دوستوں کو کھلانا۔ میلوں میں بڑے لاڈلے کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ تقریبات میں بے تماشا کھانے پکوانا اور اذن عام دے دینا کہ جس کا جی چاہے آٹے اور کھانے، یا اپنے ڈیرے پر کھلانگہ جاری رکھتا کہ۔ درود تک یہ شہرت ہو جائے کہ فلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی نیاضی اور فراخ دلی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انہی پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجاتے تھے۔ انہی پر ان کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا فخر جتاتے تھے۔

۷۶ یعنی کیا یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ ادھر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا، اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہوگی؟ کیا

وَشَفَتَيْنِ ۙ وَهَدَيْنَهُ النُّجْدَيْنِ ۙ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۙ
 وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۙ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ أَوْ اطْعَمْتُ يَوْمَ ذِي
 مَسْعَبَةَ ۙ تَتِيماً ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ أَوْ مَسَكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۙ ثُمَّ

ہونٹ نہیں دئیے، اور دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں دکھا دیئے، مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے
 گزرنے کی ہمت نہ کی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا،
 یا فاتحے کے دن کسی قریبی تیمم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر اس کے ساتھ یہ کہ

اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح خدا بھی اس سے دھوکا کھا جائے گا؟

۵۹ مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اُسے علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے؟ اور آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی
 آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھولی کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا
 پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفس
 ناطقہ ہے جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہار مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

۶۰ یعنی ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ
 اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کر کے رکھ دیے تاکہ
 وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کرے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ ذہر میں فرمائی
 گئی ہے کہ ہم نے انسان کو ایک مخلوق نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے
 اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا (آیات ۲-۳)۔ تشریح کے لیے ملاحظہ
 ہو تفسیر القرآن، جلد ششم، الدرہ حواشی ۳ تا ۵۔

اللہ اصل الفاظ میں فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ اِقْتَحَمَ کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام
 میں ڈالنا۔ اور عَقَبَةُ اُس دشوار گزار راستے کو کہتے ہیں جو بلندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔ پس آیت کا
 مطلب یہ ہے کہ دو راستے جو ہم نے اُسے دکھائے ان میں سے ایک بلندی کی طرف جاتا ہے مگر مشقت طلب اور دشوار
 گزار ہے۔ اُس میں آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے بڑھ کر چلنا پڑتا ہے۔ اور دوسرا
 آسان راستہ ہے جو کھدوں میں اترتا ہے، مگر اس سے پستی کی طرف جانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ بس اپنے
 نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف روکتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں
 راستے دکھا دیئے تھے، اس نے اُن میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کر لیا اور اُس مشقت طلب راستے

کو چھوڑ دیا جو بندہ کی طرف جانے والا ہے۔

گلام اور پرچونکہ اُس کی فضول خیرتیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمائش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کونسا خرچ اور ملل کا کونسا مصرف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بندہ یوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اُس میں نفس کی کوئی لذت نہیں ہے بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی نادان کے بوجھ سے لگ گیا ہو تو اس کی جان اُس سے چھڑائے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بچتے اور نہ ان کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دیادلی کے وہ چہرے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاق کی بندہ یوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً قَدْ رَقِبْتُ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضور کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچا لے گا، ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرمگاہ کے بدلے میں شرمگاہ، مُسْنَدِا حَمْدًا، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی۔ حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابو ہریرہ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابو حنیفہ اور امام شعبی نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضور نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ کی یہ حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا التَّاسِعِي عَلَى الرَّمْلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالسَّاعِي فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاحِسَبَةُ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْزُوكَ الصَّائِمُ لَا يَفْطُرُ" بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔ اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضور نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے درپے روزے رکھے اور کبھی روزہ

كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالرِّحْمَةِ ۝۱۴

آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی۔

نہ چھوڑے (بخاری و مسلم)۔

یتامی کے بارے میں تو حضور کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سہل بن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا (بخاری)۔ حضرت ابو ہریرہؓ حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ”مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے برا سلوک ہو رہا ہو“ (ابن ماجہ۔ بخاری فی الادب المفرد)۔ حضرت ابوالامامہ کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ”جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا اُس نیچے کے ہر باں کے بدلے جس پر اس شخص کا ہاتھ گزرا اُس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جس نے کسی یتیم کو یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا وہ اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے۔ اور یہ فرما کر حضور نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتائیں (مسند احمد۔ ترمذی)۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ سرکارِ سالتماب نے ارشاد فرمایا ”جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شامل کیا اللہ نے اس کے لیے جنت واجب کر دی الایہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ نہ کرے جیسا جو جو معات نہیں کیا جاسکتا“ (شرح الشیخ)۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ حضور نے فرمایا ”یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکین کو کھانا کھلا“ (مسند احمد)۔

۱۴ یعنی ان اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نہ کوئی عمل صالح ہے اور نہ اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابلِ قدر اور ذریعہ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔ مثلاً سورہ نساء میں فرمایا جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے“ (آیت ۱۲۴)۔ سورہ نحل میں فرمایا ”جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو اُن کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے“ (آیت ۹۷)۔ سورہ مومن میں فرمایا ”اور جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا“ (آیت ۴۰)۔ قرآن پاک کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے اجراء اور اس کی جزائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں نازنا اُس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ عمل بلا ایمان کو کہیں بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ اس پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی نگاہ سے مخفی نہ رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ”پھر وہ ایمان لایا“ بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ”پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے“ اس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ ایمان لا کر رہ جانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا ان دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لائے ہیں تاکہ اس سے اہل ایمان کی ایک جماعت بنے، ایک مومن معاشرہ وجود میں آئے، اور اجتماعی طور پر ان بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کا قائم کرنا، اور ان برائیوں کو مٹایا جائے جن کا مٹانا ایمان کا تقاضا ہے۔

۱۷ یہ مومن معاشرے کی دو اہم خصوصیات ہیں جن کو دو مختصر فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔

جہاں تک صبر کا تعلق ہے، ہم اس سے پہلے بار بار اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اُس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے، اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب، اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بچریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم، اور دنیا بھر کے شیا طین جن و انس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہو گا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اُس معاشرے کے قدم چوبہ میں گی۔ پدری کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی۔ انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

دہا رحم، تو اہل ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان ہی ہے کہ وہ ایک سنگدل، بے رحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے لیے رحیم و شفیق اور آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و مخوار معاشرہ ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے بھی ایک مومن اللہ کی شان رحیمی کا مظہر ہے، اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کا گروہ خدا کے اُس رسول کا نمائندہ ہے جس کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ **دَمَّآرَ سَلَمَتِكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ** (الانبیاء-۱۰۶)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑھ کر جس بلند اخلاقی صفت کو اپنی امت میں فروغ دینے کی کوشش فرمائی ہے وہ یہی رحم کی صفت ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے حسب ذیل ارشادات ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ حضرت جریر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرحمہ اللہ من لا یرحمہ الناس
اللہ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم
(بخاری - مسلم) نہیں کرتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا:

الراحمون یرحمہم الرحمن۔ ارحموا من فی
الارض یرحمکم من فی السماء۔ (ابوداؤد ترمذی)
رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے۔ زمین والوں
پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

حضرت ابو سعید خدری حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

من لا یرحمہ لا یرحمہ۔ (بخاری فی الادب المفرد)
جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

امین عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر
کبیرنا۔ (ترمذی)
وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے
پر رحم نہ کھائے اور ہمارے بڑے کی توقیر نہ کرے۔

ابوداؤد نے حضور کے اس ارشاد کو حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالہ سے یوں نقل کیا ہے:

من لم یرحم صغیرنا و یعرف حق کبیرنا
فلیس منا۔
جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھایا اور
ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا وہ ہم میں سے
نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم صادق و مصدق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

لا تنزع الواحۃ الا من شقی (مسند احمد ترمذی)
بدبخت آدمی کے دل ہی سے رحم سلب کر لیا جاتا ہے۔

حضرت عیاض بن حمار کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا تین قسم کے آدمی جلتی ہیں۔ ان میں سے ایک:

رجل رحیم رقیق القلب لکل ذی قرینی و
مسلم۔
وہ شخص ہے جو ہر رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لیے
رحیم اور رقیق القلب ہو۔ (مسلم)

حضرت نعمان بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تری المؤمنین و تراحمہم و توادہم و
تعاطفہم کمثل الجسد اذا اشتکی عضوًا نادی
لہ ساثر الجسد بالسہر و الحشی۔

تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی
کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک
عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ
أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ ۝

یہ لوگ ہیں دائیں بازو والے۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو
والے ہیں، ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔

(بخاری و مسلم) بے خورانی اور بخاری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً۔
مومن دوسرے مومن کے لیے اُس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔

(بخاری و مسلم) حضرت عبداللہ بن عمر حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا
يُسلمه ومن كان في حاجة أخيه
كان الله في حاجته ومن فرح عن
مسلم كرمية فرح الله عنه كرمية من
كربات يوم القيامة ومن ستر مسلماً
ستره الله يوم القيامة

(بخاری و مسلم)

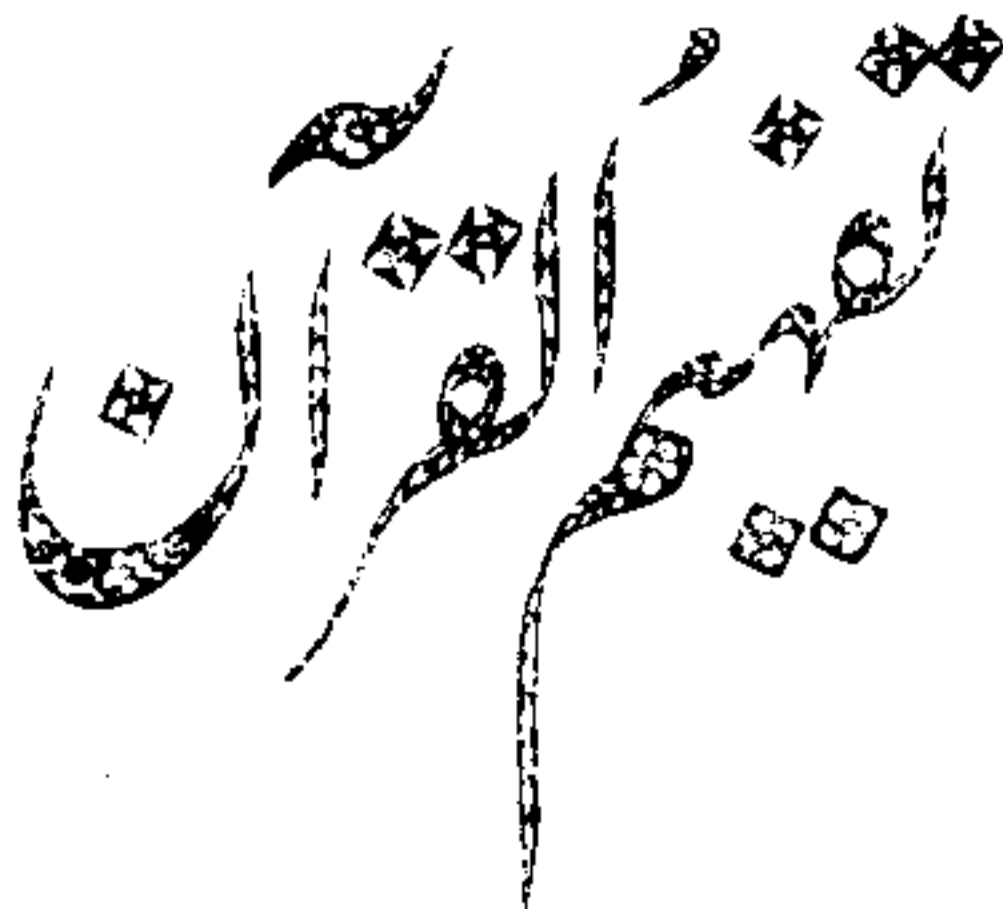
مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے
نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی
کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہو گا اللہ اس
کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا۔ اور جو
شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا اللہ
تعالیٰ اسے روز قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی
مصیبت سے نکال دے گا، اور جو شخص کسی مسلمان
کی عیب پوشی کرے گا اللہ قیامت کے روز اس
کی عیب پوشی کرے گا۔

ان ارشادات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کو ایمان لانے کے بعد اہل ایمان کے گروہ
میں شامل ہونے کی جو ہدایت قرآن مجید کی اس آیت میں دی گئی ہے اُس سے کس قسم کا معاشرہ بنانا مقصود ہے۔

۱۵ دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح ہم سورہ واقعہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد

پنجم، الواقعہ ہواشی ۵-۶۔

۱۶ یعنی آگ اس طرح اُن کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی کہ اُس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔



الشمس

(91)

الشمس

نام | پے ہی لفظ الشمس کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | مضمون اور انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ مگر اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہے جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع نیکی اور بدی کا فرق سمجھانا اور ان لوگوں کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے جو اس فرق کو سمجھنے سے انکار اور بدی کی راہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں۔

مضمون کے لحاظ سے یہ سورۃ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورت کے آغاز سے شروع ہو کر آیت ۱۰ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۱ سے آخر تک چلتا ہے۔ پہلے حصہ میں تین باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں، اسی طرح نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے آثار و نتائج میں متضاد ہیں۔ یہ دونوں نہ اپنی شکل میں یکساں ہیں اور نہ ان کے نتائج یکساں ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو جسم، جو اس اور ذہن کی قوتیں دے کر دنیا میں بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعہ سے اُس کے لاشعور میں نیکی اور بدی کا فرق، بھلے اور برے کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس اُتار دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے اندر تمیز، ارادے اور فیصلے کی جو قوتیں اللہ نے رکھ دی ہیں ان کو استعمال کر کے وہ اپنے نفس کا چھے اور برے رُحانات میں سے کس کو ابھارتا اور کس کو دباتا ہے۔ اگر وہ اچھے رُحانات کو ابھارے اور برے رُحانات سے اپنے نفس کو پاک کرے تو فلاح پائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر وہ نفس کی اچھائی کو دبا لے اور برائی کو ابھارے تو نامراد ہو گا۔

دوسرے حصے میں قوم ثمود کی تاریخی نظیر کو پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔ رسول دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ بھلائی اور برائی کا جو الہامی علم اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے وہ بجا خود انسان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی انسان خیر و شر کے غلط فلسفے اور معیار تجویز کر کے گمراہ ہوتا رہا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اُس فطری الہام کی مدد کے

لیے انبیاء علیہم السلام پر واضح اور صاف صاف وحی نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کو کھول کر بتائیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ایسے ہی ایک نبی، حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے۔ مگر وہ اپنے نفس کی برائی میں غرق ہو کر اتنی سرکش ہو گئی تھی کہ اُس نے اُن کو جھٹلا دیا، اور اُس کا منہ مانگا معجزہ جب اُنہوں نے ایک اونٹنی کی شکل میں پیش کیا تو اُن کی تنبیہ کے باوجود اُس قوم کے ایک شریک ترین آدمی نے ساری قوم کی خواہش اور طلب کے مطابق اسے بھی قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ پوری قوم تباہ کر کے رکھ دی گئی۔

ثمود کا یہ قصہ پیش کرتے ہوئے پوری سورت میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اسے قوم فریث، اگر تم ثمود کی طرح اپنے نبی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاؤ گے تو وہی انجام دیکھو گے جو ثمود نے دیکھا ہے۔ مکہ میں اُس وقت حالات درہم جورود تھے جو صالح علیہ السلام کے مقابلہ میں قوم ثمود کے انترار نے پیدا کر رکھے تھے۔ اس لیے اُن حالات میں یہ قصہ سنا دینا بجائے خود اہل مکہ کو یہ سمجھا دینے کے لیے کافی تھا کہ ثمود کی یہ تاریخچی نظیر اُن پر کس طرح چسپاں ہو رہی ہے۔

آيَاتُهَا ۱۵

سُورَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۱ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۲ وَالتَّهَارِ إِذَا
جَدَّهَا ۳ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۴ وَالتَّسْمَاءِ وَمَا بَدَّهَا ۵

سُورَجِ اور اُس کی دُھوپ کی قسم اور چاند کی قسم جبکہ وہ اُس کے پیچھے آتا ہے،
اور دن کی قسم جبکہ وہ (سُورج کو) نمایاں کر دیتا ہے اور رات کی قسم جبکہ وہ (سُورج کو)
ڈھانک لیتی ہے، اور آسمان کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے قائم کیا،

۱۔ اصل میں لفظ ضُحٰی استعمال کیا گیا ہے جو سُورج کی روشنی اور اس کی حرارت، دونوں پر دلالت کرتا ہے۔
اگرچہ عربی زبان میں اس کے معنی چاشت کے وقت کے ہیں جبکہ سُورج طلوع ہونے کے بعد خاصا بلند ہو جاتا
ہے۔ لیکن جب سُورج پڑھتا ہے تو صرف روشنی ہی نہیں دیتا بلکہ گرمی بھی دیتا ہے، اس لیے ضُحٰی کا لفظ جب
سُورج کی طرف منسوب ہو تو اس کا پورا مفہوم اُس کی روشنی، یا اُس کی بدولت نکلنے والے دن کے بجائے اُس کی دُھوپ
ہی سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

۲۔ یعنی رات کی آمد پر سُورج چھپ جاتا ہے اور اُس کی روشنی رات بھر غائب رہتی ہے۔ اس کیفیت
کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ رات سُورج کو ڈھانک لیتی ہے، کیونکہ رات کی اصل حقیقت سُورج کا افق سے نیچے اتر
جانا ہے، جس کی وجہ سے اُس کی روشنی زمین کے اُس حصے تک نہیں پہنچ سکتی جہاں رات طاری ہو گئی ہو۔

۳۔ یعنی چمت کی طرح اُسے زمین پر اٹھا کھڑا کیا۔ اس آیت اور اس کے بعد کی دو آیتوں میں ما کا لفظ استعمال
ہوا ہے یعنی مَا بَدَّهَا، اور مَا طَحَّهَا اور مَا سَوَّهَا۔ اس لفظ ما کو مفسرین کے ایک گروہ نے مصدری معنوں میں
لیا ہے اور وہ ان آیتوں کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ آسمان اور اس کے قائم کیے جانے کی قسم، زمین اور اس کے بچھانے
جانے کی قسم، اور نفس اور اس کے ہموار کیے جانے کی قسم۔ لیکن یہ معنی اس لیے درست نہیں ہیں کہ ان تین فقروں کے بعد یہ
نفرہ کہ ”پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی“ اس سلسلہ کلام کے ساتھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ دوسرے
مفسرین نے یہاں ما کو مَن یا الذی کے معنی میں لیا ہے، اور وہ ان فقروں کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جس نے آسمان کو قائم
کیا، جس نے زمین کو بچھایا اور جس نے نفس کو ہموار کیا۔ یہی دوسرا مطلب ہمارے نزدیک صحیح ہے، اور اس پر یہ اعتراض
نہیں ہو سکتا کہ ما عربی زبان میں بے جان اشیا اور بے عقل مخلوقات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن میں اس کی

وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَّهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝۷ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا
وَتَقْوَاهَا ۝۸ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۝۱۰

اور زمین کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے بچھایا، اور نفس انسانی کی اور اُس ذات کی قسم
جس نے اُسے ہموار کیا پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی، یقیناً سلاح
پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اُس کو دبا دیا۔

بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ ماکو مَن کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دَلَّكَ أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ، اور
تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ فَاذْكُرُوا مَا كُنتُمْ مِنَ النِّسَاءِ (پس عورتوں
میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرو)۔ دَلَّكَ مَا كُنتُمْ أَبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ (اور جن عورتوں
سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہوا ان سے نکاح نہ کرو)۔

۷۷ ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اور اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے
دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اُس کو دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور
سوچنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اس کے لیے بہترین ذریعہ علم بن سکتے تھے۔
اس کو قوتِ عقل و فکر، قوتِ استدلال و استنباط، قوتِ خیال، قوتِ حافظہ، قوتِ تمیز، قوتِ فیصلہ، قوتِ ارادی اور دوسری
ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ ہموار کرنے
میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اُسے پیدائشی گناہ گار اور جبلتِ بد معاش بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور
اس کی ساخت میں کوئی خلقی کمی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ یہی بات ہے جسے سورۃ بَدِیْ
میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے کہ فَطَرْتُمُوهُنَّ لِيَكُنَّ خَالِصَةً لَّكُمْ فِي مَوَاطِنَ الْمُنَازَعَاتِ ۚ فَلَمَّا ذُكِّرْتُمْ بَدَّيْتُمْ ۚ وَنَسِيتُمْ كَلِمَاتِ اللَّهِ الَّتِي
تُكْرَهُمْ وَكَانُوا يُحَذِّرُكُمُوهَا ۚ قَدْ خَلَتْ مِنكُمْ أَسْمَاءُ الْبَغْيِ الَّتِي كَانَتْ تُكْرَهُ ۚ فَلَمَّا نَسُوا مَا كَانُوا تُحَذَّرُونَ ۚ فَكُلُوا
مِمَّا كَرِهَتْ لَكُمْ آبَاؤُكُمْ وَسِيبُ آبَائِكُمُ الْمُنَافِقِينَ ۚ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۚ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۖ إِلَّا
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ لَئِنَّكُمْ لَفِي رَبِّ لَكُنَّ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۚ (سورۃ بَدِیْ ۱-۱۰)۔ اور اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ کوئی
بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہو، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یہ
ایسا ہی ہے جیسے جانور کے پیٹ سے پورا کالپورا صحیح و سالم بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم ان میں کسی کا کان کٹا ہوا پاتے ہو؟ بخاری
و مسلم)۔ یعنی یہ شکر کین ہیں جو بعد میں اپنے ادبام جاہلیت کی بنا پر جانوروں کے کان کاٹتے ہیں، ورنہ خدا کسی جانور کو
ماں کے پیٹ سے کٹے ہوئے کان لے کر پیدا نہیں کرتا۔ ایک اور حدیث میں حضور کا ارشاد ہے ”میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے
اپنے تمام بندوں کو حنیف (صحیح الفطرت) پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے اگر ان کو ان کے دین (یعنی ان کے فطری دین) سے
گمراہ کر دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں اور ان کو حکم دیا کہ میرے ساتھ ان کو
شریک کریں جن کے شریک ہونے پر میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی“ (مسند احمد)۔ مسلم نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ میں حضور

کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

۵۵۔ الہام کا لفظ لہم سے ہے جس کے معنی نکلنے کے ہیں۔ اِنَّ الشَّيْءَ وَالْتَهَمَهُ کے معنی میں فلاں شخص نے اس چیز کو نکل لیا۔ اور اَلْهَمَّتُهُ الشَّيْءَ کے معنی ہیں میں نے فلاں چیز اُس کو نکلوا دی یا اس کے حلق سے اتار دی۔ اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا کسی خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفس انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات و دلیلتیں کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی، اچھے اخلاق و اعمال اور بُرے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فحور (بیکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (برائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے بسے اور بھلے کی تیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔ یہی بات سورہ بکدر میں فرمائی گئی ہے کہ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ۔ اور ہم نے اس کو خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے (آیت ۱۰)۔ اسی کو سورہ دھر میں یوں بیان کیا گیا ہے اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا وَاِمَّا كٰفِرًا۔ ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا خواہ شاکر ہی کر رہے یا کافر (آیت ۲)۔ اور اسی بات کو سورہ قیامہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس توامد و ضمیر موجود ہے جو برائی کرنے پر اسے ظامت کرتا ہے (آیت ۲) اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے (آیات ۱۲-۱۵)۔

اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فطری الہام اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق پر اُس کی حیثیت اور نوعیت کے لحاظ سے کیا ہے، جیسا کہ سورہ طہ میں ارشاد ہوا ہے کہ الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقًا ثُمَّ هَدٰى۔ جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی (آیت ۵۰)۔ مثلاً حیوانات کی ہر نوع کو اس کی ضروریات کے مطابق الہامی علم دیا گیا ہے جس کی بنا پر پھلی کو آپ سے آپ ترنا، پندے کو اڑنا، شمد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور بٹے کو گھونسل تیار کرنا آ جاتا ہے۔ انسان کو بھی اُس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے الگ الگ قسم کے الہامی علوم دیے گئے ہیں۔ انسان کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک حیوانی وجود ہے اور اس حیثیت سے جو الہامی علم اُس کو دیا گیا ہے اُس کی ایک نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے جس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اسے نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔ اُس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے۔ اس حیثیت سے خدا نے انسان کی آفرینش کے آغاز سے مسلسل اُس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ بے دریغے اکتشافات اور ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کرتا رہا ہے۔ ان ایجادات و اکتشافات کی تاریخ کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو محض انسانی فکر و دانش کا نتیجہ ہو، ورنہ ہر ایک کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ یکا یک کسی شخص کے ذہن میں ایک بات آگئی اور اُس کی بدولت اُس نے کسی چیز کا اکتشاف کیا یا کوئی چیز ایجاد کر لی۔ ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ انسان کی ایک اور حیثیت یہ ہے کہ

وہ ایک اخلاقی وجود ہے، اور اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر و شر کا امتیاز، اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس الہامی طور پر عطا کیا ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے جس کی بنا پر دنیا میں کبھی کوئی انسانی معاشرہ خیر و شر کے تصورات سے خالی نہیں رہا ہے، اور کوئی ایسا معاشرہ نہ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے نہ اب پایا جاتا ہے جس کے نظام میں بھلائی اور برائی پر جزا اور سزا کی کوئی نہ کوئی صورت اختیار نہ کی گئی ہو۔ اس چیز کا برزبانے ہر جگہ اور ہر جگہ تہذیب و تمدن میں پایا جانا اس کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے اور مزید براں یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ ایک خالق حکیم و دانہ نے اسے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے، کیونکہ جن اجزاء سے انسان مرکب ہے اور جن قوانین کے تحت دنیا کا مادی نظام چل رہا ہے ان کے اندر کہیں اخلاق کے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔

۵۶ یہ ہے وہ بات جس پر ان چیزوں کی قسم کھانی گئی ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئی ہیں۔ اب غور کیجئے کہ وہ چیزیں اس پر کس طرح دلالت کرتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جن حقائق کو وہ انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے، ان کی شہادت میں وہ سامنے کی چند ایسی نمایاں ترین چیزوں کو پیش کرتا ہے جو ہر آدمی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں، یا خود اپنے وجود میں نظر آتی ہیں۔ اسی قاعدے کے مطابق یہاں دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں اس لیے ان کے آثار اور نتائج بھی یکساں نہیں ہیں بلکہ لازماً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف سورج ہے اور دوسری طرف چاند۔ سورج کی روشنی نہایت تیز ہے اور اس میں گرمی بھی ہے۔ اس کے مقابلہ میں چاند اپنی کوئی روشنی نہیں رکھتا۔ سورج کی موجودگی میں وہ آسمان پر موجود بھی ہو تو بے نور ہوتا ہے۔ وہ اُس وقت چمکتا ہے جب سورج چھپ جائے، اور اُس وقت بھی اس کی روشنی نہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ رات کو دن بنا دے، نہ اُس میں کوئی گرمی ہوتی ہے کہ وہ کام کر سکے جو سورج کی گرمی کرتی ہے۔ لیکن اُس کے اپنے کچھ اثرات ہیں جو سورج کے اثرات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک طرف دن ہے اور دوسری طرف رات۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کے اثرات اور نتائج باہم اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی ان کو یکساں نہیں کہہ سکتا حتیٰ کہ ایک بے وقوف سے بے وقوف آدمی کے لیے بھی یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ رات ہوئی تو کیا اور دن ہوا تو کیا، کسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح ایک طرف آسمان ہے جسے خالق نے بلند ٹھایا ہے اور دوسری طرف زمین ہے جسے پیدا کرنے والے نے آسمان کے نیچے فرش کی طرح بچھا دیا ہے۔ دونوں اگرچہ ایک ہی کائنات اور اس کے نظام اور اس کی مصلحتوں کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن دونوں کے کام اور ان کے اثرات و نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان آفاقی شہادتوں کو پیش کرنے کے بعد خود انسان کے اپنے نفس کو لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسے اعضا اور حواس اور ذہنی قوتوں کے متناسب امتزاج سے ہموار کر کے خالق نے اس کے اندر بھلائی اور برائی، دونوں کے میلانات، مرجحانات اور محرکات رکھ دیے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور الہامی طور پر اسے ان دونوں کا فرق سمجھا دیا ہے کہ ایک فحور ہے اور وہ بُری چیز ہے، اور دوسرا تقویٰ ہے، اور وہ اچھی چیز ہے۔ اب اگر سورج اور چاند، دن اور رات، زمین اور آسمان یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے اثرات اور نتائج ایک دوسرے سے لازماً مختلف ہیں، تو نفس کا فحور اور تقویٰ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ انسان

خود اس دنیا میں بھی نیکی اور بدی کو کیسا نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا۔ خواہ اس نے اپنے بنائے ہوئے فلسفوں کی رو سے خیر و شر کے کچھ بھی معیار تجویز کر لیے ہوں، بہر حال جس چیز کو بھی وہ نیکی سمجھتا ہے اس کے متعلق وہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ قابل قدر ہے، تعریف اور صلے اور انعام کی مستحق ہے۔ بخلاف اس کے جس چیز کو بھی وہ بدی سمجھتا ہے اس کے بارے میں اس کی اپنی بے لاگ رائے یہ ہے کہ وہ مذمت اور سزا کی مستحق ہے۔ لیکن اصل فیصلہ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اُس خالق کے ہاتھ میں ہے جس نے انسان کا فجور اور تقویٰ اُس پر الہام کیا ہے۔ فجور وہی ہے جو خالق کے نزدیک فجور ہے اور تقویٰ وہی ہے جو اس کے نزدیک تقویٰ ہے۔ اور خالق کے ہاں ان دونوں کے دو الگ نتائج ہیں۔ ایک کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کا تزکیہ کرے وہ فلاح پائے، اور دوسرے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو دبا دے وہ نامراد ہو۔

تزکیہ کے معنی میں پاک کرنا، ابھارنا اور نشوونما دینا۔ سیاق و سباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے، اس کو ابھار کر تقویٰ کی بندھی پر لے جائے اور اُس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے وہ فلاح پائے گا۔ اس کے مقابلہ میں دُشہا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مصدر زَنَدَ سِنْدٌ ہے۔ تندیہ کے معنی دبانے، چھپانے، اغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں۔ سیاق و سباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہو گا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشوونما دینے کے بجائے اُن کو دبا دے، اُس کو بہکا کر برائی کے رجحانات کی طرف لے جائے، اور فجور کو اُس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اس کے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھپ جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَ آلِهَتَهُ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّىٰ اللَّهُ نَفْسَهُ، یعنی فلاح پا گیا وہ جس کے نفس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہوا وہ جس کے نفس کو اللہ نے دبا دیا۔ لیکن یہ تفسیر اول تو زبان کے لحاظ سے قرآن کے طرز بیان کے خلاف ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہی بات کہنی مقصود ہوتی تو وہ یوں فرماتا کہ قَدْ أَفْلَحَتْ مَنْ ذَكَرَهَا اللَّهُ وَقَدْ خَابَتْ مَنْ دَسَّىٰهَا اللَّهُ فَلَاحٌ پلّاحٌ پا گیا وہ نفس جس کو اللہ نے پاک کر دیا اور نامراد ہو گیا وہ نفس جس کو اللہ نے دبا دیا۔ دوسرے یہ تفسیر اسی موضوع پر قرآن کے دوسرے بیانات سے ٹکراتی ہے۔ سورہ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ، فَلَاحٌ پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ (آیت ۴) سورہ غبس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا وَمَا عَلَيْكَ الْاَلَمُ كَثِيًّا، اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی نہ اختیار کرے۔ ان دونوں آیتوں میں پاکیزگی اختیار کرنا بندے کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جگہ جگہ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ مثلاً سورہ ذہر میں فرمایا "ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کی آزمائش کریں اسی لیے اُسے ہم نے سمیع و بصیر بنایا" (آیت ۲)۔ اور سورہ ملک میں فرمایا "جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تمہیں آزمائے کون تم میں بہتر عمل کرنے والا ہے" (آیت ۲)۔ اب یہ ظاہر ہے کہ امتحان سرے سے ہی بے معنی ہو جاتا ہے اگر امتحان لینے والا پہلے ہی ایک امیدوار کو ابھار دے اور دوسرے کو دبا دے۔ اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جو قتادہ، عکرمہ، مجاہد اور سعید بن جبیر نے بیان کی ہے کہ ذَكَرَهَا اور دَسَّىٰهَا کا فاعل بندہ سے نہ کہ خدا۔ رہی وہ حدیث جو ابن ابی حاتم

كَذَبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۙ إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ۗ فَقَالَ لَهُمْ
رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۗ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۗ

ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اُس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بھیکراٹھا
تو اللہ کے رسول نے اُن لوگوں سے کہا کہ خبردار اللہ کی اونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اُس کے
پانی پینے (میں ممانع نہ ہونا)۔ مگر انہوں نے اُس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔

نے عن جُوَیْرِ بْنِ سَعِيدٍ عَنِ الضَّحَّاكِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ كِي سَدَّ عَنْ نَقْلِ كِي هِيَ كِهْ خُوْدِرُ رَسُوْلِ اَللّٰهِ صَلَّى اَللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعْنِيْ اِسْ اَيْتِ كَامَطْلَبِ
يِهْ بِيَانِ فَرَمَا يَا كِهْ اَفْلَحَتْ نَفْسٌ زَكَاهَا اَللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ (فلاح پاگيا وه نفس جس كو اللّٰهُ عزوجل نے پاگ كر ديا)، تو يِهْ ارشاد
در حقيقت حضور سے ثابت نہیں ہے كيونكہ اس كِي سند ميں جُوَیْرِ بِنِ مَزْرُوْكِ المحدث ہے اور ابن عباس سے ضحاک كِي ملاقات
نہیں ہوئی ہے۔ البتہ وہ حدیث صحیح ہے جو امام احمد، مسلم، نسائی اور ابن ابی شیبہ نے حضرت زبید بن أرقم سے روایت كِي ہے
كہ حضور يِهْ دُعَا مَا نَكَا كَرْتِي تَعْتِي كِهْ اَللّٰهُمَّ اِنْتِ تَقْوَاهَا وَذَكَاهَا اَنْتِ خَيْرٌ مِّنْ ذَكَاهَا اَنْتِ وَبِهَا دُمُوهَا خَدِيَا بِيْرِ نَفْسِ كِهْ
اُس كا تقوى عطا كر اور اس كو پاگيزه كر، تو يِهْ وه بهتر هستي ہے جو اس كو پاگيزه كرے، تو يِهْ اُس كا سرپرست اور مولیٰ ہے
اس سے ملنے جلتے الفاظ ميں حضور كِي يِهْ دعا حضرت عبداللّٰه بن عباس سے طبرانی، ابن مَرْدُوْدِيَهْ اور ابن المنذر نے اور حضرت
عائشہ سے امام احمد نے نقل كِي ہے۔ اس كا مطلب در حقيقت يِهْ ہے كہ بندہ تو صرف تقوى اور تزكيه كِي خواہش اور طلب يِهْ
كر سكتا ہے، رہا، كا نصيب ہو جانا، تو وه بہر حال اللّٰه كِي توفيق پر منحصر ہے۔ اور يِهْ حال تہ سبب كا يِهْ ہے كہ اللّٰهُ زبردستی
كسي كے نفس كو نہیں دبتا، مگر جب بندہ اُس پر تامل جائے تو اللّٰهُ تعالیٰ اُسے تقوى اور تزكيه كِي توفيق سے محروم كر ديتا ہے اور اُسے
پھوڑ ديتا ہے كہ اپنے نفس كو جس گندگی كے ڈبیر ميں دبانا چاہے دبا دے۔

۷۵ اور پر كِي آیات ميں جن باتوں كو اصولاً بيان كيا گيا ہے اب انہي كِي وضاحت ايک تازہ بخي نظير سے كِي جا رہي ہے۔
يِهْ كس بات كِي نظير ہے اور اوپر كے بيان سے اس كا كيا تعلق ہے، اس كو سمجھنے كے ليے قرآن مجيد كے دوسرے بيانات كِي روشني ميں
اُن دو بنيادي حقيقتوں پر اچھی طرح غور كرنا چاہيے جو آیات ۷۴ تا ۱۰۱ ميں بيان كِي گئي يہ۔

اولاً ان ميں فرمایا گيا ہے كہ نفس انسانی كو ايک ہموار و مستقیم فطرت پر پيدا كر كے اللّٰهُ تعالیٰ نے اُس كا فخر اور اُس كا
تقوى اُس پر الہام كر ديا۔ قرآن اس حقيقت كو بيان كرنے كے ساتھ يِهْ بھی واضح كرتا ہے كہ فخر و تقوى كا يِهْ الہامی علم اس بات كے
ليے كافي نہیں ہے كہ ہر شخص خود يِهْ اُس سے تفصيل ہدایت حاصل كرے، بلکہ اس غرض كے ليے اللّٰهُ تعالیٰ نے وحی كے ذریعہ سے
انبیاء عظیم السلام كو مفصل ہدایت دی جس ميں وضاحت كے ساتھ يِهْ بتا ديا گيا كہ فخر كا اطلاق كن كن چیزوں پر ہوتا ہے جن
سے بچنا چاہيے اور تقوى اُس كس چیز كا نام ہے اور وه كيسے حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان وحی كے ذریعہ سے آنے والی اس واضح ہدایت
كو قبول نہ كرے تو وه نہ فخر سے بچ سكتا ہے نہ تقوى كا راستہ پاسكتا ہے۔

فَدَمَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۙ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۙ ۱۵

آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوندِ خاک کر دیا، اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی بُرے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔ ۱۵

ثانیاً ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ جزا اور سزا وہ لازمی نتائج ہیں جو مجبور اور تقویٰ میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مرتب ہوتے ہیں۔ نفس کو مجبور سے پاک کرنے اور تقویٰ سے ترقی دینے کا نتیجہ فلاح ہے، اور اس کے اچھے رجحانات کو دبا کر مجبور میں غرق کر دینے کا نتیجہ نامرادی اور ہلاکت و بربادی۔

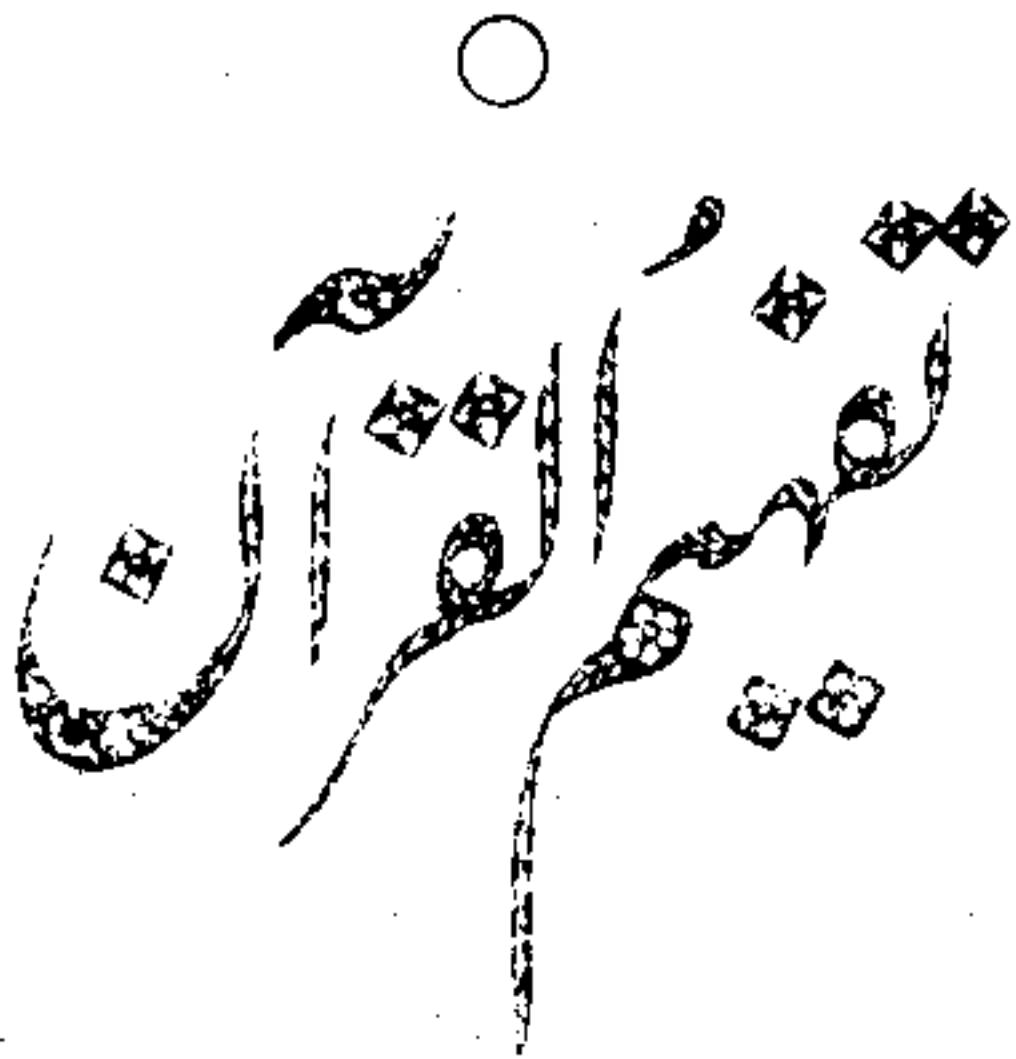
اسی بات کو سمجھانے کے لیے ایک تاریخی نظریہ پیش کی جا رہی ہے اور اس کے لیے ثمود کی قوم کو بطور نمونہ لیا گیا ہے، کیونکہ یہ پہلی نیاہ شدہ قوموں میں سے جس قوم کا علاقہ اہل مکہ سے قریب ترین تھا وہ یہی تھی۔ شمالی حجاز میں اُس کے تاریخی آثار موجود تھے جس سے اہل مکہ شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں ہمیشہ گزرتے رہتے تھے، اور جاہلیت کے اشعار میں جس طرح اس قوم کا ذکر کثرت سے آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب میں اس کی تباہی کا چہرہ چا عام تھا۔

۱۵ یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلایا جو ان کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے، اور اس جھٹلانے کی وجہ ان کی بے سرکشی تھی کہ وہ اُس مجبور کو جھوٹنے کے لیے تیار نہ تھے جس میں وہ مبتلا ہو چکے تھے اور اُس تقویٰ کو قبول کرنا انہیں گوارا نہ تھا جس کی طرف حضرت صالح انہیں دعوت دے رہے تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۶، ہود، آیات ۶۱ تا ۶۲، الشعراء، آیات ۱۴۱ تا ۱۵۳، النمل، آیات ۲۵ تا ۲۹، القمر، آیات ۲۲ تا ۲۵۔

۱۶ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ ثمود کے لوگوں نے حضرت صالح کو پہنچ دیا تھا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو۔ اس پر حضرت صالح نے ایک اونٹنی کو معجزے کے طور پر ان کے سامنے حاضر کر دیا اور ان سے کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے، یہ زمین میں جہاں چاہے گی چرتی پھرتی ہے، ایک دن سارا پانی اس کے لیے مخصوص ہو گا اور دوسرا دن تم سب کے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے رہے گا، اگر تم نے اس کو ہاتھ لگایا تو یاد رکھو کہ تم پر سخت عذاب نازل ہو جائے گا۔ اس پر وہ کچھ مدت تک ڈرتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے اس سب سے زیادہ شریر اور سرکش سردار کو پکارا کہ اس اونٹنی کا قصہ تمام کر دے اور وہ اس کام کا ذمہ سے کراٹھ کھڑا ہوا الاعراف، آیت ۷۳۔ الشعراء، آیات ۱۵۴ تا ۱۵۷، القمر، آیت ۲۹۔

۱۷ سورۃ اعراف میں ہے کہ اونٹنی کو مارنے کے بعد ثمود کے لوگوں نے حضرت صالح سے کہا اب سے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے (آیت ۷۷)۔ اور سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت صالح نے ان سے کہا تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کر لو، اس کے بعد عذاب آجائے گا اور یہ ایسی تیبیہ ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی (آیت ۶۵)۔

۱۸ یعنی اللہ دنیا کے بادشاہوں اور یہاں کی حکومتوں کے فرمانرواؤں کی طرح نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس اقدام کے نتائج کیا ہوں گے۔ اُس کا اقتدار سب سے بالاتر ہے۔ اُسے اس امر کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ ثمود کی حامی کوئی ایسی طاقت ہے جو اس سے بدلہ لینے کے لیے آئے گی۔



ایک

(۹۲)

الذَّل

نام | پہلے ہی لفظ الذَّل کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کا مضمون سورہ شمس سے اس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات ہے جسے سورہ شمس میں ایک طریقہ سے سمجھایا گیا ہے اور اس سورہ میں دوسرے طریقے سے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرتا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے یہ سورہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ آغار سے آیت ۱۱ تک ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۲ سے آخر تک۔

پہلے حصہ میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ نوع انسانی کے افراد یا اقوام اور گروہ دنیا میں جو سعی و عمل بھی کر رہے ہیں، وہ لازماً اپنی اخلاقی نوعیت کے لحاظ سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح دن رات سے اور زیادہ سے مختلف ہے۔ اس کے بعد قرآن کی مختصر سورتوں کے عام انداز بیان کے مطابق تین اخلاقی خصوصیات ایک نوعیت کی، اور تین اخلاقی خصوصیات دوسری نوعیت کی سعی و عمل کے ایک وسیع مجموعے میں سے لے کر بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جنہیں سن کر ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک قسم کی خصوصیات کس طرز زندگی نمائندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی خصوصیات اُس کے برعکس کس دوسرے طرز زندگی کی علامات ہیں۔ یہ دونوں نمونے ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت چھٹکے فقرہوں میں بیان کیے گئے ہیں کہ سنتے ہی آدمی کے دل میں اتر جائیں اور زبان پر چڑھ جائیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ آدمی مال دے، خدا ترسی و پرہیزگاری اختیار کرے اور بھلائی کو بھلائی مانے۔ دوسری قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بخل کرے، خدا اور ناراضی کی فکر سے بے پروا ہو جائے اور بھلی بات کو جھٹلا دے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ یہ دو طرز عمل جو صریحاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اپنے نتائج کے اعتبار سے ہرگز یکساں نہیں ہیں، بلکہ جس قدر یہ اپنی نوعیت میں متضاد ہیں اسی قدر ان کے نتائج بھی متضاد ہیں۔ پہلے طرز عمل کو جو شخص یا گروہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے صاف اور سیدھے راستے کو سہل کر دے گا یہاں تک کہ اس کے لیے نیکی کرنا آسان اور بدی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور دوسرے طرز عمل کو جو بھی اختیار کرے گا

اللہ تعالیٰ اس کے پیسے زندگی کے بکٹ اور سخت راستے کو سہل کر دے گا یہاں تک کہ اس کے لیے بدی آسان اور نیکی مشکل ہو جائے گی۔ اس بیان کو ایک نہایت مؤثر اور تیر کی طرح دل میں بیوست ہو جانے والے جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال جس کے پیچھے آدمی جان دینے دیتا ہے، آخر قبر میں تو اُس کے ساتھ جانے والا نہیں ہے، مرنے کے بعد یہ اُس کے کس کام آئے گا؟

دوسرے حصے میں بھی اسی اختصار کے ساتھ تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُس نے یہ بتا دینا اپنے ذمہ لیا ہے کہ زندگی کے مختلف راستوں میں سے سیدھا راستہ کونسا ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اپنا رسول اور اپنی کتاب بھیج کر اُس نے اپنی یہ ذمہ داری ادا کر دی ہے، کیونکہ رسول اور قرآن، دونوں ہدایت دینے کے لیے سب کے سامنے موجود تھے۔ دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہی ہے۔ دنیا مانگو گے تو وہ بھی اسی سے ملے گی اور آخرت مانگو گے تو اس کا دینے والا بھی وہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تمہارا اپنا کام ہے کہ تم اُس سے کیا مانگتے ہو۔ تیسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو بد سخت اُس بھلائی کو جھٹلائے گا جسے رسول اور کتاب کے ذریعے سے پیش کیا جا رہا ہے، اور اُس سے منہ پھیرے گا اُس کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ نیا رہے۔ اور جو خدا ترس آدمی پوری بے غرضی کے ساتھ محض اپنے رب کی رضا جوئی کی خاطر اپنا مال راہِ خیر میں صرف کرے گا اس کا رب اُس سے راضی ہو گا اور اسے اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

آيَاتُهَا ۲۱

سُورَةُ الْيَلِّ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْيَلِّ إِذَا يَغْشَىٰ ① وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ② وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ
وَالْأُنثَىٰ ③ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ④ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَ
اتَّقَىٰ ⑤ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ⑥ فَسَنِيَرًا لِلْيَسْرَىٰ ⑦

قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو، اور اُس ذات کی جس نے
ترا اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ تو جس نے (راہِ خدا میں)
مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو پس مناسک مانا، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔

۱۔ یہ وہ بات ہے جس پر رات اور دن اور زور مادہ کی پیدائش کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات
اور دن اور ترا اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں سے ہر دو کے آثار و نتائج باہم منضاد ہیں، اسی طرح
تم لوگ جن راہوں اور مقاصد میں اپنی کوششیں صرف کر رہے ہو وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور
اپنے نتائج کے اعتبار سے متضاد ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں بتایا گیا کہ یہ تمام مختلف کوششیں دو بڑی اقسام
میں تقسیم ہوتی ہیں۔

۲۔ یہ انسانی مساعی کی ایک قسم ہے جس میں تین چیزیں شمار کی گئی ہیں اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے
کہ وہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ ایک یہ کہ انسان زور پرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ بھی اللہ نے
اُسے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، اور خلقِ خدا کی مدد کرنے
میں صرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور وہ اخلاق، اعمال، معاشرت، معیشت، غرض اپنی
زندگی کے ہر شعبے میں اُن کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق
کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعنی لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق، اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ عقیدے میں
بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی شرک اور دہریت اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے اور اخلاق و
اعمال میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی سے بھلائیوں کا صدور محض بے شعوری کے ساتھ کسی متعین نظام کے بغیر نہ
ہو رہا ہو، بلکہ وہ خیر و صلاح کے اُس نظام کو صحیح تسلیم کرے جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، جو بھلائیوں کو اُن کی تمام اشکال

اور صورتوں کے ساتھ ایک نظم میں منسلک کرنا ہے، جس کا جامع نام شریعت الہیہ ہے۔

۱۷ یہ ہے مساعی کی اس قسم کا نتیجہ۔ آسان راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے، جو اس خالق کی مرضی کے مطابق ہے جس نے انسان کو اور ساری کائنات کو بنایا ہے، جس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑ کر نہیں چلنا پڑتا، جس میں انسان اپنے جسم و جان اور عقل و ذہن کی قوتوں پر زبردستی کر کے اُن سے وہ کام نہیں لیتا جس کے لیے یہ طاقتیں اُس کو نہیں بخشی گئی ہیں بلکہ وہ کام لیتا ہے جس کے لیے درحقیقت یہ اُس کو بخشی گئی ہیں، جس میں انسان کو ہر طرف اُس جنگ، مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری ہوئی زندگی میں پیش آتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے میں ہر قدم پر اس کو صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسر آتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خلق خدا کی بھلائی کے لیے استعمال کر رہا ہو، جو ہر ایک سے نیک سلوک کر رہا ہو، جس کی زندگی جرائم، فسق و فجور اور بدکرداری سے پاک ہو، جو اپنے معاملات میں کھرا اور راست باز ہو، جو کسی کے ساتھ بے ایمانی، بد عملی اور بے وقافی نہ کرے، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، جو ہر شخص کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور کسی کو اس کی سیرت و کردار پر انگلی رکھنے کا موقع نہ ملے، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہر حال اس کی قدر ہو کر رہتی ہے، اُس کی طرف دل کھینچتے ہیں، نگاہوں میں اُس کی عزت قائم ہو جاتی ہے، اُس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی کسی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات ہے جو سورہ نحل میں فرمائی گئی ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَنَجْعَلُ لَهٗ جُزْءًا مِّنْ عَمَلِهٖ ۚ (سورہ نحل، آیت ۹۷) اور اسی بات کو سورہ مریم میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۗ (سورہ مریم، آیت ۹۶) یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے رحمان اُن کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔ (آیت ۹۶)۔ پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے بے کر آخرت تک انسان کے لیے ضروری شُرد اور راحت ہی راحت ہے۔ اس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ ابدی اور لازوال ہیں۔

اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم اُسے اس راستے پر چلنے کے لیے سہولت دیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ بھلائی کی تصدیق کر کے یہ فیصلہ کر لے گا کہ یہی راستہ میرے لائق ہے اور برائی کا راستہ میرے لائق نہیں ہے، اور جب وہ عملاً مالی ایثار اور تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے یہ ثابت کر دے گا کہ اُس کی یہ تصدیق سچی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس راستے پر چلنا اُس کے لیے سہل کر دے گا۔ اُس کے لیے پھر گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے گا۔ مال حرام اُس کے سامنے آئے گا تو وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ نفع کا سودا ہے بلکہ اسے یوں محسوس ہو گا کہ یہ آگ کا انگارہ ہے جسے وہ ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ بدکاری کے مواقع اس کے سامنے آئیں گے تو وہ انہیں لطف اور لذت حاصل کرنے کے مواقع سمجھ کر ان کی طرف نہیں پکے گا بلکہ ہنتم کے دروازے سمجھ کر اُن سے دُور بھاگے گا۔ نماز اُس پر گراں نہ ہوگی بلکہ اُسے چین نہیں پڑے گا جب تک وقت آئے پر وہ اس کو ادا نہ کر لے۔ زکوٰۃ دیتے ہوئے اس کا دل نہیں دُکھے گا بلکہ اپنا مال اسے

وَأَمَّا مَنْ يَخْلُ وَاسْتَغْنَى ۙ ۘ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى ۙ ۙ
فَسَنِيئَةٌ لِّلْعَسَى ۙ ۙ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى ۙ ۙ

اور جس نے نخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور اُس کا مال آخر اُس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے ۹

ناپاک محسوس ہوگا جب تک وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال نہ دے۔ غرض ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو اس راستے پر چلنے کی توفیق و تائید ملے گی، حالات کو اُس کے لیے سازگار بنا یا جائے گا، اور اُس کی مدد کی جائے گی۔
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے سورۃ بلد میں اسی راستے کو دشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے جس پر چڑھنے کے لیے اُسے اپنے نفس کی خواہشوں سے، اپنے دنیا پرست اہل و عیال سے، اپنے رشتہ داروں سے اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے، اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر ایک اس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔ لیکن جب انسان بھلائی کی تصدیق کر کے اُس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے اور اپنا مال راہ خدا میں دے کر اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کر کے عملاً اس عزم کو سچا کر لیتا ہے تو اس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں رُطھلنا اُس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

۱۰ یہ انسانی ماساجی کی دوسری قسم ہے جو اپنے ہر جُز میں پہلی قسم کے ہر جُز سے مختلف ہے۔ نخل سے مراد محض وہ نخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اُس آدمی کو نخل کہتے ہیں جو روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ اس جگہ نخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صرف نہ کرنا ہے اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی نخل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش و آرام پر، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر مال ٹٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام و نمود، حکام رسی، یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ و دو اور محنت و کوشش کا مقصد بنا لے اور خدا سے بالکل مستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کو جھٹلانا، تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے، اس لیے اس کی تشریح کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھلائی کی تصدیق کا مطلب ہم واضح کر چکے ہیں۔

۱۱ اس راستے کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر چلنے والا اگرچہ مادی فائدوں اور دنیوی لذتوں اور ظاہری کامیابیوں

کے لالچ میں اس کی طرف جاتا ہے، لیکن اس میں ہر وقت اپنی نظرت سے اپنے ضمیر سے، خالق کائنات کے بنائے ہوئے قوانین سے، اور اپنے گرد و پیش کے معاشرے سے اس کی جنگ برپا رہتی ہے۔ صداقت، دیانت، امانت، شرافت اور عفت و عصمت کی اخلاقی حدوں کو توڑ کر جب وہ ہر طریقے سے اپنی اغراض اور خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اس کی ذات سے خلق خدا کو بھلائی کے بجائے برائی ہی پہنچتی ہے، اور جب وہ دوسروں کے حقوق اور ان کی عزتوں پر دست درازیاں کرتا ہے، تو اپنی نگاہ میں وہ خود ذلیل و خوار ہوتا ہے اور جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اس سے بھی قدم قدم پر لڑ کر اسے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کمزور ہو تو اس روش کی بدولت اسے طرح طرح کی سزائیں بھگنی ہوتی ہیں، اور اگر وہ مال دار، طاقتور اور با اثر ہو، تو چاہے دنیا اس کے زور کے آگے دب جائے لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی، عزت اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اس کے شریک کار بھی اس کو ایک خبیث آدمی ہی سمجھتے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف افراد ہی تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتور قومیں بھی جب اخلاق کے حدود بچانے اور اپنی طاقت اور دولت کے زعم میں بدکرداری کا رویہ اختیار کرتی ہیں، تو ایک طرف باہر کی دنیا ان کی دشمن ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف خور ان کا اپنا معاشرہ جرائم، خودکش، نشہ بازی، امراض خبیثہ، خانہ دانی زندگی کی تباہی، نوجوان نسلوں کی بدمرادی، طبقاتی کشمکش، اور ظلم و جور کی روز افزوں وبا سے دوچار ہو جاتا ہے، بیان تک کہ جب وہ بام عروج سے گرتی ہے تو دنیا کی تاریخ میں اپنے لیے لعنت اور پھسکار کے سوا کوئی مقام چھوڑ کر نہیں جاتی۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی، برائی کے دروازے اس کے لیے کھول دیے جائیں گے، اسی کے اسباب اور وسائل اس کے لیے فراہم کر دیے جائیں گے، بدی کرنا اس کے لیے آسان ہو گا اور نیکی کرنے کے خیال سے اس کو یوں محسوس ہو گا کہ جیسے اس کی جان پر بن رہی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے دوسری جگہ قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھیجتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے) جیسے اس کی روح آسمان کی طرف بردار کر رہی ہے“ (الانعام، آیت ۱۲۵)۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے ”بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے مگر فرماں بردار بندوں کے لیے نہیں“ (البقرہ، آیت ۴۶)۔ اور منافقین کے متعلق فرمایا ”وہ نماز کی طرف آتے بھی ہیں تو گنہگار ہوتے آتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے بھی ہیں تو بادل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں“ (التوبہ، آیت ۵۴)۔ اور یہ کہ ”ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی جیسی سمجھتے ہیں“ (التوبہ، آیت ۹۸)۔

۶ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ایک روز اسے بہر حال مرنا ہے اور وہ سب کچھ دنیا ہی میں چھوڑ جاتا ہے جسے اس نے یہاں اپنے عیش کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگر اپنی آخرت کے لیے کچھ کما کر وہ ساتھ لے گیا تو یہ مال اس کے کس کام آئے گا؟ قبر میں تو وہ کوئی کوٹھی، کوئی موٹر، کوئی جائیداد اور کوئی جمع پونجی لے کر نہیں جائے گا۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝۱۴ وَاِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْاُولٰۤى ۝۱۳ فَاَنْذَرْتَكُمْ
 نَارًا تَلْقٰۤى ۝۱۳ لَا يَصْلٰهَا اِلَّا الْاَشْقٰۤى ۝۱۵ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلٰۤى ۝۱۳
 وَسَيَجْزِيْهَا الْاَتَقٰۤى ۝۱۴ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهٗ يَتَزَكٰۤى ۝۱۵ وَمَا لِاَحَدٍ
 عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُخْزٰۤى ۝۱۹ اِلَّا اَبْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهٖ الْاَعْلٰى ۝۲۰
 وَاَلَسَوْفَ يَرْضٰۤى ۝۲۱

بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے، اور درحقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے
 ہم ہی مالک ہیں۔ پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھرکتی ہوئی آگ سے۔ اُس میں نہیں
 جھلسے گا مگر وہ انتہائی بد بخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔ اور اُس سے دُور رکھا جائیگا
 وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔ اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں
 جس کا بدلہ اُسے دیتا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے۔ اور
 ضرور وہ (اُس سے) خوش ہوگا۔ ع

۱۴ یعنی انسان کا فائق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت، اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر
 اس بات کا ذمہ لیا ہے کہ اُس کو دنیا میں بے خبر نہ چھوڑے بلکہ اسے یہ بتا دے کہ راہ راست کونسی ہے اور غلط راہیں کونسی،
 نیکی کیا ہے اور بدی کیا، حلال کیا ہے اور حرام کیا، کونسی روش اختیار کر کے وہ فرمانبردار بندہ بنے گا اور کونسا رویتا اختیار کر
 کے بندہ نافرمان بن جائے گا۔ یہی بات ہے جسے سورہ نحل میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ وَعَلَىٰ اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ
 وَهِيَ اَجْرًا (آیت ۹) "اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیرھے بھی موجود ہیں" (تشریح کے
 لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹)۔

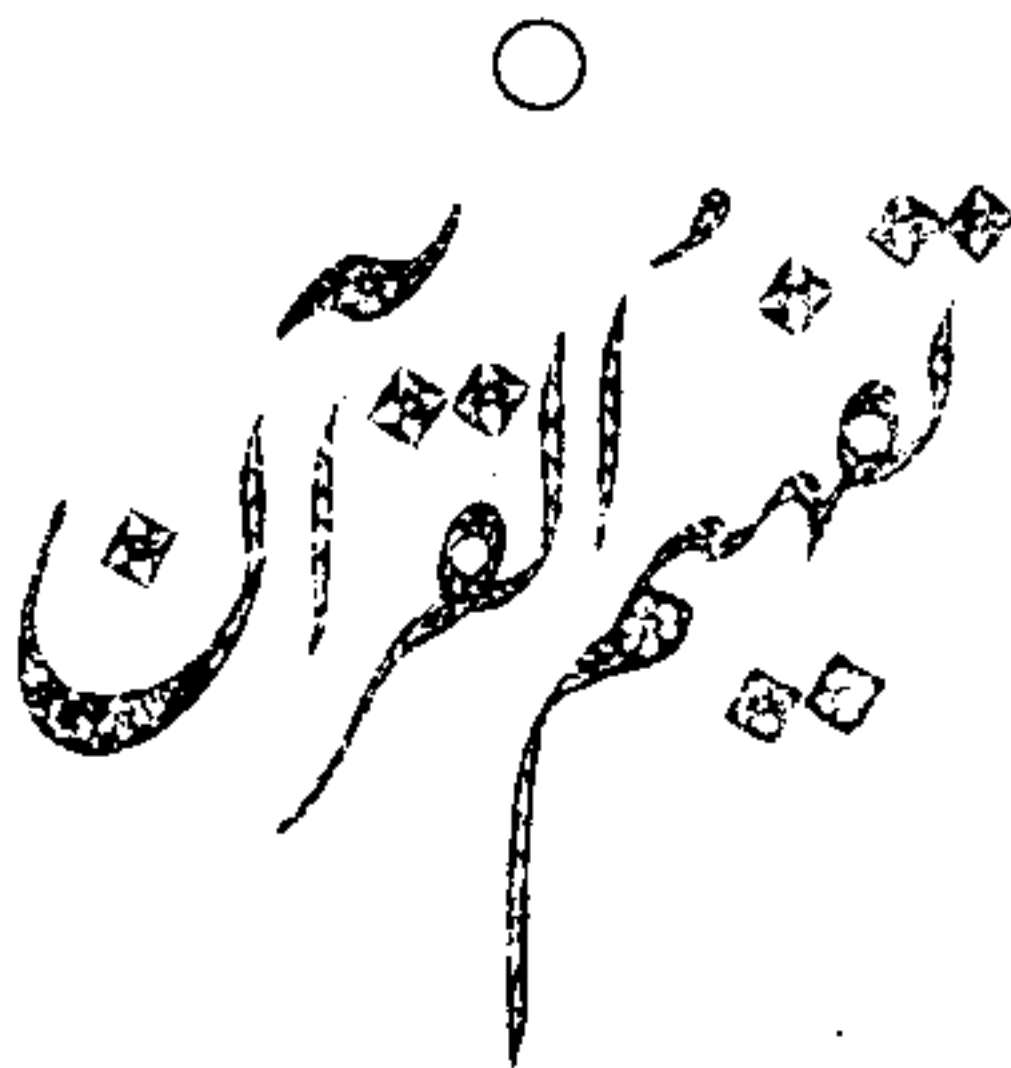
۱۵ اس ارشاد کے کئی مفہوم ہیں اور وہ سب صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا سے آخرت تک تم کبھی ہماری گرفت سے باہر
 نہیں ہو، کیونکہ دونوں جہانوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری ملکیت دنیا اور آخرت دونوں پر بہر حال قائم ہے
 خواہ تم ہماری بتائی ہوئی راہ پر چلو یا نہ چلو۔ مگر اہی اختیار کرو گے تو ہمارا کچھ نہ بگاڑو گے، اپنا ہی نقصان کر لو گے، اور راہ راست
 اختیار کرو گے تو ہمیں کوئی نفع نہ پہنچاؤ گے، خود ہی اس کا نفع اٹھاؤ گے۔ تمہاری نافرمانی سے ہماری ملک میں کوئی کمی نہیں
 ہو سکتی اور تمہاری فرمانبرداری سے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ تیسرے یہ کہ دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ دنیا چاہو

گے تو وہ بھی ہم ہی سے تمہیں ملے گی اور آخرت کی بھلائی چاہو گے تو اس کا دنیا بھی جہاں سے ہی اختیار میں ہے۔ یہی بات ہے جو سورہ آل عمران آیت ۱۴۵ میں فرمائی گئی ہے کہ **وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا** جو شخص ثواب دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم آخرت میں سے دیں گے۔ اور اسی کو سورہ شوریٰ آیت ۲۸ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ **مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ** جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، آل عمران، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم الشوریٰ، حاشیہ ۲۷)۔

۱۵۹ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نہایت شقی کے سوا کوئی آگ میں نہ جائے گا اور نہایت شقی کے سوا کوئی اس سے نہ بچے گا۔ بلکہ بیان مقصود دو انتہائی متضاد کرداروں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر کے ان کا انتہائی متضاد انجام بیان کرنا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو ٹھٹھلا دے اور اطاعت کی راہ سے منہ پھیرے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو نہ صرف ایمان لائے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی یا کاری اور نام و نمود کی طلب کے بغیر صرف اس لیے اپنا مال راہ خدا میں صرف کرے کہ وہ اللہ کے ہاں پاکیزہ انسان قرار پانے کا خواہاں ہے۔ یہ دونوں کردار اس وقت مکہ کے معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے۔ اس لیے کسی کا نام لیے بغیر لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ جہنم کی آگ میں دوسرے کردار والا نہیں بلکہ پہلے کردار والا ہی ٹھٹھے گا، اور اس آگ سے پہلے کردار والا نہیں بلکہ دوسرے کردار والا ہی دور رکھا جائے گا۔

۱۶۰ یہ اس پر سب کا رآدی کے خلوص کی مزید توضیح ہے کہ وہ اپنا مال جن لوگوں پر صرف کرتا ہے ان کا کوئی احسان پہلے سے اس پر نہ تھا کہ وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے، یا آئندہ ان سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو بدیہ اور نفع دے رہا ہو اور ان کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ وہ اپنے رب بزرگ کی رضا جوئی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اس پر کوئی احسان تھا، نہ آئندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ہے کہ مکہ معظمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اس قصور میں جن کے مالک ان پر بے تحاشا ظلم توڑ رہے تھے، ان کو خرید خرید کر وہ آزاد کر دیتے تھے تاکہ وہ ان کے ظلم سے بچ جائیں۔ ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت عامر بن عبد اللہ بن زبیر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو بکر کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر ان کے والد نے ان سے کہا کہ بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہو۔ اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم ہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوت بازو بنتے۔ اس پر حضرت ابو بکر نے ان سے کہا ای ابہ انما ارید ما عند اللہ، اباجان، میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے۔

۱۶۱ اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ ضرور اللہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ حقیقتاً اللہ اس شخص کو اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔



الضحي

(٩٣)

الضُّحٰی

نام | پہلے ہی لفظ وَالضُّحٰی کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک وحی کے نزول کا سلسلہ بند رہا تھا جس سے حضور سخت پریشان ہو گئے تھے اور بار بار آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ کسی نا لاضی کی بنا پر نہیں بند کا گیا تھا، بلکہ اس میں وہی مصلحت کار فرما تھی جو رفیقہ روشن کے بعد رات کا سکون طاری کرنے میں کار فرما ہوتی ہے۔ یعنی وحی کی تیز روشنی اگر آپ پر برابر پڑتی رہتی تو آپ کے اعصاب اسے برداشت نہ کر سکتے، اس لیے بیچ میں وقفہ دیا گیا تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ یہ کیفیت حضور پر نبوت کے ابتدائی دور میں گذرتی تھی جبکہ ابھی آپ کو وحی کے نزول کی شدت برداشت کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی، اس بنا پر بیچ بیچ میں وقفہ دینا ضروری ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت ہم سورہ مدثر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اور سورہ مژمل حاشیہ ۵ میں ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ نزول وحی کا کس قدر شدید بار آپ کے اعصاب پر پڑتا تھا۔ بعد میں جب حضور کے اندر اس بار کو برداشت کرنے کا تحمل پیدا ہو گیا تو طویل وقفے دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نسل دینا ہے اور مقصد اس پر نشانی

کو در کرنا ہے جو نزول وحی کا سلسلہ رک جانے سے آپ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روز روشن اور سکون شب کی قسم کھا کر آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور میں جن شدید مشکلات سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے یہ قصور سے دنوں کی بات ہے۔ آپ کے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی عطا و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی ان صریح پیشینگوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بھرت پوری ہوئی، حالانکہ جس وقت یہ پیشینگوئی کی گئی تھی اس وقت کہیں دور دور بھی اس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یار و مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ بیکار ہو گیا

ہے اُسے اتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوگی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہوگئی کہ

ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم تو تمہارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم پر مہربانیاں

کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوئے تھے، ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم

ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمہیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمہیں مالدار بنایا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا

رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمہارے شامل حال ہے۔ اس مقام

پر سورہ طہ، آیات ۲۲ تا ۲۴ کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جہاں حضرت موسیٰ کو ذبحوں جیسے جبار کے مقابلہ میں

بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی پریشانی دور کرنے کے لیے انہیں بتایا ہے کہ کس طرح تمہاری پیدائش کے وقت

سے ہماری مہربانیاں تمہارے شامل حال رہی ہیں، اس لیے تم اطمینان رکھو کہ اس خوفناک مہم میں تم اکیلے نہ ہو گے

بلکہ ہمارا فضل تمہارے ساتھ ہوگا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ جو احسانات ہم نے تم پر کیے ہیں ان کے جواب

میں خلقِ خدا کے ساتھ تمہارا کیا بڑناؤ ہونا چاہیے، اور ہماری نعمتوں کا شکر تمہیں کس طرح ادا کرنا چاہیے۔

آيَاتُهَا ۱۱

سُورَةُ الضُّحَىٰ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالضُّحَىٰ ۱ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۳
وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۴ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۵

قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے (اے نبی) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

۱۴ یہاں لفظ ضحیٰ رات کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد روز روشن ہے۔ اس کی نظیر سورۃ اعراف کی یہ آیات ہیں: اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرَىٰ اِنْ يَّاتِيَهُمْ بَأْسًا مِّنْ يَّسَارِيَاتٍ اَوْ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرَىٰ اِنْ يَّاتِيَهُمْ بَأْسًا مِّنْ وَّجْهِ بَلْعَابُدٍ ۹۸-۹۹ کیا بستیوں کے لوگ اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے جبکہ وہ سو رہے ہوں؟ اور کیا بستیوں کے لوگ اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن و رات آجائے جبکہ وہ کھیل رہے ہوں؟ ان آیات میں بھی چونکہ ضحیٰ کا لفظ رات کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد چاشت کا وقت نہیں بلکہ دن ہے۔

۱۵ اصل میں رات کے لیے لفظ سَجَىٰ استعمال ہوا ہے جس میں صرف تاریکی چھا جانے ہی کا نہیں بلکہ سکوت اور سکون طاری ہو جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ رات کی اس صفت کا اُس مضمون سے گہرا تعلق ہے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۱۶ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ وحی کا نزول بند رہا تھا۔ مختلف روایات میں یہ مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابن جریر سج نے ۱۲ روز، کلبی نے ۱۵ روز، ابن عباس نے ۲۵ روز، سدی اور مقاتل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہر حال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر سخت غمگین ہو گئے تھے اور مخالفین بھی آپ کو طعنے دینے لگے تھے، کیونکہ حضور پر جو نئی سورت نازل ہوتی تھی اسے آپ لوگوں کو سنایا کرتے تھے، اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپ نے کوئی نئی وحی لوگوں کو نہیں سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جنڈب بن عبد اللہ البجلی کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے (ابن جریر طبرانی، عبد بن حمید، سعید بن منصور، ابن مردودہ)۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے، جو حضور کی چچی ہوتی تھی اور جس کا گھر حضور کے مکان سے متصل تھا، آپ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا

ہے، عوفی اور ابن جریر نے ابی عباس کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریل کی آمد تک جانے سے حضور پریشان ہو گئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ قتادہ اور عثاک کی مرسل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اس صورت حال میں حضور کے شدید رنج و غم کا حال بھی متعدد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ محبوب کی طرف سے بظاہر عدم التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اسی ذریعہ طاقت سے بظاہر مجروحی جو اس جاں گسل کشمکش کے منجھوٹے میں آپ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اس پر مزید دشمنوں کی شہادت، یہ ساری چیزیں مل جل کر لامحالہ حضور کے لیے سخت پریشانی کی موجب ہو رہی ہوں گی اور آپ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہو گا کہ کیسے مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

اسی کیفیت میں یہ سورۃ حضور کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ اس میں دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسم کھا کر حضور سے فرمایا گیا کہ تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا ہے۔ اس بات پر ان دونوں چیزوں کی قسم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون ایسے ہونے چھانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت ان سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اسی طرح تم پر کبھی وحی بھیجتا اور کبھی اس کو روک لینا بھی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہے، اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے، اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مناسبت اس مضمون سے اس قسم کی یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے، اس لیے ایک وقت خاص تک دن کے روشن رہنے کے بعد رات کا آنا ضروری ہے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے، اسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے در پے پڑتی رہے تو تمہارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے، اس لیے وقتاً فوقتاً فتنۃ (نزول وحی کا سلسلہ رک جانے) کا ایک زمانہ بھی اللہ تعالیٰ نے مصلحت کی بنا پر رکھا ہے تاکہ وحی کے نزول سے جو بازنم بہ پڑتا ہے اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور تمہیں سکون حاصل ہو جائے۔ گویا آفتاب وحی کا طلوع بمنزلہ روز روشن ہے اور زمانہ فتنۃ بمنزلہ سکون شب۔

۵۴ یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ کی مخالفت تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دور دور کی نظر نہ آتے تھے۔ اسلام کی شمع مکہ ہی میں ٹھٹھا رہی تھی اور اسے بجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ کے لیے بہتر ثابت ہو گا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزت و شوکت اور آپ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اُس مرتبہ سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہو گا جو

الْمَرْيَدُكَ يَتِيْمًا فَارْوِي ۖ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى ۗ

کیا اُس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت کی۔

دنیا میں آپ کو حاصل ہوگا۔ طبرانی نے اوسط میں اور بیہقی نے دلائل میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ حضور نے فرمایا ”میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری امت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔“

۱۵ یعنی اگر چہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ ذلت زور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضور کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملک عرب جنوب کے سواصل سے لے کر شمال میں سلطنت روم کی شامی اور سلطنت فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحر احمر تک آپ کے زیر نگیں ہو گیا، عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہو گئی، جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی، کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے وہ پورا ملک گونج اٹھا جس میں مشرکین اور اہل کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑھی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مستخر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضور کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت کے ساتھ اٹھی کہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دنیا میں دیا، اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ (بزرگ بھگت جلد سوم، طہ، حاشیہ ۱۱)

۱۶ یعنی تمہیں چھوڑ دینے اور تم سے ناراض ہو جانے کا کیا سوال، ہم تو اُس وقت سے تم پر مہربان ہیں جب تم یتیم پیدا ہوئے تھے۔ حضور ابھی بطن مادر ہی میں چھ مہینے کے تھے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اس لیے آپ دنیا میں یتیم ہی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپ کو بچے سہارا نہ چھوڑا۔ چھ سال کی عمر تک والد ماجد آپ کی پرورش کرتی رہیں۔ ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو ۸ سال کی عمر تک آپ کے جد ماجد نے آپ کو اس طرح پالا کہ ان کو نہ صرف آپ سے غیر معمولی محبت تھی بلکہ اُن کو آپ پر فخر تھا اور وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ اُن کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ کے حقیقی چچا ابوطالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمے لی اور آپ کے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کیا کہ کوئی باپ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپ کی دشمن ہو گئی تھی اس وقت دس سال تک وہی آپ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔

۱۷ اصل میں لفظ ضالاً استعمال ہوا ہے جو ضلالت سے ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی گمراہی کے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک جگہ حیران کھڑا ہو کہ

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنِي ۙ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۙ وَأَمَّا
السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۙ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۙ

اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا۔ لہذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو، اور اپنے
رب کی نعمت کا اظہار کرو۔ ع

مختلف راستے جو سامنے ہیں ان میں سے کدھر جاؤں۔ ایک اور معنی کھوٹے ہوٹے کے ہیں، چنانچہ عربی محاورے میں
کہتے ہیں ضَلَّ الْمَاعُزُ فِي اللَّيْلِ، پانی دودھ میں گم ہو گیا۔ اُس درخت کو بھی عربی میں ضالہ کہتے ہیں جو صحراء میں اکیلا
کھڑا ہو اور اُس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ ضائع ہونے کے لیے بھی ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کوئی چیز ناموافق
اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو۔ غفلت کے لیے بھی ضلال کا لفظ استعمال ہوتا ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں اس کی
مثال موجود ہے کہ لَا يَضِلُّ دِينِي وَلَا يَنْسَى ۙ (طہ - ۵۲)۔ "میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے"۔ ان مختلف معنوں
میں سے پہلے معنی یہاں چسپاں نہیں ہوتے، کیونکہ ہمیں سے قبل نبوت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات
تاریخ میں موجود ہیں ان میں کہیں اس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے
ہوں، یا جاہلیت کے جو اعمال، رسوم اور طور طریقے آپ کی قوم میں پائے جاتے تھے ان میں سے کسی میں آپ ملوث ہوئے
ہوں۔ اس لیے لامحالہ وَوَجَدَكَ ضَالًّا کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ
پایا تھا۔ البتہ باقی معنی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں۔ نبوت
سے پہلے حضور اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کے قائل تو ضرور تھے، اور آپ کی زندگی گناہوں سے پاک اور فضائل اخلاق
سے آراستہ بھی تھی، لیکن آپ کو دین حق اور اس کے اصول اور احکام کا علم نہ تھا، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے مَا كُنْتُ
تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَالشُّورَىٰ، آیت ۵۲)۔ "تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی تمہیں کوئی خبر
تھی"۔ یہ معنی بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ حضور ایک جاہلی معاشرے میں گم ہو کر رہ گئے تھے اور ایک صادی درمہر ہونے کی
حیثیت سے آپ کی شخصیت نبوت سے پہلے نمایاں نہیں ہو رہی تھی۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے صحراء میں آپ ایک
اکیلے درخت کی حیثیت سے کھڑے تھے جس میں پھل لانے اور ایک پورا باغ کا باغ پیدا کر دینے کی صلاحیت تھی مگر نبوت سے
پہلے یہ صلاحیت کام نہیں آ رہی تھی۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قوتیں آپ کو عطا کی تھیں وہ جاہلیت کے
ناسازگار ماحول میں ضائع ہو رہی تھیں۔ ضلال کو غفلت کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے، یعنی آپ ان حقائق اور علوم سے غافل
تھے جن سے نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ فرمایا یہ بات خود قرآن میں بھی ایک جگہ ارشاد ہوئی ہے: وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ
قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَافِلِينَ ۙ (یوسف ۳) اور اگرچہ تم اس سے پہلے ان باتوں سے غافل تھے (نیز ملاحظہ ہو البقرہ آیت ۲۸۲، اور الشعراء آیت ۲۰)۔

۵۸ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آپ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اونٹنی اور ایک گھوڑی چھوڑی تھی۔

اس طرح آپ کی زندگی کی ابتدا افلاس کی حالت میں ہوئی تھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ قریش کی سب سے زیادہ مالدار خاتون حضرت خدیجہ نے پہلے تجارت میں آپ کو اپنے ساتھ شریک کیا، اس کے بعد انہوں نے آپ سے شادی کر لی اور ان کے تمام تجارتی کاروبار کو آپ نے سنبھالی لیا۔ اس طرح آپ نہ صرف یہ کہ مال دار ہو گئے، بلکہ آپ کی مالداری اس نوعیت کی زندگی کہ محض بیوی کے مال پر آپ کا انحصار ہو۔ ان کی تجارت کو فروغ دینے میں آپ کی اپنی محنت و قابلیت کا بڑا حصہ تھا۔

۹ یعنی تم چونکہ خود یتیم رہ چکے ہو، اور اللہ نے تم پر یہ فضل فرمایا کہ یتیمی کی حالت میں بہترین طریقے سے تمہاری دستگیری کی، اس لیے اس کا شکر ادا کرنا یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ سے کبھی کسی یتیم پر ظلم اور زیادتی نہ ہونے پائے۔

۱۰ اس کے دو معنی ہیں۔ اگر مسائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مدد کر سکتے ہو تو کرو، نہ کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کرو، مگر بہر حال اسے چھڑک نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ تم نادار تھے پھر اس نے تمہیں مالدار کر دیا، اور اگر مسائل کو پوچھنے والے، یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور جاڈ ہو، اور ظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے سوال کرے یا اپنے ذہن کی الجھن پیش کرے، بہر حال شفقت کے ساتھ اسے جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بد مزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور نہ بھگا دو۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ تم نادار تھے پھر اس نے تمہیں ہدایت بخشی۔ حضرت ابوالدرداء، حسن بصری، سفیان ثوری اور بعض دوسرے بزرگوں نے اسی دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ ترتیب کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد **وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ** کے جواب میں آتا ہے۔

۱۱ نعمت کا لفظ عام ہے جس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول کے وقت تک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک کو عطا فرمائی تھیں، اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں اس نے اپنے ان وعدوں کے مطابق آپ کو عطا کیں جو اس سورہ میں اس نے کیے تھے اور جن کو اس نے بدرجہ اتم پورا کیا۔ پھر حکم یہ ہے کہ اسے نبی بر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے اس کا ذکر اور اس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ نعمتوں کے ذکر و اظہار کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کا ایک خاص صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اس بات کا اقرار و اعتراف کیا جائے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہیں ورنہ کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کماں کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمت نبوت کا اظہار اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمت قرآن کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمت ہدایت کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور ترشٹیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ یتیمی میں دستگیری کا جو احسان اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ یتیموں کے ساتھ ویسے ہی احسان کا سلوک کیا جائے۔ نادار سے مال دار بنادینے کا جو احسان اللہ نے کیا اس کا اظہار یہی صورت چاہتا ہے کہ اللہ کے محتاج بندوں کی مدد کی جائے۔ غرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات و احسانات بیان کرنے کے بعد اس مختصر فقرے میں اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

تفسير القرآن

المنشور

(٩٢)

الْمَنْشُورُ

نام | پہلے ہی فقرے کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کا مضمون سورہ ضحیٰ سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانے اور ایک جیسے حالات میں نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ مکہ معظمہ میں والضحیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا مقصد مدعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ نبوت سے پہلے حضور کو کبھی ان حالات سے سابقہ پیش نہ آیا تھا جن کا سامنا نبوت کے بعد دعوتِ اسلامی کا آغاز کرتے ہی بیکار آپ کو کرنا پڑا۔ یہ خود آپ کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم تھا جس کا کوئی اندازہ آپ کو قبل نبوت کی زندگی میں نہ تھا۔ اسلام کی تبلیغ آپ نے کیا شروع کی کہ دیکھتے دیکھتے وہی معاشرہ آپ کا دشمن ہو گیا جس میں آپ پہلے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہی رشتہ دار، دوست، اہل قبیلہ اور اہل محلہ آپ کو گالیاں دینے لگے جو پہلے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ مکہ میں کوئی آپ کی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ راہ چلتے آپ پر آواز سے کہے جانے لگے۔ قدم قدم پر آپ کے سامنے مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ آپ کو ان حالات، بلکہ ان سے بھی بدرجہا زیادہ سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ گئی، لیکن ابتدائی زمانہ آپ کے لیے نہایت دل شکن تھا۔ اسی بنا پر آپ کو تسلی دینے کے لیے پہلے سورہ ضحیٰ نازل کی گئی اور پھر اس سورت کا نزول ہوا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ ہم نے آپ کو تین بہت بڑی نعمتیں عطا کی ہیں جن کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ آپ دل شکستہ ہوں۔ ایک شرح صدر کی نعمت۔ دوسری یہ نعمت کہ آپ کے اوپر سے ہم نے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو نبوت سے پہلے آپ کی کمر توڑ سے ڈال رہا تھا۔ تیسری رفیع ذکر کی نعمت جو آپ سے بڑھ کر تو درکنار آپ کے برابر بھی کبھی کسی بندے کو نہیں دی گئی۔ آگے چل کر ہم نے اپنے حواشی میں وضاحت کر دی ہے کہ ان تینوں نعمتوں سے مراد کیا ہے اور یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔

اس کے بعد ربِّ کائنات اپنے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ مشکلات کا یہ دور، جس سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے، کوئی بہت لمبا دور نہیں ہے بلکہ اس تنگی کے ساتھ ہی ساتھ



فراخی کا دور بھی لگا چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہٴ ضحیٰ میں اس طرح فرمائی گئی تھی کہ آپ کے لیے ہر بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہو گا اور عنقریب آپ کا رب آپ کو وہ کچھ دے گا جس سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

آخر میں حضور کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ ابتدائی دور کی ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت آپ کے اندر ایک ہی چیز سے پیدا ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب اپنے مشاغل سے آپ فارغ ہوں تو عبادت کی مشقت و ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے لو لگائیں۔ یہ وہی ہدایت ہے جو زیادہ تفصیل کے ساتھ حضور کو سورہٴ مزمل آیات ۹ تا ۱۹ میں دی گئی ہے۔



آيَاتُهَا ۸

سُورَةُ الْمُنَشَّرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمُنَشَّرُ لَكَ صَدْرَكَ ۱ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۲ الَّذِي
 أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۳ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۴ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ
 يُسْرًا ۵ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۶ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۷
 وَإِلَىٰ سَرَايِكَ فَارْغَبْ ۸

(اے نبی) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری
 بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند
 کر دیا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی
 ہے۔ لہذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔

۱۔ اس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں
 اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دور میں آپ کو پیش آرہی تھیں۔
 ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے نبی، کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی
 ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے اُن پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔
 (۱) سورۃ انعام آیت ۲۵ میں فرمایا قَمِنْ يُرِدُ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ”پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ
 ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے“ اور سورۃ نمر آیت ۲۲ میں فرمایا قَمِنْ يَشْرَحْ
 اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ سَرَّابٍ۔ ”تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول
 دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو.....“ ان دونوں مقامات پر شرح صدر سے مراد ہر قسم کے
 ذہنی خلجان اور تردد سے پاک ہو کر اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی
 عقائد، وہی اصول اخلاق و تہذیب و تمدن، اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

(۲) سورہ شُعرا آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصبِ عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جانکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انہوں نے عرض کیا دیتِ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَّکَذِّبُوْنِ وَ یَصْبِقُوْا صَدْرِیْ - میرے رب، میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے ۱۱ اور سورہ طہ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ دیتِ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یَّکَذِّبُوْا صَدْرِیْ وَ یَصْبِقُوْا صَدْرِیْ - میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے ۱۲ یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تنہا کفر کی ایک جابر و طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا جو صلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی ٹیم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے قائل نہ ہو، اور نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنی مراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حقیقت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض تابعین تو حید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی۔ اس کی تشریح ہم تفسیر القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵ کر چکے ہیں، لیکن آپ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خلجان کو دور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپ کو کامل اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرمادی جو اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکثر و معاشرے میں کسی سرد سامان اور ظاہر اُکسی پشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں، اس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپ کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ یہ شرح صدر کی بیش بہا دولت جب اللہ نے آپ کو عطا کر دی ہے تو آپ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اس مرحلے میں پیش آرہی ہیں۔

بعض مفسرین نے شرح صدر کو شق صدر کے معنی میں لیا ہے اور اس آیت کو اُس معجزہ شق صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرح صدر کو کسی طرح بھی شق صدر کے معنی

میں نہیں لیا جاسکتا۔ علامہ آنوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الآیة علی شق الصدہ ضعیف عند المحققین
 و محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شق صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے ۵

۷۱ مفسرین میں سے بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبوت سے پہلے آیام جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ
 قصور ایسے ہو گئے تھے جن کی فکر آپ کو سخت گراں گزر رہی تھی اور یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطمئن کر دیا کہ آپ
 کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ معنی لینا سخت غلطی ہے۔ اول تو لفظ دُرّ کے معنی لازماً گناہ
 ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ بھاری بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو خواہ مخواہ بُرے معنی میں لیا جائے۔
 دوسرے حضور کی نبوت سے پہلے کی زندگی بھی اس قدر پاکیزہ تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اُس کو ایک چیلنج کے طور پر
 پیش کیا گیا تھا چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمَةً قَبْلَهُ۔ "میں
 اس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں" (یونس، آیت ۱۶)۔ اور حضور اس کردار کے
 انسان بھی نہ تھے کہ لوگوں سے چُھپ کر آپ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ معاذ اللہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تو اُس سے نادانف نہ
 ہو سکتا تھا کہ جو شخص کوئی چُھپا ہوا داغ اپنے دامن پر لیے ہوئے ہوتا اُس سے خلقِ خدا کے سامنے بر ملا وہ بات کہو اتنا جو سورۃ
 یونس کی مذکورہ بالا آیت میں اس نے کہوائی ہے۔ پس درحقیقت اس آیت میں دُرّ کے صحیح معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے
 مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جمالت و جاہلیت کو دیکھ کر آپ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا
 تھا۔ آپ کے سامنے بُت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا ہاتھ گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی
 ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں قسور عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور رہیں رہے تھے۔
 لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اذقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں
 کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کس کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جھنڈا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ
 کر آپ کڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی صورت آپ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپ کی کمر توڑ سے ڈال رہی تھی جس کا بار
 گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ
 کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا نقل کھولا جا
 سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپ کے ذہن کا
 سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوع انسانی کو ان خرابیوں
 سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔

۷۲ یہ بات اُس زمانہ میں فرمائی گئی تھی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فرد فرید کے ساتھ گفتی کے
 چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہر تک محدود ہیں اُس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا اور کیسی ناموری اس کو حاصل ہوگی۔ لیکن
 اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ خود بخود نجاتی اور پھر عجیب طریقہ سے اس کو پورا کیا۔ سب سے
 پہلے آپ کے رفیع ذکر کا کام اُس نے خود آپ کے دشمنوں سے لیا۔ کفار مکہ نے آپ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار

کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ کھج کھج کر ان کے شہر میں آتے تھے، اُس زمانہ میں کفار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادو کرتا ہے کہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر اور بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے، اس لیے ذرا اُس سے بچ کر رہنا۔ یہی باتیں وہ اُن سب لوگوں سے بھی کہتے تھے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا کسی کاروبار کے سلسلے میں مکہ آتے تھے۔ اس طرح اگرچہ وہ حضور کو بدنام کر رہے تھے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ کا نام پہنچ گیا اور مکہ کے گوشہ گنہامی سے نکال کر خود دشمنوں نے آپ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کتا ہے؟ کیا آدمی ہے؟ اُس کے ”جادو“ سے متاثر ہونے والے کون لوگ ہیں اور ان پر اس کے ”جادو“ کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفار مکہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا لوگوں میں یہ جستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر مختلف ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرت کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دورِ نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضور کے رفیع ذکر کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں ایک طرف منافقین، یہود، اور تمام عرب کے اکابر مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ حبیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسن معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبرگیری، عمدہ بیمان کی پاسداری اور معاملات میں راستبازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسحور نہ بنا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعہ سے حضور کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو مٹانے کی کوشش کی، مگر آپ کی قیادت میں اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالت جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ ۱۰ سال کے اندر حضور کا رفیع ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اُس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدَانِ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ کی صدا سے گونج اٹھا۔ پھر تیسرے مرحلے کا افتتاح خلافت راشدہ کے دور سے ہوا جب آپ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں باواز بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضور پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکر خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے

کوئی دن اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضور کا ذکر مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس وقت نبوت کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ **وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ** اُس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفیع ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ حدیث میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”جبریل میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھنا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفیع ذکر کیا ہے میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا“ ابن جریر، ابن ابی حاتم، مسند ابو یعلیٰ، ابن المنذر، ابن حبان، ابن مردویہ، ابو نعیم۔ بعد کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بھری ہوئی۔

۴۷ اس بات کو درمیان میں دہرایا گیا ہے تاکہ حضور کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی میں اچھے حالات آنے والے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی چلا آ رہا ہے۔

۴۸ فارغ ہونے سے مراد اپنے مشاغل سے فارغ ہونا ہے، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے مشاغل ہوں یا اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کے مشاغل، یا اپنے گھر بار اور دنیاوی کاموں کے مشاغل۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی اور مشغولیت نہ رہے تو اپنا فارغ وقت عبادت کی ریاضت و مشقت میں صرف کرے اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف اپنے رب کی طرف منوجہ ہو جاوے۔



التَّيْنِ

(٩٥)

التین

نام | پہلے ہی لفظ التین کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | فائدہ کہتے ہیں کہ یہ سورہ مدنی ہے۔ ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے

اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جمہور علماء اسے مکی ہی قرار دیتے ہیں اور اس کے مکی ہونے کی کھلی ہوئی علامت

یہ ہے کہ اس میں شہر مکہ کے لیے **هَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ** (یہ پر امن شہر) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ظاہر

ہے کہ اگر اس کا نزول مدینہ میں ہوا ہوتا تو مکہ کے لیے یہ شہر کنیا صحیح نہیں ہو سکتا تھا۔ علاوہ بریں سورت

کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ معظمہ کے بھی ابتدائی دور کی تازہ شدہ سورتوں میں

سے ہے، کیونکہ اس میں کوئی نشان اس امر کا نہیں پایا جاتا کہ اس کے نزول کے وقت کفر و اسلام کی کشمکش برپا

ہو چکی تھی، اور اس کے اندر مکی دور کی ابتدائی سورتوں کا وہی انداز بیان پایا جاتا ہے جس میں نہایت مختصر

اور دل نشین طریقہ سے لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا ضروری اور سراسر معقول ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع ہے جزا و سزا کا اثبات۔ اس عرض کے لیے سب سے پہلے **القدر**

انبیاء کے مقامات ظہور کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا

ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کو دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔

مثلاً کیس فرمایا کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا اور فرشتوں کو اس کے آگے سجدہ کرنے

کا حکم دیا (البقرہ، ۳۰-۳۲-الانعام، ۱۶۵-الأعراف، ۱۱-الحجر، ۲۸-۲۹-النمل، ۶۲-ص ۷۱ تا ۷۳)۔

کیس فرمایا کہ انسان اُس امانتِ الہی کا حامل ہوا ہے جسے اٹھانے کی طاقت زمین و آسمان اور پہاڑوں

میں بھی مدغنی (الاحزاب، ۷۲)۔ کیس فرمایا کہ ہم نے نئی آدم کو عزت بخشی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت

عطا کی (بنی اسرائیل، ۷۰)۔ لیکن یہاں خاص طور پر انبیاء کے مقامات ظہور کی قسم کھا کر یہ فرمایا کہ انسان کو

بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ نوع انسانی کو اتنی بہتر ساخت عطا کی گئی کہ اس کے

اندرون میں جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے جس سے اوپر سچا منصب خدا کی کسی دوسری

مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں ایک وہ جو اس بہترین ساخت پر

پیدا ہونے کے بعد بُرائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے اُس انہاد کو پہنچ جاتے

ہیں جہاں اُن سے زیادہ نیچ کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتی، دوسرے وہ جو ابھاری و عمل صالح کا راستہ اختیار کر کے اس گراؤ سے بچ جاتے ہیں اور اُس مقام بلند پر قائم رہتے ہیں جو اُن کے بہترین ساخت پر پیدا ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نوع انسانی میں ان دونوں قسموں کے لوگوں کا پایا جانا ایک ایسا امر واقعی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کا مشاہدہ انسانی معاشرے میں ہر جگہ ہر وقت ہو رہا ہے۔

آخر میں اس امر واقعی سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب انسانوں میں یہ دو الگ الگ اور ایک دوسرے سے قطعاً مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں تو پھر جزائے اعمال کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔ اگر پستی میں گرنے والوں کو کوئی سزا اور بلندی پر چڑھنے والوں کو کوئی اجر نہ ملے، اور انجام کار دونوں کا یکساں ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی خدائی میں کوئی انصاف نہیں ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت اور انسان کی عقل عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص بھی حاکم ہو وہ انصاف کرے۔ پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اللہ جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، وہ انصاف نہیں کرے گا۔



آيَاتُهَا ۸

سُورَةُ التِّينِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سِیْنِیْنَ ۝ وَهَذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۝

قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا اور اس پر امن شہر (مکہ) کی،

اس کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ حسن بھری، بکریدہ، عطا بن ابی رباح، جابر بن زید، مجاہد اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون بھی یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ابن ابی حاتم اور حاکم نے ایک قول حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اس کی تائید میں نقل کیا ہے۔ اور جن مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے انہوں نے انجیر اور زیتون کے خواص اور فوائد بیان کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی خوبییوں کی وجہ سے ان دونوں پھلوں کی قسم کھائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک عام عربی داں تین اور زیتون کے الفاظ سن کر وہی معنی سے گامزہ عربی زبان میں معروف ہیں۔ لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنی لینے میں مانع ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طور سینا اور شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے، اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے ان چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس پر طور سینا اور شہر مکہ تو دلالت کرتے ہیں، لیکن یہ دو پھل اس پر دلالت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں بھی کسی چیز کی قسم کھائی ہے، اس کی عظمت یا اس کے منافع کی بنا پر نہیں کھائی، بلکہ ہر قسم اس مضمون پر دلالت کرتی ہے جو قسم کھانے کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ان دونوں پھلوں کے خواص کو وجہ قسم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بعض دوسرے مفسرین نے تین اور زیتون سے مراد بعض مقامات لیے ہیں۔ کعب احبار، قتادہ اور ابن زید کہتے ہیں کہ تین سے مراد دمشق ہے اور زیتون سے مراد بیت المقدس۔ ابن عباس کا ایک قول ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مژوہ نے یہ نقل کیا ہے کہ تین سے مراد حضرت نوح کی وہ مسجد ہے جو انہوں نے بخودی پاڑ پر بنائی تھی اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ لیکن وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ کے الفاظ سن کر یہ معنی ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے اور نہ یہ بات قرآن کے مخاطب اہل عرب میں معروف تھی کہ تین اور زیتون ان مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریقہ اہل عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو اس علاقے کو وہ بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب مناسبت تین اور زیتون، یعنی ان پھلوں کی پیداوار کا علاقہ ہو سکتا ہے، اور وہ شام و فلسطین کا علاقہ ہے، کیونکہ اس زمانے کے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ
سُفْلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے
پینچ کر دیا، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے

اہل عرب میں یہی علاقہ انجیر اور زیتون کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ ابن تیمیہ، ابن القیم، زرخشری اور آلوسی رحمہم اللہ
نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اور ابن جریر نے بھی اگرچہ پہلے قول کو ترجیح دی ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بات تسلیم کی ہے کہ زیتون
وزیتون سے مراد ان بھلوں کی پیداوار کا علاقہ بھی ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اس تفسیر کو قابل لحاظ سمجھا ہے۔

۱۷ اصل میں طُورِ سَيْنِينَ فرمایا گیا ہے۔ سینین جزیرہ نمائے سینا کا دوسرا نام ہے۔ اس کو سینا یا سینا بھی
کہتے ہیں اور سینین بھی خود قرآن میں ایک جگہ طُورِ سَيْنَاءِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اب چونکہ وہ علاقہ جس میں کوہ
واقع ہے سینا ہی کے نام سے مشہور ہے اس لیے ہم نے ترجمہ میں اس کا ہی مشہور نام درج کیا ہے۔

۱۸ یہ ہے وہ بات جس پر انجیر وزیتون کے علاقے یعنی شام و فلسطین اور کوہ طور اور مکہ کے پُرمان شہر کی قسم کھائی
گئی ہے۔ انسان کے بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو وہ اعلیٰ درجہ کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی دوسری
جاندار مخلوق کو نہیں دیا گیا، اور اُسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی
گئیں۔ پھر چونکہ نوع انسانی کے اس فضل و کمال کا سب سے زیادہ بلند نمونہ انبیاء علیہم السلام ہیں اور کسی مخلوق کے لیے
اس سے ادنیٰ کوئی مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اُسے منصب نبوت عطا کرنے کے لیے منتخب فرمائے، اس لیے انسان کے
احسن تقویم پر ہونے کی شہادت میں اُن مقامات کی قسم کھائی گئی ہے جو خدا کے پیغمبروں سے نسبت رکھتے ہیں۔ شام و فلسطین
کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بکثرت انبیاء مبعوث ہوئے۔
کوہ طور وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی۔ رہا مکہ معظمہ تو اس کی بنا ہی حضرت ابراہیم
اور حضرت اسماعیل کے ہاتھوں پڑی، انہی کی بدولت وہ عرب کا مقدس ترین مرکزی شہر بنا، حضرت ابراہیم ہی نے یہ
دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا، "اے میرے رب اس کو ایک پُرمان شہر بنا" (البقرہ-۱۲۶) اور اسی دعا کی
ببرکت تھی کہ عرب میں ہر طرف پھیلی ہوئی بدامنی کے درمیان صرف یہی ایک شہر ڈھائی ہزار سال سے امن کا گہوارہ بنا
ہوا تھا۔ پس کلام کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے نوع انسانی کو ایسی بہترین ساخت پر بنایا کہ اس میں نبوت جیسے عظیم مرتبے
کے حامل انسان پیدا ہوئے۔

۱۹ مفسرین نے بالعموم اس کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اُسے اُرْقُلُ الْعُرَى یعنی بڑے محلے کی
ایسی حالت کی طرف پھیر دیا جس میں وہ کچھ سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ہم نے اُسے جہنم کے

اجْرٌ غَيْرِ مَمْنُونٍ ۝۶ فَمَا يَكْذِبُكَ بَعْدُ بِالْذِّينِ ۝۷ أَلَيْسَ اللَّهُ
بِأَحْكَمِ الْحَكِيمِينَ ۝۸

کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ پس (اے نبی) اس کے بعد کون جزا و سزا کے معاملہ میں تم کو ٹھنڈا
سکتا ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

سب نیچے درجے کی طرف پھیر دیا۔ لیکن یہ دونوں معنی اُس مقصود کلام کے لیے دلیل نہیں بن سکتے جسے ثابت کرنے
کے لیے یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ سورۃ کا مقصود جزا و سزا کے برحق ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ اس پر نہ یہ بات دلالت
کرتی ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ بڑھ چلے کی انتہائی کمزور حالت کو پہنچا دیے جاتے ہیں، اور نہ ہی بات دلالت
کرتی ہے کہ انسانوں کا ایک گروہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ پہلی بات اس لیے جزا و سزا کی دلیل نہیں بن سکتی کہ بڑھ چلے
کی حالت اچھے اور بُرے، دونوں قسم کے لوگوں پر طاری ہوتی ہے، اور کسی کا اس حالت کو پہنچا کوئی سزا نہیں ہے جو اُسے
اُس کے اعمال پر دی جاتی ہو۔ رہی دوسری بات، تو وہ آخرت میں پیش آنے والا معاملہ ہے۔ اُسے اُن لوگوں کے سامنے
دلیل کے طور پر کیسے پیش کیا جاسکتا ہے جنہیں آخرت ہی کی جزا و سزا کا قائل کرنے کے لیے یہ سارا استدلال کیا جا رہا
ہے؟ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کے بعد جب انسان اپنے
جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے برائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے
گراتے اُسے گراؤٹ کی اُس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراؤٹ میں اُس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک
ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر کثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی،
کینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ شوق ہو جاتے ہیں وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب
نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو لے لیجیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی
دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں تمام درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے
کسی جانور کا شکار کرتا ہے۔ جانوروں کا قتل عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتل عام کرتا ہے۔
درندہ صرف اپنے بچوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ احسن تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے کام
لے کر نوپ، بندوق، ٹینک، ہوائی جہاز، ایٹم بم، حائڈروجن بم اور دوسرے بے شمار ہتھیار ایجاد کرتا ہے تاکہ ان کی
آن میں پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں
کو اذیت دینے کے لیے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصور بھی کبھی کسی درندے کے دماغ میں نہیں
آسکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کینہ پن کی اس انتہا کو پہنچتا ہے کہ عورتوں کے ننگے جلوس
نکالتا ہے، ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں، باپوں اور بھائیوں اور شوہروں

کے سامنے اُن کے گھر کی عورتوں کی عصمت لوٹتے ہیں، بچوں کو اُن کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں، ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں، انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسان کی اس وحشت کا کسی درجہ میں بھی مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہی حال دوسری بڑی صفات کا بھی ہے کہ اُن میں سے جس کی طرف بھی انسان رخ کرتا ہے، اپنے آپ کو ازل المخلوقات ثابت کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مذہب، جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے، اُس کو بھی وہ اتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضاء جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے، اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوتاؤں کی عبادت سے زنا کا ارتکاب کا ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جن ہستیوں کو وہ دیوتا اور معبود کا درجہ دیتا ہے ان کی طرف اس کی دیوتا لایا میں ایسے ایسے گندے قہقہے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسان کے لیے بھی باعث شرم ہیں۔

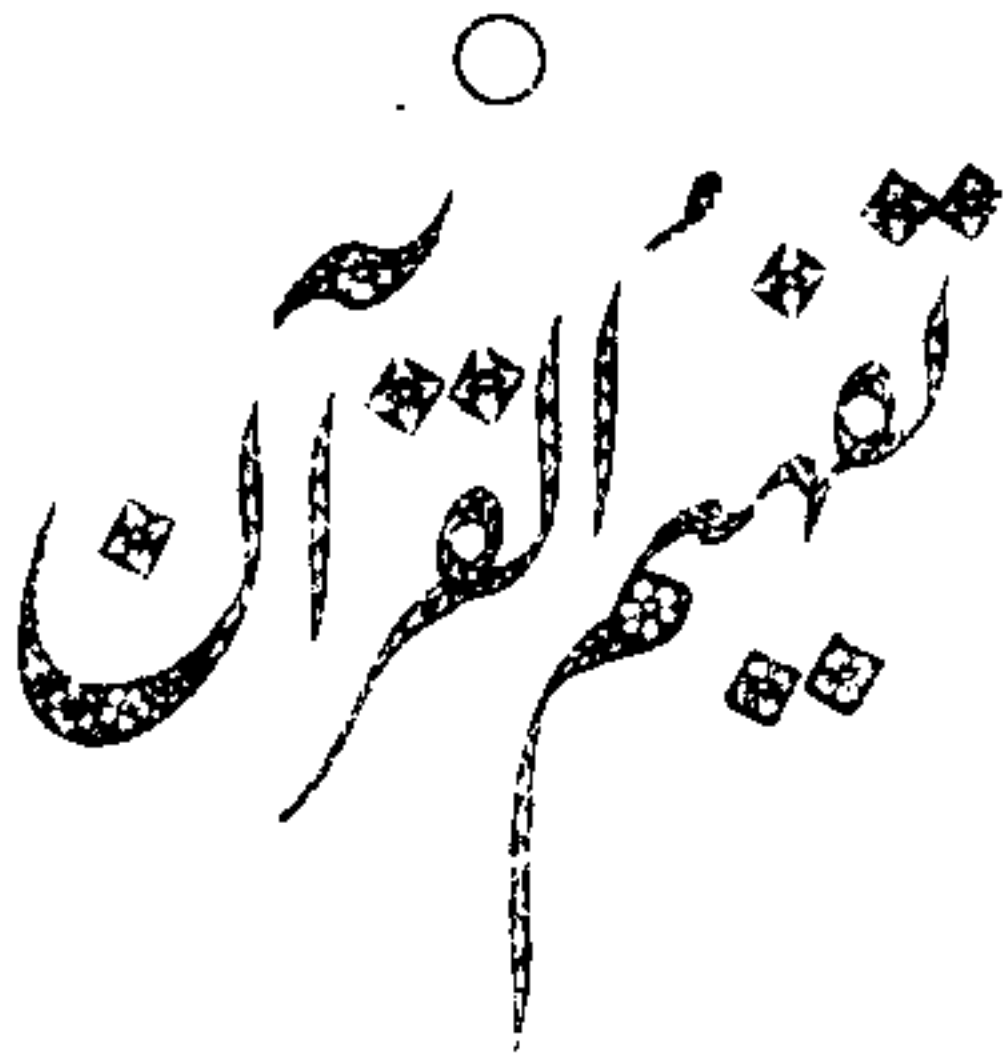
۵۵ جو مفسرین نے اسفل سافلین سے مراد بڑھا پے کی وہ حالت کی ہے جس میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے وہ اس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”مگر جن لوگوں نے اپنی جوہانی اور تندرستی کی حالت میں ایمان لا کر نیک اعمال کیے ہوں اُن کے لیے بڑھا پے کی اس حالت میں بھی وہی نیکیاں لکھی جائیں گی اور اُنہی کے مطابق وہ اجر پائیں گے۔ اُن کے اجر میں اس بنا پر کوئی کمی نہ کی جائے گی کہ عمر کے اس دور میں اُن سے وہ نیکیاں صادر نہیں ہوئیں۔ اور جو مفسرین اسفل سافلین کی طرف پھیرے جانے کا مطلب جہنم کے ادنیٰ ترین درجہ میں پھینک دیا جانا لیتے ہیں ان کے نزدیک اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ”ایمان لا کر عمل صالح کرنے والے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، وہ اس درجہ کی طرف نہیں پھیرے جائیں گے، بلکہ اُن کو وہ اجر ملے گا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ لیکن یہ دونوں معنی اُس استدلال سے متناہت نہیں رکھتے جو جزا و سزا کے برحق ہونے پر اس سورت میں کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسانی معاشرے میں یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ اخلاقی پستی میں گرنے والے لوگ گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچے ہو جاتے ہیں اُسی طرح یہ بھی ہر زمانے کا عام مشاہدہ ہے کہ جو لوگ خدا اور آخرت اور رسالت پر ایمان لائے اور جنہوں نے اپنی زندگی عمل صالح کے سانچے میں ڈھالی وہ اس پستی میں گرنے سے بچ گئے اور اُسی احسن تقویم پر قائم رہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا تھا، اس لیے وہ اجر غیر ممنون کے مستحق ہیں، یعنی ایسے اجر کے جو نہ اُن کے استحقاق سے کم دیا جائے گا، اور نہ اُس کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا۔

۵۶ دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”پس (اسے انسان) اس کے بعد کیا چیز تجھے جزا و سزا کو جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟“ دونوں صورتوں میں مدعا ایک ہی رہتا ہے۔ یعنی جب یہ بات علانیہ انسانی معاشرے میں نظر آتی ہے کہ بہترین ساخت پر پیدا کی ہوئی نوع انسانی میں سے ایک گروہ اخلاقی پستی میں گرتے گرتے سب نیچوں سے نیچے ہو جاتا ہے، اور دوسرا گروہ ایمان و عمل صالح اختیار کر کے اس گراؤ سے بچا رہتا ہے اور اُسی حالت پر قائم رہتا ہے جو بہترین ساخت پر انسان کے پیدا کیے جانے سے مطلوب تھی، تو اس کے بعد جزا و سزا کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے یہی عقل

یہ کتنی ہے کہ دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں ہو؟ کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ نہ اسْفَل السَّافِلین میں گرنے والوں کو کوئی سزا دی جائے اور نہ اُس سے بچ کر پاکیزہ زندگی اختیار کرنے والوں کو کوئی جزا؟ یہی بات دوسرے مقامات پر قرآن میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ . مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ . کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ (القلم - ۲۵-۳۴) . اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّجِئًا هُمْ وَمَنْ اٰمَنُوا سَوَاءً مَا يَحْكُمُونَ . کیا برا بیوں کا ارتکاب کرنے والوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انہیں اُن لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے؟ دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو؟ بہت بڑے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں (الباقیہ - ۲۱) .

۷۰ یعنی جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے حاکموں سے بھی تم یہ چاہتے ہو اور یہی توقع رکھتے ہو کہ وہ انصاف کریں، مجرموں کو سزا دیں اور اچھے کام کرنے والوں کو صلہ و انعام دیں، تو خدا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ اگر تم اس کو سب سے بڑا حاکم مانتے ہو تو کیا اس کے بارے میں تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ کوئی انصاف نہ کرے گا؟ کیا اُس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ برے اور بھلے کو ایک جیسا کر دے گا؟ کیا اس کی دنیا میں بدترین افعال کرنے والے اور بہترین کام کرنے والے، دونوں مر کر خاک ہو جائیں گے، اور کسی کو نہ بد اعمالیوں کی سزا ملے گی نہ حسن عمل کی جزا؟

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن المنذر، بیہقی، حاکم اور ابن مردودہ نے حضرت ابو ہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی سورۃ والتین والذین یؤمنون پڑھے اور اَلْیَسَّ اَللّٰهُ بِاَحْکِمِ الْمُحْکِمِیْنَ پر پہنچے تو کہے بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ رَاٰہُ، اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے بِسْمِکَ فَبَلٰی۔



العلق

(٩٤)

العلق

نام | دوسری آیت کے لفظ علق کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

ترمانہ نزول | اس سورۃ کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اقرأ سے شروع ہو کر پانچویں آیت کے الفاظ مَا لَمْ يَعْلَمْ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصہ کَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَبَّطٌ سے شروع ہو کر آخر سورۃ تک چلتا ہے۔ پہلے حصے کے متعلق علامہ امت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس معاملہ میں حضرت عائشہ کی وہ حدیث جسے امام احمد بخاری، مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد مسندوں سے نقل کیا ہے، صحیح ترین احادیث میں شمار ہوتی ہے، اور اس میں حضرت عائشہ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر آغازِ وحی کا پورا قصہ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری اور صحابہ کی ایک جماعت سے بھی یہی بات منقول ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیات جو حضور پر نازل ہوئیں وہ یہ تھیں۔ دوسرا حصہ بعد میں اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابو جہل نے آپ کو دھکیاں دے کر اس سے روکنے کی کوشش کی۔

آغازِ وحی | محدثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زہری سے، اور انہوں نے حضرت عروہ بن زبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے (حضرت عائشہ نے تحفۃ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زہری نے تعبیر سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا)۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ ایک روز جبکہ آپ غارِ حرا میں تھے، یکایک آپ پر وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔ اس کے بعد حضرت عائشہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتی ہیں کہ میں نے کہا ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھیجا یہاں تک کہ

میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا بیان تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا قرا یا سجدہ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ رُحُوہ اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ مَا لَكُمْ بِعِلْمِ رَبِّهِ وَهُوَ لَا يَأْتِي تَحْتَهُ شَيْءٌ مِّنْ عِشْيَانِكُمْ فَذُكِّرُوا بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُرْجَوْنَ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے نفوت زدگی کی کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے فرمایا "اسے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے" پھر سارا قصہ آپ نے اُن کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے" انہوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے، خدائی قسم، آپ کو خدا کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں، مابے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، سہان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں" پھر وہ حضور کو ساتھ لے کر ذرقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو اُن کے چچا زاد بھائی تھے، زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے حضرت خدیجہ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بیٹے کا قصہ سنیے۔ ذرقہ نے حضور سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ذرقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانہ نبوت میں قوی جوان ہوتا۔ کاش میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" ذرقہ نے کہا "ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ذرقہ کا انتقال ہو گیا۔

یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طالب یا متوقع ہونا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ کے اوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے

اعتراضات کیے، مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس وقت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریک زندگی تھیں۔ پیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے ان کو غار حراء میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تامل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اسی طرح ذوق بنو نزل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی جب یہ واقعہ سنا تو اسے کوئی دشواری نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر فراز ہونا کوئی قابل تعجب امر نہ تھا۔

دوسرے حصہ کی شان نزول | اس سورہ کا دوسرا حصہ اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں اسلامی طریقہ پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابو جہل نے آپ کو ڈرا دھمکا کر اس سے روکنا چاہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی ہونے کے بعد قبل اس کے کہ حضورؐ اسلام کی علانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپ نے حرم میں اُس طریقے پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائی تھی، اور یہی وہ چیز تھی جس سے قریش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپ کسی نئے دین کے پیرو ہو گئے ہیں۔ دوسرے لوگ تو اسے عبرت ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابو جہل کی رگ جاہلیت اس پر پھڑک اٹھی اور اس نے آپ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اس طریقے پر حرم میں عبادت نہ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہیں جن میں ابو جہل کی ان بیہودگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ ابو جہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں پتھروں کے کمانوں۔ اس نے کہا "لات اور عزیٰ کی قسم، اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا پھر ایسا ہوا کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تا کہ آپ کی گردن پہ پاؤں رکھے، مگر بیکار لوگوں نے دیکھا کہ وہ جھپٹے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا میرے اور اُن کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہوناک چیز تھی اور کچھ پر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹتا تو ملائکہ اُس کے چوتھڑے اڑا دیتے۔ احمد، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردد، ابو نعیم، اصغفانی، بیہقی۔

ابن عباس کی روایت ہے کہ ابو جہل نے کہا اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملائکہ علانیہ اُسے آپکڑیں گے (بخاری، ترمذی، نسائی، ابن جریر، عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن مردد)۔

ابن عباس کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل کا اُدھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا اے محمد، کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ اور اس نے آپ کو دھکیا دینی شروع کیں۔ جو اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اس پر اس نے کہا اے محمد، تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم، اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، طبرانی، ابن مردد)۔

ابنی واقعات پر اس سورہ کا وہ حصہ نازل ہوا جو کَلَّا اِنَّ اِلٰنَسَانَ كِبٰطِفٰی سے شروع ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اس حصے کا مقام وہی ہوتا چاہیے تھا جو قرآن کی اس سورہ میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد اسلام کا اولین اظہار حضور نے نماز ہی سے کیا تھا، اور کفار سے آپ کی ٹھہریٹ کا آغاز بھی اسی واقعہ سے ہوا تھا۔

رُكُوعَهَا ۱

سُورَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا ۱۹

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۲ اِقْرَأْ
وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۳ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۴ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۵

پڑھو (اسے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے
ایک لوتھرے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے
ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

۱ جیسا کہ ہم نے دیا ہے، فرشتے نے جب حضور سے کہا کہ پڑھو تو حضور نے جواب دیا کہ میں
پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش
کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولنا جاؤں آپ اسی
طرح پڑھنے جائیں، تو حضور کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

۲ یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی
کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپ کا رب کون ہے، بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

۳ مطلقاً "پیدا کیا" فرمایا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اُس رب کا
نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

۴ کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے
اُس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اُسے پورا انسان بنایا۔ علق جمع ہے علقہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی
حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور
اس کے بعد تدریجاً اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،
جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷۔

۵ یعنی یہ اُس کا انتہائی کریم ہے کہ اس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اُس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو
مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا، بلکہ اُس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظِرٌ ۝۱۰
 رَبِّكَ الرَّجُوعِي ۝۱۱ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ۝۱۲ عَبْدًا إِذَا

ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جبکہ

بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی، اور نسلاً بعد نسل اُس کے بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الٹا ہی طور پر انسان کو ظلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھ کر رہ جاتی اور اُسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

۱۱ یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اُسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اُس پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیت الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ دَلَّا يَجْبُطُونَ رَبِّي ۝۱۱ مِّنْ عِلْمِي ۝۱۲ مَا شَاءَ ۝۱۳ اور لوگ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اُس کے جو وہ خود چاہے، (البقرہ - ۲۵۵)۔ جن جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اُسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات میں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپ سے براہ راست مخاطب ہے اس کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اس کے ایک مدت بعد سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپ کو بتایا گیا کہ نبوت پر مامور ہونے کے بعد اب آپ کو کام کیا کرنا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، المدثر، دیا چیم)۔

۱۲ یعنی ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ جس خدائے کریم نے انسان پر اتنا بڑا اکرام فرمایا ہے اس کے مقابلہ میں وہ جمالت برت کر وہ روٹیہ اختیار کرے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۱۳ یعنی یہ دیکھ کر کہ مال، دولت، عزت و جاہ اور جو کچھ بھی دنیا میں وہ چاہتا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا ہے، شکر گزار ہونے کے بجائے وہ سرکشی پر اتر آتا ہے اور حد بندگی سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔

۱۴ یعنی خواہ کچھ بھی اس نے دنیا میں حاصل کر لیا ہو جس کے بل پر وہ تڑا اور سرکشی کر رہا ہے، آخر کار اسے جانا تو تیرے رب ہی کے پاس ہے۔ پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس روشن کا انجام کیا ہوتا ہے۔

صَلَّى ۵ اَرَعَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَيَّ الْهُدَى ۱۱ اَوْ اَمَرَ بِالْتَّقْوَى ۱۲
 اَرَعَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۱۳ اَلَمْ يَعْلَم بِاَنَّ اللّٰهَ يَرَى ۱۴ كَلَّا لَئِنْ
 لَّمْ يَنْتَهُ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۱۵ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۱۶

وہ نماز پڑھتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیزگاری
 کی تلقین کرتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر یہ منع کرنے والا شخص حق کو جھٹلانا اور منہ
 موڑنا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ ہرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی
 پیشانی کے بال پکڑ کر اُسے کھینچیں گے، اُس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کا رہے۔

۱۱ بندے سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس طریقے سے حضور کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات
 پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (بنی اسرائیل - ۱)
 ”پاک ہے وہ جو ہے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف“ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْ عَبْدِہٖ
 الْکِتٰبَ (الکہف - ۱) ”تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی“ وَاِنَّہٗ لَتَا قَامٌ عَبْدًا لِلّٰہِ
 یَدْعُوہٗ کَا دُوۡا یٰکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لَیْلًا (الرحمن - ۱۹) ”اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس
 پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب
 میں اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت
 کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اُس طریقے کا
 ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے کہ اسے نبی تم اس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہذا یہ اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ
 سے آپ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔

۱۲ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے۔ اُس سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے دیکھی اس
 شخص کی حرکت جو خدا کی عبادت کرنے سے ایک بندے کو روکتا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہِ راست پر ہو، یا
 لوگوں کو خدا سے ڈرنے اور برے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہو، اور یہ منع کرنے والا حق کو جھٹلاتا اور اُس سے منہ موڑتا
 ہوا تو اُس کی یہ حرکت کیسی ہے؟ کیا یہ شخص بیروٹس اختیار کر سکتا تھا اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اُس بندے کو بھی دیکھ
 رہا ہے جو نیکی کا کام کرتا ہے اور اس کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کو جھٹلانے اور اُس سے روگردانی کرنے میں لگا ہوا ہے؟ ظالم
 کے ظلم اور مظلوم کی مظلومی کو اللہ تعالیٰ کا دیکھنا خود اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی داد دے گا۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَدَّ الزَّبَانِيَةَ ۝ كَلَّا لَا تَطِعُهُ
وَأَسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝

وہ بلائے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔ ہرگز نہیں اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔

۱۸ یعنی یہ شخص جو دھکی دیتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھیں گے تو وہ ان کی گردن کو پاؤں سے دبا دے گا، یہ ہرگز ایسا نہ کر سکے گا۔

۱۹ پیشانی سے مراد یہاں پیشانی والا شخص ہے۔

۲۰ جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں بیان کیا ہے ابو جہل کے دھکی دینے پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھڑک دیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اسے محمد، تم کس ملی پر مجھے ڈراتے ہو، خلا کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بلائے اپنے حمایتیوں کو۔

۲۱ اصل میں زبانیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو فساد کی تشریح کے مطابق کلام عرب میں پولیس کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور زبانیہ کے اصل معنی دھکا دینے کے ہیں۔ بادشاہوں کے ہاں چوہدری بھی اسی غرض کے لیے ہوتے تھے کہ جس پر بادشاہ ناراض ہوا سے وہ دھکے دے کر نکال دیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے حمایتیوں کو بلائے، ہم اپنی پولیس، یعنی ملائکہ عذاب کو بلا لیں گے کہ وہ اس کی اور اس کے حمایتیوں کی خبر لیں۔

۲۲ سجدہ کرنے سے مراد نماز ہے۔ یعنی اسے نبی، تم بے خوف اسی طرح نماز پڑھتے رہو جس طرح پڑھتے رہے ہو، اور اس کے ذریعہ سے اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ”بندہ سب سے زیادہ اپنے رب سے اس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے“ اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت بھی آئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھتے تھے تو سجدہ تلاوت ادا فرماتے تھے۔



تفسير القرآن

القدس

(٩٤)

القدر

نام | پہلی ہی آیت کے لفظاً القدر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زماضہ نزول | اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابو نعیمان نے البحر المحیط میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ علی بن احمد الواحیدی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورہ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ بخلاف اس کے الماوردی کہتے ہیں کہ اکثر اہل علم کے نزدیک یہ مکی ہے، اور یہی بات امام سیوطی نے ائقان میں لکھی ہے۔ ابن مزدویہ نے ابن عباس، ابن الزبیر اور حضرت عائشہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کو مکہ ہی میں نازل ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ کرنا ہے قرآن مجید کی ترتیب میں اسے سورہ علق کے بعد رکھنے سے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتاب پاک کے نزول کا آغاز سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا تھا اسی کے متعلق اس سورہ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ کس تقدیر سازرات میں نازل ہوئی ہے۔ کیسی جلیل القدر کتاب ہے اور اس کا نزول کیا معنی رکھتا ہے۔

سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا ہے۔ یعنی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس کا نزول ہماری طرف سے شب قدر میں ہوا ہے۔ شب قدر کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ یہ وہ رات ہے جس میں تقدیروں کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کوئی معمولی رات عام راتوں جیسی نہیں ہے، بلکہ یہ قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے کی رات ہے۔ اس میں اس کتاب کا نزول محض ایک کتاب کا نزول نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو نہ صرف قریش، نہ صرف عرب، بلکہ دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دے گا۔ یہی بات سورہ دخان میں بھی فرمائی گئی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، سورہ دخان کا دیا چہ اور عاشیہ ۳)۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ بڑی قدر و منزلت اور عظمت و شرف رکھنے والی رات ہے، اور آگے اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اس سے کفار مکہ کو گویا منبتہ کیا گیا ہے کہ تم اپنی نادمانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی اس کتاب کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہو اور کوس رہے ہو کہ یہ کیا بلا ہم پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ جس رات

کو اس کے نزول کا فیصلہ صادر کیا گیا وہ اتنی خیر و برکت کی رات تھی کہ کبھی انسانی تاریخ کے ہزار صدیوں میں بھی انسان کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا تھا جو اس رات میں کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سورہ دُخان آیت ۳ میں ایک دوسرے طریقے سے بیان کی گئی ہے اور اس سورہ کے دیباچے میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اس رات کو فرشتے اور جنوں نے اپنے رب کے اذن سے بر حکم لے کر نازل ہوتے ہیں جسے سورہ دُخان آیت ۴ میں امر حکیم کہا گیا ہے، اور وہ شام سے صبح تک سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے، یعنی اس میں کسی شرکاء دخل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلے بالآخر بھلائی کے لیے ہوتے ہیں، ان میں کوئی بُرائی مقصود نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوتا ہے تو تیر کے لیے ہوتا ہے نہ کہ شر کے لیے۔

آيَاتُهَا

سُورَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ②

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے ؟

۱۔ اصل الفاظ ہیں اَنْزَلْنَاهُ۔ ہم نے اس کو نازل کیا ہے۔ لیکن بغیر اس کے کہ پہلے قرآن کا کوئی ذکر ہو، اشارہ قرآن ہی کی طرف ہے، اس لیے کہ "نازل کرنا" خود بخود اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔ اور قرآن مجید میں اس امر کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ اگر سیاق کلام یا انداز بیان سے ضمیر کا مرجع خود ظاہر ہو رہا ہو تو ضمیر ایسی حالت میں بھی استعمال کئی جاتی ہے جب کہ اُس کے مرجع کا ذکر پہلے یا بعد میں کیوں نہ کیا گیا ہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۹)۔

یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے، اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے سَنَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ "رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا" (البقرہ - ۱۸۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ رات جس میں پہلی مرتبہ خدا کا فرشتہ غار حراء میں ہی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آیا تھا وہ ماہ رمضان کی ایک رات تھی۔ اس رات کو یہاں شب قدر کہا گیا ہے اور سورہ دخان میں اسی کو مبارک رات فرمایا گیا ہے: إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ۔ ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے" (آیت ۳)۔

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات پورا قرآن حامل وحی فرشتوں کے حوالہ کر دیا گیا، اور پھر واقعات اور حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً ۲۳ سال کے دوران میں جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔ یہ مطلب ابن عباس نے بیان کیا ہے (ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردودہ، بیہقی)۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی۔ یہ امام شعبی کا قول ہے، اگرچہ اُن سے بھی دوسرا قول وہی منقول ہے جو ابن عباس کا اور گزرا ہے۔ (ابن جریر) بہر حال دونوں صورتوں میں بات ایک ہی رہتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نزول کا سلسلہ اسی رات کو شروع ہوا اور یہی رات تھی جس میں سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل کی گئیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی آیات اور سورتیں اللہ تعالیٰ اُسی وقت تصنیف نہیں فرماتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت اسلامی کو کسی واقعہ یا معاملہ میں ہدایت کی ضرورت پیش آتی تھی، بلکہ کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے انزل میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین پر نوع انسانی کی پیدائش، اس میں انبیاء کی بعثت، انبیاء پر نازل کی جانے والی کتابوں، اور تمام

انبیاء کے بعد آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے اور آپ پر قرآن نازل کرنے کا پورا منصوبہ موجود تھا۔ شب قدر میں صرف یہ کام ہوا کہ اس منصوبے کے آخری حصے پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اُس وقت اگر پورا قرآن حاملین وحی کے حوالہ کر دیا گیا ہوتا تو کوئی قابل تعجب امر نہیں ہے۔

قدر کے معنی بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کرتا ہے۔ اس کی تائید سورہ دُخان کی یہ آیت کرتی ہے: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ اُس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے (آیت ۵)۔ بخلاف اس کے امام زہری کہتے ہیں کہ قدر کے معنی عظمت و شرف کے ہیں، یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔ اس معنی کی تائید اسی سورہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ "شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسی رات تھی، تو اس میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب ہم مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں۔ لیکن علماء امت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے، اور ان میں بھی زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اس معاملہ میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا وہ ستائیسویں یا اسیسویں رات ہے (ابوداؤد طیالسی)۔ دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے (مسند احمد)۔

حضرت ابی بن کعب سے زبیر بن جحیش نے شب قدر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے حلفاً کہا اور شہداء نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان)۔

حضرت ابو ذر سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمر، حضرت صدیقہ اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بیت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے (ابن ابی شیبہ)۔

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، یا تیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا اسیسویں، یا آخری (مسند احمد)۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو جب کہ حدیث ختم ہونے میں ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی (بخاری)۔ اکثر اہل علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضور کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابو بکرہ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو (ترمذی، نسائی)۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ هِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنْزِلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ
فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَّمَ هِيَ حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اُس میں اپنے رب کے اذن سے
ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔ ع

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں
سے طاق رات میں تلاش کرو (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی)۔ حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ بھی روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تازست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملہ میں جو روایات حضرت معاویہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی
بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شب قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعیین اللہ اور اس کے
رسول کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ شب قدر کی فضیلت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ
راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت کلمہ معظمہ میں رات ہوتی
ہے اُس وقت دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں دن ہوتا ہے، اس لیے اُن علاقوں کے لوگ تو کبھی شب قدر کو پا ہی نہیں
سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان
کی ان نارتخوں میں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصہ میں ہو اُس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شب قدر
ہو سکتی ہے۔

۱۷ مفسرین نے بالعموم اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عمل خیر ہزار مہینوں کے عمل خیر سے افضل ہے
جس میں شب قدر شمار نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات
کے عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا من قام
لیلة القدر ایماناً و احتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔ جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت
کے لیے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ اور ستاد احمد میں حضرت عبادة بن صامت کی روایت ہے کہ حضور
نے فرمایا کہ شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے، جو شخص ان کے اجر کی طلب میں عبادت کے لیے کھڑا رہا اللہ
اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے گا۔ لیکن آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ العمل فی لیلة القدر خیر من العمل فی الف شهر
(شب قدر میں عمل کرنا ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے) بلکہ فرمایا گیا ہے کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اور
ہزار مہینوں سے مراد بھی گئے ہوئے ۸۳ سال چار مہینے نہیں ہیں بلکہ اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ بڑی کثیر تعداد کا تصور دلانے
کے لیے وہ ہزار کا لفظ بولتے تھے۔ ۲۱۔ یہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک رات میں خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ

کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا۔

۵۱ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کے فضل و شرف کی بنا پر ان کا ذکر فرشتوں سے الگ کیا گیا ہے۔

۵۲ یعنی وہ بطور خود نہیں آتے بلکہ اپنے رب کے اذن سے آتے ہیں۔ اور ہر حکم سے مراد وہی ہے جسے سورۃ

ذخاں آیت ۵ میں امر حکیم (حکیمانہ کام) کہا گیا ہے۔

۵۵ یعنی شام سے صبح تک وہ پوری رات خیر ہی خیر ہے، ہر شر اور فتنے سے پاک۔





الْبَيْتَةُ

البینۃ

نام | پہلی آیت کے لفظ البینۃ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے بھی مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک

یہ مکی ہے اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک مدنی ہے۔ ابن الزبیر اور عطاء بن یسار

کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ ابن عباس اور قتادہ کے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے، دوسرا یہ کہ

مدنی ہے۔ حضرت عائشہ اسے مکی قرار دیتی ہیں۔ ابو سعید خدری اور عبد المنعم ابن الفرس صاحب

احکام القرآن اس کے مکی ہونے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک اس کے مضمون کا تعلق ہے، اس میں

کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جو اس کے مکی یا مدنی ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

موضوع اور مضمون | قرآن مجید کی ترتیب میں اس کو سورہ علق اور سورہ قدر کے بعد رکھنا بت مضمونی خیر

ہے۔ سورہ علق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورہ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی۔ اور اس

سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب پاک کے ساتھ ایک رسول بھیجا کیوں ضروری تھا۔

سب سے پہلے رسول بھیجنے کی ضرورت بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہل

کتاب ہیں۔ سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے اُس سے اُن کا نکلنا اس کے

بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود خود اپنی رسالت پر دلیل روشن ہو، اور وہ لوگوں

کے سامنے خدا کی کتاب کو اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے جو باطل کی اُن تمام آمیزشوں سے

پاک ہو جن سے پچھلی کتب آسمانی کو آلودہ کر دیا گیا ہے اور بالکل راست اور درست تعلیمات پر

مشتمل ہو۔

اس کے بعد اہل کتاب کی گمراہیوں کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ اُن کے ان مختلف راستوں میں

بھٹکنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی، بلکہ وہ اس کے بعد بھٹکے کہ راہ راست

کا بیان واضح اُن کے پاس اچھا تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنی گمراہیوں کے وہ خود ذمہ دار

ہیں، اور اب پھر اللہ کے اس رسول کے ذریعہ سے بیان واضح آجانے کے بعد بھی اگر وہ بھٹکتے ہی رہیں گے

تو اُن کی ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

اسی سلسلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیاء بھی آئے تھے، اور جو کتابیں بھی

بھیجی گئی تھیں، انہوں نے اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا تھا کہ سب طریقوں کو چھوڑ کر خالص اللہ کی بندگی کا طریقہ اختیار کیا جائے، کسی اور کی عبادت و بندگی اور اطاعت و پرستش کو اس کے ساتھ شامل نہ کیا جائے، نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے۔ یہی ہمیشہ سے ایک صحیح دین رہا ہے۔ اس سے بھی یہ نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اس اصل دین سے ہٹ کر اپنے مذہبوں میں جن نئی نئی باتوں کا اضافہ کر لیا ہے وہ سب باطل ہیں، اور اللہ کا یہ رسول جو آپ آیا ہے اسی اصل دین کی طرف پلٹنے کی انہیں دعوت دے رہا ہے۔

آخر میں صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ جو اہل کتاب اور مشرکین اس رسول کو ماننے سے انکار کریں گے وہ بدترین خلائق ہیں، ان کی سزا ابلیسی جہنم ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کا طریقہ اختیار کر لیں گے اور دنیا میں خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے وہ بہترین خلائق ہیں، ان کی جزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔



آيَاتُهَا ۸

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِیْنَ

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے

۱۔ کفر میں مشترک ہونے کے باوجود ان دونوں گروہوں کو دو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس پہلے انبیاء کی لانی ہوئی کتابوں میں سے کوئی کتاب، خواہ تحریف شدہ شکل ہی میں بھی، موجود تھی اور وہ اُسے مانتے تھے۔ اور مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی کے پیرو اور کسی کتاب کے ماننے والے نہ تھے۔ قرآن مجید میں اگرچہ اہل کتاب کے شرک کا ذکر بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ کہتے ہیں اللہ تین خداؤں میں کا ایک ہے (المائدہ - ۷۳)۔ وہ مسیح ہی کو خدا کہتے ہیں (المائدہ - ۱۷)۔ وہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں (التوبہ - ۳۰)۔ اور یہود کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ عزیز کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں (التوبہ - ۳۰)۔ لیکن اس کے باوجود قرآن میں کہیں ان کے لیے ”مشرک“ کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی بلکہ ان کا ذکر اہل کتاب یا الَّذِیْنَ اٰتُوْا الْكِتٰبَ رَجُلًا كُفِرَ بِهِ لَمَّا جَاءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا اَوْ كُفِرَتْ بِهِمْ اَوْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ الْاِسْلَامِ كُفْرًا وَلَئِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَمُشْرِكُونَ (البقرہ - ۱۷۰) کے تحت کیا گیا ہے، کیونکہ وہ اصل دین توحید ہی کو مانتے تھے اور پھر شرک کرتے تھے۔ بخلاف اس کے غیر اہل کتاب کے لیے ”مشرک“ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اصل دین شرک ہی کو قرار دیتے تھے اور توحید کے ماننے سے ان کو قطعی انکار تھا۔ یہ فرق ان دونوں گروہوں کے درمیان صرف اصطلاح ہی میں نہیں بلکہ شریعت کے احکام میں بھی ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال کیا گیا ہے اگر وہ اللہ کا نام لے کر حلال جانور کو صحیح طریقہ سے ذبح کریں، اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس مشرکین کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح حلال۔

۲۔ بیان کفر اپنے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں کفرانہ رویہ کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ مثلاً کوئی اس معنی میں کافر تھا کہ سر سے اللہ ہی کو نہ مانتا تھا۔ کوئی اللہ کو مانتا تھا مگر اسے واحد معبود نہ مانتا تھا بلکہ خدا کی ذات یا خدائی کی صفات و اختیارات میں کسی نہ کسی طور پر دوسروں کو شریک ٹھہرا کر ان کی عبادت بھی کرتا تھا۔ کوئی اللہ کی وحدانیت بھی مانتا تھا مگر اس کے باوجود کسی نوعیت کا شرک بھی کرتا تھا۔ کوئی خدا کو مانتا تھا مگر اس کے بیسوں کو نہیں مانتا تھا اور اُس بدایت کو قبول کرنے کا قائل نہ تھا جو انبیاء کے ذریعہ سہائی ہے۔ کوئی کسی نبی کو مانتا تھا اور کسی دوسرے نبی کا انکار کرتا تھا۔ کوئی آخرت کا منکر تھا۔ غرض مختلف قسم کے کفر تھے جن میں لوگ مبتلا تھے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے“ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ کفر میں مبتلا نہ تھے، بلکہ مطلب یہ ہے

حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲
 فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ ۝۳ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا
 جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ ۝۴ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۝
 حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيمَةِ ۝۵

جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے
 پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس
 (راہ راست کا) بیان واضح آچکا تھا۔ اور ان کو اس کے سوا کوئی علم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی
 کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل بچھو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یہی
 نہایت صحیح و درست دین ہے۔

کہ کفر میں مبتلا ہونے والے دو گروہ تھے۔ ایک اہل کتاب، دوسرے مشرکین۔ یہاں من تبعین کے لیے نہیں بلکہ بیان کے
 لیے ہے۔ جس طرح سورہ حج آیت ۲۴ میں فرمایا گیا فَأَجْتَنَّبُوا الرَّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بتوں کی
 گندگی سے بچو، نہ یہ کہ بتوں میں جو گندگی ہے اُس سے بچو۔ اسی طرح الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ الْمُنِيرِينَ کا مطلب
 بھی یہ ہے کہ کفر کرنے والے جو اہل کتاب اور مشرکین میں سے ہیں، نہ یہ کہ ان دونوں گروہوں میں سے جو لوگ کفر کرنے والے ہیں۔

۵ یعنی ان کے اس حالت کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک دلیل روشن آکر انہیں کفر کی ہر
 صورت کا غلط اور خلاصہ حق ہونا سمجھائے اور راہ راست کو واضح اور مدلل طریقے سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس
 کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس دلیل روشن کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجائے والے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ
 ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں تو ان کا اس حالت سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں سے
 جو لوگ اپنے کفر پر قائم رہیں اُس کی ذمہ داری پھر انہی پر ہے، اس کے بعد وہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ
 نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے
 بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ نمل میں فرمایا وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ، "سیدھا راستہ بنانا اللہ کے ذمہ ہے" (آیت ۹)
 سورہ لیل میں فرمایا إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ "راستہ بنانا ہمارے ذمہ ہے" (آیت ۱۲)۔ اِنَّا اَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا

إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ..... رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ. (اسے نبی) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی..... ان رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا گیا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت نہ رہے۔ (النساء ۱۶۴-۱۶۵)۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ، فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ. (اسے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول حقیقت واضح کرنے کے لیے رسولوں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آ گیا ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا نہ خبردار کرنے والا۔ سو لو اب تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا آ گیا۔ (المائدہ ۱۹)۔

۱۷ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود ایک دلیلِ روشن کہا گیا ہے، اس لیے کہ آپ کی نبوت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپ کا اُتی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپ کا بالکل معقول عقائد، نہایت مستحضر عبادات، کمالِ درجہ کے پاکیزہ اخلاق، اور انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا، اور آپ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا، یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

۱۸ لغت کے اعتبار سے تو صحیفوں کے معنی ہیں ”لکھے ہوئے اوراق“، لیکن قرآن مجید میں اصطلاحاً یہ لفظ انبیاءِ علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور پاک صحیفوں سے مراد ہیں ایسے صحیفے جن میں کسی قسم کے باطل، کسی طرح کی گمراہی و ضلالت، اور کسی اخلاقی گندگی کی آمیزش نہ ہو۔ ان الفاظ کی پوری اہمیت اُس وقت واضح ہوتی ہے جب انسان قرآن مجید کے مقابلے میں بائبل (اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کا بھی) مطالعہ کرتا ہے اور ان میں صحیح باتوں کے ساتھ ایسی باتیں لکھی ہوئی دیکھتا ہے جو حق و صداقت اور عقلِ سلیم کے بھی خلاف ہیں اور اخلاقی اعتبار سے بھی بہت گری ہوئی ہیں۔ اُن کو پڑھنے کے بعد جب آدمی قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی پاک اور مطہر کتاب ہے۔

۱۹ یعنی اس سے پہلے اہل کتاب جو مختلف گمراہیوں میں بھٹک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے اُس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اُن کی رہنمائی کے لیے دلیلِ روشن بھیجنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی، بلکہ یہ روش انہوں نے اللہ کی جانب سے رہنمائی آجانے کے بعد اختیار کی تھی، اس لیے اپنی گمراہی کے وہ خود ذمہ دار تھے، کیونکہ ان پر حجت تمام کی جا چکی تھی۔ اسی طرح اب چونکہ اُن کے صحیفے پاک نہیں رہے ہیں اور ان کی کتابیں بالکل راست اور درست تعلیمات پر مشتمل نہیں رہی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دلیلِ روشن کی حیثیت سے اپنا ایک رسول بھیج کر اور اس کے ذریعہ سے پاک صحیفے بالکل راست اور درست تعلیمات پر مشتمل پیش کر کے ان پر پھر حجت تمام کر دی ہے، تاکہ اس کے بعد بھی اگر وہ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۖ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۗ جَزَاءُ وُجُوهٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۗ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۙ

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اُس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو۔

متفرق رہیں تو اس کی ذمہ داری انہی پر ہو، اللہ کے مقابلہ میں وہ کوئی حجت پیش نہ کر سکیں۔ یہ بات قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۲۱۳-۲۵۲۔ آل عمران، ۱۹۰۔ المائدہ، ۴۴ تا ۵۰۔ یونس، ۹۳۔ الشوریٰ، ۱۳ تا ۱۵۔ الباقیہ، ۶ تا ۱۸۔ اس کے ساتھ اگر وہ حواشی بھی پیش نظر رکھے جائیں جو تفسیر القرآن میں ان آیات پر ہم نے لکھے ہیں تو بات سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔

۷ یعنی جس دین کو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، اسی دین کی تعلیم اہل کتاب کو ان کے ہاں آنے والے انبیاء اور ان کے ہاں نازل ہونے والی کتابوں نے دی تھی، اور ان عقائد باطلہ اور اعمالِ فاسدہ میں سے کسی چیز کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا جنہیں انہوں نے بعد میں اختیار کر کے مختلف مذاہب بنا ڈالے۔ صحیح اور درست دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ خالص اللہ کی بندگی کی جائے، اُس کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی کی آمیزش نہ کی جائے، ہر طرف سے رخ پھیر کر انسان صرف ایک اللہ کا پرستار اور تابع فرمان بن جائے، نماز قائم کی جائے، اور زکوٰۃ ادا کی جائے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۹۔ یونس، حواشی ۱۰۸-۱۰۹۔ جلد سوم، الروم، حواشی

اس آیت میں دین القیمة کے جو الفاظ آئے ہیں ان کو بعض مفسرین نے دین الملة القیمة یعنی "راست رو ملت کا دین" کے معنی میں لیا ہے اور بعض اسے اصناف صفت الی الموصوف قرار دیتے ہیں اور قیمة کی کا کو علامہ اور فہامہ کی طرح مبالغہ کی کا قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں۔

۵۸۔ یہاں کفر سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے اُس رسول کے آجانے کے بعد اُس کو نہیں مانا جس کا وجود خود ایک دلیل روشن ہے اور جو بالکل درست تحریروں پر مشتمل پاک صحیفے اُن کو پڑھ کر سنا رہا ہے، اُن کا انجام وہ ہے جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔

۵۹۔ یعنی خدا کی مخلوقات ہیں اُن سے بذکر کوئی مخلوق نہیں ہے حتیٰ کہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں، کیونکہ جانور عقل اور اختیار نہیں رکھتے، اور یہ غفل اور اختیار رکھتے ہوئے حق سے منہ موڑتے ہیں۔

۶۰۔ یعنی وہ خدا کی مخلوقات ہیں سب سے، حتیٰ کہ ملائکہ سے بھی افضل و اشرف ہیں۔ کیونکہ فرشتے نافرمانی کا اختیار ہی نہیں رکھتے، اور یہ اُس کا اختیار رکھنے کے باوجود فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں۔

اللہ بالفاظ دیگر جو شخص خدا سے بے خوف اور اس کے مقابلہ میں جبری دے باک بن کر نہیں رہا بلکہ دنیا میں قدم قدم پر اس بات سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا کہ کہیں مجھ سے ایسا کوئی کام نہ ہو جائے جو خدا کے ہاں میری پکڑ کا موجب ہو، اس کے لیے خدا کے پاس یہ جزا ہے۔

سُبْحَانَكَ يَا قُدُّوسُ

الَّذِي نَزَّلَ

(۹۹)

الزَّلْزَال

نام | پہلی آیت کے لفظ زُكْرًا لَهَا سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابن مسعود، عطاء، جابر اور مجاہد کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے اور ابن عباس کا بھی ایک قول اس کی تائید کرتا ہے۔ بخلاف اس کے قتادہ اور مقاتل کہتے ہیں کہ یہ مدنی ہے اور ابن عباس سے بھی دوسرا قول اس کے مدنی ہونے کی تائید میں نقل ہوا ہے۔ اس کے مدنی ہونے پر حضرت ابو سعید خدری کی اس روایت سے استدلال کیا جاتا ہے جو ابن ابی حاتم نے اُن سے نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں اپنا عمل دیکھنے والا ہوں؟ حضور نے فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا یہ بڑے بڑے گناہ؟ آپ نے جواب دیا ہاں۔ میں نے عرض کیا اور یہ چھوٹے چھوٹے گناہ بھی؟ حضور نے فرمایا ہاں۔ اس پر میں نے کہا پھر تو میں مارا گیا۔ حضور نے فرمایا خوش ہو جاؤ اسے ابو سعید، کیونکہ ہرنکی اپنے جیسی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ اس حدیث سے اس سورہ کے مدنی ہونے پر استدلال کی بنا یہ ہے کہ حضرت ابو سعید خدری مدینے کے رہنے والے تھے اور غزوہ اُحد کے بعد تن بوع کو پہنچے اس لیے اگر یہ سورہ ان کی موجودگی میں نازل ہوئی تھی، جیسا کہ ان کے بیان سے ظاہر ہے، تو اسے مدنی ہونا چاہیے۔ لیکن صحابہ اور تابعین کا جو طریقہ آیات اور سورتوں کی شان نزول کے بارے میں تھا، اس کی تشریح اس سے پہلے ہم سورہ دہر کے دیا چھے میں کر چکے ہیں۔ اس لیے کسی صحابی کا یہ کہنا کہ یہ آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی، اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ اس کا نزول اُس وقت ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو سعید نے ہوش سنبھالنے کے بعد جب پہلی مرتبہ حضور کی زبان مبارک سے یہ سورہ سنی جو اس وقت اس کے آخری حصے سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے حضور سے وہ سوالات کیے ہوں جو اوپر درج کیے گئے ہیں، اور اس واقعہ کو انہوں نے اس طرح بیان کیا ہو کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضور سے یہ عرض کیا۔ اگر یہ روایت سامنے نہ ہو تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر شخص یہی محسوس کرے گا کہ یہ مکی سورہ ہے، بلکہ اس کے مضمون اور انداز بیان سے تو اس کو یہ محسوس ہو گا کہ یہ مکہ کے بھی اُس ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی جب نہایت مختصر اور انتہائی دل نشین طریقہ سے اسلام کے بنیادی عقائد لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع ہے موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں اُن سب اعمال کا پورا کچا چٹھا انسان کے سامنے آجانا جو اُس نے دنیا میں کیے تھے۔ سب سے پہلے تین مختصر فقروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کس طرح واقع ہوگی اور وہ انسان کے لیے کیسی حیران کن ہوگی۔ پھر دو فقروں میں بتایا گیا ہے کہ یہی زمین جس پر رہ کر انسان نے بے فکری کے ساتھ ہر طرح کے اعمال کیے ہیں، اور جس کے متعلق کبھی اس کے درہم دگمان میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ بے جان چیز کسی وقت اُس کے افعال کی گواہی دے گی، اُس روز اللہ تعالیٰ کے حکم سے بول پڑے گی اور ایک ایک انسان کے متعلق یہ بیان کرے گی کہ کس وقت کہاں اُس نے کیا کام کیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اُس دن زمین کے گوشے گوشے سے انسان گروہ درگروہ اپنے مرقدوں سے نکل نکل کر آئیں گے تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں، اور اعمال کی یہ پیشی ایسی مکمل اور مفصل ہوگی کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ رہ جائے گی جو سامنے نہ آجائے۔

آيَاتُهَا

سُورَةُ الزَّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ

رُكُوعُهَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ②
وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ④ بِإِذْنِ رَبِّكَ أَخْبَرُ

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی، کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم

۱۔ اصل الفاظ ہیں زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا زلزلہ کے معنی پے در پے زور زور سے حرکت کرنے کے ہیں۔ پس زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو جھٹکے پر جھٹکے دے کر شدت کے ساتھ ہلا ڈالا جائے گا۔ اور چونکہ زمین کو ہلانے کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ زمین کا کوئی مقام یا کوئی حصہ یا علاقہ نہیں بلکہ پوری کی پوری زمین ہلا ماری جائے گی۔ پھر اس زلزلے کی مزید شدت کو ظاہر کرنے کے لیے زِلْزَالَهَا کا اُس پر اضافہ کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ”اُس کا ہلایا جانا“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو ایسا ہلایا جائے گا جیسا اُس جیسے عظیم کڑے کو ہلانے کا حق ہے، یا جو اُس کے ہلانے کی انتہائی ممکن شدت ہو سکتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس زلزلے سے مراد وہ پہلا زلزلہ لیا ہے جس سے قیامت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہو گا یعنی جب ساری مخلوق ہلاک ہو جائے گی اور دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جس سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گا، یعنی جب تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ یہی دوسری تفسیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ بعد کا سارا مضمون اسی پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ یہ وہی مضمون ہے جو سورہ انشقاق آیت ۴ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وَالْقَتَّ مَا فِيهَا وَنَحَلَّتْ ”اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی“ اس کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے اُن سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور بعد کا فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہو کر از سر نو اُسی شکل و صورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ یہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ ان کی

پہلی زندگی کے افعال و اقوال اور حرکات و سکنات کی شہادتوں کا جو انبار اُس کی تمہوں میں دبا پڑا ہے اُس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اس پر بعد کا یہ فقرہ دلالت کرتا ہے کہ زمین اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر، اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی ہیں وہ چیزیں جن پر وہ دنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اُس نے قتل کیے، حق داروں کے حقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں فترتیاں کیں، جنگ کے معرکے برپا کیے اور پوری پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اُس کے کسی کام کا نہیں ہے بلکہ اٹا اس کے لیے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔

۳۔ انسان سے مراد ہر انسان بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ زندہ ہو کر موتش میں آتے ہی پہلانا اثر ہر شخص پر یہی ہوگا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے، بعد میں اُس پر یہ بات کھلے گی کہ یہ روزِ حشر ہے۔ اور انسان سے مراد آخرت کا منکر انسان بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس چیز کو وہ غیر ممکن سمجھتا تھا وہ اس کے سامنے برپا ہو رہی ہوگی اور وہ اس پر حیران و پریشان ہوگا۔ رہے اہل ایمان تو ان پر یہ حیرانی و پریشانی طاری نہ ہوگی، اس لیے کہ سب کچھ ان کے عقیدہ و یقین کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایک حدیث اس دوسرے معنی کی تائید سورہ بیہین کی آیت ۵۲ کرتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ اُس وقت منکرینِ آخرت کہیں گے کہ مَنْ بَعَثْنَا مِنْ قَوْمٍ نَا كَس نے ہماری خواب گاہ سے ہمیں اٹھا دیا؟ اور جواب ملے گا هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ یہ وہی چیز ہے جس کا خدا نے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں نے سچ کہا تھا۔ یہ آیت اس معاملہ میں صریح نہیں ہے کہ کافروں کو یہ جواب اہل ایمان ہی دیں گے، کیونکہ آیت میں اس کی تصریح نہیں ہے، لیکن اس امر کا احتمال ضرور ہے کہ اہل ایمان کی طرف سے ان کو یہ جواب ملے گا۔

۴۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر پوچھا "جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا "وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندے کے بارے میں اُس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی" (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، عبد بن حمید، ابن المنذر، حاکم، ابن مردودہ، بیہقی فی الشعب)۔ حضرت ربیعۃ الخزیمی کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا "فران زمین سے سچ کر رہنا کیونکہ یہ تمہاری جڑ بنیاد ہے اور اس پر عمل کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے عمل کی یہ خبر نہ دے خواہ اچھا ہو یا بُرا" (مجموع الطبرانی)۔ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے روز زمین ہر اُس عمل کو لے آئے گی جو اس کی پیٹھ پر کیا گیا ہو" پھر آپ نے یہی آیات تلاوت فرمائیں (ابن مردودہ، بیہقی)۔ حضرت علی کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ بیت المال کا سب روپیہ اہل حقوق میں تقسیم کر کے اُسے خالی کر دیتے تو اس میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر فرماتے "تجھے گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تجھ کو حق کے ساتھ بھرا اور حق ہی کے ساتھ خالی کر دیا"۔

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اوپر گزرے ہوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے

کے آدمی کے لیے تو بڑی حیران کن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی، لیکن آج علوم طبیعی کے اکتشافات اور سینما، لاڈو اور سپرکام
ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات
کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اُس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور
اُن کے فرش اور چھت کے ذرے ذرے میں، اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو اُن سب کے
ذرات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دُبروا سکتا ہے جس
طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اُس وقت سن لے گا کہ یہ اُس کی اپنی ہی آواز ہے۔ اور
اس کے سب جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سن رہے ہیں وہ اسی شخص کی آواز اور اسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے
زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اُس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے
اور اس کی تصویر اُن پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھپ اندھیرے میں بھی اُس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں
موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا، وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں یہ ساری تصویریں
قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندہ گی بھر کس وقت، کہاں
کہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ
عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اُس کی عدالت میں ہر مجرم
انسان کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا جائے گا اُس کو ایسی مکمل شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا کہ اس کے مجرم ہونے میں
کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ سب سے پہلے تو وہ نامہ اعمال ہے جس میں ہر وقت اُس کے ساتھ لگے ہوئے کراٹا کا تین
اس کے ایک ایک قول اور فعل کا ریکارڈ درج کر رہے ہیں (قی، آیات ۱۷-۱۸۔ الانبساط، آیات ۱۰ تا ۱۲)۔ یہ نامہ اعمال
اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ پڑھ اپنا کارنامہ حیات، اپنا حساب لینے کے لیے تو خود کافی
ہے (بنی اسرائیل - ۱۴)۔ انسان اسے پڑھ کر حیران رہ جائے گا کہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اس میں ٹھیک ٹھیک
درج نہ ہو (الکہف - ۴۹)۔ اس کے بعد انسان کا اپنا جسم ہے جس سے اُس نے دنیا میں کام لیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں اُس
کی اپنی زبان شہادت دے گی کہ اُس سے وہ کیا کچھ بولتا رہا ہے، اس کے اپنے ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے کہ ان سے کیا کیا
کام اُس نے لیے (النور - ۲۴)۔ اس کی آنکھیں شہادت دیں گی، اس کے کان شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کیا کچھ
سنا۔ اس کے جسم کی پوری کھال اس کے افعال کی شہادت دے گی۔ وہ حیران ہو کر اپنے اعضا سے کہے گا کہ تم بھی میرے
خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اس کے اعضا جواب دیں گے کہ آج جس خدا کے حکم سے ہر چیز بول رہی ہے اسی کے حکم سے
ہم بھی بول رہے ہیں (خم السجدہ - ۲۰ تا ۲۲)۔ اس پر مزید وہ شہادتیں ہیں جو زمین اور اس کے پورے ماحول سے پیش کی
جائیں گی جن میں آدمی اپنی آواز میں خود اپنے کانوں سے، اور اپنی حرکات کی ہو ہو تصویریں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا
اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ انسان کے دل میں جو خیالات، ارادے اور مقاصد چھپے ہوئے تھے، اور جن نیتوں کے ساتھ

لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝

دیا ہوگا۔ اُس روز لوگ متفرق حالت میں پیش گئے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں۔

اس نے سارے اعمال کیے تھے وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے، جیسا کہ آگے سورہ عادیات میں آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے قطعی اور صریح اور ناقابل انکار ثبوت سامنے آ جانے کے بعد انسان دم بخود رہ جائے گا اور اُس کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کا موقع باقی نہ رہے گا (المہرسلت، آیات ۳۵-۳۶)۔

۵۵ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ایک اکیلا اپنی انفرادی حیثیت میں ہوگا، خاندان، جتنے پارٹیاں، قومیں، سب بکھر جائیں گی۔ یہ بات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس روز لوگوں سے فرمائے گا کہ "لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا" (آیت ۹۴)۔ اور سورہ مریم میں فرمایا یہ "اکیلا ہمارے پاس آنے گا" (آیت ۸۰) اور یہ کہ "ان میں سے ہر ایک قیامت کے روز اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا" (آیت ۹۵)۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جو ہزار ہا برس کے دوران میں جگہ جگہ مرے تھے، زمین کے گوشے گوشے سے گروہ درگروہ چلے آ رہے ہوں گے، جیسا کہ سورہ نباء میں فرمایا گیا "جس روز صور میں پھونک مار دی جائے گی تم فوج در فوج آ جاؤ گے" (آیت ۱۸)۔ اس کے علاوہ جو مطلب مختلف مفسرین نے بیان کیے ہیں ان کی گنجائش لفظاً اُشتاتاً میں نہیں ہے، اس لیے ہمارے نزدیک وہ اس لفظ کے معنوی حدود سے باہر ہیں، اگرچہ بجائے خود صحیح ہیں اور قرآن و حدیث کے بیان کردہ احوال قیامت سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۵۶ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں، یعنی ہر ایک کو بتایا جائے کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کو ان کے اعمال کی جزاء دکھائی جائے۔ اگرچہ یہ دوسرے معنی بھی لیروا اعمالہم کے لیے جاسکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے لیروا جزاء اعمالہم (تاکہ انہیں ان کے اعمال کی جزاء دکھائی جائے) نہیں فرمایا ہے بلکہ لیروا اعمالہم (تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں) فرمایا ہے۔ اس لیے پہلے معنی ہی قابل تریح میں خصوصاً جبکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی تفسیر فرمائی گئی ہے کہ کار و مومن، صالح و فاسق، تابع فرمان اور نافرمان، سب کو ان کے نامہ اعمال ضرور دیے جائیں گے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الحاقہ، آیات ۱۹ و ۲۵ اور الانشقاق، آیات ۱۰، ۱۱)۔ ظاہر ہے کہ کسی کو اُس کے اعمال دکھانے، اور اس کا نامہ اعمال اس کے حوالہ کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علاوہ بریں زمین جب اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات پیش کرے گی تو حق و باطل کی وہ کشمکش جو ابتدا سے برپا ہے اور قیامت تک برپا رہے گی، اُس کا پورا نقشہ بھی سب کے سامنے آ جائے گا، اور اس میں سب ہی دیکھ لیں گے کہ حق کے لیے کام کرنے والوں نے کیا کچھ کیا، اور باطل کی حمایت کرنے والوں نے ان کے مقابلہ میں کیا کیا حرکتیں کیں۔ بعینہ نہیں کہ ہدایت کی طرف بلانے والوں اور ضلالت پھیلانے والوں کی ساری تقریریں اور گفتگوئیں لوگ اپنے کانوں سے سن لیں۔ دونوں طرف کی تحریروں اور لٹریچر کا پورا ریکارڈ ہوں گا تو سب کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے۔ حق پرستوں

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝

پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

پہر ہاٹل پرستوں کے ظلم، اور دونوں گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے معرکوں کے سارے مناظر میدانِ حشر کے حاضرین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

۷۵ اس ارشاد کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی کی کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہیں ہوگی جو اس کے نامٹہ اعمال میں درج ہونے سے رہ گئی ہو، اُسے وہ بہر حال دیکھ لے گا۔ لیکن اگر دیکھنے سے مراد اس کی جزا و سزا دیکھنا یا جانے تو اس کا یہ مطلب لینا بالکل غلط ہے کہ آخرت میں ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی جزا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بدی کی سزا ہر شخص کو دی جائے گی، اور کوئی شخص بھی وہاں اپنی کسی نیکی کی جزا اور کسی بدی کی سزا پانے سے نہ بچے گا۔ کیونکہ اول تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک ایک بڑے عمل کی سزا، اور ایک ایک اچھے عمل کی جزا الگ الگ دی جائے گی۔ دوسرے اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صالح مومن بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کی سزا پانے سے نہ بچے گا اور کوئی بدترین کافر و ظالم اور بدکار انسان بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے اچھے فعل کا اجر پائے بغیر نہ رہے گا۔ یہ دونوں معنی قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہیں، اور عقل بھی اسے نہیں مانتی کہ یہ تقاضائے انصاف ہے۔ عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیسے سمجھ میں آنے کے قابل ہے کہ آپ کا کوئی خادم نہایت وفادار اور خدمت گزار ہو، لیکن آپ اس کے کسی چھوٹے سے قصور کو بھی معاف نہ کریں، اور اس کی ایک ایک خدمت کا اجر و انعام دینے کے ساتھ اس کے ایک ایک قصور کو گن گن کر برابر ایک کی سزا بھی اُسے دے ڈالیں۔ اسی طرح یہ بھی عقلاً ناقابلِ فہم ہے کہ آپ کا پروردہ کوئی شخص جس پر آپ کے بے شمار احسانات ہوں، وہ آپ سے غداری اور بے وفائی کرے اور آپ کے احسانات کا جواب ہمیشہ نمک حرامی ہی سے دیتا رہے، مگر آپ اس کے مجموعی رویے کو نظر انداز کر کے اس کی ایک ایک غداری کی الگ سزا اور اس کی ایک ایک خدمت کی، خواہ وہ کسی وقت پانی لا کر دے دینے یا پلکھا جھل دینے ہی کی خدمت ہو، الگ جزا دیں۔ اب رہے قرآن و حدیث، تو وہ وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومن صالح، مومن خطاکار، مومن ظالم و فاسق، محض کافر، اور کافر مفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کا ایک مفصل قانون بیان کرتے ہیں اور یہ جزا و سزا دنیا سے آخرت تک انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید اصولی طور پر چند باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

اول یہ کہ کافر و مشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے) ضائع کر دیے گئے، آخرت میں

وہ ان کا کوئی اجر نہیں پاسکیں گے۔ ان کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں ان کو مل جائے گا۔ مثال کے طور پر
ملاحظہ ہو الاعراف ۱۲۷۔ التوبہ ۱۷۔ یونس ۶۹۔ ہود ۱۵۔ ابراہیم ۱۸۔ الکہف ۱۰۲۔ النور ۳۹۔ الفرقان ۲۳
الاحزاب ۱۹۔ الزمر ۶۵۔ الاحقاف ۲۰۔

دوم یہ کہ بدی کی سزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہے، مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی، بلکہ
کہیں تشریح ہے کہ بر نیکی کا اجر اس سے ۱۰ گنا ہے، اور کہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کر دے۔
ملاحظہ ہو البقرہ ۲۶۱۔ الانعام ۱۶۰۔ یونس ۲۶۔ ۲۷۔ النور ۳۸۔ القصص ۸۲۔ سبأ ۲۷۔ المؤمن ۲۰۔
سوم یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں گے تو ان کے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔
النساء ۳۱۔ الشوریٰ ۳۷۔ النجم ۳۲۔

چهارم یہ کہ مومن صالح سے بلکا حساب لیا جائے گا، اس کی برائیوں سے درگزر کیا جائے گا اور اس کے بہترین اعمال
کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔ العنکبوت ۷۔ الزمر ۳۵۔ الاحقاف ۱۶۔ الانشاق ۸۔

احادیث بھی اس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔ اس سے پہلے ہم سورۃ انشاق کی تفسیر میں وہ احادیث نقل
کر چکے ہیں جو قیامت کے روز ہلکے حساب اور سخت حساب فہمی کی تشریح کرتے ہوئے حضور نے فرمائی ہیں (تفہیم القرآن،
جلد ششم، الانشاق، حاشیہ ۶)۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکر نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور عرض کیا کہ "یا
رسول اللہ کیا میں اس ذرہ برابر برائی کا نتیجہ دیکھوں گا جو مجھ سے سرزد ہوئی؟" حضور نے فرمایا "اسے ابوبکر دنیا میں جو
معاملہ بھی تمہیں ایسا پیش آتا ہے جو تمہیں ناگوار ہو وہ ان ذرہ برابر برائیوں کا بدلہ ہے جو تم سے صادر ہوں، اور جو ذرہ برابر
نیکیاں بھی تمہاری ہیں انہیں اللہ آخرت میں تمہارے لیے محفوظ رکھ رہا ہے" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی فی الاوسط،
بیہقی فی الشعب، ابن المنذر، حاکم، ابن مرددویہ، عبد بن حمید)۔ حضرت ابوالیوب انصاری سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو شخص نیکی کرے گا اس کی جزا آخرت میں ہے اور جو کسی قسم
کی برائی کرے گا وہ اسی دنیا میں اس کی سزا مصائب اور امراض کی شکل میں بھگت لے گا" (ابن مرددویہ)۔ قتادہ نے حضرت
انس کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا دنیا میں اس کی نیکیوں کے
بدلے وہ رزق دیتا ہے اور آخرت میں ان کی جزا دے گا۔ رہا کافر، تو دنیا میں اس کی بھلائیوں کا بدلہ چکا دیا جاتا ہے،
پھر جب قیامت ہوگی تو اس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی" (ابن جریر)۔ مسروق حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں
کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ عبد اللہ بن جندعان جاہلیت کے زمانہ میں صلہ رحمی کرتا تھا، مسکین
کو کھانا کھلاتا تھا، مہمان نواز تھا، اسروں کو رہائی دلواتا تھا۔ کیا آخرت میں یہ اس کے لیے نافع ہوگا؟ حضور نے فرمایا
نہیں، اس نے مرتے وقت تک کبھی یہ نہیں کہا کہ دَبَّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ، "میرے پروردگار، رزق جزا میں
میری خطا معاف کیجیو" (ابن جریر)۔ اسی طرح کے جوابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اور لوگوں کے بارے

میں بھی دیے ہیں جو جاہلیت کے زمانہ میں نیک کام کرتے تھے، مگر مرے کفر و شرک ہی کی حالت میں تھے۔ لیکن حضور نے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی نیکی اُس جہنم کے عذاب سے تو نہیں بچا سکتی، البتہ جہنم میں اُس کو وہ سخت سزا دی جائے گی جو ظالم اور فاسق اور بدکار کافروں کو دی جائے گی۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ حاتم طائی کی سخاوت کی وجہ سے اُس کو ہلکا عذاب دیا جائے گا (روح المعانی)۔

تاہم یہ آیت انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے، اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، یونہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ اس لیے کسی چھوٹی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اسے چھوڑنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسی بہت سی نیکیاں مل کر اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک بہت بڑی نیکی قرار پا سکتی ہیں، اور کسی چھوٹی سے چھوٹی بدی کا ازکاب بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح کے بہت سے چھوٹے گناہ مل کر گناہوں کا ایک انبار بن سکتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عدی بن حاتم سے یہ روایت منقول ہے کہ حضور نے فرمایا ”دوزخ کی آگ سے بچو خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دینے یا ایک اچھی بات کہنے ہی کے ذریعہ سے ہو“ ابھی حضرت عدی سے صحیح روایت میں حضور کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ”کسی نیک کام کو بھی حقیر نہ سمجھو، خواہ وہ کسی بانی مانگنے والے کے برتن میں ایک ڈول ڈال دینا ہو، یا یہی نیکی ہو کہ تم اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو“ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ حضور نے عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا ”اے مسلمان عورتو، کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہاں کوئی چیز بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے خواہ وہ بکری کا ایک کھڑی کیوں نہ ہو“ مسند احمد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حضور فرمایا کرتے تھے ”اے عائشہ، اُن گناہوں سے بچی رہنا جن کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ کے ہاں ان کی پرستش بھی ہوتی ہے“ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضور نے فرمایا ”خبردار، چھوٹے گناہوں سے بچ کر رہنا، کیونکہ وہ سب آدمی پر جمع ہو جائیں گے یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیں گے“ ”گناہ کبیرہ اور صغیرہ کے فرق کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، النساء، حاشیہ ۵۳۔ جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۳۲۔

٠
عبد المولى

العديت

(١٠٠)

العدیۃ

نام | پہلے ہی لفظ العدیۃ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، جابر بن عبد اللہ، عکرمہ اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے۔ حضرت انس بن مالک اور قتادہ کہتے ہیں کہ مدنی ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سورۃ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن سورۃ کا مضمون اور اندازہ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے، بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا مقصد لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اُس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ لوگوں کو اس بات سے خبردار بھی کرنا ہے کہ آخرت میں صرف اُن کے ظاہری افعال ہی کی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے اسرار تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔

اس مقصد کے لیے عرب میں پھیلی ہوئی اُس عام بد امنی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے سارا ملک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کشت و خون برپا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ قبیلوں پر قبیلے چھا پے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چہن سے نہیں گزار سکتا تھا کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایک ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت لوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ اس صورت حال کی طرف اشارہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں خدا کے حضور جواب دہی سے ناواقف ہو کر انسان اپنے رب کا ناشکر ہو گیا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو ظلم و ستم اور عاریت گری کے لیے استعمال کر رہا ہے، وہ مال و دولت کی محبت میں اندھا ہو کر ہر طریقے سے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ناپاک اور گھناؤنا طریقہ ہو، اور اُس کی حالت خود اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی قوتوں کا غلط استعمال کر کے اس کی ناشکری کر رہا ہے۔ اُس کی یہ روش ہرگز نہ ہوتی اگر وہ اُس وقت کو جانتا ہوتا جب قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا، اور جب وہ ارادے اور وہ اغراض و مقاصد تک دیوں سے نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے جن کی تحریک سے اُس نے دنیا میں طرح طرح کے کام کیے تھے۔ اُس وقت انسانوں کے رب کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور کس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

إِيَّانَهَا ۱۱

سُورَةُ الْعَدِیَّتِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالْعَدِیَّتِ صَبْحًا ۱۱ فَاَلْمُورِیَّتِ قَدْحًا ۱۲ فَاَلْبَغِیَّتِ صَبْحًا ۱۳

فَاَثْرَنَ بِهٖ نَقْعًا ۱۴ فَوْسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۱۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ

قسم ہے اُن (گھوڑوں) کی جو چنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنکاریاں جھاڑتے ہیں، پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں، پھر اس موقع پر گردوغبار اڑاتے ہیں، پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا

۱۱ آیت کے الفاظ میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، بلکہ صرف وَالْعَدِیَّتِ (قسم ہے دوڑنے والوں کی) فرمایا گیا ہے۔ اسی لیے مفسرین کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد کیا ہے۔ صحابہ و تابعین کا ایک گروہ اس طرف گیل ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں، اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں۔ لیکن چونکہ دوڑتے ہوئے وہ خاص قسم کی آواز جسے ضجج کہتے ہیں، گھوڑوں ہی کی شدت تنفس سے نکلتی ہے، اور بعد کی آیات بھی جن میں چنکاریاں جھاڑنے اور صبح سویرے کسی بستی پر چھاپہ مارنے اور وہاں گرد اڑانے کا ذکر آیا ہے، گھوڑوں ہی پر راست آتی ہیں، اس لیے اکثر محققین نے اس سے مراد گھوڑے ہی لیے ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ ”دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابل ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ اونٹ ضجج نہیں کرتا، گھوڑا ہی ضجج کیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُن دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے ضجج کرتے ہیں“ امام رازی کہتے ہیں کہ ”ان آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ ضجج کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی، اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر ٹھوسوں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا، اور اسی طرح صبح سویرے چھاپہ مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعہ سے سہل ہوتا ہے“

۱۲ چنکاریاں جھاڑنے کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ گھوڑے رات کے وقت دوڑتے ہیں، کیونکہ رات ہی کو ان کی ٹاپوں سے ٹھہرنے والے شرارے نظر آتے ہیں۔

۱۳ اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر نہیں چھاپہ مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ دشمن خبردار نہ ہو سکے، اور صبح سویرے اچانک اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آسکے، اور دن اتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔

لَكِنُّودٌ ۝ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذٰلِكَ لِشَهِيدٌ ۝ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝

بڑا ناشکر ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے، اور وہ مال و دولت کی محبت میں بڑی طرح مبتلا ہے۔

۵۵ یہ ہے وہ بات جس پر ان گھوڑوں کی قسم کھانی گئی ہے جو رات کو پھنکار سے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر صبح سویرے بخارا اڑاتے ہوئے کسی بستی پر جا پڑتے ہیں اور مدافعت کرنے والوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں۔ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اکثر مفسرین نے ان گھوڑوں سے مراد غازیوں کے گھوڑے لیے ہیں اور جس مجمع میں ان کے جا گھسنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد ان کے نزدیک کفار کا مجمع ہے۔ حالانکہ یہ قسم اس بات پر کھانی گئی ہے کہ ”انسان اپنے رب کا بڑا ناشکر ہے“ اب یہ ظاہر ہے کہ جماد فی سبیل اللہ میں غازیوں کے گھوڑوں کی دوڑ دھوپ اور کفار کے کسی مجمع پر ان کا ٹوٹ پڑنا اس امر پر کوئی دلالت نہیں کرتا کہ انسان اپنے رب کا ناشکر ہے، اور نہ بعد کے یہ فقرے کہ انسان اپنی اس ناشکری پر خود گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبت میں بڑی طرح مبتلا ہے، ان لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس سورہ کی ابتدائی پانچ آیات میں جو تمہیں کھانی گئی ہیں ان کا اشارہ دراصل اس عام کشت و خون اور غارت گری کی طرف ہے جو عرب میں اس وقت برپا تھی۔ جاہلیت کے زمانے میں رات ایک بہت لمبائی کی چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نہ معلوم کون سا دشمن ان پر چڑھائی کرنے کے لیے آ رہا ہو، اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ رات خیریت سے گزر گئی۔ وہاں قبیلوں کے درمیان محض انتقامی لڑائیاں ہی نہیں ہوتی تھیں، بلکہ مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اس غرض کے لیے بھی چھا پے مارتے رہتے تھے کہ ان کی دولت لوٹ لیں، ان کے مال مویشی ہانک لیں، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیں۔ اس ظلم و ستم اور غارت گری کو جو زیادہ تر گھوڑوں پہ سوار ہو کر ہی کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکر ہے۔ یعنی جس طاقت کو وہ جنگ و جدل اور غارت گری میں استعمال کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس لیے تو نہیں دی تھی کہ اس سے یہ کام لیا جائے۔ پس درحقیقت یہ بہت بڑی ناشکری ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے ان وسائل اور اس کی بخشی ہوئی ان طاقتوں کو اس نسانی الارض میں استعمال کیا جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

۵۶ یعنی اس کا ضمیر اس پر گواہ ہے، اس کے اعمال اس پر گواہ ہیں، اور بہت سے کافر انسان خود اپنی زبان سے غلابہ ناشکری کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک خدا ہی سر سے موجود نہیں کجا کہ وہ اپنے اوپر اس کی کسی نعمت کا اعتراف کریں اور اس کا شکر اپنے ذمے لازم سمجھیں۔

۵۶ اصل الفاظ میں وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا کہ ”وہ خیر کی محبت میں بہت سخت ہے“ لیکن عربی زبان میں خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ مال و دولت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۱۸۰ میں خیر یعنی مال و دولت ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ بات کلام کے موقع و محل سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں خیر کا لفظ نیکی کے معنی میں ہے اور کہاں مال و دولت کے معنی میں۔ اس آیت کے سابق و سابق سے خود ہی یہ ظاہر ہو رہا ہے

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعِثَ مَا فِي الْقُبُورِ ۖ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۖ
 إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝

تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اُسے نکال لیا جائے گا، اور
 سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی، یقیناً اُن کا رب
 اُس روز اُن سے خوب باخبر ہوگا۔

کہ اس میں خیرِ مال و دولت کے معنی میں ہے نہ کہ بھلائی اور نیکی کے معنی میں، کیونکہ جو انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور اپنے
 طرزِ عمل سے خود اپنی ناشکری پر شہادت دے رہا ہے، اُس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نیکی اور بھلائی کی محبت
 میں بہت سخت ہے۔

۷ یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے وہاں سے اُن کو نکال کر زندہ انسانوں
 کی شکل میں اٹھایا جائے گا۔

۸ یعنی دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار اور ہیبتی افعال کے پیچھے جو
 باطنی محرکات Motives چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیتے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کی جائے گی
 کو الگ اور برائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر فیصلہ مرنے کا ہی کو دیکھ کر میں لیا جائے گا کہ انسان نے عمل
 کیا کچھ کیا، بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو جو کام انسان نے اپنے دوسرے سے اور
 کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصافِ خداوندی عدالت
 کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے لادینی قوا میں بھی اصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری
 فعل کی بنا پر اُسے سزا دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اُس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے
 پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان
 کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرکات کارفرما رہے ہیں ان کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنے
 کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اُس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ
 دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز ان رازوں کو کھول کر ظاہر سامنے
 رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دکھا دیا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ اسی لیے
 حُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تحصیل کے معنی کسی چیز کو نکال کر باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً پھینکا
 اتار کر مغز نکالنا، اور مختلف قسم کی چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہذا دلوں

میں چھپے ہوئے اسرار کی تحصیل میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ اُن کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی، اور ان کو چھپانٹ کر بُرائی اور کھلائی کو الگ کر دینا بھی۔ یہی مضمون سورۃ طارق میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ **يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ**۔ ”جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی“ (آیت ۹)۔

۵۹ یعنی اُس کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا ہے اور کس سزا یا جزا کا مستحق ہے۔



نصير

القرية

(١٠١)



القارعة

نام | پہلے لفظ القارعة کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں سارا ذکر قیامت ہی کا ہے۔

زبانہ نزول | اس کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع ہے قیامت اور آخرت۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ کہہ کر چو نکایا گیا ہے کہ عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ اس طرح سامعین کو کسی ہولناک واقعہ کے پیش آنے کی خبر سننے کے لیے تیار کرنے کے بعد دو فقروں میں ان کے سامنے قیامت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے کہ اُس روز لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اس طرح ہر طرف بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، اور پاٹروں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، ان کی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ دھنکے ہوئے اون کی طرح ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب لوگوں کا حساب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی تو اُس میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس شخص کے نیک اعمال بڑے اعمال سے زیادہ وزنی ہیں، اور کس کے نیک اعمال کا وزن اس کے برے اعمال کی بہ نسبت ہلکا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو وہ عیش نصیب ہوگا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، اور دوسری قسم کے لوگوں کو اُس گہری کھاٹی میں پھینک دیا جائے گا جو آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

سُورَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۝ ۱۱ ۝ اِيَاتُهَا ۝ ۱۱ ۝ زَكَوٰتُهَا ۝

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 الْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳
 یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ
 کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْثِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهُ ۝۶ فَهُوَ
 فِیْ عِیْشَةٍ رَّاٰیۡۤیَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهُ ۝۸
 فَاَمَّهُ هَآوِیَةٌ ۝۹ وَمَا اَدْرٰکَ مَا هِیَ ۝۱۰ نَارٌ حَامِیَةٌ ۝۱۱

عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ پھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ رنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے۔ پھر جس کے پڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

۱۱ اصل میں لفظ قارعة استعمال ہوا ہے جن کا لفظی ترجمہ ہے ”ٹھونکنے والی“ قرع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز پر زور سے مارنے کے ہیں جس سے سخت آواز نکلے۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے قارعة کا لفظ ہولناک حادثے اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں قَرَعْتُمُ الْقَارِعَةَ یعنی فلاں قبیلے یا قوم کے لوگوں پر سخت آفت آگئی ہے۔ قرآن مجید میں بھی ایک جگہ یہ لفظ کسی قوم پر بڑی مصیبت نازل ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورہ رعد میں ہے وَکَا یَزَالُ الذِّیْنَ کَفَرُوْا نُصِبْنٰهُمْ سَمًا صَنَعُوْا قَارِعَةً۔ ”جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے“ (آیت ۳۱)۔ لیکن یہاں القارعة کا لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور سورہ الحاقة میں بھی قیامت کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے (آیت ۴)۔ اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب و ثواب کے آخری مرحلے تک پورے عالم آخرت کا ایک جا ذکر ہو رہا ہے۔

۱۲ یہاں تک قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ یعنی جب وہ حادثہ عظیم برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا

نظام درہم درہم ہو جائے گا اُس وقت لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ منتشر ہوتے ہیں، اور ہاٹ رنگ، برنگ کے ڈھنگے ہوئے دن کی طرح اڑنے لگیں گے۔ رنگ برنگ کے دن سے ہاٹوں کو تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ اُن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

۱۲۔ یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے جب دوبارہ زندہ ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔

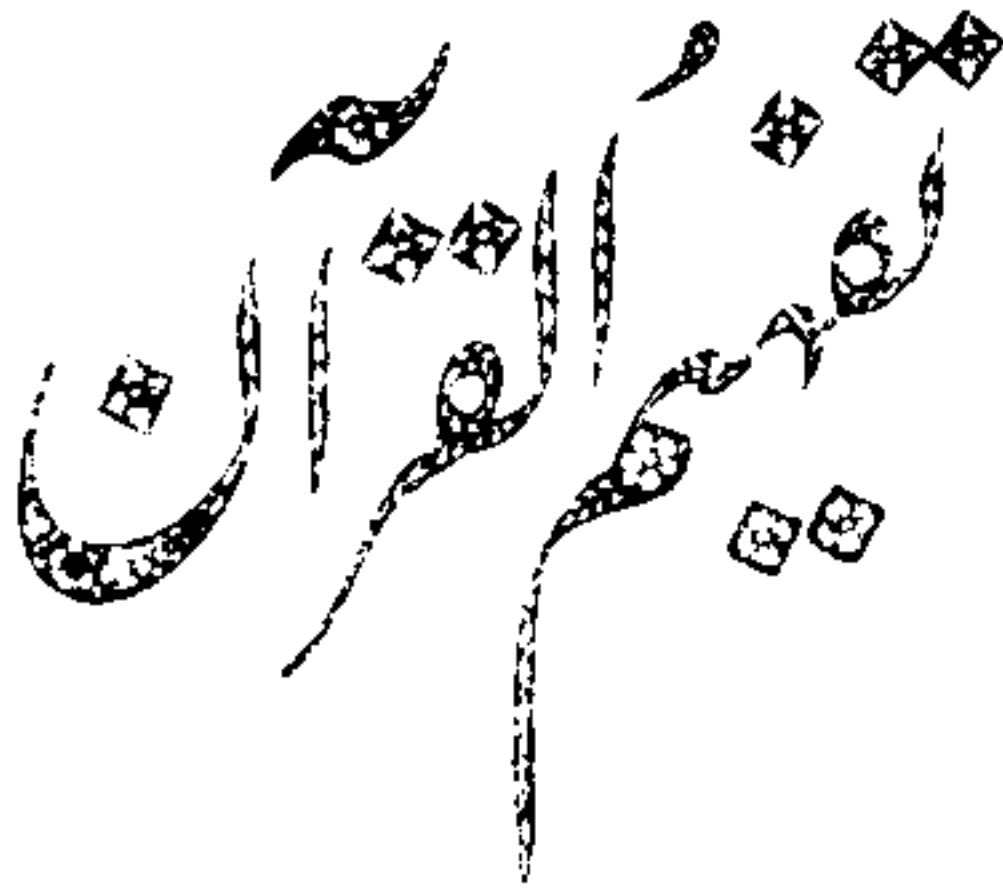
۱۳۔ اصل میں لفظ موازین استعمال ہوا ہے جو موزون کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور میزان کی جمع بھی۔ اگر اس کو موزون کی جمع قرار دیا جائے تو موازین سے مراد وہ اعمال ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وزن ہو، جو اس کے ہاں کسی قدر کے مستحق ہوں۔ اور اگر اسے میزان کی جمع قرار دیا جائے تو موازین سے مراد ترازو کے پلڑے ہوں گے۔ پہلی صورت میں موازین کے بھاری اور ہلکے ہونے کا مطلب نیک اعمال کا برے اعمال کے مقابلے میں بھاری یا ہلکا ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف نیکیاں ہی وزنی اور قابل قدر ہیں۔ دوسری صورت میں موازین کے بھاری ہونے کا مطلب اللہ جل شانہ کی میزانِ عدل میں نیکیوں کے پلڑے کا براٹیوں کے پلڑے کی بہ نسبت زیادہ بھاری ہونا ہے، اور اُن کے ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بھلائیوں کا پلڑا براٹیوں کے پلڑے کی بہ نسبت ہلکا ہو۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے محاورے میں میزان کا لفظ وزن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس معنی کے لحاظ سے وزن کے بھاری اور ہلکا ہونے سے مراد بھلائیوں کا وزن بھاری یا ہلکا ہونا ہے۔ بہر حال موازین کو خواہ موزون کے معنی میں لیا جائے، یا میزان کے معنی میں، یا وزن کے معنی میں، تدعا ایک ہی رہتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ آدمی اعمال کی جو پونجی لے کر آیا ہے وہ وزنی ہے، یا بے وزن، یا اس کی بھلائیوں کا وزن اُس کی براٹیوں کے وزن سے زیادہ ہے یا کم۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے جن کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے "اور وزن اُس روز حق ہوگا، پھر جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے، اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسار سے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے" (آیات ۸-۹)۔ سورہ کہف میں ارشاد ہوا "اے نبی ان لوگوں سے کہو، کیا تم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے" (آیات ۱۰۴-۱۰۵)۔ سورہ انبیاء میں فرمایا "قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تو لےنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم نے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں" (آیت ۴۷)۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ کفر اور حق سے انکار بچائے خود اتنی بڑی بُرائی ہے کہ وہ براٹیوں کے پلڑے کو لازماً جھکا دے گی اور کافر کی کوئی نیکی ایسی نہ ہوگی کہ بھلائیوں کے پلڑے میں اُس کا کوئی وزن ہو جس سے اُس کی نیکی کا پلڑا جھک سکے۔ البتہ مومن کے پلڑے

میں ایمان کا وزن بھی ہوگا اور اس کے ساتھ اُن نیکیوں کا وزن بھی جو اس نے دنیا میں کیں۔ دوسری طرف اُس کی جو بدی بھی ہوگی وہ بدی کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ آیا نیکی کا پلڑا اٹھکا ہوا ہے یا بدی کا۔

۵۵ اصل الفاظ ہیں اُمَّةٌ هَاوِيَةٌ ”اُس کی ماں حاویہ ہوگی“ حاویہ صوی سے ہے جس کے معنی اونچی جگہ سے نیچی جگہ گرنے کے ہیں، اور حاویہ اِس گہرے گڑھے کے لیے بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز گرے۔ جہنم کو حاویہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ بہت عمیق ہوگی اور اہل جہنم اس میں اور پر سے پھینکے جائیں گے۔ رہا یہ ارشاد کہ اس کی ماں جہنم ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماں کی گود بچے کا ٹھکانا ہوتی ہے، اسی طرح آخرت میں اہل جہنم کے لیے جہنم کے سوا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔

۵۶ یعنی وہ محض ایک گہری کھائی ہی نہ ہوگی بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔





الشكر

(١٠٢)



التکاثر

نام | پہلی آیت کے لفظ التکاثر کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | ابوخیان اور شوکانی کہتے ہیں کہ یہ تمام مفسرین کے نزدیک مکی ہے۔ اور امام سیوطی کا قول ہے کہ مشہور ترین بات یہی ہے کہ یہ مکی ہے، لیکن بعض روایات ایسی ہیں جن کی بنا پر اسے مدنی کہا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

ابن ابی حاتم نے ابو بکر صدیق کی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورۃ انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی الحارث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کے مفاخر بیان کیے، پھر قبرستان جا کر اپنے اپنے مرے ہوئے لوگوں کے مفاخر پیش کیے۔ اس پر یہ ارشاد الہی نازل ہوا کہ اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ لیکن شان نزول کے بارے میں صحابہ و تابعین کا جو طریقہ تھا، اُس کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو یہ روایت اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ سورۃ تکاثر اسی موقع پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے اس فعل پر یہ سورۃ چسپاں ہوتی ہے۔

امام بخاری اور ابن جریر نے حضرت اُبی بن کعب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو کہ لو ان لابن آدم وادیین من مال لتمشی وادیا ثلثا وکلائملا جوف ابن آدم اکتا الترابا اگر آدم زاد کے پاس دو وادیاں بھر کر مال ہو تو وہ تیسری وادی کی تمنا کرے گا۔ ابن آدم کا پیٹ مٹی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھر سکتا، قرآن میں سے سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ نازل ہوئی۔" اس حدیث کو سورۃ تکاثر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ حضرت اُبی مدینے میں مسلمان ہوئے تھے۔ مگر حضرت اُبی کے اس بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ صحابہ کرام کس معنی میں حضور کے اس ارشاد کو قرآن میں سے سمجھتے تھے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اسے قرآن کی ایک آیت سمجھتے تھے تو یہ بات ماننے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ صحابہ کی عظیم اکثریت اُن اصحاب پر مشتمل تھی جو قرآن کے حرف وادب سے واقف تھے، ان کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو سکتی تھی کہ یہ حدیث قرآن کی ایک آیت ہے۔ اور اگر قرآن میں سے ہونے کا مطلب قرآن سے ماخوذ ہونا یا جائے تو اس روایت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جو اصحاب داخل اسلام ہوئے تھے انہوں نے جب پہلی مرتبہ حضور کی زبان مبارک سے یہ سورۃ سنی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے، اور پھر حضور کے مذکورہ بالا ارشاد کے متعلق اُن



کو یہ خیال ہوا کہ وہ اسی سورۃ سے ماخوذ ہے۔

ابن جریر، ترمذی اور ابن المنذر وغیرہ محدثین نے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ہم عذاب قبر کے بارے میں برابر شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ اللہم التکاثر نازل ہوئی۔ اس کو سورۃ تکاثر کے مدنی ہونے کی دلیل اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ عذاب قبر کا ذکر مدینے ہی میں ہوا تھا، مگر میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ قرآن کی مکی سورتوں میں بکثرت مقامات پر قبر کے عذاب کا ایسے صریح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوا لانعام، آیت ۹۳، النحل، ۲۸۔ المؤمنون ۹۹۔ ۱۰۰۔ المؤمن ۴۵۔ ۴۶۔ یہ سب مکی سورتیں ہیں۔ اس لیے حضرت علیؑ کے ارشاد سے اگر کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا مکی سورتوں کے نزول سے پہلے سورۃ تکاثر نازل ہو چکی تھی، اور اُس کے نزول نے عذاب قبر کے بارے میں صحابہ کے شک کو دور کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان روایات کے باوجود مفسرین کی عظیم اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے۔ ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ مکی سورۃ ہے، بلکہ اس کا مضمون اور انداز بیان یہ بتا رہا ہے کہ یہ کئے کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس میں لوگوں کو اُس دنیا پرستی کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ مال و دولت، اور دنیوی فائدے اور لذتیں اور جاہ و اقتدار حاصل کرنے اور اُس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے، اور انہی چیزوں کے حصول پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں، اور اس ایک فکر نے اُن کو اس قدر منہمک کر رکھا ہے کہ انہیں اس سے بالاتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اس کے برے انجام پر متنبہ کرنے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں جن کو تم یہاں بے فکرانہ کے ساتھ سمیٹ رہے ہو، یہ محض نعمتیں ہی نہیں ہیں بلکہ تمہاری آزمائش کا سامان بھی ہیں۔ ان میں سے ہر نعمت کے بارے میں تم کو آخرت میں جواب دہی کرنی ہوگی۔



آيَاتُهَا ۸

سُورَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْهٰكِمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② كَلَّا سَوْفَ

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گو تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں غمگین

۱۔ اصل میں اَلْهٰكِمُ التَّكَاثُرُ فرمایا گیا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ ایک پوری عبارت میں بمشکل اس

کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اَلْهٰكِمُ لَبُو سے ہے جس کے اصل معنی غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اُس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں مُتَمَهِّک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اس مادے سے جب اَلْهٰكِمُ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی لہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا، جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اُسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اس انسانک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

تکاثُر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

پس اَلْهٰكِمُ التَّكَاثُرُ کے معنی ہوئے تکاثر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اُس کی دُھن نے تمہیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْهٰكِمُ میں کس چیز سے غافل ہو جانا زیادہ ہے، اور اَلْهٰكِمُ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ اس عدم تصریح کی وجہ سے ان الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثر کے معنی محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع شاملین عیش، اسباب لذت، اور وسائل قوت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جہد کرنا، ان کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں ان کی کثرت پر فخر جتانا اُس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اَلْهٰكِمُ کے مخاطب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اُس کے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے، اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار

تَعْلَمُونَ ۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ
الْيَقِينِ ۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۷
ثُمَّ لَتَسْأَلَنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۸

تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوئے (تو تمہارا یہ طریقہ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔ ع

ہے اور اقوام پر بھی۔ اسی طرح اَنفَعَكُمُ التَّكَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثر نے لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اُس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس تکاثر کی دُھن نے ہر اُس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ حق داروں کے حقوق اور ان کی ادائیگی کے معاملہ میں اپنے فرائض سے غافل ہو گئے ہیں۔ انہیں معیار زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ امت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ انہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اس ہوس مافی میں غرق ہو کر وہ اس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اس روش کا انجام کیا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اس معاملہ میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اس بات کی فکر انہیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سر و سامان ہے۔ غرض تکاثر کی بے شمار صورتیں ہیں جنہوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ انہیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔

۳ یعنی تم اپنی ساری عمر اسی کوشش میں کھیلا دیتے ہو اور مرتے دم تک یہ فکر تمہارا ہی چھینا نہیں چھوڑتی۔

۴ یعنی تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاع دنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے، عنقریب اس کا ہر انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لو گے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس بستی کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے، اس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت

یسی ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے، اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کھل جائے گی کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے وہ اس کے لیے سعادت و خوش بختی کا ذریعہ بنے یا بد بختی کا ذریعہ۔

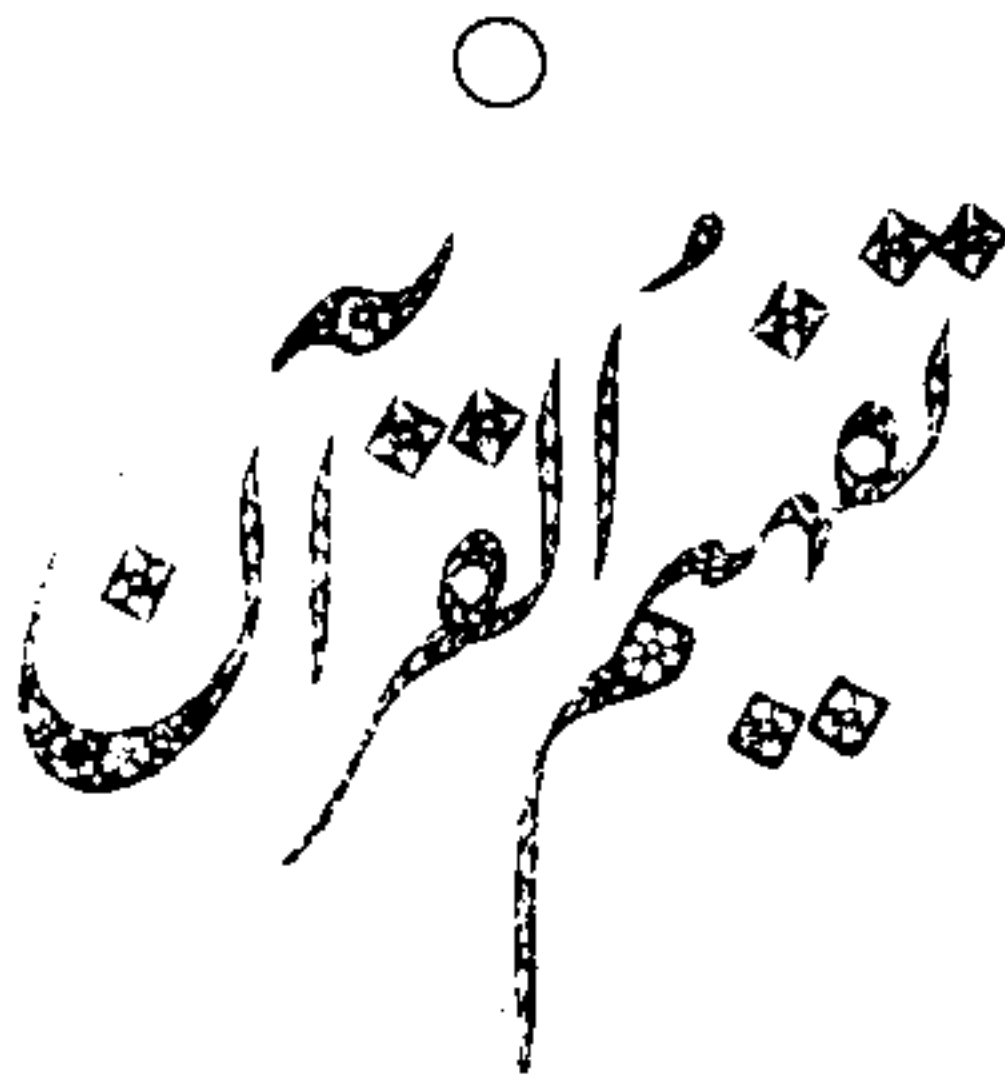
۷۷ اس فقرے میں ”پھر“ کا لفظ اس معنی میں نہیں ہے کہ دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جواب طلبی کی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر یہ خبر بھی ہم تمہیں دیے دیتے ہیں کہ تم سے ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سوال عدالت الہی میں حساب لینے کے وقت ہو گا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بندوں کو دی ہیں ان کے بارے میں جواب دہی مومن و کافر سب ہی کو کرنی ہو گی۔ یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں نے کفرانِ نعمت نہیں کیا اور شکر گزار بن کر رہے وہ اس محاسبہ میں کامیاب رہیں گے، اور جن لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا اور اپنے قول یا عمل سے یا دونوں سے ان کی ناشکری کی وہ اس میں ناکام ہوں گے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہم نے آپ کو ترونازہ کھجوریں کھلائیں اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر حضور نے فرمایا ”یہ ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا“ (مسند احمد، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ، عبد بن حمید، بیہقی فی الشعب)۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے کہا کہ چلو ابوالہثم بن الیہمان انصاری کے ہاں چلیں۔ چنانچہ ان کو لے کر آپ ابن الیہمان کے نخلستان میں تشریف لے گئے۔ انہوں نے لاکھ کھجوروں کا ایک خوشہ رکھ دیا۔ حضور نے فرمایا تم خود کیوں نہ کھجوریں توڑ لائے؟ انہوں نے عرض کیا، میں چاہتا تھا کہ آپ حضرات خود چھانٹ چھانٹ کر کھجوریں تناول فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے کھجوریں کھائیں اور ٹھنڈا پانی پیا۔ غایب ہونے کے بعد حضور نے فرمایا ”اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ ان نعمتوں میں سے ہے جن کے بارے میں تمہیں قیامت کے روز جواب دہی کرنی ہو گی، یہ ٹھنڈا سایہ، یہ ٹھنڈی کھجوریں، یہ ٹھنڈا پانی، اس قصے کو مختلف طریقوں سے مسلم، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن جریر اور ابویعلیٰ وغیرہم نے حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے جن میں سے بعض میں ان انصاری بزرگ کا نام لیا گیا ہے اور بعض میں صرف انصاری سے ایک شخص لیا گیا ہے۔ اس قصے کو مختلف طریقوں سے متعدد تفصیلات کے ساتھ ابن ابی حاتم نے حضرت عمر سے، اور امام احمد نے ابوعبیب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سے نقل کیا ہے۔ ابن حبان اور ابن مردویہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوالیوب انصاری کے ہاں پیش آیا تھا۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوال صرف کفار ہی سے نہیں، مومنین صالحین سے بھی ہو گا۔ رہیں خدا کی وہ نعمتیں جو اُس نے انسان کو عطا کی ہیں، تو وہ لا محدود ہیں، اُن کا کوئی شمار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں کہ انسان کو اُن کی خبر بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ ”وَرَأَى تَعْدًا وَنِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا“ ”اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم اُن کا پورا شمار نہیں کر سکتے“ (ابراہیم ۲۴)۔ ان نعمتوں میں سے بے حد حساب نعمتیں تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ

نے براہ راست انسان کو عطا کی ہیں، اور بکثرت نعمتیں وہ ہیں جو انسان کو اُس کے اپنے کسب کے ذریعہ سے دی جاتی ہیں۔ انسان کے کسب سے حاصل ہونے والی نعمتوں کے متعلق اُس کو جواب دہی کرنی پڑے گی کہ اس نے ان کو کن طریقوں سے حاصل کیا اور کن راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی براہ راست عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں اُسے حساب دینا ہو گا کہ اُن کو اُس نے کس طرح استعمال کیا۔ اور مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے متعلق اُس کو بتانا پڑے گا کہ آیا اُس نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ یہ نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں اور ان پر دل نہ بان، اور عمل سے اُس کا شکر ادا کیا تھا؟ یا یہ سمجھا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے اتفاقاً مل گیا ہے؟ یا یہ خیال کیا تھا کہ بہت سے خدا ان کے عطا کرنے والے ہیں؟ یا یہ عقیدہ رکھا تھا کہ یہ ہیں تو خدا ہی کی نعمتیں مگر ان کے عطا کرنے میں بہت سی دوسری ہستیوں کا بھی دخل ہے اور اس بنا پر انہیں معبود ٹھہرایا تھا اور انہی کے شکر یہ ادا کیے تھے؟



العصر

(١٠٣)

العصر

نام | پہلی آیت کے لفظ العصر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اگرچہ مجاہد، قتادہ اور مقاتل نے اسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اسے مکی قرار دیتی ہے۔ اور اس کا مضمون بہ شہادت دیتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سننے والے ایک دفعہ ان کو سس کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں، اور وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون | یہ سورۃ جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر چند چھپتے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس میں بالکل دلوک طریقہ سے بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعی نے بہت صحیح کہا ہے کہ اگر لوگ اس سورۃ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابہ کرام کی نگاہ میں اس کی اہمیت کیا تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر الداری ابو بکرؓ کی روایت کے مطابق اصحاب رسول اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملنے تو اس وقت تک جدانہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ عصر نہ سنالیتے (طبرانی)۔

آيَاتُهَا ۳ سُورَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ رُكُوْعَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالْعَصْرِ ۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۲ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَتَوَّصَّوْا بِالْحَقِّ ۳ وَتَوَّصَّوْا بِالصَّبْرِ ۴

زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

۱۔ اس سورۃ میں زمانے کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان - (۲) عمل صالح - (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا - (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ اس کے ایک ایک جز کو الگ لے کر اس پر غور کرنا چاہیے تاکہ اس ارشاد کا پورا مطلب واضح ہو جائے۔

جہاں تک قسم کا تعلق ہے، اس سے پہلے بارہا ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اُس کی عظمت یا اُس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے، بلکہ اس بنا پر کھائی ہے کہ وہ اُس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔ پس زمانے کی قسم کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن میں یہ چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔

زمانے کا لفظ گزیرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی جس میں حال و حقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر اُن گزیرے کو ماضی بنتی چلی جا رہی ہے، اور ہر اُن کو مستقبل کو حال اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے دونوں طرح کے زمانے اُس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزیرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے، اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اُس کی مثال اُس وقت کی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ فقوٹری دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ

جیسا ہی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے، اور خدا کی خلقی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ نہا ہم اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے، اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا بُرا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں سب کچھ اُس محدود مدتِ عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازی نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ ”میں نے سورہ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے، رحم کرو اُس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے۔ اُس کی یہ بات سن کر میں نے کہا یہ ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكْفُورٌ۔ مطلب عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اِس کو اگر ضائع کیا جائے، یا غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔ واپس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اِس سورہ میں کہی گئی ہے، اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مُہلتِ عمر کو صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اُس طالب علم سے جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرتے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، مگر س کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت بتا رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالب علم ہے جو اِس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے، لیکن بعد کے فقرے میں اُس سے اُن لوگوں کو تشبیہ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متصف ہوں، اِس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اسم جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اُس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام، اور پوری نوعِ انسانی پر کیا ہوتا ہے۔ پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہوگا۔ خواہ اُن سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم، یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ نہ ہر انسان کے لیے مُہلت ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ ہر حال مُہلت ہے خواہ ایک فرد اِس کو کھائے، یا ایک پوری قوم، یا ساری دنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں۔ نہ ہر کی مُہلت خاصیت اپنی جگہ اُٹل ہے، اُس میں اِس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اِس کو کھا یا ہے، یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے، یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اِس پر ہو گیا ہے کہ نہ ہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اِسی طرح یہ بات اپنی جگہ اُٹل ہے کہ چار مذکورہ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اِس قاعدہ کلیہ میں اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص اُن سے خالی ہے، یا کسی قوم نے، یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بد عملی، اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگیِ نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خسارے کا لفظ قرآن مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے خسارہ نفع کی ضد ہے، اور تجارت میں اِس لفظ کا استعمال اُس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں کھانا آئے، اور اُس حالت میں بھی جب

سارا کار و بار گھاٹے میں جا رہا ہو، اور اُس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے۔ قرآن مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے، اور جس طرح اُس کا تصور فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے، اسی طرح اُس کا تصور خسار بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر حاوی ہے۔ فلاح اور خسار، دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں اس لیے اُن کے اعادے کی حاجت نہیں ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الأعراف، حاشیہ ۹۔ الأنفال، حاشیہ ۳۰۔ یونس، حاشیہ ۲۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۔ المؤمنون، حواشی ۱-۲-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۲۔ الزمر، حاشیہ ۲۴)۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لی جاوے کہ اگرچہ قرآن کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی، اور حقیقی خسار وہاں اُس کی ناکامی ہے، لیکن اس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اُس کا انجام خود اسی دنیا میں خسار ہے، اور جس چیز کو لوگ خسار سمجھتے ہیں وہ دراصل خسار نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ہر جگہ ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، مريم، حاشیہ ۵۳، طہ، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد ششم، ایل، حواشی ۳-۵)۔ پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ ”در حقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے“ تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسب ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں، تو اس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اس سورۃ کی رو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض نہانی اقرار ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳، المائدہ، آیت ۵۴، الأنفال، آیت ۲۰، التوبہ، آیت ۳۸، اور الصف، آیت ۲ میں)، لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے، اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ لغت میں اَمَّنَ لَهُ کے معنی ہیں صَدَقَهُ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ (اس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا)، اور اَمَّنَ بِهِ کے معنی ہیں اَيَّقَنَ بِهِ (اُس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اُس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول

پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس

پر ڈٹ گئے۔

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ

ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا۔ (المحجرات - ۱۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔

(احزاب السجدۃ - ۳۰)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ

وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ - (الأنفال ۲)

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ -

(البقرة ۱۷۵)

فَلَا وَرَأَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي
أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيَسْلَمُوا
تَسْلِيمًا -

(النساء ۶۵)

جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ

کرا اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

پس نہیں، (اے نبی) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز

مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں

تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ

کو دے اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں

بلکہ سرسیر تسلیم کر لیں۔

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرار ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل

مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَ

رَسُولِهِ - (النساء ۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور

اس کے رسول پر۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی کھول کھول

کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے مراد اولاً، اللہ کو ماننا ہے۔ محض اُس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی

ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اُس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجالائے۔ وہی

قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اس سے دعا مانگنی چاہیے اور اس پر توکل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے

والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رک جائے۔ وہ سب

کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس

نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا عہداری ورہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم

بھی اُس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسلیم ہے۔ اسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء

اور کتب البیتہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسول نے دی ہیں۔

ثالثاً آخرت کو ماننا، اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان

کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے، اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور اس

مخاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزاء، اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے

لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سر سے سے یہ ایمان

ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اُس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں

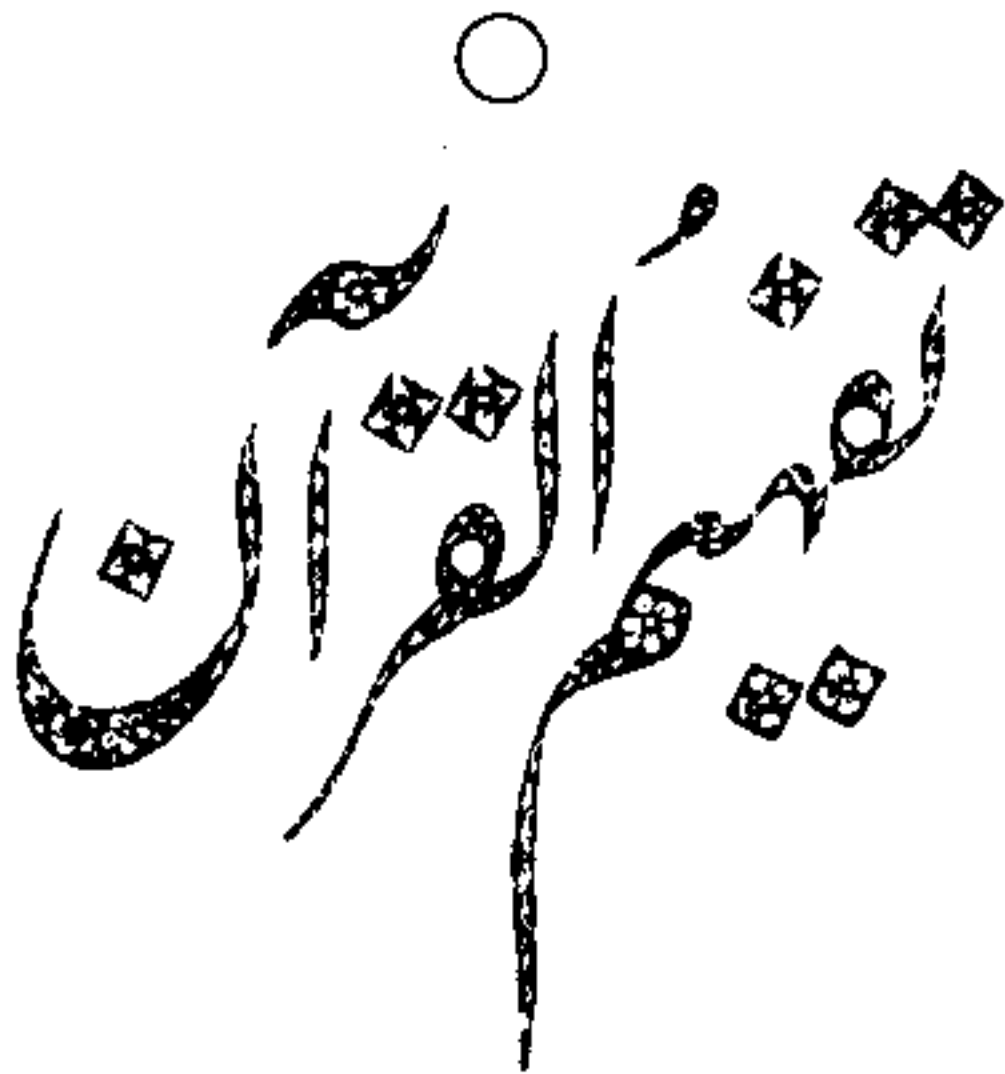
کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لاکر عمل صالح کریں، اور یہی بات اس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورہ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد یہ سورۃ دو مزید صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابق حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا ہے جس نہ ہو کہ اُس میں باطل سے اٹھارہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں، بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ سب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرز عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ

خُسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خُسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورہ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸-۷۹)۔ پھر اسی بات کو سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا نبوت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں بکڑنی شروع کر دیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۶۳ تا ۱۶۶)۔ اور اسی بات کو سورہ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جو اُس قحط سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵)۔ اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران ۱۰۴) اور اُس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران ۱۱۰)۔ حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے، اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، الدھر، حاشیہ ۱۱۱، البلد، حاشیہ ۱۱۲)۔



الْحَمْدُ لِلَّهِ

(١٠٢)

المہنت

نام | پہلی آیت کے لفظ **هُمَّنَا** کو اس سورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے کئی ہونے پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ اور اس کے مضمون اور انداز بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اس میں چند ایسی اخلاقی برائیوں کی مذمت کی گئی ہے جو جاہلیت کے معاشرے میں زیر پرست مالداروں کے اندر پائی جاتی تھیں، جنہیں ہر عرب جانتا تھا کہ یہ برائیاں فی الواقع اُس کے معاشرے میں موجود ہیں، اور سب ہی برا سمجھتے تھے، کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ کوئی خوبیاں ہیں۔ اس گھناؤنے کردار کو پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اُن لوگوں کا کیا انجام ہوگا جن کا یہ کردار ہے۔ یہ دونوں باتیں یعنی ایک طرف یہ کردار اور دوسری طرف آخرت میں اُس کا یہ انجام، ایسے انداز سے بیان کی گئی ہیں جس سے سامع کا ذہن خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ اس طرح کے کردار کا یہی انجام ہونا چاہیے، اور چونکہ دنیا میں ایسے کردار والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی، بلکہ وہ پھلتے پھولتے ہی نظر آتے ہیں، اس لیے آخرت کا ہر یا ہونا قطعی ناگزیر ہے۔

اس سورہ کو اگر اُن سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورہ زلزالت سے بیان تک چلی آرہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقہ سے اسلام کے عقائد اور اُس کی اخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورہ زلزالت میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پورا نامہ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کوئی ذرہ بڑا نیکی یا بدی بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اُس کے سامنے نہ آجائے۔ سورہ عادیات میں اُس لوٹ مار، کشت و خون اور غارتگری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اُس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمہارے افعال ہی کی نہیں، تمہاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس سلوک کا مستحق ہے۔ سورہ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے اچھے یا برے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اُس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورہ تکوین میں اُس مادہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں اور عیش و آرام اور جاہ و منزلت زیادہ سے زیادہ حاصل

کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اس غفلت کے برے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دنیا کوئی خزانِ یغمانہیں ہے کہ اُس پر تم جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت جو بیاں تمہیں مل رہی ہے اُس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جو اب دینا ہو گا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا، اور حاصل کر کے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ سورۃ عصر میں بالکل دو ٹوک طریقے سے بتا دیا گیا کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد، ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم، حتیٰ کہ پوری دنیا شے انسانیت خسارے میں ہے اگر اُس کے افراد میں ایمان و عملِ صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اس کے معاً بعد سورۃ صمّزہ آتی ہے جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو؟

سُورَةُ الْهُنٰۤرَةِ مَكِّيَّةٌ ۙ اٰیٰتُهَا ۙ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَبِیْلِ لِّکْلِ هُنْرَةٍ لُّمْرَةٍ ۙ ۱ الَّذِیْ جَمَعَ مَا لَا وَعَدَدَہٗ ۙ ۲
 یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَہٗ ۙ ۳ کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۙ ۴
 وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْحُطَمَةُ ۙ ۵ نٰسُ اللّٰهِ الْمُوَقَّدَةُ ۙ ۶ الَّتِیْ
 تَطَّلِعُ عَلٰی الْاَفِیْدَةِ ۙ ۷ اِنِّهَا عَلَیْہُمْ مُّوَصَّدَةٌ ۙ ۸ فِی
 عَمَدٍ مُّمدَّدَةٍ ۙ ۹

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (بیٹھتی بچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دونوں تک پہنچے گی۔ وہ اُن پر ڈھانک بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اُونچے اُونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)۔

۱۔ اصل الفاظ ہیں هُنْرَةٍ لُّمْرَةٍ۔ عزلی زبان میں حُمز اور لُز معنی کے اعتبار سے باہم اتنے قریب ہیں کہ کبھی دونوں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں، اور کبھی دونوں میں فرق ہوتا ہے، مگر ایسا فرق کہ خود اہل زبان میں سے کچھ لوگ حُمز کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ وہی مفہوم لُز کا بیان کرتے ہیں، اور اس کے برعکس کچھ لوگ لُز کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے نزدیک حُمز کے معنی ہیں۔ یہاں چونکہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں اور هُنْرَةٍ لُّمْرَةٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے دونوں مل کر یہ معنی دیتے ہیں کہ اُس شخص کی عادت ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے، کسی کو دیکھ کر انگلیاں اٹھاتا اور آنکھوں سے اشارے کرتا ہے، کسی کے نسب پر طعن کرتا ہے، کسی کی ذات میں کٹرے نکالتا ہے، کسی پر منہ در منہ چوٹیں کرتا ہے، کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کی برائیاں کرتا ہے، کہیں پچھلیاں کھا کر اور لگائی بھجائی کر کے دستوں کو لڑواتا اور کہیں بھائیوں میں پھوٹ ڈلواتا ہے، لوگوں کے بُرے بُرے نام رکھتا ہے، اُن پر چوٹیں کرتا ہے اور اُن کو

عیب لگاتا ہے۔

۵۲ پہلے فقرے کے بعد یہ دوسرا فقرہ خود بخود یہ معنی دیتا ہے کہ لوگوں کی یہ تحقیر ذلیل وہ اپنی مال داری کے غرور میں کرتا ہے۔ مال جمع کرنے کے لیے جمعاً مآلاً کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے مال کی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے۔ پھر گن گن کر رکھنے کے الفاظ سے اُس شخص کے بخل اور زر پرستی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

۵۳ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ بھختا ہے اُس کا مال اُسے حیاتِ جاہلِ بخش دے گا، یعنی دولت جمع کرنے اور اُسے گن گن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اُسے اپنی موت یا دہنیں رہی ہے اور اُسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت اُس کو یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو جانا پڑے گا۔

۵۴ اصل میں لفظ حطّمہ استعمال کیا گیا ہے جو حطّم سے ہے۔ حطّم کے معنی توڑنے، کچل دینے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں۔ جہنم کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ جو چیز بھی اُس میں پھینکی جائے گی اُسے وہ اپنی گہرائی اور اپنی آگ کی وجہ سے توڑ کر رکھ دے گی۔

۵۵ اصل میں لَبَّنَدَان فرمایا گیا ہے۔ نَبذِ عَرَبِيّ زبان میں کسی چیز کو بے وقعت اور خفیہ سمجھ کر پھینک دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنی مال داری کی وجہ سے وہ دنیا میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہے، لیکن قیامت کے روز اُسے حقارت کے ساتھ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

۵۶ قرآن مجید میں اس مقام کے سوا اور کہیں جہنم کی آگ کو اللہ کی آگ نہیں کہا گیا ہے۔ اس مقام پر اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے نہ صرف اُس کی ہولناکی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی دولت پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جانے والوں کو اللہ کس قدر سخت نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کی وجہ سے اُس نے اُس آگ کو خاص اپنی آگ کہا ہے جس میں وہ پھینکے جائیں گے۔

۵۷ اصل الفاظ ہیں تَطَلَعُ عَلَى الْآفِئِدَةِ۔ تَطَلَعُ اِطْلَاع سے ہے جس کے ایک معنی چرچھنے اور اوپر پہنچ جانے کے ہیں، اور دوسرے معنی باخبر ہونے اور اطلاع پانے کے۔ آفِئِدَةُ فِئَادِیّ کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں، لیکن یہ لفظ اُس عضو کے لیے استعمال نہیں ہوتا جو سینے کے اندر دھڑکتا ہے، بلکہ اُس مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور و ادراک اور جذبات و خواہشات اور عقائد و افکار، اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اُس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے بُرے خیالات، فاسد عقائد، ناپاک خواہشات و جذبات، خبیث نیتوں اور ارادوں کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر اس کے جرم کی نوعیت معلوم کرے گی اور ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دے گی۔

۵۸ یعنی جہنم میں مجرموں کو ڈال کر اوپر سے اُس کو بند کر دیا جائے گا۔ کوئی دروازہ تو درکنار کوئی چھری تک کھلی ہوئی نہ ہوگی۔

۵۹ فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہنم کے دروازوں کو بند کر کے اُن پر اونچے اونچے ستونوں کا ڈریے جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مجرم اونچے اونچے ستونوں سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ تیسرا مطلب ابن عباس نے یہ بیان کیا ہے کہ اُس آگ کے شعلے لمبے ستونوں کی شکل میں اٹھ رہے ہوں گے۔



مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا

الْقَيْلِ

(١٠٥)

الفیل

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ اَھْطابِ الْفِیْلِ سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول | یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے اور اس کے تاریخی پس منظر کو اگر نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکہ معظمہ کے بھی ابتدائی دور میں ہوا ہوگا۔

تاریخی پس منظر | اس سے پہلے تفسیر سورۃ بروج حاشیہ ۴ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نجران میں یمن کے یہودی فرمانروا ذونواس نے پیردوان مسیح علیہ السلام پر جو ظلم کیا تھا اُس کا بدلہ لینے کے لیے حبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حبشری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ۵۲۵ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی سلطنت اور حبش کی حکومت کے باہم تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اُس زمانے میں کوئی قابل ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اُسی کے ذریعہ سے یمن کے ساحل پر اتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینا چاہیے کہ یہ سب کچھ محض مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی اُسی وقت سے اُس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آ رہے تھے، اُسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ اُس کے منافع پورے کے پورے اُسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اس مقصد کے لیے ۲۵ یا ۲۶ قبل مسیح میں قیصر آگسٹس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل پبلیس گالوس (Aebus Gallus) کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اتاری تھی تاکہ وہ اُس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ (اس شاہراہ کا نقشہ ہم نے تفسیر القرآن، جلد دوم میں صفحہ ۱۲۲ پر درج کیا ہے)۔ لیکن عرب کے شدید جغرافیائی حالات نے اس فہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رومی اپنا جنگی بیڑہ بچرا حمر میں لے آئے اور انہوں نے عربوں کی اُس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے، اور صرف بصری راستہ ان کے لیے باقی رہ گیا۔ اسی بصری راستے کو قبضے میں لینے کے لیے انہوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو یمن پر قابض کرادیا۔

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی اس کے متعلق عرب مورخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک از یاط، دوسرا ابرہہ۔ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اریاط تھا، اور ابرہہ اُس میں شامل تھا پھر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ابرہہ اور اریاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اریاط مارا گیا، ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا اور پھر اُس نے شاہ حبش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسکی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اس کے برعکس یونانی اور سریانی مورخین کا بیان ہے کہ فتح یمن کے بعد حبیب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یعنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو ان میں سے ایک سردار الشیمیفج اشوع (جسے یونانی مورخین Esymphaeus لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جزیرہ ادا کرنے کا عہدہ کر کے شاہ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی فوج نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی اور ابرہہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ ادولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں وہ یا اس سے مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دیدی۔ آخر کار شاہ حبش کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا (یونانی مورخین اُس کا نام ابراہم Abrames اور سریانی مورخین ابراہام Abraham لکھتے ہیں۔ ابرہہ غالباً اسی کا حبشی تلفظ ہے، کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفظ ابراہیم ہے)۔

یہ شخص رفتہ رفتہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مؤوض الملک (نائب شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ۵۲۳ء میں وہ سدہ یارب کی مراثت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں قیصر روم، شاہ ایران، شاہ حیرہ اور شاہ خُستان کے سفرا شریک ہوئے۔ اس کا مفصل تذکرہ اُس کتبے میں درج ہے جو ابرہہ نے سدہ یارب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے اور گلیزر (Glaser) نے اس کو نقل کیا ہے (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ سبا، حاشیہ ۲۷)۔

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مقبوض کر لینے کے بعد ابرہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتداء سے رومی سلطنت اور اُس کے حلیف حبش عیاشیوں کے پیش نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیاشیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلاد مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکش اقتدار نے بلاد مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیے تھے۔

ابرہہ نے اس مقصد کے لیے یمن کے دار السلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا جس کا ذکر عرب مورخین نے اقلیس یا اقلیس یا اقلیس کے نام سے کیا ہے۔ یہ یونانی لفظ Ekklesia کا

مغرب ہے اور اردو کا لفظ کلیب بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اُس نے شاہ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیب کی طرف موڑے بغیر نہ ہوں گا۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اُس نے یمن میں علی الاطلاق اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرادی۔ اُس کی اس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصہ دلائے تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اُس کو تکرار پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اس اعلان پر غضبناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیب میں گھس کر رفع حاجت کر ڈالی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مقاتل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیب میں آگ لگا دی تھی۔ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابل تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان نصرت و اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دور میں اس پر کسی عرب، یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا شتمل ہو کر کلیب کو گند کر دینا یا اس میں آگ لگانا کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے غصہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہل عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کرے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب ابرہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے مقتدین نے اس کے کلیب کی یہ توہین کی ہے تو اس نے تم کھائی کہ میں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھانہ دوں۔

اس کے بعد وہ شہنشاہ ۱۱۷ھ میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذؤنفر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر قنار ہو گیا۔ پھر خشم کے علاقے میں ایک عرب سردار نقیل بن حبیب ششمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ بھی شکست کھا کر قنار ہو گیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بدرقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ان کے معبودلات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ ان کا سردار مسعود ایک وفد لے کر ابرہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا بت کہ وہ معبد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں، ہم مکہ کا راستہ تباہ کرنے کے لیے آپ کو بدرقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ ابرہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنی ثقیف نے ابورغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ جب مکہ تین کوس رہ گیا تو المغمس ریا المغمس نامی مقام پر پہنچ کر ابورغال مر گیا، اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ بنی ثقیف کو بھی وہ

۱۱۷ھ میں پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ

بنائیں اور عرب میں اُس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا جس کا ذکر ہم تفسیر سورہ بروج

حاشیہ ۴ میں کر چکے ہیں۔

سال سال تک طعنے دیتے رہے کہ انہوں نے صلات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے نعاذی کیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المنعمس سے ابرہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھایا اور وہ اہل نہایت اور قریش کے بت سے مویشی لوٹ لے گیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے اہل مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہل مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔ مکے کے سب سے بڑے سردار اُس وقت عبدالمطلب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر ابرہہ کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے، وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچائے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ابرہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ ان کو دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اتر کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھ واپس دیدیے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا، مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دین آبائی کا مرجع ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اس کا ایک رب ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔ ابرہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ ابرہہ کے پاس سے اٹھ آئے اور اُس نے ان کے اونٹ واپس کر دیے۔

ابن عباس کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اُس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن مردودہ، حاکم، ابو نعیم اور بیہقی نے اُن سے جو روایات نقل کی ہیں اُن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ابرہہ القصفاح کے مقام پر پہنچا جو عَرَقات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حدود حرم کے قریب واقع ہے، تو عبدالمطلب خود اُس کے پاس گئے اور اس سے کہا آپ کو بیان تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجنے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اس پر تسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ ابرہہ نے جواب دیا ہم اسے منہدم کیے بغیر نہیں گئے۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر ابرہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمطلب کو کچھ چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دو دنوں روایتوں کے اس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، تو ان میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہر حال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابل فہم بات ہے کہ قریش نے اُس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگِ احزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر کے تھے۔ وہ ۶۰۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابرص کی لشکرگاہ سے واپس آ کر عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قبل عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردارِ حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کٹا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بٹن موجود تھے، مگر یہ لوگ اُس نازک گھڑی میں اُن سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ اُن کی جو دعائیں نازل ہوئیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابن ہشام نے سیرت میں عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

لَا هُمْ إِلَّا الْعَبْدُ يَسْتَعِينُ رَحْمَةً فَأَمْنٌ حَيْثُ لَدْنَا

خدا یا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما

إِلَّا يَغْنَبُ صَلِيبُهُمْ وَرَحْمَتُهُمْ عِزٌّ وَجَاهُكَ

کل ان کی صلیب اور اُن کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے

ان كنت تاركهم وقبيلتنا فأمر ما بدأ لك

اگر تو ان کو اور ہمارے قبیلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے تو جو تو چاہے کر

سہیلی نے روض الالاف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

وَانصُرْنَا عَلَى آلِ الصَّالِبِ وَعَابَدِيهِ الْيَوْمَ وَالْغَدَ

صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما

ابن جریر نے عبدالمطلب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دعائیں کہتے ہوئے انہوں نے پڑھے تھے:

يَا رَبِّ لَا رَجْوَ لِهَمِّ سِوَاكَ يَا رَبِّ فَأَمْنٌ مِنْهُمْ حَمَاكَ

اے میرے رب تیرے سوا میں اُن کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر

ان عدوا البيت من عاداكا امنعهم ان يحدوا فراقا

اس گھر کا دشمن نیرا دشمن ہے، اپنی بستنی کو تباہ کرنے سے ان کو روک

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے، اور دوسرے روز ابرص کے پاس

داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اُس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تیر مارے گئے، آنکسوں سے کچھ کے دیے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اُسے جنوب، شمال، مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر کتے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر ان سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنگر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عکرمہ مہدی کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنگری گرتی اسے سخت کھلی لاسنی ہو جاتی اور کھجاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابن عباس کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور بڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لمبو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نفیل بن حبیب شعمی کو، جسے یہ لوگ بدرقہ بنا کر بلادِ شعم سے پکڑ لانے تھے، تلاش کر کے انہوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المقلد والالہ الطالِبُ والاشرار المغلوب لیس الغالب

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جبکہ خدا تعالیٰ کر رہا ہے اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے اس بھگدر میں جگہ جگہ یہ لوگ گر کر مرتے رہے۔ عطاء بن یسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ ابرہہ بھی بلادِ شعم پہنچ کر مرا۔

یہ واقعہ مُزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادیِ مُصَیْب کے قریب مُحَیْبَر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مُزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو مُحَیْبَر کی وادی میں آپ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نووی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحابِ الفیل کا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا، اس لیے سنت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ موطاء میں امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا کہ مزدلفہ پورا

لسہ اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے جہنی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ قتل کے بعد یمن میں ان کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی، جگہ جگہ یمنی سردار علم بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے،

پھر ایک یمنی سردار سیص بن ذی یزید نے شاہ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی طرف ایک ہزار فوج جو چھ جہازوں کے ساتھ

آئی تھی، ہش حکومت کا قاتلہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے۔

کا پورا ٹھہرنے کا مقام ہے، مگر محتر کی وادی میں نہ ٹھہرا جائے۔ نفیل بن حبیب کے جو اشعار ابن اسحاق نے نقل کیے ہیں ان میں وہ اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے:

مَدِينَةٌ لَوْ رَأَيْتِ وَلَا تَرِيهِ لَدَى جَنْبِ الْمُحْصَبِ مَا رَأَيْتُنَا
اسے رُدیۃ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی جو کچھ ہم نے وادی محصَب کے قریب دیکھا
حَدَّثَ اللَّهُ إِذَا بَصُرَتْ طَيْرًا وَخَفَّتْ جَحَاسَةٌ تَلْفِي عَلَيْنَا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آپڑیں

وَكَلَّ الْقَوْمَ يَسْأَلُ عَنْ نَفِيلٍ كَأَنَّ عَلَى اللَّحِيشَانِ دَيْنًا
ان لوگوں میں سے ہر ایک نفیل کو ڈھونڈ رہا تھا، گویا کہ میرے اوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا

یہ آنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہو گئی اور اس پر بہت سے شعراء نے قصائد کہے۔ ان قصائد

میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارۃً دُنیا بھی یہ

نہیں کہا کہ اس میں اُن بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبد اللہ ابن الزبیر نے
کہتا ہے:

سَتُونَ الْفَالِكِ يَوْمَئِذٍ أَسْرَهُمْ وَلَمْ يَعْتَشِ جَدَّ الْأَيَّابِ سَقِيمَهَا

۶۰ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جاسکے اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (ابصر) زندہ رہا

كَانَتْ بِهَا عَادٌ وَجَرَهُمْ قَبْلَهُمْ وَاللَّهُ مِنْ فَوْقِ الْعِبَادِ يَقْبَهُمَا

یہاں ان سے پہلے عاد اور جزیم تھے، اور اللہ بندوں کے اوپر موجود ہے جو اُسے قائم رکھے ہوئے ہے

ابو قیس بن اسلت کہتا ہے:

فَقَوْمًا فَصَلُّوا رَبَّكُمْ وَتَمَسُّحُوا بِأَرْكَانِ هَذَا الْبَيْتِ بَيْنَ الْأَخَاشِبِ

اٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسج کرو

فَلَمَّا آتَاكُمْ نَصْرَ ذِي الْعَرْشِ رَدَّاهُمْ جُنُودَ الْمَلِيكِ بَيْنَ سَافِرِ حَاصِبِ

جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں

پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت امّ حنان اور حضرت زبیر بن العوام کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قریش نے ۱۰ سال داؤر بروایت بعض سات سال تک اللہ وعدہ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ امّ حنان

کی روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی، حاکم، ابن مردودہ اور بیہقی نے اپنی کتب حدیث میں نقل کی ہے۔

حضرت زبیر کا بیان طبرانی اور ابن مردودہ اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی تائید مزید حضرت سعید

بن المسیب کی اُس مُردسل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہل عرب اُسے عام الفیل (یا تھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اُسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ حرم میں پیش آیا تھا اور حضور کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ کی ولادت واقعہ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

مقصود کلام جو تاریخی تفصیلات اور پردہ کی گئی ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورہ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ مکے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہل عرب اس بات کے قائل تھے نہ ابرہہ کے اس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوبی یا دیوتانے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اور چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اس قدر متاثر رہے تھے کہ انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورہ فیل میں ان تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً، اور اہل عرب عموماً، اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام دوسرے معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کی جائے۔ نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اس دعوت حق کو دبانے کے لیے انہوں نے زور بردستی سے کام لیا تو جس خدا نے اصحاب الفیل کا نہیں نہیں کیا تھا اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔

سُورَةُ الْفِيلِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمَ تَرَكَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝۱
 أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ
 فِي تَضَلُّيلٍ ۝۲ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝۳
 تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ
 مِّنْ سِجِّيلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝۵

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو آکارت نہیں کر دیا؟ اور اُن پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے جو اُن پر پگی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، پھر اُن کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا۔

۱۔ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر اصل مخاطب نہ صرف قریش، بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں جو اس سارے قحط سے خوب واقف تھے۔ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اَلَمْ تَرَ دیکھا تم نے نہیں دیکھا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اُن سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ عام لوگوں کو مخاطب کرنا ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں: ابراہیم، آیت ۱۹-۱۸ الحج ۴۵-النور ۲۲-لقمان ۲۹-۲۱-فاطر ۲۴-الزمر ۲۱۔ پھر دیکھنے کا لفظ اس مقام پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ مکہ اور اطراف مکہ اور عرب کے ایک وسیع علاقے میں مکہ سے سین تک ایسے بہت سے لوگ اُس وقت زندہ موجود تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا، کیونکہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے چالیس پینتالیس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا، اور سارا عرب ہی اس کی ایسی متواتر خبریں دیکھنے والوں سے سن چکا تھا کہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا۔

۲۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی تفصیل اس امر کی بیان نہیں کی کہ یہ ہاتھی والے کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کس غرض کے لیے آئے تھے۔ کیونکہ یہ باتیں سب کو معلوم تھیں۔

۳۔ اصل میں لفظ کیا استعمال کیا گیا ہے جو کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں خفیہ کیا چیز تھی؟ ساتھ ہزار کا لشکر تھی ہاتھی لیے ہوئے علائقہ یمن سے مکہ آیا تھا، اور اُس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ جو بات خفیہ تھی وہ جشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر قریش کو کھل کر، اور تمام اہل عرب کو سوچ کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوب عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اس غرض کو انہوں نے چھپا رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ اُن کے کلیب کی جو بے حرمتی عربوں نے کی ہے اس

کا بدلہ وہ ان کا معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔

۱۵۴ اصل الفاظ ہیں فی تَضَلُّيلٍ۔ یعنی ان کی تدبیر کو اس نے گمراہی میں ڈال دیا۔ لیکن محاورے میں کسی تدبیر کو گمراہ کرنے کا مطلب اُسے ضائع کر دینا اور اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام کر دینا ہے، جیسے ہم اردو زبان میں کہتے ہیں فلان شخص کا کوئی داؤں نہ چل سکا، یا اس کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: مَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ "مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی" (المومن - ۲۵)۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا: إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ "اور یہ کہ اللہ خائموں کی چال کو کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا" (یوسف - ۵۲)۔ اہل عرب امرؤ القیس کو الْمَلِكُ الضَّلِيلُ "ضائع کرنے والا بادشاہ" کہتے تھے، کیونکہ اس نے اپنے باپ سے پائی ہوئی بادشاہی کو کھو دیا تھا۔

۱۵۵ اصل میں ظَبْرًا أَبَائِيلَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اردو زبان میں چونکہ ابابیل ایک خاص قسم کے پرندے کو کہتے ہیں اس لیے ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ابرہہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں۔ لیکن عربی زبان میں ابابیل کے معنی میں بہت سے منفرد کردہ جو پے در پے مختلف سمتوں سے آئیں، خواہ وہ آدمیوں کے ہوں یا جانوروں کے۔ بکرہ اور تادہ کہتے ہیں کہ یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بحر احمر کی طرف سے آئے تھے۔ سعید بن جبیر اور بکرہ کہتے ہیں کہ اس طرف کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں دیکھے گئے۔ یہ نہ نجد کے پرندے تھے، نہ حجاز کے، اور نہ تہامہ یعنی حجاز اور بحر احمر کے درمیان ساحلی علاقے کے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ان کی جو بچہیں پرندوں جیسی تھیں اور بچے کہتے تھے جیسے۔ بکرہ کا بیان ہے کہ ان کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے۔ اور تقریباً سب زادیوں کا متفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چوخیچ ہیں ایک ایک ککر تھا اور زنجوں میں دود ککر۔ مکہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ ککر ایک مدت تک محفوظ رہے۔ چنانچہ ابو نعیم نے نوفل بن ابی معاد یہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ ککر دیکھے ہیں جو اصحاب الفیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مڑ کے چھوٹے دانے کے برابر سیاھی مائل سرخ تھے۔ ابن عباس کی روایت ابو نعیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے اور ابن مرددہ کی روایت میں ہے کہ بکری کی میٹنی کے برابر۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے۔ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔

۱۵۶ اصل الفاظ ہیں مِجَادًا مِّن رَّيْحَانٍ، یعنی سجیل کی قسم کے پتھر۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گل کا معرب ہے اور اس سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہوا درپک کر سخت ہو گیا ہو۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، سورہ ہود آیت ۸۲ اور سورہ حجر آیت ۷۴ میں کہا گیا ہے کہ قوم لوط پر سجیل کی قسم کے پتھر برسائے گئے تھے، اور انہی پتھروں کے متعلق سورہ ذاریات آیت ۲۳ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ حجارة من طین، یعنی مٹی کے گارے سے بنے ہوئے پتھر تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی مرحوم دماغور، جنہوں نے عہد حاضر میں قرآن مجید کے معانی و مطالب کی تحقیق پر بڑا قیمتی کام کیا ہے، اس آیت میں نیز مینہم کا فاعل اہل مکہ اور دوسرے اہل عرب کو قرار دیتے ہیں جو آئہ تر کے مخاطب ہیں، اور پرندوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ سنگریزے نہیں پھینک رہے تھے، بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اصحاب الفیل کی لاشوں کو کھائیں۔ اس تاویل کے لیے جو دلائل انہوں نے دیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالمطلب کا ابرہہ کے پاس جا کر کعبہ کے بجائے اپنے اونٹوں کا

مطالبہ کرنا کسی طرح باور کرنے کے قابل بات نہیں ہے، اور یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ قریش کے لوگوں اور دوسرے عربوں نے، جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے، حملہ آور فوج کا کوئی مقابلہ نہ کیا ہو اور کعبے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہ پہاڑوں میں جا چھپے ہوں۔ اس لیے صورت واقعہ دراصل یہ ہے کہ عربوں نے ابرہہ کے لشکر کو پتھر مارے، اور اللہ تعالیٰ نے پتھر اڑ کرنے والی طوفانی ہوائیں بھیج کر اس لشکر کا بھروسہ نکال دیا، پھر ہندسے اُن لوگوں کی لاشیں کھانے کے لیے بھیجے گئے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھا ہے، روایت صرف یہی نہیں ہے کہ عبدالمطلب اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنے گئے تھے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اونٹوں کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا اور ابرہہ کو خانہ کعبہ پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام معتبر روایات کی رو سے ابرہہ کا لشکر محترم میں آیا تھا جبکہ حجاج واپس جا چکے تھے۔ اور یہ بھی ہم نے بتا دیا ہے کہ ۶ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا قریش اور اُس پاس کے عرب قبائل کے بس کا کام نہ تھا، وہ تو غزوة احزاب کے موقع پر بڑی نیابریوں کے بعد مشرکین عرب اور یہودی قبائل کی جو فوج لائے تھے وہ دس بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی، پھر بھلا وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتے تھے۔ تاہم ان ساری دلیلوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور صرف سورۃ فیل کی ترتیب کلام کو دیکھا جائے تو یہ تاویل اُس کے خلاف پڑتی ہے۔ اگر بات یہی ہوتی کہ پتھر عربوں نے مارے، اور اصحاب فیل بھس بن کر رہ گئے، اور اس کے بعد ہندسے ان کی لاشیں کھانے کو آئے، تو کلام کی ترتیب یوں ہوتی کہ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّا كُوِّلٌ وَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيلَ اتم ان کو پکی ہوئی مٹی کے پتھر مارے تھے، پھر اللہ نے اُن کو کھائے ہوئے بھس جیسا کر دیا، اور اللہ نے اُن پر ٹھنڈ کے ٹھنڈے پرنڈے بھیج دیے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے پرنڈوں کے ٹھنڈے بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، پھر اُس کے تَسْلًا بَعْدَ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ جو ان کو پکی ہوئی مٹی کے پتھر مارے تھے، فرمایا ہے، اور آخر میں کہا ہے کہ پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھس جیسا کر دیا۔

۱۵ اصل الفاظ ہیں كَعَصْفٍ مَّا كُوِّلٌ عَصْفٌ كَالْفِطْرِ رَحْمَانِ آیت ۱۲ میں آیا ہے: ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانِ، اور غلہ بھوسے اور دانے والا اس سے معلوم ہوا کہ عَصْفٌ کے معنی اُس چمکے کے ہیں جو غلے کے دانوں پر ہوتا ہے اور جسے کسان دانے نکال کر پھینک دیتے ہیں، پھر جانور اُسے کھاتے بھی ہیں، اور کچھ ان کے چبانے کے دوران میں گرتا بھی جاتا ہے، اور کچھ ان کے پاؤں تلے روند بھی جاتا ہے۔

تصویر

قرین

(۱۰۶)

قریش

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ قریش کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اگرچہ صحاک اور کلبی نے اس کو مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اس کے مکی ہونے پر متفق ہے، اور اس کے مکی ہونے کی کھلی شہادت خود اس سورہ کے الفاظ رَبِّ هَذَا الْبَيْتِ رَأْسِ الْكُوفَةِ میں موجود ہے۔ اگر یہ مدینہ میں نازل ہوتی تو خانہ کعبہ کے لیے "اس گھر" کے الفاظ کیسے موزوں ہو سکتے تھے؟ بلکہ اس کے مضمون کا سورہ فیل کے مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ غالباً اس کا نزول اُس کے منسلکاً بعد ہی ہوا ہوگا۔ دونوں سورتوں کے درمیان اسی مناسبت کی بنا پر سلف میں سے بعض بزرگ اس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ یہ دونوں دراصل ایک ہی سورہ ہیں۔ اس خیال کو تقویت ان روایات کی بنا پر ملتی ہے کہ حضرت ابی بن کعب کے مضعف میں یہ دونوں ایک ساتھ لکھی ہوئی تھیں اور درمیان میں بسم اللہ مرقوم نہ تھی۔ نیز یہ کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ کسی فصل کے بغیر ان دونوں کو ملا کر نماز میں پڑھا تھا۔ لیکن یہ رائے اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم تعداد کے تعاون سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے جو نسخے سرکاری طور پر لکھوا کر بلاد اسلام کے مراکز میں بھجوائے تھے ان میں دونوں کے درمیان بسم اللہ درج تھی، اور اُس وقت سے آج تک تمام دنیا کے مصاحف میں یہ الگ الگ سورتوں کی حیثیت ہی سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ مزید برآں دونوں سورتوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ علانیہ دو الگ سورتیں نظر آتی ہیں۔

تاریخی پس منظر | اس سورہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اس کے مضمون اور سورہ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ اعلیٰ قُصَی بن کلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ سب سے پہلے قُصَی نے اُس کو کتے میں جمع کیا اور بیت اللہ کی تُو لُبَّیْتِ اس قبیلے کے ماتھے میں آگئی۔ اسی بنا پر قُصَی کو مُجَمِّع (جمع کرنے والے) کا لقب دیا گیا۔ اس شخص نے اپنے اعلیٰ درجہ کے تندرست سے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی، اور جملہ اطراف عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا جس کی بدولت رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبائل اور تمام علاقوں میں قریش کا اثر و رسوخ قائم ہوتا چلا گیا۔ قُصَی کے بعد اس کے بیٹوں عبدمناف اور عبدتبارک کے درمیان مکہ کی ریاست کے مناسب تقسیم ہو گئے، مگر دونوں میں سے عبدمناف کو اپنے باپ ہی کے زمانے میں زیادہ ناموری حاصل ہو چکی تھی اور عرب میں اُس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا تھا۔

عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل۔ ان میں سے ہاشم عبدالمطلب کے والد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہل عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور رکے کی منڈی میں اندرون ملک کے تجارتی خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اس لیے جنوبی عرب سے بحرا حمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اُس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیت اللہ کے حُدام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنہیں اس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں اُن کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رکھ کر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس اسکیم میں اپنے باقی بیٹوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبد شمس نے، یمنی امراء سے مطلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں۔ اس طرح ان لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترستی چلی گئی۔ اسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتَجَرِبِ تجارت پیشہ کے نام سے مشہور ہو گئے، اور جو روابط انہوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے اُن کی بنا پر ان کو اصحابُ الاِیلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے لفظی معنی "الفت پیدا کرنے والوں" کے ہیں۔

اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و پیش اتنا بلند ہونا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ ان میں الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جنہے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قریش قَادَةُ النَّاسِ "قریش لوگوں کے لیڈر ہیں" (مسند احمد، مرویات محمد بن العاص)۔ اور حضرت علی کی روایت بھی ہے کہ حضور نے فرمایا کانَ هَذَا الْاَمْرُ فِي حَبِيْرٍ فَنَزَعَهُ اللهُ مِنْهُمْ وَجَعَلَهُ فِي قُرَيْشٍ "پہلے عرب کی سرداری قبیلہ حَبِيْرٍ والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے

وہ ان سے سلب کر کے قریش کو دے دی۔

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ کتہہ پر ابرص کی چڑھائی کا واقعہ پیش آگیا۔ اگر اُس وقت ابرص اس شہر مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں، خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانہ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خاتم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ لاکھ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد وہی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی۔ اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قحطی ہی کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے شکر پڑے مارا کر ابرص کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکہ سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اس تباہ شدہ فوج کے آدمی گر کر مرنے چلے گئے تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہل عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا، اور اُس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ ان لوگوں پر اللہ کا فضل خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ اُنہیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

مقصود کلام | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں یہ حالات چونکہ سب ہی کو معلوم تھے، اس لیے اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم خود اس گھر (خانہ کعبہ) کو بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر مانتے ہو، اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں اس گھر کے طفیل یہ امن عطا کیا، تمہاری تجارتوں کو یہ فروغ بخشا، اور تمہیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوشحالی نصیب فرمائی، تو تمہیں اُسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

آيَاتُهَا ۲ سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ اٰیَاتُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا یَلِیْفُ قُرَیْشٍ ۱ اِلَیْهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ ۲ فلیعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَیْتِ ۳ الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوعٍ ه وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۴

چونکہ قریش مانوس ہوئے، (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔ ۵

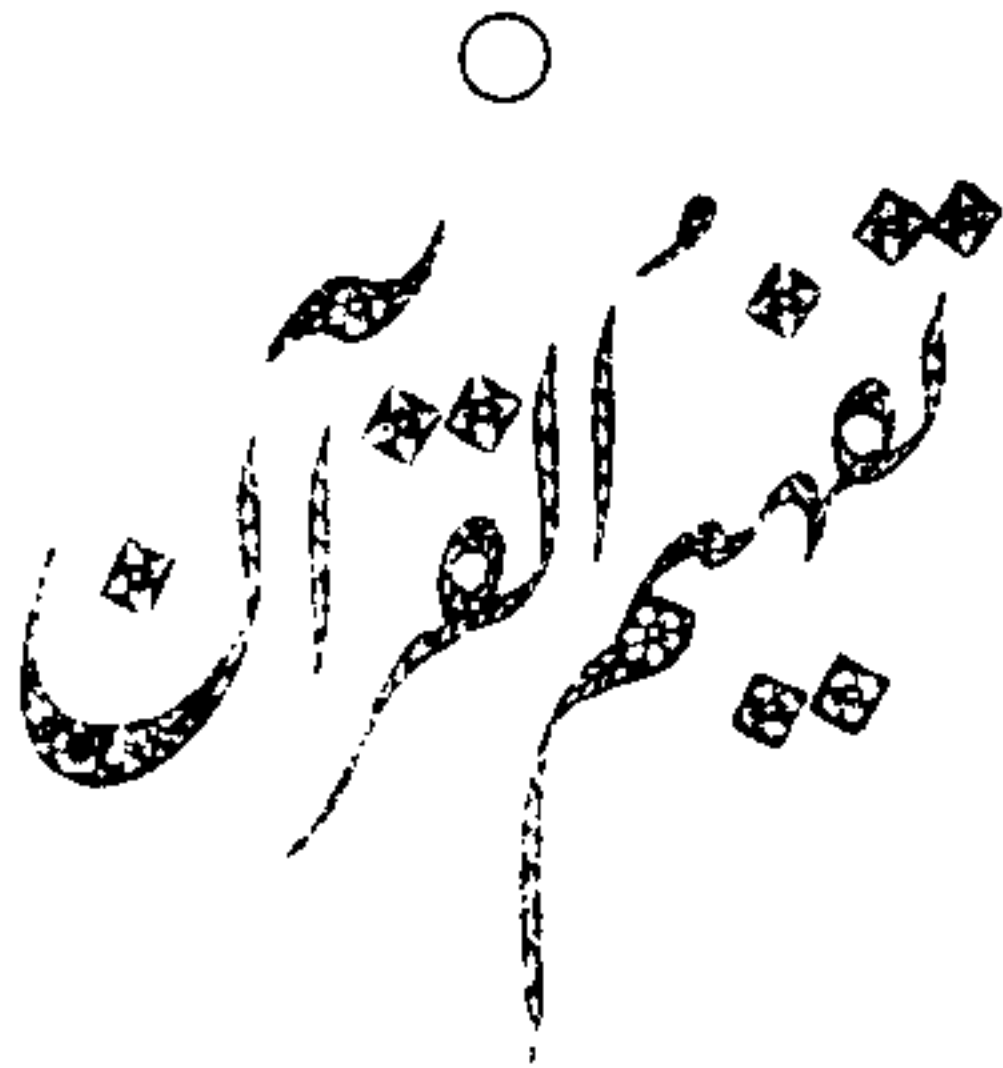
۱۔ اصل الفاظ میں لَا یَلِیْفُ قُرَیْشٍ، ایلات اُلف سے ہے جس کے معنی خوگر ہونے، مانوس ہونے، پھٹنے کے بعد رل جانے، ماورسی چیز کی عادت اختیار کرنے کے ہیں۔ اردو زبان میں اُلفت اور اُلفت کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ ایلات سے پہلے جو لام آیا ہے اس کے متعلق عربی زبان کے بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ عربی محاورے کے مطابق تعجب کے معنی میں ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں کہ لَوِیْدٌ وَمَا صَنَعْنَا بِہِ، یعنی ذرا اس زید کو دیکھو کہ ہم نے اس کے ساتھ کیسا نیک سلوک کیا اور اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ پس لَا یَلِیْفُ قُرَیْشٍ کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا رویہ بڑا ہی قابل تعجب ہے کہ اللہ ہی کے فضل کی بدولت وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور ان تجارتی سفروں کے خوگر ہو گئے جو ان کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اور وہ اللہ ہی کی بندگی سے روگردانی کر رہے ہیں۔ یہ رائے اُخفش، کیسانی، اور فراء کی ہے، اور اس رائے کو ابن جریر نے ترجیح دینے ہوئے لکھا ہے کہ عرب جب اس لام کے بعد کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو وہی بات یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے کہ اُس کے ہوتے جو شخص کوئی رویہ اختیار کر رہا ہے وہ قابل تعجب ہے۔ بخلاف اس کے خلیل بن احمد، سینویہ اور زحشری کہتے ہیں کہ یہ لام تعلیل ہے اور اس کا تعلق آگے کے فقرے فلیعبدوا رب هذا البیت سے ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ لوں تو قریش پر اللہ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں، لیکن اگر کسی اور نعمت کی بنا پر نہیں تو اسی ایک نعمت کی بنا پر وہ اللہ کی بندگی کریں کہ اُس کے فضل سے وہ ان تجارتی سفروں کے خوگر ہوئے، کیونکہ یہ بجائے خود ان پر اُس کا بہت بڑا احسان ہے۔

۲۔ گرمی اور جاڑے کے سفروں سے مراد یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں قریش کے تجارتی سفر شام و فلسطین کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ ٹھنڈے علاقے ہیں، اور جاڑے کے زمانے میں وہ جنوب عرب کی طرف ہوتے تھے، کیونکہ وہ گرم علاقے ہیں۔

۳۵ اس گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ نعمت اسی گھر کی بدولت حاصل ہوئی ہے، اور وہ خود مانتے ہیں کہ وہ ۳۶۰ بت اس کے رب نہیں ہیں جن کی یہ پوجا کر رہے ہیں، بلکہ صرف اللہ ہی اس کا رب ہے۔ اُس نے ان کو اصحابِ نبیل کے حملے سے بچایا۔ اسی سے انہوں نے ابرصہ کی فوج کے مقابلے میں مدد کی دعا کی تھی۔ اُس کے گھر کی پناہ میں آنے سے پہلے جب وہ عرب میں منتشر تھے تو اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ عرب کے عام قبائل کی طرح وہ بھی ایک نسل کے بکھرے ہوئے گروہ تھے۔ مگر جب وہ مکہ میں اس گھر کے گرد جمع ہوئے اور اس کی خدمت انجام دینے لگے تو سارے عرب میں محترم ہو گئے، اور ہر طرف اُن کے تجارتی قافلے بے خوف و خطر آنے جانے لگے۔ پس انہیں جو کچھ بھی نصیب ہوا ہے اس گھر کے رب کی بدولت نصیب ہوا ہے، اس لیے اسی کی ان کو عبادت کرنی چاہیے۔

۳۶ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ مکے میں آنے سے پہلے جب قریش عرب میں منتشر تھے تو بھوکوں مر رہے تھے۔ یہاں آنے کے بعد اُن کے بے رزق کے دروازے کھلتے چلے گئے اور ان کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا حرفِ بحرف پوری ہوئی کہ اسے پروردگار، میں نے اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محرم گھر کے پاس ایک بے آب و گیاہ وادی میں لایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے (ابراہیم۔ آیت ۳۷)۔

۳۷ یعنی جس خوف سے عرب کی سرزمین میں کوئی محفوظ نہیں ہے اُس سے یہ محفوظ ہیں عرب کا حال اُس دور میں تھا کہ پورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھسکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گروہ اچانک اُس پر چھا پا مار دے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے حدود سے باہر قدم رکھنے کی ہمت کر سکے، کیونکہ اکاڈ کا آدمی کا زندہ بچ کر واپس آ جانا، یا اگر قمار ہو کر غلام بن جانے سے محفوظ رہنا گویا امر محال تھا۔ کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پر ڈاکہ پڑنے کا خطرہ تھا، اور راستے بھر کے بااثر قبائلی سرداروں کو رشوتیں دے کر تجارتی قافلے بخیریت گزر سکتے تھے۔ لیکن قریش مکہ میں بالکل محفوظ تھے، انہیں کسی دشمن کے حملے کا خطرہ نہ تھا۔ اُن کے پھیٹے اور بڑے ہر طرح کے قافلے ملک کے ہر حصے میں آتے جاتے تھے، کوئی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ قافلہ حرم کے خادموں کا ہے، انہیں چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اکیلا قریشی بھی اگر کہیں سے گزر رہا ہو اور کوئی اس سے تعویذ کرتا تو صرف لفظ ”حرمی“ یا ”انا من حرم اللہ“ کہہ دینا کافی ہو جاتا تھا، یہ سنتے ہی اٹھے ہوئے ہاتھ رک جاتے تھے۔



الْمَا عُون

(١٠٦)

الماعون

نام | آخری آیت کے آخری لفظ الماعون کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے

زمانہ نزول | ابن جریر نے ابن عباس اور ابن التبریزی رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یہ سورہ مکی ہے، اور یہی قول عطاء اور جابر کا بھی ہے۔ لیکن ابو حیان نے البحر المحیط میں ابن عباس اور قتادہ اور ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک خود اس سورہ کے اندر ایک داخل شہادت ایسی موجود ہے جو اس کے مدنی ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس میں اُن نماز پڑھنے والوں کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے اور دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ منافقین کی یہ قسم مدینہ ہی میں پائی جاتی تھی، کیونکہ وہیں اسلام اور اہل اسلام کو یہ قوت حاصل ہوئی تھی کہ بہت سے لوگوں کو مصلحتاً ایمان لانا پڑا تھا اور وہ مجبوراً مسجد میں آتے تھے، جماعت میں شریک ہوتے تھے اور دکھاوے کی نمازیں پڑھتے تھے، تاکہ انہیں مسلمانوں میں شمار کیا جائے اس کے برعکس کتبے میں ایسے حالات سرے سے موجود ہی نہ تھے کہ وہاں کسی کو دکھاوے کی نماز پڑھنی پڑتی۔ وہاں تو اہل ایمان کے لیے نماز باجماعت کا اہتمام ہی مشکل تھا۔ اُن کو چھپ چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی تھی اور کوئی علانیہ پڑھنا تھا تو جان پھیل کر پڑھنا تھا۔ منافقین کی جو قسم وہاں پائی جاتی تھی وہ ریاکارانہ ایمان لانا اور دکھاوے کی نمازیں پڑھنے والوں کی نہیں، بلکہ اُن لوگوں کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برسرِ حق ہونے کو جان اور جان گئے تھے، مگر اُن میں سے کوئی اپنی ریاست و دجاہت اور مشیخت کو برقرار رکھنے کی خاطر اسلام قبول کرتے سے گریز نہ کرتا تھا اور کوئی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان ہو کر اُن مصائب میں مبتلا ہو جائے جن میں وہ ایمان لانے والوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مبتلا ہونے دیکھ رہا تھا۔ مکی دور کے منافقین کی یہ حالت سورہ عنکبوت، آیات ۱۰-۱۱ میں بیان کی گئی ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، عنکبوت، حواشی ۱۳ تا ۱۶)۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع یہ بتانا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا انسان کے اندر قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔ آیت

۲ اور ۳ میں اُن کفار کی حالت بیان کی گئی ہے جو علانیہ آخرت کو جھٹلاتے ہیں۔ اور آخری چار آیتوں میں اُن منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں، مگر دل میں آخرت اور اس کی جزا و سزا اور اس کے ثواب و عقاب کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ مجموعی طور پر دونوں قسم کے گروہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہے کہ انسان کے اندر ایک مضبوط اور مستحکم پاکیزہ کردار عقیدہ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

رُكُوعَهَا

سُورَةُ الْمَاعُونِ مَكِّيَّةٌ

آيَاتُهَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَرۡءَیۡتَ الَّذِیۡ یُكۡذِبُ بِالۡدِیۡنِ ۱؎ فَذٰلِكَ الَّذِیۡ یَدۡعُ الۡیَتِیۡمَ ۲؎
 وَلَا یَحۡضُ عَلٰی طَعَامِ الْمِسۡكِیۡنِ ۳؎ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصۡلِیۡنَ ۴؎ الَّذِیۡنَ
 هُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاهُونَ ۵؎ الَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُونَ ۶؎
 وَیَمۡنَعُونَ الْمَاعُونَ ۷؎

تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے، وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اگستا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔

۱؎ تم نے دیکھا کا خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر قرآن کا انداز بیان یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ عموماً ہر صاحب عقل اور سوچنے سمجھنے والے شخص کو مخاطب کرتا ہے۔ اور دیکھنے کا مطلب آنکھوں سے دیکھنا بھی ہے، کیونکہ آگے لوگوں کا جو حال بیان کیا گیا ہے وہ ہر دیکھنے والا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اور اس کا مطلب جاننا، سمجھنا اور غور کرنا بھی ہے۔ عربی کی طرح اردو میں بھی دیکھنے کا لفظ اس دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "میں دیکھ رہا ہوں" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں جانتا ہوں، یا مجھے خبر ہے۔ یا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "ذرا یہی تو دیکھو" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذرا اس بات پر بھی غور کرو۔ پس اگر لفظ اَدْعٰی ت کو اس دوسرے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "جانتے ہو وہ کیسا شخص ہے جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟" یا "تم نے غور کیا اس شخص کے حال پر جو جزائے اعمال کی تکذیب کرتا ہے؟"

۲؎ اصل میں یُكۡذِبُ بِالۡدِیۡنِ فرمایا گیا ہے۔ الدین کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں آخرت کی جوائے اعمال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دین اسلام کے لیے بھی۔ لیکن جو مضمون آگے بیان ہوا ہے اس کے ساتھ پہلے معنی ہی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، اگرچہ دوسرے معنی بھی سلسلہ کلام سے غیر مطابق نہیں ہیں۔ ابن عباس نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے، اور اکثر مفسرین پہلے معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر پہلے معنی لیے جائیں تو پوری سورۃ کے مضمون کا مطلب یہ ہوگا کہ آخرت کے انکار کا عقیدہ انسان میں یہ میرٹ و کردار پیدا کرتا ہے۔ اور

دوسرے معنی لیے جائیں تو پوری سورۃ کا مدعا دین اسلام کی اخلاقی اہمیت واضح کرنا قرار پائے گا۔ یعنی کلام کا مقصد یہ ہو گا کہ اسلام اُس کے برعکس سیرت و کردار پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس دین کا انکار کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔

۱۵ اندازہ کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس سوال سے بات کا آغاز کرنے کا مقصد یہ پوچھنا نہیں ہے کہ تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے یا نہیں، بلکہ سامع کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دینا ہے کہ آخرت کی جزا و سزا کا انکار آدمی میں کس قسم کا کردار پیدا کرتا ہے، اور اُسے یہ جاننے کا خواہشمند بنانا ہے کہ اس عقیدے کو جھٹلانے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں تاکہ وہ ایمان بالآخرت کی اخلاقی اہمیت سمجھنے کی کوشش کرے۔

۱۶ اصل میں فِذَالِکَ الَّذِیْ فرمایا گیا ہے۔ اس فقرے میں فت ایک پورے جملے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "اگر تم نہیں جانتے تو تمہیں معلوم ہو کہ وہی تو ہے جو" یا پھر یہ اس معنی میں ہے کہ "اپنے اسی انکار آخرت کی وجہ سے وہ ایسا شخص ہے جو"

۱۷ اصل میں یَدَاؤُ الْیَدِیْبِہِ کا فقرہ استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یتیم کا حق مار کھاتا ہے اور اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی میراث سے بے دخل کر کے اسے دھکے مار کر نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یتیم اگر اس سے مدد مانگنے آتا ہے تو رحم کھانے کے بجائے اسے دھتکار دیتا ہے اور پھر بھی اگر وہ اپنی پریشان حالی کی بنا پر رحم کی امید لیے ہوئے کھڑا رہے تو اسے دھکے دے کر دفع کر دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ یتیم پر ظلم ڈھاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں اگر اس کا اپنا ہی کوئی رشتہ دار یتیم ہو تو اس کے نصیب میں سارے گھر کی خدمتگاری کرنے اور بات بات پر جھڑکیاں اور ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اس فقرے میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ اُس شخص سے کبھی کبھار بے ظالمانہ حرکت سرزد نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کی عادت اور اس کا مستقل رویہ یہی ہے۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کوئی بُرا کام ہے جو وہ کر رہا ہے۔ بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ روش اختیار کیے رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یتیم ایک بے بس اور بے یار مددگار مخلوق ہے، اس لیے کوئی ہرج نہیں اگر اس کا حق مار کھایا جائے، یا اسے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا کر رکھا جائے یا وہ مدد مانگنے کے لیے آئے تو اسے دھتکار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماورزی نے اپنی کتاب اَعْلَامُ النَّبُوَّةِ میں لکھا ہے۔ ابو جہل ایک یتیم کا دمی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اُسے کچھ دیدے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پیٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہ شرارت اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابو جہل سے سفارش کر کے تجھے نیز مال دلوادیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابو جہل کا حضور سے کیا تعلق ہے اور یہ بد بخت اُسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضور کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابو جہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کر اس نے آپ کا استقبال کیا اور جب آپ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو، تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار بھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابو جہل کے پاس آئے

اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم، میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے بڑے بڑے سرداروں کا تقیوں اور دوسرے بے یار مددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپ کے اس اخلاق کا آپ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا رعب تھا، سنی قسم کا ایک واقعہ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۱۷۶ پر نقل کر چکے ہیں جو حضور کے اُس زبردست اخلاقی رعب پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے کفار و قریش آپ کو جاویدگر کہتے تھے۔

۷۷ اِطْعَامِ الْمَسْكِينِ نہیں بلکہ **طَعَامِ الْمَسْكِينِ** کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر اطعام المسکین کہا گیا ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکتا تا لیکن طعام المسکین کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکتاتا۔ بالفاظ دیگر جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں بلکہ اُس مسکین کا کھانا ہے، وہ اُس کا حق ہے جو دینے والے پر عائد ہوتا ہے، اور دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ اُس کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہی بات ہے جو سورۃ ذاریات آیت ۱۹ میں فرمائی گئی ہے کہ **رَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ** اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

۷۸ كَايْحٰصٍ کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے نفس کو بھی اس کام پر آمادہ نہیں کرتا، اپنے گھروالوں کو بھی یہ نہیں کہتا کہ مسکین کا کھانا دیا کریں، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس بات پر نہیں اکتاتا کہ معاشرے میں جو غریب و محتاج لوگ بھوکے مر رہے ہیں ان کے حقوق پہچانیں اور ان کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکارِ آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود ان دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے میں یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارنے میں اور مسکینوں کا کھانا دینے پر نہیں اکتاتے۔ بلکہ جو بے شمار خرابیاں اس گمراہی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں ان میں سے دو ایسی چیزیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان ماننے لگا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی ردائیں ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کبینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں جو یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے، اس کو دھتکارے، اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔ آخرت کا یقین رکھنے والوں کے اوصاف تو وہ ہیں جو سورۃ بقرہ اور سورۃ بلد میں بیان کیے گئے ہیں کہ **وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ** (وہ ایک دوسرے کو غنیمت پر رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں) اور **وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ** (وہ ایک دوسرے کو حق پرستی اور ادا سے حقوق کی نصیحت کرتے ہیں)۔

۷۹ نَوِيْلٍ لِّلْمَسْكِيْنَ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں اس معنی میں ہے کہ کھلے کھلے منکرینِ آخرت کا حال تو یہ تھا جو ابھی تم نے سنا، اب ذرا ان منافقوں کا حال بھی دیکھو جو نماز پڑھنے والے گروہ، یعنی مسلمانوں میں شامل ہیں۔ وہ چونکہ بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود آخرت کو جھوٹ سمجھتے ہیں، اس لیے زیادہ بھوکہ وہ اپنے لیے کس نہا ہی کا سامان کر رہے ہیں۔

مُصَلِّينَ کے معنی تو ” نماز پڑھنے والوں“ کے ہیں لیکن سب سلسلہ کلام میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور آگے ان لوگوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کے لحاظ سے اس لفظ کے معنی درحقیقت نمازی ہونے کے نہیں بلکہ اہل صلوٰۃ، یعنی مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔

۹ فِي صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ نہیں کہا گیا بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ کہا گیا ہے۔ اگر فی صلوٰۃ تم کے الفاظ استعمال ہوتے تو مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی نماز میں بھولتے ہیں۔ لیکن نماز پڑھتے پڑھتے کچھ بھول جانا شریعت میں نفاق تو درکنار گناہ بھی نہیں ہے، بلکہ سرے سے کوئی عیب یا قابل گرفت بات تک نہیں ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی وقت نماز میں بھول لاسحق ہوئی ہے۔ اور حضور نے اس کی تلافی کے لیے سجدہ سہو کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ اس کے برعکس عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی نماز سے غافل ہیں۔ نماز پڑھی تو اور نہ پڑھی تو، دونوں کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے۔ پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ نماز کے وقت کو ٹالتے رہتے ہیں اور جب وہ بالکل ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتے ہیں۔ یا نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو بے دلی کے ساتھ اٹھتے ہیں اور بادل ناخواستہ پڑھ لیتے ہیں جیسے کوئی مصیبت ہے جو ان پر نازل ہو گئی ہے۔ کپڑوں سے کھینچتے ہیں۔ جماعیاں لیتے ہیں۔ خدا کی یاد کا کوئی شائبہ تک ان کے اندر نہیں ہوتا۔ پوری نماز میں نہ ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ انہوں نے کیا پڑھا ہے۔ پڑھ رہے ہوتے ہیں نماز اور دل کہیں اور پڑھ رہتا ہے۔ مارا مارا اس طرح پڑھتے ہیں کہ نہ قیام ٹھیک ہوتا ہے نہ رکوع نہ سجود۔ بس کسی نہ کسی طرح نماز کی شکل بنا کر جلدی سے جلدی فارغ ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ کسی جگہ بچس گئے تو نماز پڑھ لی، ورنہ اس عبادت کا کوئی مقام ان کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ نماز کا وقت آتا ہے تو انہیں محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ نماز کا وقت ہے۔ مؤذن کی آواز کان میں آتی ہے تو انہیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ کیا پکار رہا ہے، کس کو پکار رہا ہے اور کس لیے پکار رہا ہے۔ یہی آخرت پر ایمان نہ ہونے کی علامات ہیں۔ کیونکہ دراصل اسلام کے تدعیوں کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نہ نماز پڑھنے پر کسی جزا کے قائل ہیں اور نہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اس کے نہ پڑھنے پر کوئی سزا ملے گی۔ اسی بنا پر حضرت انس بن مالک اور عطاء بن دینار کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے اس نے فی صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ نہیں بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ فرمایا۔ یعنی ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں منافقین کی اس کیفیت کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وَكَأَيُّنَ الصَّلٰوةِ اِذَا وَهَمُّوْا كَسٰلٰی وَاَلَا يَتَّقُوْنَ اِذَا وَهَمُّوْا كِرٰهُوْنَ ۝ ”وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر گنہگار ہوتے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرنے مگر بادل ناخواستہ“ (التوبہ-۵۴)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تَلٰكْ صَلٰوةٌ الْمُنٰفِقِ، تَلٰكْ صَلٰوةٌ الْمُنٰفِقِ، تَلٰكْ صَلٰوةٌ الْمُنٰفِقِ يَجْلِسُ بِرَقَبِ الشَّمْسِ حَتّٰى اِذَا كَانَتْ بَيْنَ قَرْنِ الشَّيْطٰنِ قَامَ فَقَرَارًا بَعَا لَئِيْذَكَ اللهُ فِيهَا اَلَا قَلِيْلًا ”یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ یہ منافق کی نماز ہے۔ غصہ کے وقت بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، بیان تک کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے (یعنی غروب کا وقت قریب آجاتا ہے) تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے جن میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے“ (بخاری)۔ مسلم رحمہ اللہ۔ حضرت سعد بن ابی وقاص سے ان کے صاحبزادے نضیب بن سعد روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا تھا جو نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کا وقت ٹال کر پڑھتے ہیں

ابن جریر البزعی - ابن المنذر - ابن ابی حاتم - طبرانی فی الاوسط - ابن مردودہ بیہقی فی السنن - یہ روایت حضرت سعد کے اپنے قول کی حیثیت سے بھی موقوفاً نقل ہوئی ہے اور اس کی سند زیادہ قوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حیثیت سے اس کی مرفوعاً روایت کو بیہقی اور حاکم نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت مصعب کی دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ اس آیت پر آپ نے غور فرمایا؟ کیا اس کا مطلب نماز کو چھوڑ دینا ہے؟ یا اس سے مراد نماز پڑھتے پڑھتے آدمی کا خیال کہیں اور چلا جانا ہے؟ خیال بٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی؟ انہوں نے جواب دیا نہیں، اس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے (ابن جریر ابن ابی شیبہ، البزعی، ابن المنذر، ابن مردودہ بیہقی فی السنن)۔

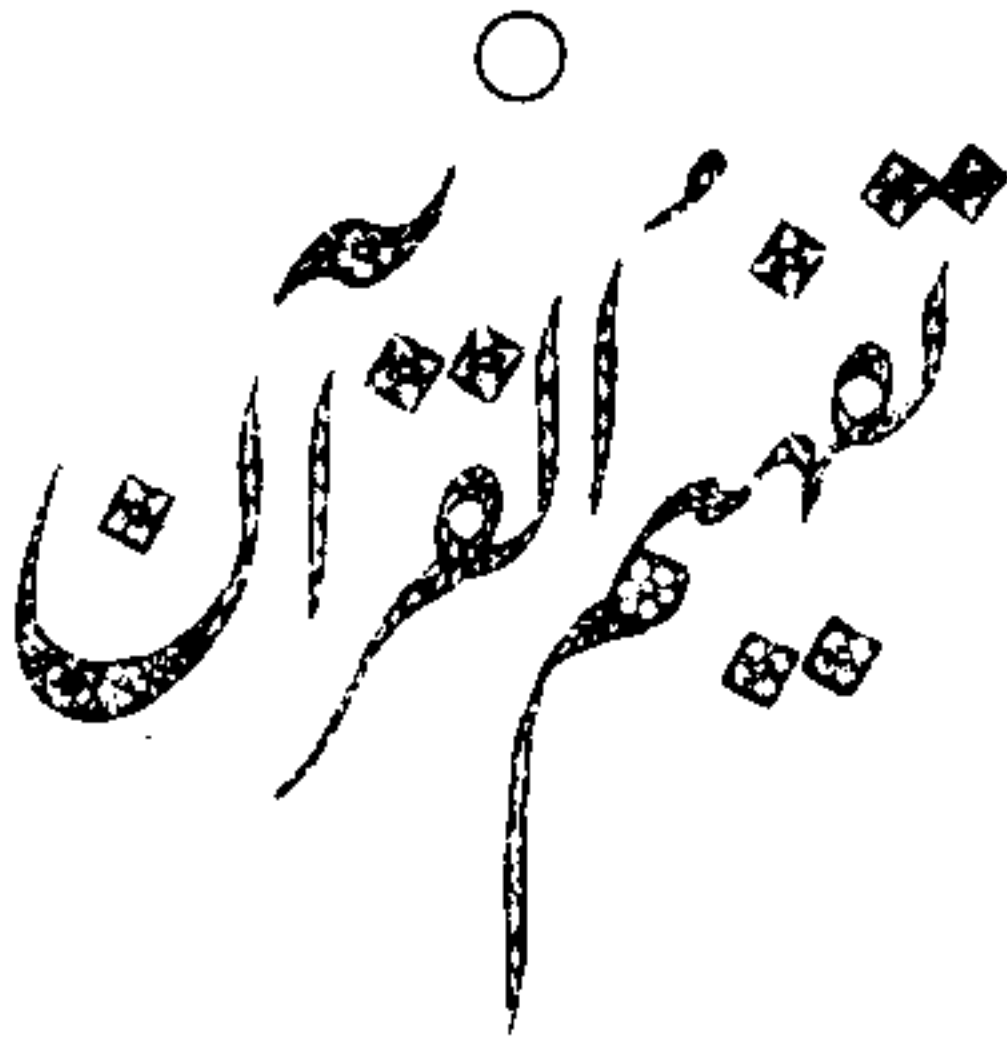
اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ نماز میں دوسرے خیالات کا آجانا اور چیز سے اور نماز کی طرف کبھی متوجہ نہ ہونا اور اس میں ہمیشہ دوسری باتیں ہی سوچتے رہنا بالکل دوسری چیز۔ پہلی حالت تو بشریت کا تقاضا ہے، بلا ارادہ دوسرے خیالات آ ہی جاتے ہیں، اور مومن کو جب بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ نماز سے اس کی توجہ بٹ گئی ہے تو وہ پھر کوشش کر کے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ دوسری حالت نماز سے غفلت برتنے کی تعریف میں آتی ہے، کیونکہ اس میں آدمی صرف نماز کی ورزش کر لیتا ہے، خدا کی یاد کا کوئی ارادہ اس کے دل میں نہیں ہوتا، نماز شروع کرنے سے سلام پھیرنے تک ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اور جن خیالات کو لیے ہوئے وہ نماز میں داخل ہوتا ہے انہی میں مستغرق رہنا ہے۔

۱۰ یہ فقرہ ایک مستقل فقرہ ہی ہو سکتا ہے اور پہلے فقرے سے متعلق بھی۔ اگر اسے ایک مستقل فقرہ قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی نیک کام بھی وہ خالص نیت کے ساتھ خدا کے لیے نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کرتے ہیں دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں تاکہ ان کی تعریف ہو، لوگ ان کو نیکو کار سمجھیں، ان کے کار خیر کا ڈھنڈورا دینا میں پٹے، اور اس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں انہیں دینا ہی میں حاصل ہو جائے۔ اور اگر اس کا تعلق پہلے فقرے کے ساتھ مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ دکھاوے کی غماز میں پڑھتے ہیں۔ مفسرین نے بالعموم دوسرے ہی معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ پہلی نظر میں ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تعلق پہلے فقرے سے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں: "اس سے مراد منافقین میں جو دکھاوے کی غماز پڑھتے تھے، اگر دوسرے لوگ موجود ہوتے تو پڑھ لیتے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو نہیں پڑھتے تھے" دوسری روایت میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "تہا ہوتے تو نہ پڑھتے اور علانیہ پڑھ لیتے تھے" (ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردودہ، بیہقی فی الشعب)۔ قرآن مجید میں بھی منافقین کی یہ حالت بیان کی گئی ہے کہ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَانِي يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا۔ "اور جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسما تے ہوئے اٹھتے ہیں، لوگوں کو دکھانے میں، اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں" (النساء - ۱۱۲)۔

اللہ اصل میں لفظ ماعون استعمال ہوا ہے۔ حضرت علیؑ، ابن عمرؓ، سعید بن جبیرؓ، قتادہ، حسن بصریؒ، محمد بن حنفیہؒ، ضحاک، ابن زبیر، عکرمہ، مجاہد، عطاء اور زہری رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، ابراہیم نخعیؒ، ابو مالکؓ اور بہت سے دوسرے حضرات کا قول ہے کہ اس سے مراد عام ضرورت کی اشیاء، مثلاً ہنڈیا، ڈول، کھانسی، ترازو، نمک، پانی، آگ، پتھاق (جس کی جانتین اب دیا سلائی ہے) وغیرہ ہیں جو عموماً لوگ ایک دوسرے سے عاریتہ مانگتے رہتے ہیں۔ سعید بن جبیر اور مجاہد کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ حضرت علیؑ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ بھی ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی عام ضروریات کی چیزیں بھی۔ عکرمہ سے

ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ ماعون کا اعلیٰ مرتبہ زکوٰۃ ہے اور ادنیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ کسی کو تھپلنی، ڈول یا سوئی عاریتہً دی جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہا کرتے تھے (اور بعض روایات میں ہے کہ حضور کے عبد مبارک میں یہ کہا کرتے تھے) کہ ماعون سے مراد ہنڈیا، کلھاڑی، ڈول، نراند، اور ایسی ہی دوسری چیزیں مستعار دینا ہے (ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابو داؤد، نسائی، ابن زرارہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، جرائنی فی الاوسط، ابن مردودہ، سنن فی السنن، سعد بن جبلی ناموں کی تصریح کے بغیر قریب قریب یہی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے نقل کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے متعدد صحابہ سے یہ بات سنی تھی را بن جریر، ابن ابی شیبہ، ذہبی، ابن عساکر اور ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ اس سے مراد کلھاڑی اور ڈول اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو غالباً یہ دوسرے لوگوں کے علم میں نہ آئی ہوگی، ورنہ ممکن نہ تھا کہ پھر کوئی شخص اس آیت کی کوئی اور تفسیر کرتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ماعون چھوٹی اور قلیل چیز کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کے لیے کوئی منفعت یا فائدہ ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ بھی ماعون ہے، کیونکہ وہ سنت سے مال میں سے فقورِ اسامان ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے دینا ہوتا ہے، اور وہ دوسری عام ضرورت کی اشیاء بھی ماعون ہیں جن کا ذکر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے ہم خیال حضرات نے کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ماعون کا اطلاق ان تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہوتا ہے جو عادتاً ہمسایہ ایک دوسرے سے مانگتے رہتے ہیں۔ ان کا مانگنا کوئی ذلت کی بات نہیں ہوتا، کیونکہ غریب اور امیر سب ہی کو کسی نہ کسی وقت ان کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ البتہ ایسی چیزوں کو دینے سے نخل برتنا، اخلاقاً ایک ذلیل حرکت سمجھا جاتا ہے۔ عموماً ایسی چیزیں بچائے خود باقی رہتی ہیں اور ہمسایہ ان سے کام لے کر انہیں جوں کا توں واپس نہ دیتا ہے۔ اسی ماعون کی تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ کسی کے ہاں سمان آجائیں اور وہ ہمسائے سے چارپائی یا بستر مانگ لے۔ یا کوئی اپنے ہمسائے کے تنور میں اپنی روٹی پکا لیتے کی اجازت مانگے۔ یا کوئی کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہو اور حفاظت کے لیے اپنا کوئی قیمتی سامان دوسرے کے ہاں رکھوانا چاہے۔ پس آیت کا مقصود یہ بتانا ہے کہ آخرت کا انکار آدمی کو اتنا تنگ دل بنا دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کوئی معمولی ایشیا کرنے کے لیے بھی نیا نہیں ہوتا۔



الكوثر

(١٠٨)

الکوثر

نام | اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ كے لفظ کوثر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

ترجمہ نزول | ابن مردودوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ سے نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ نازل ہوئی اور مخالف بھی اسے کئی کہتے ہیں، اور جمہور مفسرین کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن حضرت حسن بصریؒ، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کو مدنی قرار دیتے ہیں، امام سیوطی نے ائقان میں اسی قول کو صحیح ٹھہرایا ہے، اور امام نووی نے شرح مسلم میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ وجہ اس کی وہ روایت ہے جو امام احمد، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن مردودوی اور ترمذی وغیرہ محدثین نے حضرت انس بن مالک سے نقل کی ہے کہ حضور ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ اتنے میں آپ پر کچھ اونگھ سی طاری ہوئی، پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر مبارک اٹھایا۔ بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا آپ کس بات پر تبسم فرما رہے ہیں؟ اور بعض میں ہے کہ آپ نے خود لوگوں سے فرمایا اس وقت میرے اوپر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے۔ پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر آپ نے سورۃ کوثر پڑھی۔ اس کے بعد آپ نے پوچھا جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ فرمایا وہ ایک نبر ہے جو میرے رب نے مجھے جنت میں عطا کی ہے (اس کی تفصیل آگے کوثر کی تشریح میں آرہی ہے)۔ اس روایت سے اس سورہ کے مدنی ہونے پر اس وجہ سے استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت انسؓ مکہ میں نہیں بلکہ مدینے میں تھے، اور ان کا یہ کہنا کہ ہماری موجودگی میں یہ سورۃ نازل ہوئی، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مدنی ہے۔

مگر اول تو انہی حضرت انس سے امام احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور ابن جریر نے یہ روایات نقل کی ہیں کہ جنت کی یہ نبر (کوثر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں دکھائی جا چکی تھی، اور سب کو معلوم ہے کہ معراج ہجرت سے پہلے مکہ میں ہوئی تھی۔ دوسرے، جب معراج میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے اس عطیہ کی نہ صرف خبر دی جا چکی تھی بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کر دیا گیا تھا تو کوثری وجہ نہ تھی کہ حضور کو اس کی خوشخبری دینے کے لیے مدینہ طیبہ میں سورۃ کوثر نازل کی جاتی۔ تیسرے، اگر صحابہ کے ایک مجمع میں حضور نے خود سورۃ کوثر کے نزول کی وہ خبر دی جوتی جو حضرت انسؓ کی مذکورہ بالا روایت میں بیان ہوئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا کہ پہلی مرتبہ یہ سورۃ اسی وقت نازل ہوئی ہے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے باخبر صحابہ اس سورۃ کو کئی قرار دیتے اور جمہور مفسرین اس کے کئی ہونے کے قائل ہو جاتے؟ اس معاملہ پر غور کیا جائے تو حضرت انسؓ کی روایت میں یہ خلاصہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں یہ تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے کہ جس مجلس میں حضور نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی

اُس میں پہلے سے کیا گفتگو چلی رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس وقت حضور کسی مسئلے پر کچھ ارشاد فرما رہے ہوں، اُس کے دوران میں وحی کے ذریعہ سے آپ کو مطلع کیا گیا ہو کہ اس مسئلے پر سورہ کوثر سے روشنی پڑتی ہے، اور آپ نے اسی بات کا ذکر یوں فرمایا ہو کہ مجھ پر یہ سورہ نازل ہوئی ہے۔ اس قسم کے واقعات متعدد مواقع پر پیش آئے ہیں جن کی بنا پر مفسرین نے بعض آیات کے متعلق کہا ہے کہ وہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔ اس دوسرے نزول کا مطلب دراصل یہ ہونا ہے کہ آیت تو پہلے نازل ہو چکی تھی، مگر دوسری بار کسی موقع پر حضور کو بدرجہہ وحی اُسی آیت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ایسی روایات میں کسی آیت کے نزول کا ذکر یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا کہ وہ کئی ہے یا مدنی، اور اس کا اصل نزول فی الواقع کس زمانے میں ہوا تھا۔

حضرت انسؓ کی یہ روایت اگر شک پیدا کرنے کی موجب نہ ہو تو سورہ کوثر کا پورا مضمون بجائے خود اس امر کی شہادت عتیقا ہے کہ یہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی اور اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب حضور کو انتہائی دل شکن حالات سے سابقہ درپیش تھا۔

تاریخی پس منظر | اس سے پہلے سورہ صغیٰ اور سورہ الم نشرح میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حامل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضور اور آپ کے چند صحابی بھرا ہونے کو دور دور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپ کو تسلی دینے اور آپ کی ہمت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں۔ سورہ صغیٰ میں فرمایا: **لَا يَخُذُكَ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُدْنٰى ۝ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى**۔ اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور (یعنی ہر بعد کا دور) پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔ اور الم نشرح میں فرمایا کہ **وَدَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ** اور ہم نے تمہارا آواز بلند کر دیا۔ یعنی دشمن نہیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں مگر ہم نے اُن کے علی الرغم تمہارا نام روشن کرنے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے۔ اور **فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا** پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ یعنی اس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب یہ مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورہ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضور کو تسلی بھی دی اور آپ کے مخالفین کے نباہ دہر بباد ہونے کی پیشینگوئی بھی فرمائی۔ قریش کے کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور اُن کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے۔ عکرمہ کی روایت ہے کہ جب حضور نبی بنا گئے اور آپ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے **بئس جہدٌ منا** (ابن جریر) یعنی تمہاری قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور متوقع یہی ہو

کہ کچھ مدت بعد وہ سوکھ کر بیوند خاک ہو جائے گا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا "اجی چھوڑو انہیں، وہ تو ایک ابن زجر کٹے (آدمی ہیں، ان کی کوئی اولاد نہ رہے گی)۔" مر جانیں گے تو کوئی ان کا نام لہو بھی نہ ہوگا، شمر بن عطیہ کا بیان ہے کہ عقبہ بن ابی معیط بھی ایسی ہی باتیں حضور کے متعلق کہا کرتا تھا ابن جریر بن عباس کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کعب بن اشرف (مدینہ کا یہودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا "اتری الی هذا الصبی المبتور من قومہ یزعم انہ خیر منا ومن اهل الحجیہ و اهل السدانہ و اهل السفایئ بلادیکم تو سہی، اس لڑکے کو تو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے، حالانکہ ہم حج اور سداقت اور سقاقت کے منتظم ہیں" (بتزار)۔ اسی واقعہ کے متعلق عکرمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضور کے لیے الصُّبُورُ الْمُبْتَرُ مِنْ قَوْمِهِ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی "کمزور، بے یار و مددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے" (ابن جریر)۔ ابن سعد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحب زادے قاسم تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینب تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہ تھے، پھر علی الترتیب تین صاحبزادے ابان، مکنثم، فاطمہ اور زینب تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسم کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہو گئی۔ اب وہ ابتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا ان محمد ابن زکرا ابن لہ یقوم مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ واستوحتم منہ "محمد ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ای سے تمہارا بیچھا پھوٹ جائے گا" عبد بن حمید نے ابن عباس کی جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے صاحبزادے عبداللہ کی وفات پر ابو جہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضور کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عقبہ بن ابی معیط نے کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضور کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضور کا اپنا بیچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضور کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بنو محمد اللیلۃ۔

"آج رات محمد لا ولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی"

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورہ کوثر حضور پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو اپنے علاوہ رد کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ سے چھین لیا گیا تھا اور آپ کو یارادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپ کے چند مٹھی بھر ساغنی بھی سب بے یار و مددگار تھے اور مار سے کھد بڑے جارہے تھے۔ اس پر مزید آپ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے عموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت

کے بچانے وہ خوشحیاں منائی جا رہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مختصر ترین سورۃ کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دنیائے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی۔ اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کاٹ جائے گی۔

آيَاتُهَا ۳

سُورَةُ الْكُوْثِرِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكُوْثَرَ ۱ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَاَنْحَرْ ۲

اِنْ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۳

(اے نبی) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔

تمہارا دشمن بھی بچ کر رہے گا۔

۱۔ کوثر کا لفظ بیان جس طرح استعمال کیا گیا ہے اس کا پورا مفہوم ہماری زبان تو درکنار، شاید دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک لفظ سے اور انہیں کیا جاسکتا۔ یہ کثرت سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے لغوی معنی تو یہ انتہا کثرت کے ہیں، مگر جس موقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اُس میں محض کثرت کا نہیں بلکہ خیر اور بھلائی اور نعمتوں کی کثرت، اور ایسی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے جو افراط اور فراوانی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو، اور اُس سے مراد کسی ایک خیر یا بھلائی یا نعمت کی نہیں بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔ دیکھا ہے میں اس سورہ کا جو پس منظر ہم نے بیان کیا ہے اُس پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال کر دیکھیے۔ حالات وہ تھے جب دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر حیثیت سے تباہ ہو چکے ہیں۔ قوم سے کٹ کر بے یار و مددگار رہ گئے۔ تجارت برباد ہو گئی۔ اولاد زہینہ تھی جس سے آگے اُن کا نام چل سکتا تھا۔ وہ بھی وفات پا گئی۔ بات ایسی لے کر اٹھے ہیں کہ چند گننے پینے آدی چھوڑ کر مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس کو سنا تک گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے اُن کے مقتدر میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ جیتے جی ناکامی و نامرادی سے دو چار ہیں اور جب وفات پا جائیں تو دنیا میں کوئی اُن کا نام لیا بھی نہ ہو۔ اس حالت میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمایا گیا کہ ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا تو اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمہارے مخالف بنے و قوت تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم برباد ہو گئے اور نبوت سے پہلے جو نعمتیں تمہیں حاصل تھیں وہ بھی تم سے چھین گئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمہیں بے انتہا خیر اور بے شمار نعمتوں سے نوازا دیا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ بے نظیر خوبیاں بھی شامل ہیں جو حضور کو بخشی گئیں۔ اس میں نبوت اور قرآن اور علم اور حکمت کی وہ عظیم نعمتیں بھی شامل ہیں جو آپ کو عطا کی گئیں۔ اس میں توحید اور ایک ایسے نظام زندگی کی نعمت بھی شامل ہے جس کے سیدھے سادھے، عام فہم، عقل و فطرت کے مطابق اور جامع و ہمہ گیر اصول تمام عالم میں پھیل جانے اور ہمیشہ پھیلتے ہی چلے جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس میں رفع ذکر کی نعمت بھی شامل ہے جس کی بدولت حضور کا نام نامی چورہ سو برس سے دنیا کے گوشے گوشے میں بلند ہو رہا ہے اور قیامت تک بلند ہوتا رہے گا۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ آپ کی دعوت سے بالآخر ایک ایسی عالمگیر امت وجود میں آئی جو دنیا میں ہمیشہ کے لیے دین حق کی علمبردار بن گئی، جس سے زیادہ نیک اور پاکیزہ اور بلند پایہ انسان دنیا کی کسی امت میں کبھی پیدا نہیں ہوئے، اور جو بگاڑ کی حالت کو پہنچ کر بھی دنیا کی سب قوموں سے بڑھ کر

خیر اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ حضور نے اپنی آنکھوں سے اپنی سیات مبارکہ ہی میں اپنی دعوت کو انتہائی کامیاب دیکھ لیا اور آپ کے ہاتھوں سے وہ جماعت تیار ہو گئی جو دنیا پر چھا جانے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس میں یہ نعمت بھی شامل ہے کہ اولاد عربینہ سے محروم ہو جانے کی بنا پر دشمن تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائے گا، لیکن اللہ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی صورت میں آپ کو وہ روحانی اولاد عطا فرمائی جو قیامت تک تمام روئے زمین پر آپ کا نام روشن کرنے والی ہے، بلکہ آپ کی صرف ایک ہی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے آپ کو وہ جسمانی اولاد بھی عطا کی جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کا سارا سرمایہ افتخار ہی حضور سے اس کا انتساب ہے۔

یہ تو وہ نعمتیں ہیں جو اس دنیا میں لوگوں نے دیکھ لیں کہ وہ کس فراوانی کے ساتھ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں ان کے علاوہ کوثر سے مراد دو مزید ایسی عظیم نعمتیں بھی ہیں جو آخرت میں اللہ تعالیٰ آپ کو دینے والا ہے۔ ان کو جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان کی خبر دی اور بتایا کہ کوثر سے مراد وہ بھی ہیں۔ ایک حوض کوثر جو قیامت کے روز میدان حشر میں آپ کو ملے گا۔ دوسرے نہر کوثر جو جنت میں آپ کو عطا فرمائی جائے گی۔ ان دونوں کے متعلق اس کثرت سے احادیث حضور سے منقول ہوئی ہیں اور اتنے کثیر راویوں نے ان کو روایت کیا ہے کہ ان کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

حوض کوثر کے متعلق حضور نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوض قیامت کے روز آپ کو عطا ہوگا اور اس سخت وقت میں جبکہ ہر ایک العطش العطش کر رہا ہوگا، آپ کی امت آپ کے پاس اُس پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی۔ آپ اس پر سب سے پہلے پیئے ہوئے ہوں گے اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہوں گے۔ آپ کا ارشاد ہے: "هو حوض نزل علی امتی یوم القیمة"۔ وہ ایک حوض ہے جس پر میری امت قیامت کے روز وارد ہوگی" (مسلم، کتاب الصلوٰۃ - ابوداؤد، کتاب السنن - انانہ طکم علی الحوض - "میں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہوا ہوں گا" بخاری، کتاب الرقاق اور کتاب الفتن - مسلم، کتاب الفضائل اور کتاب الطہارۃ - ابن ماجہ، کتاب المناسک اور کتاب الزہد - مسند احمد، مرویات عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، ابوبہریرہ)۔ انی فوط لکم داناً شهید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الانی "میں تم سے آگے پہنچنے والا ہوں، اور تم پر گواہی دوں گا اور خدا کی قسم میں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں" بخاری، کتاب الخیرات، کتاب التغازی، کتاب الرقاق)۔ انصار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپ نے فرمایا انکم ستلقون بعدی اثرۃ فاصبروا حق تلقونی علی الحوض "میرے بعد تم کو خود غریبوں اور اقربا نوازوں سے پالا پڑے گا، اس پر صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آکر حوض پر ملو" (بخاری، کتاب مناقب الانصار و کتاب المغازی - مسلم، کتاب الامارہ - ترمذی، کتاب الفتن)۔ انا یوم القیمة عند عقر الحوض "میں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہوں گا" مسلم، کتاب الفضائل)۔ حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے حوض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انہوں نے کہا ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، باہر پار سنا ہے، جو اُس کو جھٹلائے اللہ سے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے (ابوداؤد، کتاب السنن)۔ عبداللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جھوٹ سمجھتا تھا، حتیٰ کہ اس نے حضرت ابوبکرؓ سے اسلی، براء بن عازب اور عائذ بن عمرو کی سب روایات کو جھٹلادیا۔ آخر کار ابوبکرؓ ایک تحریر نکال کر لائے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے سن کر نقل کی تھی اور اس میں

حضور کا یہ ارشاد درج تھا کہ اَلَا اِنَّ هُوَ عَدُوٌّ كَرُهٌ حَوْضِيٌّ "خبردار رہو میری اور تمہاری ملاقات کی جگہ میرا حوض ہے" (مسند احمد) مرویات عبداللہ بن عمرو بن عاص۔

(۲) اُس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے۔ مگر کثیر روایات میں یہ ہے کہ وہ ایلہ (اسرائیل) کے موجودہ بندرگاہ (ایلات) سے یمن کے صنعا تک، یا ایلہ سے عدن تک، یا عمان سے عدن تک طویل ہوگا اور اس کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنا ایلہ سے حُجَفہ (جدہ) اور رابیع کے درمیان ایک مقام تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری، کتاب الرقاق۔ ابوداؤد الطیبی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مسند احمد) مرویات ابوبکر صدیق و عبداللہ بن عمر۔ مسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحر احمر ہی کو حوض کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اس حوض کے متعلق حضور نے بتایا ہے کہ اس میں جنت کی نہر کوثر (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) سے پانی لاکر ڈالا جائے گا۔ یشخب فیہ میزابان من الجنة، اور دوسری روایت میں ہے یغت فیہ میزابان یبتذانہ من الجنة، یعنی اس میں جنت سے دونالیاں لاکر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی (مسلم، کتاب الفضائل)۔ ایک اور روایت میں ہے یفتح نہس من الکوثرالی الحوض، جنت کی نہر کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائے گی (مسند احمد مرویات عبداللہ بن مسعود)۔

(۴) اس کی کیفیت حضور نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی رودہ سے اور بعض روایات میں ہے چاندی سے اور بعض میں برف سے زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی، اس پر اتنے کوزے رکھے ہوں گے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اس کا پانی پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں حضور سے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بکثرت احادیث میں منقول ہوئی ہیں (بخاری، کتاب الرقاق۔ مسلم، کتاب الطہارت و کتاب الفضائل۔ مسند احمد، مرویات ابن مسعود، ابن عمر، و عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامہ۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد۔ ابوداؤد طیبی، حدیث ۹۹۵ (۲۱۳۵)۔

(۵) اس کے بارے میں حضور نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے ان کو اُس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی اُن کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دور ہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب الرقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مسند احمد، مرویات ابن مسعود و ابوبکر صدیق۔ ابن ماجہ، کتاب المناہک۔ ابن ماجہ نے اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے وہ بڑے ہی دروزناک الفاظ میں ہے۔ اس میں حضور فرماتے ہیں الاوانی فہرطکم علی الحوض واکاثر بکم الاعم فلا تسودوا ذہبی، الاوانی مستنقد انا ساو مستنقد انا سہتی فاقول یاربہ سبحانی یقول انک لاتدری ما احد ثواب عبدکم خبردار رہو میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہوں گا اور تمہارے ذریعہ سے دوسری امتوں کے مقابلے میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ اُس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو کچھ لوگوں کو میں چھڑاؤں گا اور کچھ لوگ مجھ سے چھڑائے جائیں گے۔ میں کہوں گا کہ اسے پروردگار، یہ تو میرے صحابی ہیں۔ وہ فرمائے گا تم نہیں جانتے انہوں نے تمہارے بعد کیا نزلے کام کیے ہیں۔ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ یہ الفاظ حضور نے

عزرات کے خطبے میں فرمائے تھے۔

(۶) اسی طرح حضور نے اپنے دور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں رد و بدل کر دیں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا، میں کموں گا کہ اسے رب یہ تو میرے ہیں، میری امت کے لوگ ہیں۔ جواب ملے گا آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا تغیرات کیے اور اُلٹے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔ اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں (بخاری، کتاب المساقات، کتاب الرقاق، کتاب الفتن، مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الفرائض، ابن ماجہ، کتاب الزہد، مسند احمد، مرویات ابن عباس)۔

اس حوض کی روایات ۵۰ سے زیادہ صحابہ سے مروی ہیں، اور سفیان نے بالعموم اس سے مراد حوض کوثر لیا ہے۔ امام بخاری نے کتاب الرقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ باندھا ہے باب فی الحوض وقول اللہ انا اعطینک الکوشر۔ اور حضرت انس کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضور نے کوثر کے متعلق فرمایا ہو حوض تزد علیہ اقی۔ وہ ایک حوض ہے جس پر میری امت وارد ہوگی۔

جنت میں کوثر نامی جو نہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت انس سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں (اور بعض روایات میں مہراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حقیقت سے بیان کرتے ہیں) کہ معراج کے موقع پر حضور کو جنت کی سیر کرائی گئی اور اس موقع پر آپ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پہ اندر سے نرٹے ہوئے موتیوں یا بیروں کے ٹپتے بنے ہوئے تھے۔ اس کی نہ کی مٹی مشک اذخر کی تھی۔ حضور نے جبریل سے، یا اس فرشتے سے جس نے آپ کو سیر کرائی تھی، پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا یہ نہر کوثر ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے (مسند احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابوداؤد طیالسی، ابن جریر)۔ حضرت انس ہی کی روایت ہے کہ حضور سے پوچھا گیا یہ ایک شخص نے پوچھا کوثر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مشک ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن جریر، مسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضور نے نہر کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا اس کی نہ میں کنکر یوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں)۔ ابن عمر فرماتے ہیں کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں، وہ موتیوں اور بیروں پر برہی ہے (یعنی کنکر یوں کی جگہ اس کی نہ میں یہ جو ابر پڑے ہوئے ہیں)۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی دودھ سے (یا برف سے) زیادہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، دارمی، ابوداؤد طیالسی، ابن المنذر، ابن مرددویہ، ابن ابی شیبہ)۔ اسامہ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ گھر پہنچے۔ ان کی اہلیہ نے حضور کی تواضع کی اور دوڑان گفتگو عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو جنت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، اور اس کی نہ میں یا قوت در جان اور زہر جدا در موتوں کی ہے (ابن جریر، ابن مرددویہ)۔ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ان مرفوع

روایات کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے بکثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد جنت کی یہ نہر جلتی ہے اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اوپر گزری ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ، مجاہد، اور ابوالعالیہ کے اقوال مستند، بخاری، ترمذی، نسائی، ابن مردودہ، ابن جریر اور ابن اثیر وغیر محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں۔

۱۵۔ اس کی مختلف تفسیریں مختلف بزرگوں سے منقول ہیں۔ بعض حضرات نے نماز سے مراد پنجوقتہ فرض نماز ہی ہے، بعض اس سے بقرعید کی نماز مراد لیتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ بجائے خود نماز مراد ہے۔ اسی طرح وَأَنْحَرُ یعنی نحر کر کے مراد بعض جلیل القدر بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ نماز میں بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کر اسے سینے پر باندھنا بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کرنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ افتتاح نماز کے وقت، اور رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھ کر رفع یدین کرنا مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بقرعید کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد قربانی کرنا ہے۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ حکم دیا گیا ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کا مطلب صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے نبی، جب تمہارے رب نے تم کو اتنی کثیر اور عظیم بجلائیاں عطا کی ہیں تو تم اسی کے لیے نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو۔ یہ حکم اُس ماحول میں دیا گیا تھا جب مشرکین قریش ہی نہیں تمام عرب کے مشرکین اور دنیا بھر کے مشرکین اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے تھے اور انہی کے آستانوں پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ پس حکم کا منشا یہ ہے کہ مشرکین کے برعکس تم اپنے اسی رویے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو کہ تمہاری نماز بھی اللہ ہی کے لیے ہو اور قربانی بھی اسی کے لیے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا قُلْ لَاتُشْرِكْ بِرَبِّي شَيْئًا وَرَبِّيَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ اے نبی، کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے صراطِ طاعت جھکانے والا ہوں (الانعام ۱۶۲-۱۶۳)۔ یہی مطلب ابن عباس، عطاء، مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ، محمد بن کعب القرظی، ضحاک، ربیع بن انس، عطاء الخراسانی، اور بہت سے دوسرے اکابر مفسرین رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے (ابن کثیر)۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بقرعید کی نماز اور قربانی کا طریقہ جاری کیا تو اس بنا پر کہ آیت اِنِّیْ صَلَّیْتُ وَنَسِیْتُ اور آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَأَنْحَرْ میں نماز کو مقدم اور قربانی کو مؤخر رکھا گیا ہے، آپ نے خود بھی یہ عمل اختیار فرمایا اور اسی کا حکم مسلمانوں کو دیا کہ اُس روز پہلے نماز پڑھیں اور پھر قربانی کریں۔ یہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے، نہ اس کی شان نزول ہے، بلکہ ان آیات سے حضور کا استنباط ہے، اور آپ کا استنباط بھی وحی کی ایک قسم ہے۔

۱۶۔ اصل میں لفظ شَأْنُکَ استعمال ہوا ہے۔ شائی شُن سے ہے جس کے معنی ایسے بعض اور ایسی عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَٰی اَکْاٰتِہُمْ لَوْ اَکْرٰہُوْا۔ اور اسے مسلمانوں کسی گروہ کی عداوت تمہیں اس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو۔ یہیں شَأْنُکَ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا اندھا ہو گیا ہو کہ آپ کو عیب لگانا ہو، آپ کے خلاف بدگوئی کرنا ہو، آپ کی توہین کرنا ہو، اور آپ پر طرح طرح کی باقی چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔

کے ہوا کرتے۔ ”دی ایتز ہے“ فرمایا گیا ہے، یعنی وہ آپ کو ایتز کہتا ہے، لیکن حقیقت میں ایتز وہ خود ہے۔ ایتز کی کچھ تشریح ہم اس سے پہلے اس سورۃ کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ یہ لفظ ایتز سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ مگر محاورے میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اُس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے ایتز کہا گیا ہے، یعنی اکیل رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے کل امر ذی بال لا یبد اذہ بحد اللہ فہو ایتز۔ ”ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ایتز ہے“ یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے، اسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ناسر اور آدمی کو بھی ایتز کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی ایتز کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی غیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب امیدیں منقطع ہو گئی ہوں وہ بھی ایتز ہے۔ جو آدمی اپنے کنبے برادری اور اعداؤں و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو وہ بھی ایتز ہے۔ جس آدمی کی کوئی اولاد نہ رہے نہ ہو یا مر گئی ہو، اس کے لیے بھی ایتز کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیا جاتا نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب ان سب معنوں میں کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایتز کہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی، ایتز تم نہیں ہو بلکہ تمہارے یہ دشمن ایتز ہیں۔ یہ بعض کوئی ”جو ابلی حملہ“ نہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشینگوئیوں میں سے ایک پیشینگوئی تھی جو حرف بھرت صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشینگوئی کی گئی تھی اُس وقت لوگ حضور ہی کو ایتز سمجھ رہے تھے اور کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ایتز ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعداؤں و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائل عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ باوجود وقت تھا کہ غزوہ احزاب (شہدہ) کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضور کو محصور ہو کر شہر کے گرد حندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ شہدہ میں جب آپ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملک عرب حضور کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے، اور آپ کے دشمن بالکل بے بس اور بے بار و بارو ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو ان میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابو جہل یا ابولہب یا عامر بن وائل یا عتبہ بن ابی معیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپ ہی سے نہیں بلکہ آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعث عز و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری، اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابو جہل یا ابولہب نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ایتز حضور نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

تفسير القرآن

الكافرون

(١٠٩)



الکفرۃ

نام | پہلی ہی آیت **قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ** کے لفظ الکافرین کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حسن بصری اور عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے، حضرت عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں مدنی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباس اور قتادہ سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے۔ لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک یہ مکی سورہ ہے، اور اس کا مضمون خود اس کے مکی ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

تاریخی پس منظر | مکہ معظمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جاسکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور ان کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضور نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضور نے فرمایا اچھا، ٹھیکرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی

سہ اس کا مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی درجہ میں بھی اس تجویز کو قابل قبول کیا معنی قابل غور ہی سمجھتے تھے، اور آپ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے۔ بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابل قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اور پیچھے دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ اور یہ کہ قُلْ أَغْفِرَ اللَّهُ تَا مَرُّ دِقِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ۰

راثر (آیت ۶۴)۔ "ان سے کہو، اسے نادانوں کی بات تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں گا (ابن جریر۔ ابن ابی حاتم۔ طبرانی)۔ ابن عباس کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضور سے کہا "اسے محمد اگر تم ہمارے معبود بنوں تو جو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے" اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی (عبد بن حمید)۔

سعید بن میناء را ابو البختری کے آزاد کردہ غلام، کی روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن دائل، اسود بن العطب اور امیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ سے کہا "اسے محمد، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم نے کرائے ہو اس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمہارے ساتھ اس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصہ اس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اس سے بہتر ہوئی جو تمہارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پالیں گے" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ (ابن جریر دین ابی حاتم۔ ابن ہشام نے بھی سیرت میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے)۔

و جب بن میناء کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حمید۔ ابن ابی حاتم)۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفار قریش نے حضور کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دو ٹوک جواب دے کر ان کی اس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کچھ دوا دیکھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔

موضوع اور مضمون اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی نجا و نیر مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی، لیکن یہ اتنی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے ان کو اس سے فوری اور عمل میں براءت کا اظہار کرنا چاہیے اور بلا رور عایت کہہ دینا چاہیے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی ملاہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے یہ سورۃ اس

رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اوپر سے حکومت کا جواب ہی تمہارے مطالبہ کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔

وقت بھی پڑھی جاتی رہی جب وہ لوگ رکھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا، اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے، اور ان کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اس سورہ کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ ذیل کی چند احادیث سے کیا جاسکتا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے بارہا حضور کو فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ اور قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ پڑھتے دیکھا ہے اس مضمون کی متعدد روایات کچھ لفظی اختلافات کے ساتھ امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جبران اور ابن مردودیہ نے ابن عمر سے نقل کی ہیں۔

حضرت نجائب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم سونے کے لیے اپنے بستریہ لیٹو تو قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھ لیا کرو، اور حضور کا خود بھی یہ طریقہ تھا کہ جب آپ سونے کے لیے لیٹتے تو یہ سورہ پڑھ لیا کرتے تھے (بزار، طبرانی، ابن مردودیہ)۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا "میں تمہیں بتاؤں وہ کلمہ جو تم کو شرک سے محفوظ رکھنے والا ہے؟ وہ یہ ہے کہ سوتے وقت قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھ لیا کرو (ابو نعیم، طبرانی)۔

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا سوتے وقت قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ شرک سے براءت ہے (بیہقی فی الشعب)۔

فردہ بن نوفل اور عبدالرحمان بن نوفل، دونوں کا بیان ہے کہ ان کے والد نوفل بن معاویہ الأشجعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جسے میں سوتے وقت پڑھ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ آخر تک پڑھ کر سو جایا کرو، کیونکہ یہ شرک سے براءت ہے (مسند احمد، ابوداؤد وغیرہ)۔

نسائی، ابن ابی شیبہ، حاکم، ابن مردودیہ، بیہقی فی الشعب)۔ ایسی ہی درخواست حضرت زید بن حارثہ کے بھائی حضرت جبیلہ بن حارثہ نے حضور سے کی تھی اور ان کو بھی آپ نے یہی جواب دیا تھا (مسند احمد، طبرانی)۔

آيَاتُهَا ۶ سُورَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ رُّكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۱ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۲ وَلَا اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ ۳ وَلَا اَنَا عٰبِدُ مَا عَبَدْتُمْ ۴ وَلَا اَنْتُمْ
عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُهُ ۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَاِلٰی دِيْنِ ۶

کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور نہ تم
اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا
ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا
ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔

۱۔ اس آیت میں چند باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

(۱) حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے کہ آپ کافروں سے یہ بات صاف صاف کہہ دیں، لیکن آگے کا مضمون یہ بتا رہا ہے کہ
ہر مومن کو وہی بات کافروں سے کہہ دینی چاہیے جو بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہے حتیٰ کہ جو شخص کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آیا ہو اس
کے لیے بھی لازم ہے کہ دین کفر اور اس کی عبادت اور عبودوں سے اسی طرح اپنی برائت کا اظہار کر دے۔ پس لفظ قُلْ (کہہ دو) کے
اولین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر حکم حضور کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپ کے واسطے سے ہر مومن کو پہنچتا ہے۔
(۲) ”کافر“ کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے جو اس آیت کے مخاطبوں کو دی گئی ہو، بلکہ عربی زبان میں کافر کے معنی انکار کرنے والے
اور نہ ماننے والے (Unbeliever) کے ہیں، اور اس کے مقابلے میں ”مومن“ کا لفظ مان لینے اور تسلیم کر لینے والے (Believer) کے
کے لیے بولا جاتا ہے۔ لہذا اللہ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ”اے کافر“ دراصل اس معنی میں ہے کہ ”اے وہ لوگو جنہوں نے
میری رسالت اور میری لائی ہوئی تعلیم کو ماننے سے انکار کر لیا ہے“ اور اسی طرح ایک مومن جب یہ لفظ کہے گا تو اس کی مراد محمد صلی اللہ علیہ
وسلم پر ایمان نہ لانے والے ہوں گے۔

(۳) اے کافر و کما ہے، اے مشرک و نہیں کہا، اس لیے مخاطب صرف مشرکین ہی نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کو اللہ تعالیٰ کا رسول، اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم و ہدایت کو اللہ جل شانہ کی تعلیم و ہدایت نہیں مانتے، خواہ وہ بیود ہوں، نصاریٰ ہوں،
مجوسی ہوں، یا دنیا بھر کے کفار و مشرکین اور ملاحدہ ہوں۔ اس خطاب کو صرف قریش یا عرب کے مشرکین تک محدود رکھنے کی کوئی

وجہ نہیں ہے۔

(۴) منکرین کو اسے کافر و کفر خطاب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کچھ لوگوں کو اسے دشمن و بیاد سے مخالف و کفر خطاب کریں۔ اس طرح کا خطاب دراصل مخاطبوں کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ ان کی صفت دشمنی اور صفت مخالفت کی بنا پر ہوتا ہے اور اسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک ان میں یہ صفت باقی رہے۔ اگر ان میں سے کوئی دشمنی و مخالفت چھوڑ دے، یا دوست اور حامی بن جائے تو وہ اس خطاب کا مخاطب نہیں رہتا۔ بالکل اسی طرح جن لوگوں کو اسے کافر و کفر خطاب کیا گیا ہے وہ بھی ان کی صفت کفر کے لحاظ سے ہے نہ کہ ان کی ذاتی حیثیت سے۔ ان میں سے جو شخص مرتے دم تک کافر رہے اس کے لیے تو یہ خطاب دائمی ہوگا، لیکن جو شخص ایمان لے آئے وہ اس کا مخاطب نہ رہے گا۔

(۵) مفسرین میں سے بہت سے بزرگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سورۃ میں "اسے کافر و کفر خطاب قریش کے مرتے ان چند مخصوص لوگوں سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین کے معاملے میں مصالحت کی تجویز نہیں لے کر آ رہے تھے اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ یہ رائے انہوں نے دو وجوہ سے قائم کی ہے۔ ایک یہ کہ آگے لآعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ (جس کی یا جن کی عبادت تم کرتے ہو اس کی یا ان کی عبادت میں نہیں کرتا) فرمایا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قول بیورد و نصاریٰ پر صادق نہیں آتا، کیونکہ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آگے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ دَلَّا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں) اور ان کا استدلال یہ ہے کہ یہ قول ان لوگوں پر صادق نہیں آتا جو اس سورۃ کے نزول کے وقت کافر تھے اور بعد میں ایمان لے آئے۔ لیکن یہ دونوں دلیلیں صحیح نہیں ہیں۔ جہاں تک ان آیتوں کا تعلق ہے ان کی تشریح تو ہم آگے چل کر کریں گے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کا وہ مطلب نہیں ہے جو ان سے سمجھا گیا ہے۔ یہاں اس استدلال کی غلطی واضح کرنے کے لیے صرف اتنی بات کہہ دینا کافی ہے کہ اگر اس سورہ کے مخاطب صرف وہی لوگ تھے تو ان کے مرکب جاننے کے بعد اس سورہ کی تلاوت جاری رہنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ اور اسے مستقل طور پر قرآن میں درج کر دینے کی کیا ضرورت تھی کہ قیامت تک مسلمان اسے پڑھتے رہیں؟

۱۵۲ اس میں وہ سب معبود شامل ہیں جن کی عبادت دنیا بھر کے کفار اور مشرکین کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خواہ وہ ملائکہ ہوں، بن ہوں، انبیاء اور اولیاء ہوں، زندہ یا مردہ انسانوں کی ارواح ہوں، یا سورج، چاند، ستارے، جانور، درخت، دریا، بت اور خیالی دیویاں اور دیوتا ہوں۔ اس پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کو بھی تو معبود مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین نے بھی قدیم زمانے سے آج تک اللہ کے معبود ہونے کا انکار نہیں کیا ہے۔ رہے اہل کتاب تو وہ اصل معبود تو اللہ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ان سب لوگوں کے تمام معبودوں کی عبارت سے کسی استثناء کے بغیر براءت کا اعلان کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ بھی ان میں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معبودوں کے مجموعے میں ایک معبود کی حیثیت سے شامل کر کے اگر دوسروں کے ساتھ اس کی عبادت کی جائے تو وہ شخص جو توحید پر ایمان رکھتا ہو لہذا اس عبادت سے اپنی براءت کا اظہار کرے گا، کیونکہ اس کے نزدیک اللہ معبودوں کے مجموعے میں سے ایک معبود نہیں بلکہ وہی ایک تنہا معبود ہے، اور اس مجموعے کی عبادت اسے سے اللہ کی عبادت ہی نہیں ہے اگرچہ اس میں اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔ قرآن مجید میں اس بات کو صاف صاف کہا گیا ہے

کہ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس میں انسان اپنی بندگی کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کرے۔ وَمَا أُرَادُ إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءً۔ ”لوگوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل نیک سو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی عبادت کریں“ (البینہ - ۵)۔ یہ مضمون بکثرت مقامات پر قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ اور پورے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو النساء، آیات ۱۲۵-۱۲۶-الأعراف، ۲۹-الزمر، ۲-۳-۱۱-۱۲-۱۵-المومن، ۱۲-۶۶ تا ۶۷۔ یہ مضمون ایک حدیث قدسی میں بیان کیا گیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں سب سے بڑھ کر ہر شریک کی شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی عمل ایسا کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی اُس نے شریک کیا ہو اُس سے میں بُری ہوں اور وہ پورا کا پورا عمل اُس کے لیے ہے جس کو اُس نے شریک کیا“ (مسلم، مسند احمد، ابن ماجہ)۔ پس درحقیقت اللہ کو دیا نین یا بہت سے خداؤں میں سے ایک قرار دینا اور اُس کے ساتھ دوسروں کی بندگی و پرستش کرنا ہی تو وہ اصل کفر ہے جس سے اظہارِ براءت کرنا اس سورۃ کا مقصود ہے۔

۱۲ اصل الفاظ میں مَا أَعْبُدُ۔ عربی زبان میں مَا کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَن أَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَا أَعْبُدُ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے چار جواب عام طور پر مفسرین نے دیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں مَا بمعنی مَن ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مَا بمعنی الَّذِي (یعنی جو یا جس) ہے۔ تیسرے یہ کہ دونوں فقروں میں مَا مصدر کے معنی میں ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ عبادت نہیں کرتا جو تم کرتے ہو، یعنی مشرکانہ عبادت، اور تم وہ عبادت نہیں کرتے جو میں کرتا ہوں، یعنی مؤحدانہ عبادت۔ چوتھے یہ کہ پہلے فقرے میں چونکہ مَا تَعْبُدُونَ فرمایا گیا ہے اس لیے دوسرے فقرے میں کلام کی مناسبت برقرار رکھتے ہوئے مَا أَعْبُدُ فرمایا گیا ہے، لیکن دونوں جگہ صرف لفظ کی یکسانی ہے، معنی کی یکسانی نہیں ہے، اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ (آیت ۱۹۳) میں فرمایا گیا ہے فَمِنَ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ”جو تم پہ زیادتی کہے اس پر تم ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی ہے“۔ ظاہر ہے کہ زیادتی کا ویسا ہی جواب جیسی زیادتی کی گئی ہو، زیادتی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر محض کلام کی یکسانی کے لیے جواباً زیادتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ توبہ (آیت ۶۶) میں ارشاد ہوا ہے نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ”وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ ان کو بھول گیا“ حالانکہ اللہ بھولتا نہیں ہے اور مقصود کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو نظر انداز فرمایا، لیکن اُن کے نسیان کے جواب میں اللہ کے لیے نسیان کا لفظ محض کلام کی یکسانی برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں یہ سب معنی لینے کی گنجائش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَن أَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَا أَعْبُدُ کہا گیا ہے۔ دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَن کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اُس کی ذات کے متعلق کچھ کنایا پوچھنا ہوتا ہے، اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اردو

زبان میں جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کیا ہیں؟ تو اس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مثلاً وہ فوج کا آدمی ہے تو فوج میں اس کا منصب کیا ہے؟ اور کسی درس گاہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں ریڈر ہے؟ لکچرر ہے؟ پروفیسر ہے؟ کس علم یا فن کا استاد ہے؟ کیا ڈگریاں رکھتا ہے؟ وغیرہ پس اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَنْ أَعْبَدُوا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور اس کے جواب میں مشرکین اور کفار یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور اس کی عبادت بھی ہم کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَنْ أَعْبَدُوا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں ان صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر ہی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین منکر بن خدا کے سوا تمام اقسام کے کفار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کا خدا ان سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے کسی کا خدا ایسا ہے جس کو چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی، جو رب العالمین نہیں بلکہ رب اسرائیل ہے، جس کا ایک نسل کے لوگوں سے ایسا خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، جو حضرت یعقوب سے کشتی لڑتا ہے اور ان کو گرائیں سکتا، جو عزیر نامی ایک بیٹا بھی رکھتا ہے۔ کسی کا خدا یسوع مسیح نامی ایک اکلوتے بیٹے کا باپ ہے اور وہ دوسروں کے گناہوں کا کفارہ بنانے کے لیے اپنے بیٹے کو صلیب پر چڑھا دیتا ہے۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے، مگر بے چارے کے ہاں صرف بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھارتا ہے اور زمین پر انسانی جسم میں رہ کر انسانوں کے سے کام کرتا ہے۔ کسی کا خدا محض واجب الوجود، یا علت العلل یا علت اولیٰ (First Cause) ہے، کائنات کے نظام کو ایک مرتبہ حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے، اس کے بعد کائنات لگے بندھے قوانین کے مطابق شروع چل رہی ہے اور انسان کا اس سے اور اس کا انسان سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ غرض خدا کو ماننے والے کفار بھی درحقیقت اس خدا کو نہیں مانتے جو ساری کائنات کا ایک ہی خالق، مالک، مدبّر، منظم اور حاکم ہے۔ جس نے نظام کائنات کو صرف بنایا ہی نہیں ہے بلکہ ہر آن وہی اس کو چلا رہا ہے اور اس کا حکم ہر وقت یہاں چل رہا ہے۔ جو ہر عیب، نقص، کمزوری اور غلطی سے منترہ ہے۔ جو ہر تشبیہ اور تخمیر سے پاک، ہر نظیر و تشبہ سے مُبرّا اور ہر سائنسی اور سماجی سے بے نیاز ہے۔ جس کی ذات، صفات، اختیارات اور استحقاق معبودیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے جو اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو، یا کسی کو وہ بیٹا بنائے، یا کسی قوم اور نسل سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہو جس کا اپنی مخلوق کے ایک ایک فرد کے ساتھ رزاقی اور ربوبیت اور رحمت اور نگہبانی کا براہ راست تعلق ہے۔ جو دعائیں سننے والا اور ان کا جواب دینے والا ہے۔ جو موت اور زندگی، نفع اور ضرر اور قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کے جملہ اختیارات کا تنها مالک ہے۔ جو اپنی مخلوق کو صرف پالتا ہی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کی حیثیت اور ضرورت کے مطابق ہدایت بھی دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ہمارا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ہمارا معبود ہے اور ہم اس کی پرستش کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے ہمیں امر و نہی کے احکام دیتا ہے اور ہمارا کام اس کے احکام کی اطاعت کرنا ہے۔ جس کے سامنے ہم اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں جو مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ اٹھانے والا ہے اور ہمارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے اور سزا دینے والا ہے۔ ان صفات کے معبود کی عبادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے اگر خدا کی عبادت کر بھی رہے ہیں تو اصلی اور حقیقی خدا کی نہیں بلکہ اس خدا کی عبادت کر

رہے ہیں جو ان کا اپنا اختراع کردہ ایک خیالی خدا ہے۔

۷۴ مفسرین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دونوں فقرے پہلے دو فقروں کے مضمون کی تکرار ہیں، اور یہ تکرار اس غرض کے لیے کی گئی ہے کہ اُس بات کو زیادہ پر زور بنا دیا جائے جو پہلے دو فقروں میں کہی گئی تھی۔ لیکن بہت سے مفسرین اس کو تکرار نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ان میں ایک اور مضمون بیان کیا گیا ہے جو پہلے فقروں کے مضمون سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اس حد تک تو ان کی بات صحیح ہے کہ ان فقروں میں تکرار نہیں ہے، کیونکہ ان میں صرف ”اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں“ کا اعادہ کیا گیا ہے، اور یہ اعادہ بھی اُس معنی میں نہیں ہے جس میں یہ فقرہ پہلے کہا گیا تھا۔ مگر تکرار کی نفی کرنے کے بعد مفسرین کے اس گروہ نے ان دونوں فقروں کے جو معنی بیان کیے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے بیان کردہ معنی کو نقل کر کے اُس پر بحث کریں، اس لیے طویل کلام سے بچتے ہوئے ہم صرف وہ معنی بیان کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح ہیں۔

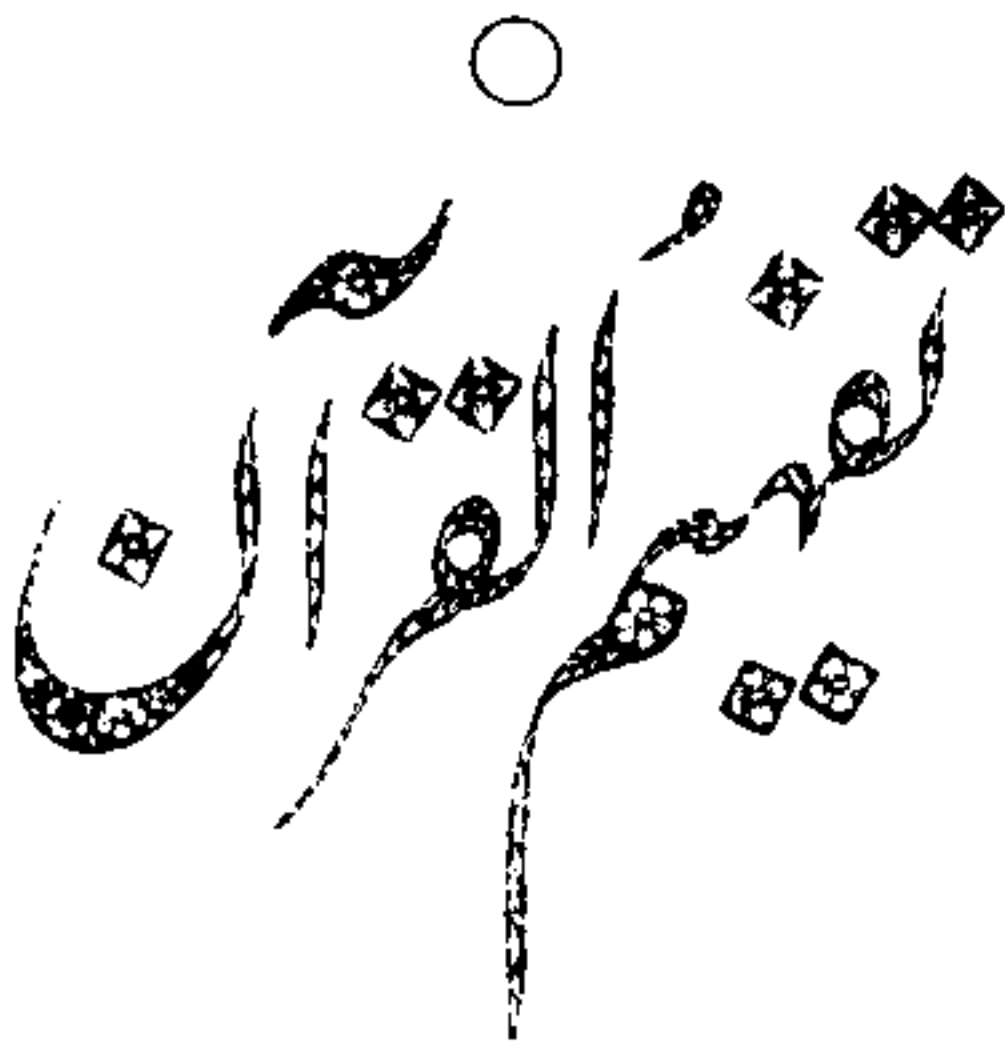
پہلے فقرے میں فرمایا گیا ہے کہ ”اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے“ اس کا مضمون آیت نمبر ۲ کے مضمون سے بالکل مختلف ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ ”میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو“ ان دونوں باتوں میں دو حیثیتوں سے بہت بڑا فرق ہے۔ ایک یہ کہ میں فلاں کام نہیں کرتا یا نہیں کروں گا کہنے میں اگر چہ انکار اور پر زور انکار ہے، لیکن اس سے بہت زیادہ زور یہ کھینچتا ہے کہ میں فلاں کام کرنے والا نہیں ہوں، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا بڑا کام ہے جس کا ارتکاب کرنا تو درکنار اُس کا ارادہ یا خیال کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ”جن کی عبادت تم کرتے ہو“ کا اطلاق صرف اُن معبودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفار اب کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے ”جن کی عبادت تم نے کی ہے“ کا اطلاق ان سب معبودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفار اور اُن کے آباؤ اجداد زمانہ ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ اب یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مشرکین اور کفار کے معبودوں میں ہمیشہ رد و بدل اور حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے، مختلف زمانوں میں کفار کے مختلف گروہ مختلف معبودوں کو پوجتے رہے ہیں، اور سارے کافروں کے معبود ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی نہیں رہے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے آج کے معبودوں ہی سے نہیں بلکہ تمہارے آباؤ اجداد کے معبودوں سے بھی بری ہوں اور میرا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے معبودوں کی عبادت کا خیال تک اپنے دل میں لاؤں۔

رہا دوسرا فقرہ، تو اگرچہ آیت نمبر ۵ میں اُس کے الفاظ وہی ہیں جو آیت نمبر ۲ میں ہیں، لیکن دونوں جگہ اُس کا مفہوم مختلف ہے۔ آیت نمبر ۲ میں وہ اس فقرے کے بعد آیا ہے کہ ”میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو“، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ”ان نہ تم اُن صفات کے معبودِ واحد کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں“ اور آیت نمبر ۵ میں وہ اس فقرے کے بعد آیا ہے کہ ”اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے“ اس لیے اس کے معنی یہ ہیں کہ ”اور نہ تم اُس معبودِ واحد کی عبادت کرنے والے بنتے نظر آتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں“ یا بالفاظِ دیگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جن جن کو تم نے اور تمہارے اسلاف نے پوجا ہے اُن کا پوجاری بن جاؤں، اور تم کو بہت سے معبودوں کی بندگی چھوڑ کر ایک معبودِ واحد کی عبادت اختیار کرنے سے جو چڑ ہے اُس کی بنا پر تم سے یہ توقع نہیں ہے کہ اپنی اس غلط عبادت سے باز آ جاؤ گے اور اُس کی عبادت کرنے والے بن جاؤ گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔

۷۵ یعنی میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ۔ میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں۔ میں

تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کر سکتا اور تم میرے معبود کی بندگی کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس لیے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہو سکتا۔ یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے، بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لیے براءت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے، اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر بالیوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا۔ یہی اعلان براءت اور اظہار بیزاری اس سورۃ کے بعد نازل ہونے والی نئی سورتوں میں پے درپے کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس میں فرمایا "اگر یہ تجھے ٹھٹھکانے میں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے ہے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں" (آیت ۲۱)۔ پھر آگے چل کر اسی سورۃ میں فرمایا: "اے نبی، کہہ دو کہ لوگو، اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو (میں لوگوں) اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرنے میں ان کی بندگی نہیں کرنا بلکہ صرف اُس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمہاری موت ہے" (آیت ۱۰۴)۔ سورۃ شعراء میں فرمایا "اے نبی، اب اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے میں بری الذمہ ہوں" (آیت ۲۱۶)۔ سورۃ سبأ میں فرمایا "ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔ کہو، ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا" (آیات ۲۵-۲۶)۔ سورۃ زمر میں فرمایا "ان سے کہو، اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رُسوا کُن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ہٹنے والی نہیں" (آیات ۲۹-۳۰)۔ پھر یہی سبق مدینہ طیبہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ "تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے اُن معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور میرا بڑا گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (الممتحنہ - آیت ۴)۔ قرآن مجید کی ان پے درپے توضیحات سے اس شبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ لکنہ دینکم ولی دین کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھ اپنے دین پر چلنے دو۔ بلکہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورۃ زمر میں فرمائی گئی ہے کہ "اے نبی، ان سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو" (آیت ۱۲)۔

اس آیت سے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے یہ استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب خواہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن کفر بحیثیت مجموعی ایک ہی ملت ہے، اس لیے یہودی عیسائی کا، اور عیسائی یہودی کا، اور اسی طرح ایک مذہب کا کافر دوسرے مذہب کے کافر کا وارث ہو سکتا ہے اگر ان کے درمیان نسب، یا نکاح یا کسی سبب کی بنا پر کوئی ایسا تعلق ہو جو ایک کی وراثت دوسرے کو پہنچنے کا مقتضی ہو۔ بخلاف اس کے امام مالک، امام اوزاعی اور امام احمد اس بات کے قائل ہیں کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت نہیں پاسکتے۔ ان کا استدلال اُس حدیث سے ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر و بن عاص سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یتوارث اہل ملتین مشتی۔ "دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے" (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی)۔ اس سے ملنے جلتے مضمون کی ایک حدیث ترمذی نے حضرت جابر سے اور ابن حبان نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اور تہار نے حضرت ابو ہریرہ سے نقل کی ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے مسلک حنفی



التَّحْرِيرُ

(١١٠)

النَّصْرُ

نام | پہلی آیت اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ کے لفظ نصر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔
 نزائے نزول | حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی
 مکمل سورت حضور پر نازل نہیں ہوئی (مسلم، نسائی، طبرانی، ابن ابی شیبہ، ابن مردودہ)۔ حضرت عبداللہ بن عمر
 کی روایت ہے کہ یہ سورت حجتہ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں بمقام منیٰ نازل ہوئی اور اس کے بعد
 حضور نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا (ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، ابن ابی شیبہ، عید بن حمید،
 ابویعلیٰ، ابن مردودہ)۔ بیہقی نے کتاب الحج میں حضرت ستر اہلبیت نبھان کی روایت سے حضور کا وہ خطبہ نقل
 کیا ہے جو آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ:

”میں نے حجتہ الوداع میں حضور کو یہ فرماتے سنا کہ لوگو جاننے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ
 اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ ایام تشریق کے بیچ کا دن ہے۔ پھر آپ نے پوچھا جانتے ہو
 یہ کونسا مقام ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ مشعر حرام ہے۔
 پھر حضور نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، شاید اس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ خبردار رہو، تمہارے خون

سب سے محفوظ رہنا چاہئے اس کے بعد بعض آیات نازل ہوئی ہیں لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن کی وہ آیت کون سی ہے، جو
 حضور پر سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بخاری و مسلم میں حضرت ہریر بن عازب کی روایت یہ ہے کہ وہ سورہ نسا کی آخری آیت **يَسْتَفْتُونَكَ رَبِّ اَللّٰهُ
 يَفْتِنُكُمْ فِي الْكَلْبَةِ** ہے۔ امام بخاری نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ آیت ربو یعنی جس آیت میں سو کی حرمیت کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کی سب
 سے آخری آیت ہے۔ اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد، ابن ماجہ اور ابن مردودہ نے حضرت عمر سے نقل کی ہیں، مگر ان میں یہ نہیں کہا گیا ہے
 کہ یہ آخری آیت ہے، بلکہ حضرت عمر کا قول یہ ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ ابوہبیب نے فضائل القرآن میں امام زہری کا،
 اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن المسیب کا قول نقل کیا ہے کہ آیت ربوا آیت دین یعنی سورہ بقرہ رکوع ۳۸، ۳۹ قرآن میں نازل ہونے والی
 آخری آیات ہیں۔ نسائی، ابن مردودہ اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ **وَاذْقُوا اَيُّ مَآئِدٍ جَعَلْتُمْ رِزْقِيْهِ**
 (البقرہ ۲۸۱) قرآن کی آخری آیت ہے۔ الطبرانی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کا جو قول نقل کیا ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ یہ آیت حضور کی وفات سے
 ۸۱ دن پہلے نازل ہوئی تھی اور سعید بن جبیر کا قول جو ابن ابی سالم نے نقل کیا ہے، اس میں اس آیت کے نزول اور حضور کی وفات کے درمیان صرف ۹ دن
 کا فاصلہ بیان کیا گیا ہے۔ امام احمد کی مسند اور امام مالک کی المستدرک میں حضرت ابی بن کعب کی روایت یہ ہے کہ سورہ توبہ کی آیات ۱۲۸، ۱۲۹ سب
 سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔

اور نمازی عزیزیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح یہ دن اور یہ مقام حرام ہے، یہاں تک کہ تم اپنے رب کے سامنے حاضر ہو اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے۔ سنو، یہ بات تم میں سے قریب والا دور والے تک پہنچا دے۔ سنو، کیا میں نے تمہیں پہنچا دیا؟ اس کے بعد جب ہم لوگ مدینہ واپس ہوئے تو کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ حضور کا انتقال ہو گیا۔

ان دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ نصر کے نزول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے درمیان ۳ مہینے کچھ دن کا فصل تھا، کیونکہ تاریخ کی رو سے حجۃ الوداع اور حضور کے وصال کے درمیان اتنا ہی زمانہ گزرا تھا۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضور نے فرمایا مجھے مہری وفات کی خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پورا ہوا، مسند احمد، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مرددہ۔ دوسری روایات جو حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہوئی ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کے نزول سے حضور نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ کو دنیا سے رخصت ہونے کی اطلاع دے دی گئی ہے (مسند احمد، ابن جریر، طبرانی، نسائی، ابن ابی حاتم، ابن مرددہ)۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ فرماتی ہیں کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضور نے فرمایا اس سال میرا انتقال ہونے والا ہے۔ یہ بات سن کر حضرت فاطمہؓ رو دیں۔ اس پر آپ نے فرمایا میرے خاندان میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آگے ملو گی۔ یہ سن کر وہ ہنس دیں (ابن ابی حاتم۔ ابن مرددہ)۔ قریب قریب اسی مضمون کی روایت بیہقی نے ابن عباس سے نقل کی ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے غزوة بدر میں شریک ہونے والے بڑے بڑے شیوخ کے ساتھ اپنی مجلس میں بلاتے تھے۔ یہ بات بعض بزرگوں کو ناگوار گزری اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لڑکے بھی تو اسی لڑکے جیسے ہیں، اس کو خاص طور پر کیوں ہمارے ساتھ شریک مجلس کیا جاتا ہے؟ (امام بخاری اور ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت عبدالرحمان بن عوف تھے)۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ علم کے لحاظ سے اس کا جو مقام ہے وہ آپ لوگ جانتے ہیں۔ پھر ایک روز انہوں نے شیوخ بدر کو بلایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ بلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے یہ دکھانے کے لیے بلایا گیا ہے کہ مجھ کو ان کی مجلس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ دوران گفتگو میں حضرت عمر نے شیوخ بدر سے پوچھا کہ آپ حضرات اذآجاء نصر اللہ والفتوح کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ بعض نے کہا اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی نصرت آئے اور ہم کو فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد اور اس سے استغفار کریں۔ بعض نے کہا اس سے مراد شہروں اور قلعوں کی فتح ہے۔ بعض خاموش رہے۔ اس کے بعد حضرت عمر نے کہا ابن عباس، کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا، نہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل ہے۔ اس میں حضور کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا وقت آن پورا ہوا، اس

کے بعد آپ الشکي حمد اور استغفار کریں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا میں بھی اُس کے سوا کچھ نہیں جانتا جو تم نے کہا ہے۔ ایک روایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے شیوخ بدر سے فرمایا آپ لوگ مجھے کیسے ملامت کرتے ہیں جبکہ اس لڑکے کو اس مجلس میں شریک کرنے کی وجہ آپ نے دیکھی (بخاری، مسند احمد، ترمذی، ابن جریر، ابن مردودہ، بغوی، بیہقی، ابن المنذر)۔

موضوع اور مضمون جیسا کہ مندرجہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ اُس کے فضل سے آپ انشا پر کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے، اور اُس سے دعا کریں کہ اس خدمت کی انجام دہی میں جو بھول چوک یا کوتاہی بھی آپ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرما دے۔ اس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلاب عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرنے اٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈالا اور جمالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اٹھا کر اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوام عالم کی امام بن جائے، مگر ایسا عظیم کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جشن منانے کا نہیں بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور وہ پوری عاجزی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ (بعض روایات میں سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ اسْتَغْفِرُ اللَّهُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ) کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیسے کلمات ہیں جو آپ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اُسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ ہے إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (مسند احمد، مسلم، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردودہ) یا سے ملتی جلتی بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپ اپنے رکوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي۔ یہ قرآن یعنی سورہ نصر کی تاویل تھی جو آپ نے فرمائی تھی (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر)۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر آپ کے آخری زمانہ حیات

میں اٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے یہ الفاظ جاری رہتے: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ میں نے ایک روز پوچھا کہ
یا رسول اللہ! آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے رہتے ہیں؟ فرمایا مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے پھر آپ نے یہ سورۃ
پڑھی (ابن جریر)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کثرت سے یہ ذکر فرماتے رہتے: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي، سُبْحَانَكَ رَبَّنَا
وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي يَا نَكَّ أَنْتَ النَّوَابُ الْغَفُورُ۔ (ابن جریر، مُسْتَدْرَكُ
ابن ابی حاتم)۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کے
بے محنت و ریاضت کرنے میں اس قدر شدت کے ساتھ مشغول ہو گئے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے
نسائی، طبرانی، ابن ابی حاتم، ابن مردودہ)۔

آيَاتُهَا ۳

سُورَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِیْ
 دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ
 اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (راے نبی) تم دیکھ لو کہ لوگ
 فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح
 کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

۱۔ فتح سے مراد کسی ایک معرکے میں فتح نہیں، بلکہ وہ فیصلہ کن فتح ہے جس کے بعد ملک میں کوئی طاقت اسلام سے ٹکر لینے کے
 قابل باقی نہ رہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عرب میں اسی دین کو غالب ہو کر رہنا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد فتح
 مکہ لے لی ہے۔ لیکن فتح مکہ ۶۱۰ء میں ہوئی ہے اور اس سورہ کا نزول سلمہ کے آخر میں ہوا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور
 حضرت ستر اہ بنت بزمان کی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے دیباچے میں نقل کی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت عبداللہ بن عباس
 کا یہ قول بھی اس تفسیر کے خلاف پڑتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی سب سے آخری سورہ ہے۔ کیونکہ اگر فتح سے مراد فتح مکہ ہو تو پوری سورہ
 توبہ اس کے بعد نازل ہوئی تھی، پھر یہ سورہ آخری سورہ کیسے ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ فتح مکہ اس لحاظ سے فیصلہ کن تھی کہ اس نے مشرکین
 عرب کی جتنی پسند کر دی تھی، مگر اس کے بعد بھی ان میں کافی دم خم باقی تھا۔ طائف اور حنین کے معرکے اس کے بعد ہی پیش آئے
 اور عرب پر اسلام کا غلبہ مکمل ہونے میں تقریباً دو سال صرف ہوئے۔

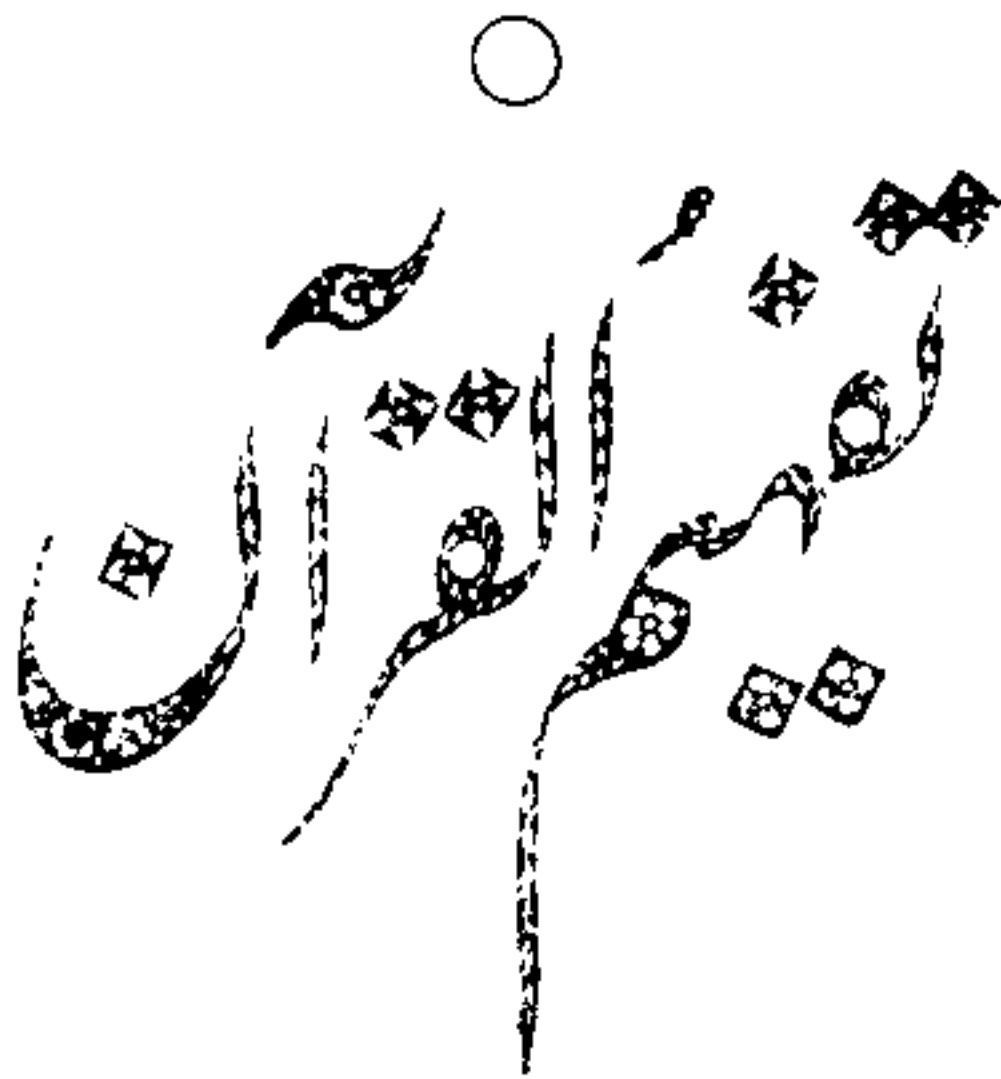
۲۔ یعنی وہ زمانہ خصت ہو جائے جب ایک ایک دورہ کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اور وہ وقت آجائے جب پورے
 پورے قبیلے، اور بڑے بڑے علاقوں کے باشندے کسی جنگ اور کسی مزاحمت کے بغیر از خود مسلمان ہونے لگیں۔ یہ کیفیت ۶۱۰ء کے آغاز
 سے رونما ہونی شروع ہوئی جس کی وجہ سے اس سال کو سالِ وفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اسلام قبول کر کے آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ سلمہ میں جب
 حضرت حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے اس وقت پورا عرب اسلام کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا اور ملک میں کوئی مشرک باقی
 نہ رہا تھا۔

وقف النبی
 صلوات اللہ علیہ وسلم

۱۵۔ حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرنا بھی ہے اور اُس کا شکر ادا کرنا بھی سا اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منترہ قرار دینا ہے۔ اس موقع پر یہ ارشاد کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اُس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی اس خیال کا کوئی شائبہ تک نہ آئے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے، بلکہ اس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو، اس پر اُس کا شکر ادا کرو، اور قلب و زبان سے اس امر کا اعتراف کرو کہ اس کامیابی کی ساری تعریف اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ اور تسبیح کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اس سے پاک اور منترہ قرار دو کہ اُس کے کلمے کا بلند ہونا تمہاری کسی سعی و کوشش کا محتاج یا اُس پر منحصر تھا۔ اس کے برعکس تمہارا دل اس یقین سے لبریز رہے کہ تمہاری سعی و کوشش کی کامیابی اللہ کی تائید و نصرت پر منحصر تھی، وہ اپنے جس بندے سے چاہتا اپنا کام لے سکتا تھا اور یہ اُس کا احسان ہے کہ اُس نے یہ خدمت تم سے لی اور تمہارے ہاتھوں اپنے دین کا بول بالا کر لیا۔ اس لیے علاوہ تسبیح، یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی مجیر العفول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا کرشمہ اُس سے صادر ہو سکتا۔

۱۶۔ یعنی اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اُس نے تمہارے سپرد کی تھی اُس کو انجام دینے میں تم سے جو بھول چوک یا کوتاہی بھی ہوئی ہو اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرمائے۔ یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔ کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو، اُس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اُس نے دی ہوں اور اس کی عبادت و بندگی بجالانے میں خواہ کتنی ہی جانفشانیاں اس نے کی ہوں، اُس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے اوپر میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پورا کا پورا ادا کر دیا ہے، بلکہ اسے ہمیشہ ہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا، اور اسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اُس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو اس سے درگزر فرما کہ میری حقیر سی خدمت قبول فرمائے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا، تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اس غرتے میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اُس پر تھا وہ اُس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اس سے بہت بالا و بزرگ ہے کہ کوئی مخلوق اُسے ادا کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمت دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اپنی جان راہِ خدا میں کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھتے رہیں کہ ”حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا اسی طرح جب کبھی انہیں کوئی نفع نصیب ہو، اُسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔



اللَّهِبِ

(۱۱۱)

اللَّهَبِ

نام | پہلی آیت کے لفظ لہب کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مکی ہونے میں تو مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ٹھیک ٹھیک یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ مکی دور کے کس زمانے میں یہ نازل ہوئی تھی۔ البتہ ابو لہب کا جو کردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت حق کے خلاف تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سورہ کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہو گا جب وہ حضور کی عداوت میں حد سے گزر گیا تھا اور اُس کا رویہ اسلام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن رہا تھا۔ بعید نہیں کہ اس کا نزول اُس زمانے میں ہوا ہو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان والوں کا مقاطعہ کر کے قریش کے لوگوں نے اُن کو شغبِ ابی طالب میں محصور کر دیا تھا اور تنہا ابو لہب ہی ایسا شخص تھا جس نے اپنے خاندان والوں کو چھوڑ کر دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ ہمارے اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ ابو لہب حضور کا چچا تھا، اور بھتیجے کی زبان سے چچا کی کھلم کھلا مذمت کرانا اُس وقت تک مناسب نہ ہو سکتا تھا جب تک چچا کی حد سے گزری ہوئی زیادتیاں علانیہ سب کے سامنے نہ آگئی ہوں۔ اس سے پہلے اگر ابتدا ہی میں یہ سورہ نازل کر دی گئی ہوتی تو لوگ اس کو اخلاقی حیثیت سے معیوب سمجھنے کہ بھتیجا اپنے چچا کی اس طرح مذمت کرے۔

پس منظر | قرآن مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اُس کی مذمت کی گئی ہے، حالانکہ کتے میں بھی، اور ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ابو لہب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے، اور اُس میں ابو لہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملک عرب میں ہر طرف بد امنی، غارت گری اور طوائف الملوک پھیلی ہوئی تھی، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خوئی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلہ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطع رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور کی شدید مخالفت کی، مگر بنی ہاشم اور

بنی المطلب ہاشم کے بھائی مطلب کی اولاد نے نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ کھلم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضور کے ان خوئی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المطلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دین آبائی سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشت پناہی کرنا قریش اور اہل عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اس اخلاقی اصول کو جسے زمانہ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابولہب بن عبدالمطلب۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ حضور کے والد ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خصوصاً جبکہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا۔ لیکن اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں ان تمام عربی روایات کو پا مال کر دیا۔

ابن عباس سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا، یا صبا حاکا (ہائے صبح کی آفت)، عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے ٹھٹھ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضور کی یہ آواز سن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ہے۔ اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آسکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا، اسے بنی ہاشم، اسے بنی عبدالمطلب، اسے بنی فہر، اسے بنی فلاں، اسے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پھاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔ اس پر قبل اس کے کہ کوئی اور بولتا، حضور کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تَبَّكَ الْهَذَا جَمَعْتَنَا، "سنیانا س جائے تیرا، کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟" ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے پتھر اٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)۔

ابن زبیر کی روایت ہے کہ ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز پوچھا اگر میں تمہارے

دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے، حضور نے فرمایا اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا تَبَّ لِهَذَا الدِّينِ تَبَّ أَنْتَ أَكُونُ وَهْوَ كَلَاءٌ سَوَاءٌ - "ناس جائے اس دین کا جس میں میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں" (ابن جریر)۔

مکہ میں ابولہب حضور کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اُس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ)، عقیبہ بن ابی معیط، عدی بن محرز اور ابن الأصداء السدنی بھی آپ کے ہمسائے تھے۔ یہ لوگ مکہ میں بھی حضور کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا ادھب آپ پر پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ حضور باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبدمناف، یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟۔ ابولہب کی بیوی اتم جلیل (ابو سفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل دتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لاکر ڈال دیتی، تاکہ صبح سویرے جب آپ یا آپ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کاٹا پاؤں میں چبھ جائے (یعنی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن عساکر، ابن ہشام)۔

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹیوں عتیبہ اور عقیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ نبوت کے بعد جب حضور نے اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹیوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عتیبہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضور کے سامنے آکر اس نے کہا کہ میں التَّجْمِرِ إِذَا هَوَىٰ أَوِ الدِّينِ دَنَا فَتَدَلَّىٰ کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے حضور کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا۔ حضور نے فرمایا خدایا، اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے۔ اس کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دوران سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہل قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اُونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اُس نے عتیبہ کو بچاؤ کھایا۔ رالا سبعباب لابن عبدالبتر، الاصابہ لابن حجر، دلائل النبوة لابن نعیم الاصفہانی، روض الالاف للشیخ السبیلی۔ روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلان نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ نَبَتْ بَدَا آتِي لَهَيْبِ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عتیبہ تھا یا عتیبہ۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتح مکہ کے بعد عتیبہ نے اسلام قبول کر کے حضور کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عتیبہ تھا۔

اُس کے جنٹِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ اپنے بیٹے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی کہ لو آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام و نشان ہو گئے اُس کی اس حرکت کا ذکر ہم سورہ کوثر کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا۔ رُبِیْعَةُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بِلَالٍ بیان کرتے ہیں کہ میں نو عمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے ”لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے اور آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ ”یہ جھوٹا ہے، دین آباہی سے پھر گیا ہے“ میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد بیہقی)۔ دوسری روایت انہی حضرت ربیعہ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں ”اے بنی خلال، میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تمہیں ہدایت کرنا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے“ آپ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ”اے بنی خلال، یہ تم کو لات اور عزیسی سے پھر کر اُس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو“ میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے۔ انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد طبرانی)۔ طارق بن عبداللہ المخزومی کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے جاتے ہیں کہ ”لوگو، لا الہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے“ اور پیچھے ایک شخص بے جو آپ کو پتھر مار رہا ہے، یہاں تک کہ آپ کی ایٹریاں خون سے تر ہو گئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ ”یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو“ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (ترمذی)۔

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا بنی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفار قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقوں کی نوبت آگئی۔ مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کوئی خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتا تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان

سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، ہمیں جو خسارہ بھی ہو گا اسے میں پورا کر دوں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارہ اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ لوٹ جاتا۔ پھر ابو لہب انہی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاڑ خرید لیتا (ابن سعد و ابن مشام)۔

یہ اس شخص کی حرکات تھیں جن کی بنا پر اس سورہ میں نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ خاص طور پر اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ مکہ سے باہر کے اہل عرب جو حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے، ان کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا چچا آپ کے پیچھے لگ کر آپ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلاف توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلا وجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بیٹھے کو برا بھلا کہے اور اُسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اس وجہ سے وہ ابو لہب کی بات سے متاثر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے مگر جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور ابو لہب نے غصے میں پتھر کر اول قول بکنا شروع کر دیا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اس شخص کا قول قابل اعتبار نہیں ہے، کیونکہ یہ اپنے بیٹھے کی دشمنی میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ نام لے کر جب آپ کے چچا کی مذمت کی گئی تو لوگوں کی یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کسی کا لحاظ کر کے کوئی مدعا سنت برت سکتے ہیں۔ جب علی الاعلان رسول کے اپنے چچا کی خبر لے ڈالی گئی تو لوگ سمجھ گئے کہ یہاں کسی لاگ لپیٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ غیر اپنا ہو سکتا ہے اگر ایمان لے آئے، اور اپنا غیر ہو جاتا ہے اگر کفر کرے۔ اس معاملہ میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں ہے۔

ایاتہا

سُورَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ

رُكُوْعُهَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبَّتْ يَدَا اَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝۱ مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۝۲
 سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝۳ وَاَمْرَاتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴
 فِي جَبَدٍ مَّا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵

ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اُس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس
 کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اُس کے ساتھ) اُس کی جو رو بھی
 لگائی بھجائی کرنے والی، اُس کی گردن میں مونجھ کی رستی ہوگی۔

۱۔ اس شخص کا اصل نام عبدالعزیز تھا، اور اسے ابولہب اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ بہت چمکتا ہوا سرخ و سفید تھا۔
 لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنی ہیں شعلہ رو۔ یہاں اُس کا ذکر اُس کے نام کے بجائے اُس کی کنیت سے کرنے کے کئی
 وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زیادہ تر اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی کنیت ہی سے معروف تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کا نام عبدالعزیز (بندہ
 عزیزی) ایک مشرکانہ نام تھا اور قرآن میں یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اُسے اس نام سے یاد کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اُس کا جو انجام اس سورہ
 میں بیان کیا گیا ہے اُس کے ساتھ اُس کی یہ کنیت ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تَبَّتْ يَدَا اَبِي لَهَبٍ کے معنی بعض مفسرین نے "ٹوٹ جائیں ابولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں اور وَتَبَّ کا
 مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہو جائے" یا "وہ ہلاک ہو گیا"۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اُس کو دیا گیا ہو، بلکہ
 ایک پیشینگوئی ہے جس میں آئندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، گویا اُس کا ہونا ایسا یقینی ہے
 جیسے وہ ہو چکی۔ اور فی الواقع آخر کار وہ ہی کچھ ہوا جو اس سورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد
 ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا
 زور لگا دیا ہو۔ اور ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے واقعی اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن
 اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے
 جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ
 زندہ نہ رہ سکا۔ پھر اس کی موت بھی نہایت عبرتناک تھی۔ اُسے مَدَسَةُ Malignant Pustule کی بیماری ہو گئی جس کی وجہ سے

اس کے گھروالوں نے اُسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں چھوٹ لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا بیان تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بو پھیلنے لگی۔ آخر کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور اُنہی مزدوروں نے اس کو دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پیچر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اُس کی مزید اور مکمل شکست اس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی وترہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر اُس کے دونوں بیٹے عبثہ اور مُعتب حضرت عباس کی وساطت سے حضور کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لاکر انہوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

۱۵۲ البولب سخت نجیل اور زر پرست آدمی تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ زمانہ مجاہدیت میں ایک مرتبہ اُس پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ اس نے کعبہ کے خزانے میں سے سونے کے دوہرن چیرا لیے ہیں ساگر چہ بعد میں وہ بہن ایک اور شخص کے پاس سے برآمد ہوئے لیکن بجائے خود یہ بات کہ اُس پر یہ الزام لگایا گیا، یہ ظاہر کرتی ہے کہ مکہ کے لوگ اُس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اُس کی والداری کے متعلق قاضی رشید بن زبیر اپنی کتاب الداخائر والشعف میں لکھتے ہیں کہ وہ قریش کے اُن چار آدمیوں میں سے ایک تھا جو ایک قنطار سونے کے مالک تھے (قنطار دو سو اوقیہ کا اور ایک اوقیہ سوا تین تولہ کا ہوتا ہے)۔ اُس کی زبردستی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر، جبکہ اُس کے مذہب کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، قریش کے تمام سردار لڑنے کے لیے گئے، مگر اُس نے عاص بن ہشام کو اپنی طرف سے لڑنے کے لیے بھیج دیا اور کہا کہ یہ اُس چار ہزار درہم قرض کا بدلہ ہے جو میرا تم پر آتا ہے۔ اس طرح اُس نے اپنا قرض وصول کرنے کی بھی ایک ترکیب نکال لی، کیونکہ عاص دیوالیہ ہو چکا تھا اور اُس سے رقم ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

مَا كَسَبَ كُوبِعْنَ مَفْسَرِينَ كَمَا لِي كَيْ مَعْشَرَ لِيَا هِيَ بَعْنِي اِسْفَ مَالٍ سَعِ مَنَافِعِ اُسُ نَعِ حَاصِلِ كَيْ وَه اُسُ كَا كَسَبَ تَعْنِي۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کا بیٹا بھی اُس کا کسب ہے (البوداؤد۔ ابن ابی حاتم)۔ یہ دونوں معنی البولب کے انجام سے مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ عکدہ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس کا مال بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور اس کی اولاد نے بھی اسے بے کسی کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا اُس کا جنازہ تک عزت کے ساتھ اٹھانے کی اس اولاد کو توفیق نہ ہوئی۔ اس طرح چند ہی سال کے اندر لوگوں نے اس پیشینگوئی کو پورا ہونے دیکھ لیا جو البولب کے متعلق اس سورہ میں کی گئی تھی۔

۱۵۳ اس عورت کا نام اُرْوٰی تھا اور اُمّ جَمَلِ اِسُ كَيْتِ تَعْنِي۔ یہ ابو سفیان کی بہن تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت میں اپنے شوہر البولب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابو بکر کی صاحبزادی حضرت اسماء کا بیان ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی اور اُمّ جَمَلِ نے اس کو سنا تو وہ پھیری ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں سُطْحِي جَبْر تَجْر تَعْنِي اور وہ حضور کی بچوں میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں حضرت ابو بکر کے ساتھ حضور

نشریف فرما تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ آرہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپ کو نہیں دیکھ سکی اور اس نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ میں نے سنا ہے تمہارے صاحب نے میری بھوک کی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا، اس گھر کے رب کی قسم! انہوں نے تو تمہاری کوئی بھوک نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی (ابن ابی حاتم۔ سیرۃ ابن ہشام۔ بتزار نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اسی سے ملنا جلتا واقعہ نقل کیا ہے)۔ حضرت ابو بکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ بھوک تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔

۷۷ اصل الفاظ میں حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، جن کا لفظی ترجمہ ہے "لکڑیاں ڈھونڈنے والی"۔ مفسرین نے اس کے متعدد معنی بیان کیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابن زید، ضحاک اور ربیع بن انس کہتے ہیں کہ وہ راتوں کو خاردار درختوں کی ٹہنیاں لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر ڈال دیتی تھی، اس لیے اس کو لکڑیاں ڈھونڈنے والی کہا گیا ہے۔ قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، مجاہد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں فساد ڈیلانے کے لیے چغلیاں کھاتی پھرتی تھی، اس لیے اسے عربی محاورے کے مطابق لکڑیاں ڈھونڈنے والی کہا گیا، کیونکہ عرب ایسے شخص کو جو اُدھر کی بات اُدھر لگا کر فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا ہو، لکڑیاں ڈھونڈنے والا کہتے ہیں۔ اس محاورے کے لحاظ سے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنی ٹھیک و ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں "بی جالو" کے معنی ہیں۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد رہا ہو اس کے متعلق عربی زبان میں بطور محاورہ کہا جاتا ہے **فَلَانٌ يَحْطِيبُ عَلَى ظَهْرِهِ**۔ اظہار شخص اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لاد رہا ہے۔ پس حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے معنی ہیں گناہوں کا بوجھ ڈھونڈنے والی۔ ایک اور مطلب مفسرین نے اس کا یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ آخرت میں اس کا حال ہوگا، یعنی وہ لکڑیاں لاکر اس آگ میں ڈالے گی جس میں ابولہب جل رہا ہوگا۔

۷۸ اس کی گردن کے لیے جمید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسی گردن کے لیے بولا جاتا ہے جس میں زیور پہنا گیا ہو۔ سعید بن المسیب، حسن بصری اور قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت قیمتی ہار گردن میں پھنسی تھی، اور کہا کرتی تھی کہ لات اور عزمی کی قسم میں اپنا یہ ہار بیچ کر اس کی قیمت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عداوت میں خرچ کر دوں گی۔ اسی بنا پر جمید کا لفظ یہاں بطور طنز استعمال کیا گیا ہے کہ اس مزین گلے میں جس کے ہار پر وہ فخر کرتی ہے، دوزخ میں رستی پڑی ہوگی۔ یہ اسی طرح کا طنزیہ انداز کلام ہے جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے **بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ**، اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

جو رستی اس کی گردن میں ڈالی جائے گی اس کے لیے **حَبْلٌ مِّنْ قَسَدٍ** کے الفاظ استعمال کیے ہیں، یعنی وہ رستی مسد کی قسم سے ہوگی۔ اس کے مختلف معنی اہل لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ خوب مضبوط بیٹی ہوئی رستی کو مسد کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رستی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی میں مونجھ کی رستی یا اونٹ کی کھال یا اس کے صوف سے بنی ہوئی رستی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد بوجے کے تاروں سے بیٹی ہوئی رستی ہے۔



الإخلاص

(۱۱۲)

الاحلاص

نام | الاحلاص اس سورہ کا محض نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں خالص توحید بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں تو بالعموم کسی ایسے لفظ کو ان کا نام قرار دیا گیا ہے جو ان میں وارد ہوا ہو، لیکن اس سورہ میں لفظ احلاص کہیں وارد نہیں ہوا ہے۔ اس کو یہ نام اس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے۔ جو شخص بھی اس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا وہ شرک سے خلاصی پا جائیگا۔

زمانہ نزول | اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے، اور یہ اختلاف ان روایات کی بنا پر ہے جو اس کے سبب نزول کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار درج کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی (طبرانی)۔

(۲) ابوالعالیہ نے حضرت ابی بن کعب کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی (مسند احمد، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ترمذی، بخاری فی التاریخ، ابن المنذر، حاکم، بیہقی)۔ ترمذی نے اسی مضمون کی ایک روایت ابوالعالیہ سے نقل کی ہے جس میں حضرت ابی بن کعب کا حوالہ نہیں ہے اور اسے صحیح ترکما ہے۔

(۳) حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک اعرابی نے (اور بعض روایات میں ہے کہ لوگوں نے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتائیے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی (ابویعلیٰ، ابن جریر، ابن المنذر، طبرانی فی الأوسط، بیہقی، ابوالنعیم فی الحلیۃ)۔

(۴) عکرمہ نے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں کعب بن اشرف اور حنی بن اخطب وغیرہ شامل تھے اور انہوں نے کہا "ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں بتائیے کہ آپ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپ کو بھیجا ہے" اس پر اللہ تعالیٰ

سلا اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی اجنبی شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ اٰسِیْبَةُ کُنَّا اِسْ کانسب ہمیں بتاؤ۔ کیونکہ ان کے ہاں تعارف میں سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ اُس کانسب کیا ہے اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنا چاہا کہ آپ کا رب کون ہے اور کیسا ہے تو انہوں نے کہا اٰسِیْبَةُ کُنَّا اِسْ کانسب ہمیں بتائیے۔

نہیہ سورت نازل فرمائی (ابن ابی حاتم، ابن عدی، بیہقی فی الاسماء والصفات)۔

ان کے علاوہ مزید چند روایات ابن تیمیہ نے اپنی تفسیر سورۃ اخلاص میں نقل کی ہیں جو یہ ہیں:

(۵) حضرت انس کا بیان ہے کہ نبی کریم کے کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا "اے ابوالقاسم، اللہ نے ملائکہ کو نورِ حجاب سے، آدم کو مٹی کے سڑے ہوئے گارے سے، ابلیس کو آگ کے شعلے سے، آسمان کو دھوئیں سے، اور زمین کو پانی کے جھاگ سے بنایا، اب ہمیں اپنے رب کے متعلق بتائیے (کہ وہ کس چیز سے بنا ہے)؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جب ریل آئے اور انہوں نے کہا اے محمد، ان سے کہیے "هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ....."

(۶) عامر بن الطفیل نے حضور سے کہا "اے محمد، آپ کس چیز کی طرف ہمیں بلاتے ہیں؟" آپ نے فرمایا اللہ کی طرف۔ عامر نے کہا، "اچھا تو اُس کی کیفیت مجھے بتائیے۔ وہ سونے سے بنا ہوا ہے یا چاندی سے یا لوہے سے؟" اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

(۷) صفحہ اک اور قتادہ اور مقاتل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علماء حضور کے پاس آئے اور انہوں نے کہا "اے محمد، اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتائیے، شاید کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت توراہ میں نازل کی ہے۔ آپ بتائیے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ کس جنس سے ہے؟ سونے سے بنا ہے یا تانبے سے، یا پتیل سے، یا لوہے سے، یا چاندی سے؟ اور کیا وہ کھانا اور پیتا ہے؟ اور کس سے اُس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

(۸) ابن عباس کی روایت ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد سات پادریوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے حضور سے کہا "ہمیں بتائیے آپ کا رب کیسا ہے، کس چیز سے بنا ہے؟" آپ نے فرمایا میرا رب کسی چیز سے نہیں بنا ہے۔ وہ تمام اشیاء سے جدا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس معبود کی مابیت اور کیفیت دریافت کی تھی جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اور ہر موقع پر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کو جواب میں یہی سورت سنائی تھی۔ سب سے پہلے یہ سوال مکہ میں قریش کے مشرکین نے آپ سے کیا اور اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں کبھی یہودیوں نے، کبھی عیسائیوں نے، اور کبھی عرب کے دوسرے لوگوں نے حضور سے اسی نوعیت کے سوالات کیے اور ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوا کہ جواب میں یہی سورت آپ اُن کو سنادیں۔ ان روایات میں سے ہر ایک میں یہ جو کما گید ہے کہ اس موقع پر یہ سورت

نازل ہوئی تھی، اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہ سب روایتیں باہم متضاد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی مسئلے کے بارے میں اگر پہلے سے کوئی آیت یا سورۃ نازل شدہ موجود ہوتی تھی تو بعد میں جب کبھی حضور کے سامنے وہی مسئلہ پیش کیا جاتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آجاتی تھی کہ اس کا جواب فلاں آیت یا سورۃ میں ہے، یا اس کے جواب میں وہ آیت یا سورۃ لوگوں کو پڑھ کر سنا دی جائے۔ احادیث کے راوی اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جب فلاں معاملہ پیش آیا، یا فلاں سوال کیا گیا تو یہ آیت یا سورۃ نازل ہوئی۔ اس کو تکرارِ نزول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ایک آیت یا سورۃ کا کئی مرتبہ نازل ہونا۔ پس صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورۃ دراصل نازل ہوئی ہے بلکہ اس کے مضمون پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بیان میں قرآن کی مفصل آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ کو سن کر لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آخر آپ کا وہ رب ہے کیسا جس کی بندگی و عبادت کی طرف آپ لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ اس کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ سورت ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مکہ میں جب حضرت بلال کا آقا امیہ بن خلف اُن کو دھوپ میں بیٹھی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بڑا سا پتھر اُن کی چھاتی پر دھک دینا تھا تو وہ اَحَدًا اَحَدًا پکارتے تھے۔ یہ لفظ اَحَدًا ہی سورہ سے ماخوذ تھا۔

موضوع اور مضمون اِشْاٰنِ نَزْوْلِ كَيْ بَارِے میں جو روایات اور درج کی گئی ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصورات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے تھے۔ شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل جلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ اُن کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اُس کے اوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا، اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں روح القدس کو بھی حصہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادیت اور جسمائیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹھنڈا تھا۔ انسانی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔ اپنے کسی بندے سے کشتی بھی لڑ لیتا تھا۔ اور ایک مدد دینے (عزیر) کا باپ بھی تھا۔ ان مذہبی گروہوں کے علاوہ مجوسی آتش پرست تھے اور صابئی ستارہ پرست اس حالت میں جب اللہ وحدہ لا شریک کو ماننے کی دعوت لوگوں کو دی گئی تو اُن کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا جسے تمام ارباب اور معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود

تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اُس نے ان سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح تصور پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اُس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔

فضیلت اور اہمیت | یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے، تاکہ وہ کثرت سے اس کو پڑھیں اور عوام الناس میں اسے پھیلانیں، کیونکہ یہ اسلام کے اولین بنیادی عقیدے (توحید) کو چار اہیے مختصر فقروں میں بیان کر دیتی ہے جو فوراً انسان کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ حضور نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، طبرانی وغیرہ میں اس مضمون کی متعدد احادیث ابوسعید خدری، ابوہریرہ، ابوالیوبانصاری، ابوالذرراء، معاذ بن جبل، جابر بن عبد اللہ، ابی بن کعب، ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط، ابن عمر، ابن مسعود، قتاد بن النعمان، انس بن مالک اور ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے منقول ہوئی ہیں۔ مفسرین نے حضور کے اس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قرآن مجید جس دین کو پیش کرنا ہے اُس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ ایک توحید۔ دوسرے رسالت۔ تیسرے آخرت۔ یہ سورۃ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔

حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بخاری و مسلم اور بعض دوسری کتب حدیث میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو ایک مہم پر سردار بنا کر بھیجا اور اس پورے سفر کے دوران میں اُن کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں وہ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ پڑھتے تھے۔ واپس پر اُن کے ساتھیوں نے حضور سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا اُن سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اُن سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں رحمان کی صفت بیان کی گئی ہے اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضور نے یہ بات سنی تو لوگوں سے فرمایا اخبروہ ان الله تعالى یحبہ " اُن کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں محبوب رکھتا ہے۔"

اسی سے ملتا جلتا واقعہ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک صاحب مسجد قبلہ میں نماز پڑھتے تھے اور اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ہر رکعت میں پہلے قُلْ هُوَ اللهُ پڑھتے، پھر کوئی اور سورت تلاوت کرتے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور ان سے کہا کہ یہ تم کیا کرتے ہو کہ قُلْ هُوَ اللهُ پڑھنے کے بعد اسے کافی نہ سمجھ کر کوئی اور سورت بھی اُس کے ساتھ تلا لیتے ہو؟ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

یا تو صرف اسی کو پڑھو، اور یا اسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھو۔ انہوں نے کہا میں اسے نہیں چھوڑ سکتا، تم چاہو تو میں تمہیں نماز پڑھاؤں ورنہ امامت چھوڑ دوں۔ لیکن لوگ ان کی جگہ کسی اور کو امام بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر کار معاملہ حضور کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھی جو کچھ چاہتے ہیں اُسے قبول کرنے میں تم کو کیا امر مانع ہے؟ تمہیں ہر رکعت میں یہ سورت پڑھنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ آپ نے فرمایا جَنَّكَ اِيَّا هَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ "اس سورت سے تمہاری محبت نے تمہیں جنت میں داخل کر دیا"



سُورَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۱ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۲ لَمْ يَلِدْهُ وَكَمْ يُوَلَّدُ ۳

وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۴

کہو، وہ اللہ ہے، ایک۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

۱۔ اس حکم کے اولین مخاطب نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ ہی سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا رب کون اور کیسا ہے، اور آپ ہی کو حکم دیا گیا کہ اس سوال کے جواب میں آپ یہ کہیں۔ لیکن حضور کے بعد ہر مومن اس کا مخاطب ہے۔ اُسے بھی وہی بات کہنی چاہیے جس کے کہنے کا حکم حضور کو دیا گیا تھا۔

۲۔ یعنی میرے جس رب سے تم تعارف حاصل کرنا چاہتے ہو وہ کوئی اور نہیں بلکہ اللہ ہے۔ یہ اُن سوال کرنے والوں کی بات کا پہلا جواب ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی نیا رب نے کر نہیں آگیا ہوں جس کی عبادت، دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر، میں تم سے کروانا چاہتا ہوں، بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ اللہ عربوں کے لیے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا۔ قدیم ترین زمانے سے وہ خالق کائنات کے لیے ہی لفظ استعمال کر رہے تھے اور اپنے دوسرے معبودوں میں سے کسی پر بھی اس کا اطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبودوں کے لیے اُن کے ہاں واللہ کا لفظ رائج تھا۔ پھر اللہ کے بارے میں اُن کے جو عقائد تھے اُن کا اظہار اُس موقع پر خوب کھل کر ہو گیا تھا جب اُبڑ معصوم نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ اُس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ اللہوں کے بت موجود تھے، مگر مشرکین نے اُن سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ اس بلا سے اُن کو بچائے۔ گویا وہ اپنے دلوں میں اچھی طرح جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ اس نازک وقت میں اُن کی مدد نہیں کر سکتا۔ کعبے کو بھی وہ اُن اللہوں کی نسبت سے بیٹا الالبہ نہیں، بلکہ اللہ کی نسبت سے بیٹا اللہ کہتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مشرکین عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر:

سورہ زُحُور میں ہے: "اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے" (آیت ۸۷)۔
سورہ غُلُوب میں ہے: "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے.... اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اُس کے

ذریعہ سے مردہ بڑی ہوئی نہ میں کو جلا اٹھایا، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے " (آیات ۶۱ تا ۶۳)۔

سورۃ مومنوں میں ہے: "ان سے کہو، بناؤ اگر تم جانتے ہو کہ بی زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی... ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ... ان سے کہو، بناؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے" (آیات ۸۴ تا ۸۹)۔

سورۃ یونس میں ہے: "ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں (جو تمہیں حاصل ہیں) کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ" (آیت ۳۱)۔

اسی سورۃ یونس میں ایک اور جگہ ہے: "جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر یادِ موافق پر فرحان و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادمخالت کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں" (آیات ۲۲-۲۳)۔

یہی بات سورۃ بنی اسرائیل میں یوں ڈہرائی گئی ہے: "جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جی جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پہ پہنچا دیتا ہے تو تم اُس سے منہ موڑ جاتے ہو" (آیت ۶۷)۔

ان آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ تمہارا رب کون ہے اور کیسا ہے جس کی بندگی و عبادت کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، تو انہیں جواب دیا گیا **هُوَ اللَّهُ**، وہ اللہ ہے اس جواب سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ جسے تم خود اپنا اور ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق اور مدبر و منتظم مانتے ہو، اور سخت وقت آنے پر جسے دوسرے سب معبودوں کو چھوڑ کر مدد کے لیے پکارتے ہو، وہی میرا رب ہے اور اسی کی بندگی کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں۔ اس جواب میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمالیہ آپ سے آپ آجاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات سر سے سے قابل تصور ہی نہیں ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا، اُس کا انتظام اور اُس کے معاملات کی تدبیر کرنے والا، اُس میں پائی جانے والی تمام مخلوقات کو رزق دینے والا، اور مصیبت کے وقت اپنے بندوں کی مدد کرنے والا، زندہ نہ ہو، سنتا اور دیکھتا نہ ہو، قادرِ مطلق نہ ہو، علیم اور حکیم نہ ہو، رحیم اور کریم نہ ہو، اور سب پر غالب نہ ہو۔

۳ نحوی قواعد کی رو سے علماء نے **هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ** کی متعذر تہ کیسے بیان کی ہیں، مگر ہمارے نزدیک ان میں سے جو ترکیب اس مقام کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ **هُوَ مُبْتَدَأٌ**، اللہ اس کی خبر ہے، اور **أَحَدٌ** اس کی دوسری خبر۔ اس ترکیب کے لحاظ سے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ (جس کے بارے میں تم لوگ سوال کر

رہے ہوں اللہ ہے، یکتا ہے، دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے، اور زبان کے لحاظ سے غلط نہیں ہے کہ ”وہ اللہ ایک ہے“

بیان سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظاً حد جس طرح استعمال کیا گیا ہے وہ عربی زبان میں اس لفظ کا غیر معمولی استعمال ہے۔ معمولاً یہ لفظ یا تو مضافات یا مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے یَوْمُ الْأَحْزَانِ، ہفتے کا پہلا دن، اور فَأَبْعَثُوا أَحَدَكُمْ، ”اپنے کسی آدمی کو بھیجو“ یا نَفْسِي عام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے مَا جَاءَنِي أَحَدٌ، ”میرے پاس کوئی نہیں آیا“ یا عمومیت کا پہلو لیے ہوئے سوالیہ فقرے میں بولا جاتا ہے، جیسے هَلْ عِنْدَكَ أَحَدٌ؟ ”کیا تمہارے پاس کوئی ہے؟“ یا اسی عمومیت کے پہلو سے شرطیہ جملہ میں بولا جاتا ہے، جیسے إِنْ جَاءَكَ أَحَدٌ، ”اگر تمہارے پاس کوئی آئے“ یا گنتی میں بولا جاتا ہے، جیسے أَحَدًا، اِثْنَانٍ، أَحَدٌ عَشَرَ، ایک، دو، گیارہ۔ ان استعمالات کے سوا نزولِ قرآن سے پہلے کی عربی زبان میں اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ محض لفظاً حد و صفت کے طور پر کسی شخص یا چیز کے لیے بولا گیا ہو، اور نزولِ قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرزِ بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے، موجودات میں سے کوئی دوسرا اس صفت متصف نہیں ہے۔ وہ ایک ہے، کوئی اُس کا ثانی نہیں۔

پھر جو سوالات مشرکین اور اہل کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے رب کے بارے میں کیے تھے اُن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دیکھیے کہ هُوَ اللَّهُ کہنے کے بعد أَحَدًا کہہ کر اُن کا جواب کس طرح دیا گیا ہے؛

اولاً، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہی اکیلا رب ہے، کسی دوسرے کا ربوبیت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اور چونکہ اللہ (معبود) وہی ہو سکتا ہے جو رب (مالک و پروردگار) ہو، اس لیے اُلُوہیت میں بھی کوئی اُس کا شریک نہیں۔

ثانیاً، اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہی تنہا کائنات کا خالق ہے، تخلیق کے اس کام میں کوئی اور اُس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا مالک الملک ہے، نظامِ عالم کا مدبّر و منتظم ہے، اپنی مخلوقات کا رزق رساں ہے، اور آٹھ سے وقت میں مدد کرنے والا فریادرس ہے۔ خدائی کے ان کاموں میں جن کو تم خود مانتے ہو کہ یہ اللہ کے کام ہیں، کسی دوسرے کا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے۔

ثالثاً، چونکہ اُنہوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ اُس کا نسب کیا ہے؟ وہ کس جنس سے ہے؟ کس سے اُس نے دنیا کی میراث پائی ہے؟ اور اُس کے بعد کون اُس کا وارث ہوگا؟ اس لیے اُن کے ان سارے سوالات کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صرف ایک لفظاً حد بول کر دے دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ (۱) وہی ایک خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اُس سے پہلے کوئی خدا تھا، نہ اُس کے بعد کوئی خدا ہوگا۔ (۲) خداؤں کی کوئی جنس نہیں ہے جس کا وہ فرد ہو، بلکہ وہ اکیلا خدا ہے اور کوئی اُس کا ہم جنس نہیں۔ (۳) اُس کی ذات محض واحد نہیں بلکہ اُحد ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ اجزاء سے مرکب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضا ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو، اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور منترہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے اُحد

ہے۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عربی زبان میں "واحد" کا لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح ہم اردو میں "ایک" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کثرتوں پر مشتمل کسی مجموعہ کو بھی اس کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے واحد یا ایک کہا جاتا ہے، جیسے ایک آدمی، ایک قوم، ایک ملک، ایک دنیا، حتیٰ کہ ایک کائنات۔ اور کسی مجموعہ کے ہر جز کو الگ الگ بھی ایک ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن اَعَدَّ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اِلٰہِ واحد، ایک ہی معبود، يَا اَللّٰهُ الْوَاحِدُ الْفَرَّادُ، اکیدا اللہ جو سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا ہے، کہا گیا ہے، محض واحد کہیں نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ لفظ ان چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو اپنی ذات میں طرح طرح کی کثرتیں رکھتی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کے لیے اور صرف اللہ ہی کے لیے اَعَدَّ کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ وجود میں صرف وہی ایک ہستی ایسی ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے جس کی وحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے۔

۱۷ اصل میں لفظ صَمَدٌ استعمال کیا گیا ہے جس کا مادہ ص، م، د ہے۔ عربی زبان میں اس مادے سے جو الفاظ نکلے ہیں ان پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے معانی کی وسعت کس قدر ہے:-

— اَلصَّمَدُ - قصد کرنا، بلند مقام جو بڑی ضخامت رکھتا ہو، سطح مرتفع، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

— اَلصَّمَدُ - ہر چیز کا بلند حصہ، وہ شخص جس سے بالاتر کوئی دوسرا شخص نہ ہو، وہ سردار جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور اُس کے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجتمند لوگ رجوع کرتے ہوں، دائم، بلند مرتبہ، ٹھوس جس میں کوئی خول یا جھول نہ ہو اور جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو نہ اس میں داخل ہو سکتی ہو، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو۔

— اَلْمُصَمَّدُ - ٹھوس چیز جس کا کوئی خوف نہ ہو۔

— اَلْمُصَمَّدُ - مقصود جس کی طرف جانے کا قصد کیا جائے، سخت چیز جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔

— بَيْتٌ مَّصْمُودٌ - وہ گھر جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

— بِنَاءٌ مَّصْمُودٌ - بلند عمارت۔

— صَمَدًا وَصَمَدًا اِلَيْهِ صَمَدًا - اُس شخص کی طرف جانے کا قصد کیا۔

— اَصَمَدًا اِلَيْهِ الْاَمْرَ - اُس کے سپرد معاملہ کر دیا، اُس کے آگے معاملہ پیش کر دیا، اُس کے اوپر معاملہ میں اعتماد کیا۔

(صحاح، قاموس، لسان العرب)۔

ان لغوی معنوں کی بنا پر آیت اللہ الصَّمَدُ میں لفظ الصَّمَدُ کی جو تفسیریں صحابہ و تابعین اور بعد کے اہل علم سے منقول ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

— حضرت علی، عکرمہ اور کعب اخبار: صَمَدٌ وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو۔

— حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور ابوہریرہ بن سلمہ: ”وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور اتنا کو پہنچی ہوئی ہو“

— ابن عباس کا دوسرا قول: ”حمد وہ ہے جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت کے نازل ہونے پر مدد کے لیے رجوع کریں“ ان کا ایک اور قول: ”وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے علم اور بردباری میں، اپنے علم میں اور اپنی حکمت میں کامل ہو“

— حضرت ابوہریرہ: ”وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اُس کے محتاج ہوں“

— عکرمہ کے دوسرے اقوال: ”وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو“ ”جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو“ اسی کے ہم معنی اقوال شعبی اور محمد بن کعب القرظی سے بھی منقول ہیں۔

— سدی: ”مطلوب چیزیں حاصل کرنے کے لیے لوگ جس کا قصد کریں اور مصائب میں مدد کے لیے جس کی طرف رجوع کریں“

— سعید بن جبیر: ”وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو“

— ربیع بن انس: ”وہ جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو“

— مقاتل بن حیان: ”وہ جو بے عیب ہو“

— ابن کثیر: ”وہ جس کی صفت سے کوئی دوسرا متصف نہ ہو“

— حسن بصری اور قتادہ: ”جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو“ اسی سے ملنے جلتے اقوال مجاہد اور مخرم اور مژة الہمدانی سے بھی منقول ہیں۔

— مژة الہمدانی کا ایک اور قول یہ ہے کہ ”وہ جو اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے اور جو کام چاہے کرے، اس کے حکم اور فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو“

— ابراہیم نخعی: ”وہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجتوں کے لیے رجوع کریں“

— ابوبکر الأنباری: ”اہل لغت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حمد اُس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالاتر کوئی اور سردار نہ ہو، اور جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور اپنے معاملات میں رجوع کریں“ اسی کے قریب التزجاج کا قول ہے ”وہ کہتے ہیں کہ حمد وہ ہے جس پر سرداری ختم ہو گئی ہو اور ہر ایک اپنی حاجات کے لیے جس کی طرف رجوع کرے“

اب غور کیجیے کہ پہلے فقرے میں اللہُ اَحَدٌ کیوں کہا گیا، اور اس فقرے میں اللہُ الصَّمَدُ کہنے کی کیا وجہ ہے۔ لفظ اَحَدٌ کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، کسی اور کے لیے سر سے مستعمل ہی نہیں ہے، اس لیے اُسے اَحَدٌ، یعنی نکرہ کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن صَمَدُ کا لفظ چونکہ مخلوقات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے اللہُ صَمَدٌ کہنے کے بجائے اللہُ الصَّمَدُ کہا گیا، جس کے

معنی یہ ہیں کہ اصلی اور حقیقی صمد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی حیثیت سے صمد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صمد نہیں ہے، کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں ہے، قابل تجزیہ و تقسیم ہے، مرکب ہے، کسی وقت اُس کے اجزا بکھر سکتے ہیں، بعض مخلوقات اُس کی محتاج ہیں تو بعض کا وہ خود محتاج ہے، اُس کی سیادت اضافی ہے نہ کہ مطلق، کس کے مقابلے میں وہ بزرگ ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور بزرگ ہے، بعض مخلوقات کی بعض حاجات کو وہ پورا کر سکتا ہے مگر سب کی تمام حاجات کو پورا کرنا کسی مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی صمدیت ہر حیثیت سے کامل ہے۔ ساری دنیا اُس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود و بقا اور اپنی حاجات و ضروریات کے لیے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اُسی کی طرف رجوع کرتی ہے اور سب کی تمام حاجات پوری کرنے والا وہی ہے۔ وہ غیر فانی اور لازوال ہے۔ رزق دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔ مفرد ہے، مرکب نہیں ہے کہ قابل تجزیہ و تقسیم ہو۔ ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے بزرگ ہے۔ اس لیے وہ محض صمد نہیں بلکہ الصمد ہے، یعنی ایک ہی ایسی ہستی جو حقیقت میں صمدیت سے بنام و کمال متصف ہے۔

پھر چونکہ وہ الصمد ہے اس لیے لازم آتا ہے کہ وہ یگانا اور یگانہ ہو، کیونکہ ایسی ہستی ایک ہی ہو سکتی ہے جو کسی کی حاجت مند نہ ہو اور سب جس کے محتاج ہوں۔ دو یا زائد مستیاں سب سے بے نیاز اور سب کی حاجت روا نہیں ہو سکتیں۔ نیز اُس کے الصمد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہی ایک معبود ہو، کیونکہ انسان عبادت اُسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو۔ اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہ ہو، کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو اُس کی بندگی و عبادت کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

۵۵ مشرکین نے ہر زمانے میں خدائی کا یہ تصور اختیار کیا ہے کہ انسانوں کی طرح خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس کے بہت سے افراد ہیں، اور اُن میں شادی بیاہ اور نوالد و نناسل کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس جاہلانہ تصور سے انہوں نے اللہ رب العالمین کو بھی پاک اور بالاتر نہیں سمجھا اور اُس کے لیے بھی اولاد تجزیہ کی۔ چنانچہ اہل عرب کا یہ عقیدہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی امتیں بھی اس جہالت سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اُن کے ہاں بھی کسی بزرگ انسان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینے کا عقیدہ پیدا ہو گیا۔ ان مختلف توہمات میں دو قسم کے تصورات ہمیشہ خلط ملط ہوتے رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جن کو وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے رہے ہیں وہ اُس ذات پاک کی نسبی اولاد ہے۔ اور بعض نے یہ دعویٰ کیا کہ جس کو وہ اللہ کا بیٹا کہہ رہے ہیں اُسے اللہ نے اپنا مُبَشَّیٰ بنایا ہے۔ اگرچہ اُن میں سے کسی کی یہ جرات نہیں ہوئی کہ معاذ اللہ کسی کو اللہ کا باپ قرار دیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ہستی کے متعلق یہ تصور کیا جائے کہ وہ نوالد و نناسل سے پاک نہیں ہے، اور اُس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ وہ بھی انسان کی طرح اُس قسم کی کوئی ہستی ہے جس کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے، اور جس کو اولاد ہونے کی صورت میں کسی کو بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو پھر انسانی ذہن اس گمان سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ اُسے بھی کسی کی اولاد سمجھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے گئے تھے اُن میں ایک سوال یہ تھا کہ اللہ کا نسب کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ

کس سے اس نے دنیا کی میراث پائی ہے اور کون اُس کے بعد وارث ہوگا؟

ان جاہلانہ مفروضات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منطقی طور پر ان کو فرض کر لینے سے کچھ اور چیزوں کو بھی فرض کرنا لازم آتا ہے:

اول یہ کہ خدا ایک نہ ہو، بلکہ خداؤں کی کوئی جنس ہو، اور اس کے افراد خدائی کے اوصاف، افعال اور اختیارات میں شریک ہوں۔ یہ بات خدا کی صرف نسبی اولاد فرض کر لینے ہی سے لازم نہیں آتی، بلکہ کسی کو متبثی فرض کرنے سے بھی لازم آتی ہے، کیونکہ کسی کا متبثی لامحالہ اُس کا ہم جنس ہی ہو سکتا ہے، اور جب معاذ اللہ وہ خدا کا ہم جنس ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدائی کے اوصاف بھی رکھتا ہے۔

دوم یہ کہ اولاد کا کوئی تصور اس کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ مرد مادہ میں اتصال ہو اور کوئی مادہ باپ اور ماں کے جسم سے نکل کر بچے کی شکل اختیار کرے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ وہ ایک مادی اور جسمانی وجود ہو، اُس کی ہم جنس کوئی اُس کی بیوی بھی ہو، اور اُس کے جسم سے کوئی مادہ بھی خارج ہو۔

سوم یہ کہ تو اُلد و تناسل کا سلسلہ جہاں بھی ہے اُس کی علت یہ ہے کہ افراد فانی ہوتے ہیں اور اُن کی جنس کے باقی رہنے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اُن سے اولاد پیدا ہو جس سے اُن کی نسل آگے چلے۔ پس اللہ کے لیے اولاد فرض کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ بذات خود معاذ اللہ فانی ہو اور باقی رہنے والی چیز خداؤں کی نسل ہو نہ کہ ذاتِ خدا۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تمام فانی افراد کی طرح نعوذ باللہ خدا کی بھی کوئی ابتدا اور انتہا ہو۔ کیونکہ تو اُلد و تناسل پر جن اجناس کے بقاء کا انحصار ہوتا ہے اُن کے افراد نہ اُزلی ہوتے ہیں نہ اُبدی۔

چهارم یہ کہ کسی کو متبثی بنانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک لاد اللہ شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا، اور اپنی وفات کے بعد کسی وارث کا حاجت مند ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ فرض کرنا کہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، اُس ذاتِ پاک کی طرف لازم و ہی سب کمزوریاں منسوب کرنا ہے جو فانی اشخاص میں پائی جاتی ہیں۔

ان تمام مفروضات کی جڑ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اُخدا اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی کٹ جاتی ہے، لیکن اُس کے بعد یہ ارشاد فرمانے سے کہ ”نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد،“ اس معاملہ میں کسی اشتباہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ پھر چونکہ ذاتِ باری کے حق میں یہ تصورات شرک کے اہم ترین اسباب میں سے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف سورہٴ اخلاص ہی میں اُن کی صاف صاف اور قطعی و حتمی تردید کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ جگہ جگہ اس مضمون کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهٌ دَائِمٌ، سُبْحٰنَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ
وَلَدٌ، لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ
(النساء ۶-۱۷)

اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ پاک ہے اس سے
کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ
زمین میں ہے، سب اُس کی ملک ہے۔

الَا اِنَّهُمْ مِنْ اٰفِكِهِمْ لَيَقُولُونَ وَلَدَ اللّٰهِ
خوب سن رکھو، یہ لوگ دراصل اپنی من گھڑت سے

وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ

(الصُّفَّت ۱۵۱-۱۵۲)

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسْبًا وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الْجِنَّةَ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ

(الصُّفَّت ۱۵۸)

وَجَعَلُوا لَكَ مِنْ عِبَادِكُمْ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ

(الشُّعْرَف ۱۵)

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّةَ وَخَلَقَهُمْ مَخْرُوجًا لَكَ بَيِّنٌ وَبَيِّنَاتٍ بِحَيْثُ عَلِمْتَ سُبْحَانَكَ وَتَعَالَى عَمَّا يُعِشُونَ، بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، أَلَىٰ يَكُونُ لَكَ ذَلْدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَكَ صَاحِبَةً وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ

(الانعام ۱۰۰-۱۰۱)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحَانَكَ بِلَدِّ عِبَادِكُمْ مَدُونٍ

(الانبیاء ۲۶)

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَكَ هُوَ الْغَنِيُّ لَكَ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا - أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ

(یونس ۶۸)

وَقِيلِ لِلْحَمْدِ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَكَ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَكَ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ (بنی اسرائیل ۱۱۰) مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ ذَلْدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ

یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ فی الواقع یہ قطعی جھوٹے ہیں۔

انہوں نے اللہ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ فرشتے خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (مجرموں کی حیثیت سے) پیش کیے جانے والے ہیں۔ لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے بعض کو اُس کا جز بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔

اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے۔ اور انہوں نے بے جانے بوجھے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں، حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو وہ کہتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا مجدد ہے۔ اُس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اُس کی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

اور ان لوگوں نے کہا کہ خدا نے رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے وہ۔ بلکہ (جن کو یہ اسکی اولاد کہتے ہیں) وہ تو نبردے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔

لوگوں نے کہا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، سبحان اللہ! وہ تو بے تیار ہے۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے سب اُس کی ملک ہے۔ تمہارے پاس اس قول کی آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے؟

اور (اسے نبی) کہو، تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا، نہ کوئی بادشاہ ہو، میں اس کا شریک ہے، اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیباں ہو۔

اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، اور کوئی دوسرا

وَمِنْ آيَاتِهِ (المؤمنون - ۹۱) خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

ان آیات میں ہر پہلو سے اُن لوگوں کے عقیدے کی تردید کر دی گئی ہے جو اللہ کے لیے نسی اولاد یا متبثی بناٹی ہوئی اولاد تجویز کرتے ہیں، اور اُس کے غلط ہونے کے دلائل بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ یہ اور ایسی مضمون کی دوسری بہت سی آیات جو قرآن مجید میں ہیں، سورۃ اخلاص کی بہترین تفسیر کرتی ہیں۔

۱۵ اصل میں لفظ کُفُو استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں نظیر، مشابہ، مماثل، ہم مرتبہ، مساوی۔ نکاح کے معاملہ میں کُفُو کا لفظ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہونا ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشرتی حیثیت سے برابر کی جوڑ ہوں۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا، نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اللہ کے مانند، یا اُس کا ہم مرتبہ ہو، یا جو اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اُس سے کسی درجہ میں بھی مشابہت رکھتا ہو۔



مُعَوِّذَاتِنَا

(۱۱۳)

القلق

(۱۱۴)

الناس

مُعَوِّذَتَيْنِ

الفلق — الناس

نام اگرچہ قرآن مجید کی یہ آخری دو سورتیں بجائے خود الگ الگ ہیں، اور مُصَحَّف میں الگ ناموں ہی سے لکھی ہوئی ہیں، لیکن ان کے درمیان باہم اتنا گہرا تعلق ہے، اور ان کے مضامین ایک دوسرے سے اتنی قریب ہی مناسبت رکھتے ہیں کہ ان کا ایک مشترک نام ”مُعَوِّذَتَيْنِ“ (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ امام بیہقی نے دلائل نبوت میں لکھا ہے کہ یہ نازل بھی ایک ساتھ ہی ہوئی ہیں، اسی وجہ سے دونوں کا مجموعی نام ”مُعَوِّذَتَيْنِ“ ہے۔ ہم یہاں دونوں پر ایک ہی دیباچہ لکھ رہے ہیں کیونکہ ان سے متعلقہ مسائل و مباحث بالکل یکساں ہیں۔ البتہ آگے ان کی ترجمانی و تفسیر الگ الگ کی جائے گی۔

زمانہ نزول حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطاء اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ مگر ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیر اور قتادہ کا بھی ہے۔ اس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں ان میں سے ایک مسلم، ترمذی، نسائی اور مستدرک امام احمد بن حنبل میں حضرت عقیبہ بن عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا اللہ ترا یاات انزلت اللیلۃ الہدیٰ مثلہن، اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ تمہیں کچھ پتہ ہے کہ آج رات مجھ پر کسی آیات نازل ہوئی ہیں؟ یہ بے مثل آیات ہیں۔ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ یہ حدیث اس بنا پر ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عقیبہ بن عامر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے، جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی نے خود ان کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس قول کی تقویت کی موجب بنی ہیں وہ ابن سعد، محی الشیخہ بخاری، امام نسفی، امام بیہقی، حافظ ابن حجر، حافظ بدر الدین عینی، عبید بن حمید وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینے میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضور بیمار ہو گئے تھے اس وقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ سورتیں کا واقعہ ہے۔ اسی بنا پر سفیان بن عیینہ نے بھی ان سورتوں کو مدنی کہا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم سورہ اخلاص کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، کسی سورہ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اسی موقع پر نازل

ہوئی تھی، بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی، اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورت حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کی طرف دوبارہ بلکہ کبھی کبھی بار بار حضور کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ معوذتین کا بھی ہے۔ ان کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہوں گی جب وہاں حضور کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔ بعد میں جب مدینہ طیبہ میں منافقین، یہود، اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اٹھے تو حضور کو پھر انہی دونوں سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر کی مندرجہ بالا روایت میں ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی علالت مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آکر پھر بھی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی۔ اس لیے ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو ملکی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملہ کے ساتھ ان کو مخصوص سمجھنے میں تو برابر بھی مانع ہے کہ اُس کے ساتھ صرف سورہ فلق کی صرف ایک آیت دَمِنُ شَرِّ اللَّغْثَاتِ فِي الْعُقَدِ ہی تعلق رکھتی ہے، سورہ فلق کی باقی آیات اور پوری سورہ الناس کا اس معاملہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

موضوع اور مضمون | مکہ معظمہ میں یہ دونوں سورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں وہ یہ تھے کہ اسلام کی

دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جوں جوں آپ کی دعوت پھیلتی گئی، کفار قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی۔ جب تک انہیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے، یا بہلا چسلا کر آپ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے، اُس وقت تک تو پھر بھی عناد کی شدت میں کچھ کمی رہی۔ لیکن جب حضور نے ان کو اس طرف سے بالکل باپوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے، اور سورہ کافرون میں صاف صاف ان سے کہہ دیا گیا کہ جن کی بندگی تم کرتے ہو ان کی بندگی کرنے والا میں نہیں ہوں، اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں اُس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لیے میرا ساتھ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ، تو کفار کی دشمنی اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔ خصوصیت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد مردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کے دلوں میں تو حضور کے خلاف ہر وقت بھڑیاں سلگتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آپ کو کوسا جا رہا تھا۔ خفیہ مشورے کیے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھپ کر آپ کو قتل کر دیا جائے تاکہ نبی ہاشم کو قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں۔ آپ کے خلاف جادو ٹونے کیے جا رہے تھے تاکہ آپ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں، یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطین جن دامن ہر طرف پھیل گئے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں آپ کے خلاف اور آپ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی دوسرا ڈال دیں جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپ سے دور بھاگنے

لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی، کیونکہ وہ اپنے سوا، یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا، دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ابو جہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں حد سے بڑھنا چلا جاتا تھا اس کی وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے کہ ”ہمارا اور بنی عبدمناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ انہوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے عقیقے دیے تو ہم نے بھی دیے۔ بیان تک کہ وہ اور ہم جب عزت و شرف میں برابر کی ٹکڑ ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک ہی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ بھلا اس میدان میں ہم کیسے اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس کو نہ مائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے“ (ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۳۷-۳۳۸)۔

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طلوع صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادو گروں اور جادو گریموں کے شر سے، اور حاسدوں کے شر سے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی ہر اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطین جن میں سے ہو یا شیاطین انس میں سے۔ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰ نے اُس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں اُن کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اِنِّي عُدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ، میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے ہر اُس تکبر کے مقابلے میں جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا“ (المومن، ۲۷)۔ اِنِّي عُدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ، ”اور میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے اس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو“ (الدخان، ۲۰)۔

دونوں مواقع پر اللہ کے ان جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سرو سامانی کی حالت میں بڑے سرو سامان اور وسائل و ذرائع اور قوت و شوکت رکھنے والوں سے تھا۔ دونوں مواقع پر وہ طاقت ور دشمنوں کے آگے اپنی دعوتِ حق پر ڈٹ گئے درنا خالیکہ اُن کے پاس کوئی مادی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بل پر وہ اُن کا مقابلہ کر سکتے۔ اور دونوں مواقع پر انہوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور معاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ تمہارے مقابلے میں ہم نے رب کا ثبات کی پناہ لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اولوالعزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اُس رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اُس کے مقابلے میں دنیا کی ساری طاقتیں بیچ ہیں، اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمہ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہشوں گا، تم جو چاہو کرو، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ میں تمہارے اور اپنے اور ساری کا ثبات کے رب کی پناہ

سے چکا ہوں۔

معوذتین کی قرآنیت | ان دونوں سورتوں کے موضوع اور مضمون کو سمجھنے کے لیے تو اتنی بحث ہی کافی ہے جو ادراک کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق تین ایسے مباحث آگئے ہیں جو درلوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لیے ہم ان کو بھی صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سے اولین قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا ان دونوں سورتوں کا قرآنی سورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، یا اس میں کسی شک کی گنجائش ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے عظیم المرتبہ صحابی سے متعدد روایتوں میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ وہ ان دونوں سورتوں کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اپنے مصحف سے انہوں نے ان کو ساقط کر دیا تھا۔ امام احمد، بزار، طبرانی، ابن کثیر، ابو یعلیٰ، عبداللہ بن احمد بن حنبل، محمدی، ابو نعیم، ابن حبان، وغیرہ محدثین نے مختلف سندوں سے، اور اکثر بیشتر صحیح سندوں سے یہ بات حضرت ابن مسعود سے نقل کی ہے۔ ان روایات میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ ان سورتوں کو مصحف سے ساقط کر دیتے تھے، بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے "قرآن کے ساتھ وہ چیزیں نہ ملاؤ جو قرآن کا جز نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک حکم تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ ان الفاظ میں خدا کی پناہ مانگیں، بعض روایات میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ ان سورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔

ان روایات کی بنا پر مخالفین اسلام کو قرآن کے بارے میں یہ شبہات ابھارنے کا موقع مل گیا کہ معانی اللہ یہ کتاب تحریر سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اس میں جب یہ دو سورتیں ابن مسعود جیسے صحابی کے بیان کے مطابق الحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا حذف و اضافے اس کے اندر ہوئے ہوں گے۔ اس طعن سے بچنا چھڑانے کے لیے قاضی ابوبکر الباقلائی اور قاضی عیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابن مسعود معوذتین کی قرآنیت کے متکرر تھے بلکہ صرف ان کو مصحف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک مصحف میں صرف وہی چیز درج کی جانی چاہیے تھی جس کے ثبوت کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو، اور ابن مسعود تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضور نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ تاویل درست نہیں ہے، کیونکہ صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے قرآنی سورتیں ہونے کا انکار کیا ہے۔ کچھ دوسرے بزرگوں، مثلاً امام نووی، امام ابن حزم اور امام فخر الدین رازی نے اس سے اس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ ابن مسعود نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ مگر مستند تاریخی حقائق کو بلا سند رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ابن مسعود کی ان روایات سے قرآن پر جو طعن وارد ہوتا ہے اس کا صحیح رد کیا ہے؟

اس سوال کے کئی جواب ہیں جن کو ہم سلسلہ وار درج کرتے ہیں:

(۱) حافظ بزاز نے اپنی سند میں ابن مسعود کی یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اپنی اس رائے میں وہ بالکل متفرد ہیں۔ صحابہ میں سے کسی نے بھی ان کے اس قول کی تائید نہیں کی ہے۔

(۲) تمام صحابہ کے اتفاق سے خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے جو نسخے مرتب کروائے تھے اور خلافت اسلامیہ کی طرف سے جن کو دیا گئے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیجا تھا۔ ان میں یہ دونوں سورتیں درج تھیں۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک تمام دنیا میں اسلام کا جس مُصَنَّف پر اجماع ہے اُس میں یہ دونوں سورتیں درج ہیں۔ تنہا عید اللہ بن مسعود کی رائے، ان کی جلالت قدر کے باوجود، اس عظیم اجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح و معتبر احادیث کے مطابق یہ ثابت ہے کہ آپ نے ان سورتوں کو نماز میں خود پڑھا ہے، دوسروں کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اور قرآن کی سورتوں کی حیثیت ہی سے لوگوں کو ان کی تعلیم دی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں:

مسلم، احمد، ترمذی، اور نسائی کے حوالہ سے حضرت عقبہ بن عامر کی یہ روایت ہم ادھر نقل کر چکے ہیں کہ حضور نے سورۃ قلن اور سورۃ ناس کے متعلق ان سے یہ فرمایا کہ آج رات یہ آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ نسائی کی ایک روایت عقبہ بن عامر سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں۔ ابن جتان نے انہی حضرت عقبہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نے ان سے فرمایا دو اگر ممکن ہو تو تمہاری نمازوں سے ان دونوں سورتوں کی قراءت چھوڑنے نہ پائے۔ سعید بن منصور نے حضرت معاذ بن جبل سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نے صبح کی نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔ امام احمد اپنی سند میں صحیح سند کے ساتھ ایک اور صحابی کی یہ روایت لائے ہیں کہ حضور نے ان سے فرمایا جب تم نماز پڑھو تو اس میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرو۔ مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں عقبہ بن عامر کی یہ روایت آئی ہے کہ حضور نے ان سے فرمایا کیا میں دو ایسی سورتیں تمہیں دکھاؤں جو ان بہترین سورتوں میں سے ہیں جنہیں لوگ پڑھتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ۔ اس پر حضور نے ان کو یہی معوذتیں پڑھائیں۔ پھر نماز کھڑی ہوئی تو حضور نے یہی دو سورتیں اس میں بھی پڑھیں۔ اور نماز کے بعد پلٹ کر جب آپ ان کے پاس سے گزرے تو فرمایا "اے عقبہ، کیا پاپا تم نے؟" اور اس کے بعد ان کو ہدایت فرمائی کہ جب تم سونے لگو اور جب سو کر اٹھو تو ان سورتوں کو پڑھا کرو۔ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں عقبہ بن عامر کی ایک روایت یہ ہے کہ حضور نے ان کو ہر نماز کے بعد معوذتہ ذات (یعنی قل ہو اللہ احد اور معوذتہ تین) پڑھنے کی تلقین کی۔ نسائی، ابن مردودہ اور حاکم نے عقبہ بن عامر کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور سواہی پر چلے جا رہے تھے اور میں آپ کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عرض کیا مجھے سورۃ

ہود یا سورۃ یوسف سکھا دیجئے۔ فرمایا "اللہ کے نزدیک بندے کے لیے قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے" عبداللہ بن عابس الجعفی کی روایت نسائی، بیہقی، بغوی اور ابن سعد نے نقل کی ہے کہ حضور نے مجھ سے فرمایا "ابن عابس، کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ پناہ مانگنے والوں نے عینی چیزوں کے ذریعہ سے اللہ کی پناہ مانگی ہے ان میں سب سے افضل کون سی چیزیں ہیں؟" میں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ۔ فرمایا "قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ، یہ دونوں سورتیں" ابن مرزوق نے حضرت ام سلمہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کو جو سورتیں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کو یہ غلط فہمی آخر کیسے لاحق ہوئی کہ یہ دونوں قرآن مجید کی سورتیں نہیں ہیں؟ اس کا جواب ہمیں دور روایتوں کو جمع کر کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ ایک یہ روایت کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے تھے کہ یہ تو ایک حکم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ اس طرح نعوذ کیا کریں۔ دوسری وہ روایت جو کئی مختلف سندوں سے امام بخاری نے صحیح البخاری میں، امام احمد نے اپنی مسند میں، حافظ ابو بکر الخلیفی نے اپنی مسند میں، ابو نعیم نے اپنی المستدرج میں اور نسائی نے اپنی سنن میں زبیر بن جہش کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت ابی بن کعب سے، جو علم قرآن کے لحاظ سے صحابہ کرام میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، نقل کی ہے۔ زبیر بن جہش کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابی سے کہا کہ آپ کے بھائی عبداللہ بن مسعود ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ آپ ان کے اس قول کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضور نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا قُلْ، تو میں نے بھی کہا قُلْ۔ اس لیے ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور کہتے تھے" امام احمد کی روایت میں حضرت ابی کے الفاظ یہ ہیں: "میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور انہوں نے قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہا تھا اس لیے آپ نے بھی ایسا ہی کہا۔ لہذا ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور نے کہا" ان دونوں روایتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کو دونوں سورتوں میں لفظ قُلْ (کہو) دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے حضور سے اس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حضرت ابی بن کعب کے ذہن میں بھی اس کے متعلق سوال پیدا ہوا اور انہوں نے حضور سے اس کو پوچھ لیا۔ حضور نے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے چونکہ قُلْ کہا تھا اس لیے میں بھی قُلْ کہتا ہوں۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ اگر کسی کو حکم دینا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا

ہوں، تو وہ حکم کی تعمیل میں یہ نہیں کہے گا کہ ”کہو، میں پناہ مانگتا ہوں“؛ بلکہ وہ ”کہو“ کا لفظ ساقط کر کے ”پناہ مانگتا ہوں“ کہے گا۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو بلا دستِ حاکم کا پیغام یہ ان الفاظ میں پیغام پہنچائے کہ ”کہو، میں پناہ مانگتا ہوں“ اور یہ پیغام اُسے اپنے تک رکھنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں تک پہنچانے کے لیے دیا جائے تو وہ لوگوں تک پیغام کے الفاظ کو جوں کا توں پہنچائے گا، اُس میں سے کوئی چیز ساقط کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ پس ان دونوں سورتوں کی ابتدا لفظِ قُل سے ہونا اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے جسے حضور اُنہی الفاظ میں پہنچانے کے پابند تھے جن الفاظ میں یہ آپ کو بلا تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک حکم کی نہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں ان دو سورتوں کے علاوہ ۱۳۳۰ آیتیں ایسی ہیں جو لفظِ قُل رکھ کر شروع ہوئی ہیں۔ ان سب میں قُل کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کلامِ وحی ہے جسے اُنہی الفاظ میں پہنچانا حضور کے ذمہ فرض تھا جن الفاظ میں یہ آپ پر نازل کیا گیا تھا۔ ورنہ ہر جگہ قُل اگر ایک حکم ہوتا تو حضور اس لفظ کو ساقط کر کے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا، اور اُسے قرآن میں درج نہ کیا جاتا بلکہ حضور صرف اس حکم کی تعمیل میں وہ بات کہہ دینے پر اکتفا فرماتے جسے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

اس مقام پر اگر آدمی کچھ غور کرے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ صحابہ کرام کو یہ غلط سمجھنا اور ان کی کسی بات کے لیے غلط کا لفظ سننے ہی تو ہیں صحابہ کا شور مچا دینا کس قدر بے جا حرکت ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی سے قرآن کی دو سورتوں کے بارے میں کتنی بڑی چوہک ہو گئی۔ ایسی چوہک اگر اتنے عظیم مرتبہ کے صحابی سے ہو سکتی ہے تو دوسروں سے بھی کوئی چوہک ہو جانی ممکن ہے۔ ہم علمی تحقیق کے لیے اُس کی چھان بین بھی کر سکتے ہیں، اور کسی صحابی کی کوئی بات یا چند باتیں غلط ہوں تو انہیں غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ سخت ظالم ہو گا وہ شخص جو غلط کو غلط کہنے سے آگے بڑھ کر ان پر زبانِ طعن دراز کرے۔ انہی معوذتین کے بارے میں مفسرین و محدثین نے ابن مسعود کی رائے کو غلط کہا ہے، مگر کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کی دو سورتوں کا انکار کر کے معاذ اللہ وہ کافر ہو گئے تھے۔

حضور پر جادو کا اثر ہونا | دوسرا مسئلہ جو ان سورتوں کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روایات کی رو سے حضور پر جادو کیا گیا تھا، اور اس کے اثر سے آپ بیمار ہو گئے تھے، اور اس اثر کو دور کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نے اگر آپ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلمند پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر مان لی جائیں تو شریعتِ ساری کی ساری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا تھا، اور ان روایات کی رو سے ہو گیا تھا، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوا اور کروا لیا ہو، اور اُس کی دی ہوئی تعلیم میں

کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے زیر اثر۔ یہی نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو سچ مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ جادو ہی کے ذریعہ سے نبی کو نبوت کے دعوے پر اُکسایا گیا ہوا۔ نبی نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اُس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ اُن کا استدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں۔ قرآن میں تو کفار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور، یعنی سحر زدہ آدمی ہے (يَقُولُ الظَّالِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا۔ بنی اسرائیل ۷۴)، مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبی پر سحر کا اثر ہوا تھا۔

اس مسئلے کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کیا درحقیقت مستند تاریخی روایات کی رو سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا؟ اور اگر ہوا تھا تو وہ کیا تھا اور کس حد تک تھا؟ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تاریخ سے ثابت ہے اس پر وہ اعتراضات وارد بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو کیٹے گئے ہیں؟

قرونِ اولیٰ کے مسلمان علماء کی یہ انتہائی راستبازی تھی کہ انھوں نے اپنے خیالات اور مضمومات کے مطابق تاریخ کو مسخ کرنے یا حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ تاریخی طور پر ثابت تھا اسے جوں کاتوں بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ ان حقائق سے اگر کوئی اُلٹے نتائج نکالنے پر اتر آئے تو اُن کا فراہم کردہ یہ مواد کس طرح اُس کے کام آسکتا ہے۔ اب اگر ایک بات نہایت مستند اور کثیر تاریخ فرایع سے ثابت ہو تو کسی دیانت دار صاحب علم کے لیے نہ تو یہ درست ہے کہ وہ اس بنا پر تاریخ کا انکار کر دے کہ اُس کو مان لینے سے اُس کے نزدیک فلاں فلاں قبائلیں رونما ہوتی ہیں، اور نہ ہی درست ہے کہ جتنی بات تاریخ سے ثابت ہے اس کو نیاسات کے گھوڑے دوڑا کر اُس کی اصلی حد سے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے اُس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے مان لے اور پھر دیکھے کہ اُس سے فی الواقع کیا ثابت ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔

جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے اور علمی تنقید سے اُس کو اگر غلط ثابت کیا جاسکتا ہو تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسے حضرت عائشہ، حضرت زبید بن ارقم اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، امام احمد، عبدالرزاق، حمیدی، بیہقی، طبرانی، ابن سعد، ابن زبیر، ابن ابی شیبہ، حاکم، عبد بن حمید وغیرہ محدثین نے اتنی مختلف اور کثیر التعداد سندوں سے نقل کیا ہے کہ اُس کا نفس مضمون تو اُس کی حد کو پہنچا ہوا ہے، اگرچہ ایک ایک روایت بجائے خود خیر واحد ہے، اس کی تفصیلات جو روایات میں آئی ہیں انہیں ہم مجموعی طور پر تمام روایات سے مرتب کر کے ایک مربوط واقعہ کی صورت

میں یہاں درج کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے بعد حبیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۶۱ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر یبید بن اعصم سے طاجرانصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اُس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے اُن پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں، کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمد پر ایک زور کا جادو کرو۔ اُس زمانے میں حضور کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اُس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضور کی نگلی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موٹے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور نگلی کے ذراٹوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ یبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بیٹی اس سے زیادہ جادوگر بنی تھی، اُن سے اُس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر یبید نے بنی زریق کے کنویں ذروان یا ذی اردوان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوئے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا، آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھٹتے چلے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے، اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے، حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ سہی آپ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اُس میں آپ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اُس زمانے میں آپ قرآن کی کوئی آیت بھول گئے ہوں، یا کوئی آیت آپ نے غلط پڑھ ڈالی ہو،

۱۵۔ بعض راویوں نے اُسے یہودی کہا ہے، اور بعض نے منافق اور یہود کا حلیف۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ بنی زریق میں سے تھا، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ بنی زریق یہودیوں کا کوئی قبیلہ نہ تھا بلکہ خزرج میں سے انصار کا ایک قبیلہ تھا۔ اس لیے یا تو وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو اہل مدینہ میں سے یہودی ہو گئے تھے، یا یہود کا حلیف ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے اسے بھی یہودی شمار کر لیا۔ تاہم اس کے لیے منافق کا لفظ استعمال ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مسلمان بنا ہوا تھا۔

۱۶۔ ابتدا میں کھجور کا خوشہ ایک غلاف کے اندر ہوتا ہے۔ اور نر کھجور کے غلاف کا رنگ انسان کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور اس کی بو انسان کے مادہ منویہ جیسی ہوتی ہے۔

یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے دغظوں اور خطبوں میں آپ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو، یا کوئی ایسا کلام آپ نے وحی کی حیثیت سے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آ جاتی تو دھوم مچ جاتی، اور پورا ملک عرب اس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چیت نہ کر سکی تھی اسے ایک جادوگر کے جادو نے چیت کر دیا۔ لیکن آپ کی حیثیت نبوت اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اسے محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آخر کار ایک روز آپ حضرت عائشہ کے ہاں تھے کہ آپ نے بلربار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیندا گئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہو کر آپ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتادی ہے۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا وہ کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرھانے کی طرف تھا اور دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ جواب دیا لبید بن اعصم نے۔ پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا کنگھی اور بالوں میں ایک زر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا وہ کہاں ہے؟ جواب دیا بنی زریق کے کنویں ذی انوان (یا ذروان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا اب اس کے لیے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اُس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت زبیر کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جبیر بن ایاس الترقی اور قیس بن مخضص الترقی (یعنی بنی زریق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں حضور خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف بردار کر لیا گیا۔ اُس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گریں پڑی ہوئی تھیں اور روم کا ایک پتلا تھا جس میں سوٹیاں چھبونی ہوئی تھیں۔ جب ریل علیہ السلام نے آ کر بتایا کہ آپ معوذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھنے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گریہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوٹی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گریں کھل گئیں، ساری سوٹیاں نکل گئیں، اور آپ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہو گئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا، پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپ نے لبید کو بلا کر باز پرس کی۔ اُس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا، کیونکہ اپنی ذات کے لیے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اس معاملہ کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے، اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔ یہ ہے سارا قصہ اس جادو کا۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپ کے منصب نبوت میں قارح ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپ کو زخمی کیا جاسکتا تھا جیسا کہ جنگ اُحد میں ہوا، اگر آپ گھوڑے سے گر کر چوٹ

کھا سکتے تھے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اگر آپ کو کچھو کاٹ سکتا تھا، جیسا کہ کچھ اور احادیث میں وارد ہوا ہے، اور ان میں سے کوئی چیز بھی اُس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے، یہ بات تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۃ اعراف میں فرعون کے جادو گروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں جب وہ آئے تو انہوں نے ہزار ہا آدمیوں کے اُس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا **سَحَرُوا عَيْنَ النَّاسِ**۔ آیت ۱۱۶، اور سورۃ طہ میں ہے کہ جولا ٹھیاں اور رسیاں انہوں نے پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں حضرت موسیٰ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی ہیں اور اس سے حضرت موسیٰ خوف زدہ ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو تم ہی غالب رہو گے، اور **اِنَّا عَصَا بَعِينِكَ** **فَاِذَا حِبَاہُمْ وَعَصِيہُمْ یَحِیْلِ اِلَیْہِمْ مِّنْ سِحْرِہُمْ اِنَّا نَسْعٰی** **فَاَوْجَسَ فِی نَفْسِہٖ حَیْقَۃً** **مُّوسٰی** **فَلَمَّا لَا تَخَفْ** **اِنَّکَ اَکْبَرُ** **وَاِنَّکَ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ**۔ آیات ۶۷ تا ۶۹۔ رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفار مکہ کے اُس الزام کی تصدیق ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ کسی جادو گر کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادو گر نے معاذ اللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اسی پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ایسے معاملہ پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذات محمد پر ہوا تھا، نبوت محمد اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو لوگ جادو کو محض ادھام کے قبیل کی چیز قرار دیتے ہیں ان کی یہ رائے صرف اس وجہ سے ہے کہ جادو کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں، مگر سائنٹفک طریقہ سے یہ بیان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کیسے رونما ہوتی ہیں۔ اس طرح کی توجیہ پر اگر ہم قادر نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس چیز ہی کا انکار کر دیا جائے جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے، مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ روٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں تھر تھری چھوٹ جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اُس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔ حضرت موسیٰ کی طرف جادو گروں نے جولا ٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی

تھیں، لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انہیں سانپ ہی محسوس کیا، اور حضرت موسیٰ تک کے تو اس جادو کی اس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اسی طرح قرآن (البقرہ، آیت ۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ باہل میں عاروت اور ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر تجربے سے لوگوں کو اس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ بندوق کی کوئی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا مؤثر ہونا بھی اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جو چیز ہزاروں سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آرہی ہو اس کے وجود کو ٹھٹھا دینا محض ایک ہٹ دھرمی ہے۔

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت اقیسرا مسئلہ ان سورتوں کے معاملہ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے؟ اور یہ کہ جھاڑ پھونک بجائے خود مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں سے ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت، اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں معوذتین، یا بعض روایات کے مطابق معوذات (یعنی قل ہو اللہ اور معوذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر، جہاں جہاں تک بھی آپ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انہیں پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہ نے یہ سورتیں (بطور خود یا حضور کے حکم سے) پڑھیں اور آپ کے دست مبارک کی برکت کے خیال سے آپ ہی کے ہاتھ سے لے کر آپ کے جسم پر پھیرے۔ اس مضمون کی روایات صحیح مسندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور مؤطا امام مالک میں خود حضرت عائشہ سے مروی ہیں جن سے بڑھ کر کوئی بھی حضور کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔

اس معاملہ میں پہلے مسئلہ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباس کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضور فرماتے ہیں کہ میری امت کے وہ لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (مسلم)۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہو گیا (ترمذی)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوذتین یا معوذات کے (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن حبان، حاکم)۔ بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضور نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرمادیا تھا، لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جاسکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز

نہیں ہے، اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔ یہ مسئلہ شرعی واضح ہو جانے کے بعد اب دیکھیے کہ احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

طبرانی نے صغیر میں حضرت علی کی روایت نقل کی ہے کہ حضور کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں پھونک نے کاٹ لیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: پھونک پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑنا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور نمک منگوا لیا اور جہاں پھونک نے کاٹا تھا وہاں آپ نمکین پانی ملتے جاتے تھے اور قل یا ایہا الکافرون، قل هو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔

ابن عباس کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین پر یہ دعا پڑھتے تھے: **اُعِذْ كَمَا يَكْلِمَاتِ اللّٰهِ التّٰمَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّ مِنْ كُلِّ عَيْنٍ لّٰمَةٍ**۔ "میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظر بد سے" (بخاری، مسند احمد، زرنندی اور ابن ماجہ)۔

عثمان بن ابی العاص الثقفی کے منعلق مسلم، مؤطا، طبرانی اور حاکم میں تقوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں حبیب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھے کہ مارے ڈالتا ہے۔ آپ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اُس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقَدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ**، "میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اُس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے" مؤطا، میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمان بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا، اور اسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مسند احمد اور طحاوی میں طلح بن علی کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پھونک نے کاٹ لیا۔ حضور نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریل نے آکر پوچھا "اے محمد، کیا آپ بیمار ہو گئے؟" آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے کہا یا سَمِ اللّٰهُ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّوْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنٍ حَاسِدَةٍ اللّٰهُ يَشْفِيْكَ يَا سَمِ اللّٰهُ اَرْقِيْكَ" میں اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑنا ہوں ہر اُس چیز سے جو آپ کو اذیت دے اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپ کو شفا دے، میں اُس کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں" اسی سے ملتی جلتی روایت مسند احمد میں حضرت

عُبادہ بن صامت سے منقول ہے کہ حضور بیمار تھے۔ میں عبادت کے لیے گیا تو آپ کو سخت تکلیف میں پایا۔ شام کو گیا تو آپ بالکل تندرست تھے۔ میں نے اس قدر جلدی تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جبریل آئے تھے اور انہوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا پھر آپ نے قریب قریب اسی طرح کے الفاظ اُن کو سنائے جو اوپر والی حدیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت عائشہ سے بھی مسلم اور مسند احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت حفصہؓ ام المومنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شیفانامی بیٹھی تھیں جو نملہ (ذباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضور نے فرمایا حفصہؓ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ خود شفا بنت عبد اللہ کی یہ روایت امام احمد، ابوداؤد اور تسانی نے نقل کی ہے کہ حضور نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حفصہ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے نملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عرف بن مالک اشجعی کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملہ میں حضور کی رائے کیا ہے۔ حضور نے فرمایا جو چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مضائقہ نہیں ہے جب تک اُس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مسند احمد، اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عمرو بن حزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (یا سانپ) کاٹے کو جھاڑتے تھے۔ مگر آپ نے اس کام سے منع فرما دیا ہے۔ پھر انہوں نے وہ چیز آپ کو سنائی جو وہ پڑھتے تھے۔ آپ نے فرمایا "اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں پاتا، تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے" جابر بن عبد اللہ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آل حزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضور نے ان کو اس کی اجازت دیدی۔ اس کی تائید مسلم، مسند احمد، اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضور نے انصار کے ایک خاندان کو زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مسند احمد اور ترمذی اور مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت انس سے بھی اس سے ملتی جلتی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں حضور نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، اور ذباب کے مرض اور نظر بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

۱۔ ان خاتون کا اصل نام لیلیٰ تھا، مگر شفا بنت عبد اللہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ہجرت سے پہلے ایمان لائیں۔ قریش کے خاندان بنی عدی سے ان کا تعلق تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک فرد حضرت عمرؓ تھے۔ اس طرح یہ حضرت حفصہؓ کی رشتہ دار ہوتی تھیں۔

مُسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت عمیرؓ مولیٰ ابی القحطم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا فلاں فلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

مؤطا میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودی یوان کو جھاڑ رہی ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب اگر توراہ یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تب بھی یہ جائز ہے۔

یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ حضورؐ نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبی معالجہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرنے۔ اب اگر دوا اور علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسمائے حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے، یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبعی املا دمیتر نہ ہو اللہ ہی کی طرف رجوع کر کے اس کے کلام اور اسماء و صفات سے استعانت کی جائے تو یہ مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو، جہاں وہ میسر ہو، جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے، اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مطب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمانی کا ذریعہ بنالیں۔

اس معاملہ میں بہت سے لوگ حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں

لے مادہ پرست دنیا کے بھی بہت سے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ دعا اور رجوع الی اللہ مریضوں کی شفا یا بی میں بہت کارگر چیز ہے۔ اور اس کا خود مجھے ذاتی طور پر اپنی زندگی میں دو مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے منانے میں آگے گئی اور ۱۶ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو وہی میرا علاج فرما دے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے بہت گئی اور ۲۰ برس تک ہٹی رہی یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پتھر تکلیف دی اور اس کو آپریشن کر کے نکالا گیا۔ دوسری مرتبہ جب ۱۹۵۳ء میں مجھے گرفتار کیا گیا تو میری دونوں پنڈلیاں کٹی بیٹھے سے داد کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور کسی علاج سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے پھر وہی دعا کی جو ۱۹۴۸ء میں کی تھی اور کسی علاج اور دعا کے بغیر پنڈلیاں داد سے بالکل صاف ہو گئیں آج تک پتھر کبھی وہ بیماری مجھے نہیں ہوئی۔

جو بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں منقول ہوئی ہے اور اس کی تائید بخاری میں ابن عباس کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضور نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں حضرت ابوسعید خدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستہ میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھہرے اور انہوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ ان مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابوسعید نے کہا ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے اس لیے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انہوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابوسعید نے جا کر اس پر سورۃ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لعاب دھن اس پر پڑھتے گئے۔ آخر کار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لاکر دے دیں۔ مگر ان حضرات نے آپس میں کہا ان بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجر لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضور نے ہنس کر فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ جھاڑنے کے کام بھی آسکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصہ بھی لگاؤ۔

لیکن اس حدیث سے تعویذ، گندے اور جھاڑ پھونک کے مطب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابوسعید خدری نے یہ کام کیا تھا اور حضور نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا، بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصہ بھی لگاؤ، تاکہ اس کے جواز و عدم جواز کے معاملہ میں ان اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانے میں بھی یہ تھے اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دوکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خور و نوش خرید سکے، ان حالات میں یہ بات عرب کے معروف اصولِ اخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اس سے انکار کے معنی بسا اوقات مسافروں کے لیے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اس طرزِ عمل کو میسوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے اس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کر دیا تھا تو ان کے سردار کا علاج کرنے

سے اکثر روایات میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عمل کرنے والے حضرت ابوسعید تھے۔ بلکہ ان میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ حضرت

ابوسعید خود اس مہم میں شریک تھے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں دونوں باتوں کی صراحت ہے۔

سے انہوں نے بھی انکار کر دیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کے بھروسے پر سورہ فاتحہ اُس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہو گیا تو طے شدہ اجرت قبیلے والوں نے لا کر دے دی اور حضور نے اس اجرت کے لینے کو طلال و طیب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کی جو روایت ہے اس میں حضور کے الفاظ یہ ہیں کہ ان احق ما اخذتم علیہا جزا کتاب اللہ یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمہارے لیے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس پر اجرت لی۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے، علاوہ بریں اس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حق تبلیغ بھی ادا ہو گیا کہ انہیں اس کلام کی برکت معلوم ہو گئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اس واقعہ کو ان لوگوں کے لیے نظیر قرار نہیں دیا جاسکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مطب چلاتے ہیں اور اسی کو انہوں نے وسیلہ معاش بنا رکھا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین اور ائمہ سلف کے ہاں نہیں ملتی۔

سورہ فاتحہ اور ان سورتوں کی مناسبت | آخری چیز جو معوذتین کے بارے میں قابل توجہ ہے وہ قرآن کے آغاز اور اختتام کی مناسبت ہے۔ اگرچہ قرآن مجید ترتیب نزول پر مرتب نہیں کیا گیا ہے، مگر ۲۳ سال کے دوران میں مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خود نہیں بلکہ ان کے نازل کرنے والے خدا کے حکم سے اُس شکل میں مرتب فرمایا جس میں ہم اب اس کو پاتے ہیں۔ اس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام معوذتین پر۔ اب ذرا دونوں پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آغاز میں اللہ رب العالمین، رحمان و رحیم، اور مالک یوم الدین کی حمد و ثنا کر کے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی میں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور سب سے بڑی مدد جو مجھے درکار ہے وہ یہ ہے کہ مجھے سیدھا راستہ بتائیے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اُسے پورا قرآن دیا جاتا ہے، اور اس کو ختم اس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو رب الفلق، رب الناس، ملک الناس اور اہل الناس ہے، عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر نفع اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں، اور خصیصیت کے ساتھ شیاطین جن و انس کے دوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ اُس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

سُورَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ
غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴
وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝۵

کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے،
اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں)
کے شر سے، اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے۔ ۵

۱۔ چونکہ قُلْ (کہو) کا لفظ اس پیغام کا ایک حصہ ہے جو تبلیغ رسالت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا
دہی نازل ہوا ہے، اس لیے اگر چہ اس ارشاد کے اولین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر آپ کے بعد ہر
مومن بھی اس کا مخاطب ہے۔

۲۔ پناہ مانگنے کے فعل میں لازماً تین اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ ایک بجائے خود پناہ مانگنا۔ دوسرے پناہ
مانگنے والا۔ تیسرا وہ جس کی پناہ مانگی جائے۔ پناہ مانگنے سے مراد کسی چیز سے خوف محسوس کر کے اپنے آپ کو اس سے
بچانے کے لیے کسی دوسرے کی حفاظت میں جانا، یا اس کی آڑ لینا، یا اس سے لپٹ جانا یا اس کے سایہ میں چلا جانا ہے۔
پناہ مانگنے والا ہر حال دہی شخص ہوتا ہے جو محسوس کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے اس کا مقابلہ وہ خود نہیں کر
سکے گا بلکہ وہ اس کا حاجت مند ہے کہ اس سے بچنے کے لیے دوسرے کی پناہ لے۔ پھر جس کی پناہ مانگی جاتی ہے وہ
لازماً کوئی ایسا ہی شخص یا وجود ہوتا ہے جس کے متعلق پناہ لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس خوفناک چیز سے دہی اس کو بچا سکتا
ہے۔ اب پناہ کی ایک قسم تو وہ ہے جو قوانین طبعی کے مطابق عالم اسباب کے اندر کسی محسوس مادی چیز یا شخص یا طاقت
سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن کے حملہ سے بچنے کے لیے کسی قلعہ میں پناہ لینا، یا گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے
خندق یا کسی دلدردے یا کسی دیوار کی آڑ لینا، یا کسی طاقت ور ظالم سے بچنے کے لیے کسی انسان یا قوم یا حکومت کے پاس پناہ
لینا، یا دھوپ سے بچنے کے لیے کسی درخت یا عمارت کے سایہ میں پناہ لینا۔ بخلاف اس کے دوسری قسم وہ ہے جس میں
ہر طرح کے خطرات اور ہر طرح کی مادی، اخلاقی یا روحانی مضرتوں اور نقصان رساں چیزوں سے کسی فوق الفطری ہستی

کی پناہ اس عقیدے کی بنا پر مانگی جاتی ہے کہ وہ ہستی عالم اسباب پر حکمراں ہے اور بالآخر از حد و ادراک طریقے سے وہ اس شخص کی ضرورت حفاظت کر سکتی ہے جو اس کی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ پناہ کی یہ دوسری قسم ہی نہ صرف سورہ فلق اور سورہ ناس میں مراد ہے بلکہ قرآن اور حدیث میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد ہی خاص قسم کی پناہ ہے۔ اور عقیدہ توحید کا لازمہ یہ ہے کہ اس نوعیت کا تعوذ یا استعاذہ (پناہ مانگنا) اللہ کے سوا کسی اور سے نہ کیا جائے۔

مشرکین اس نوعیت کا تحفظ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں، مثلاً جنوں یا دیویوں اور دیوتاؤں سے مانگتے تھے اور آج بھی مانگتے ہیں۔ مادہ پرست لوگ اس کے لیے بھی مادی ذرائع و وسائل ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، کیونکہ وہ کسی فوق الفطری طاقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مومن ایسی تمام آفات و بلیات کے مقابلے میں، جن کو دفع کرنے پر وہ خود اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتا، صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اسی کی پناہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرکین کے متعلق قرآن میں بیان کیا گیا ہے:

وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالِ مِن الْجِنِّ، "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے" (الجن - ۶) اور اس کی تشریح کرتے ہوئے ہم سورہ جن حاشیہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کو جب رات کسی سسنان وادی میں گزارنی پڑتی تو وہ پکار کر کہتے "ہم اس وادی کے رب کی (یعنی اُس جن کی جو اس وادی پر حکمراں ہے) یا اس وادی کا مالک ہے، پناہ مانگتے ہیں۔ بخلاف اس کے فرعون کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی پیش کردہ عظیم نشانیوں کو دیکھ کر فتویٰ ہو گیا، "وہ اپنے بل بوتے پر اُٹھ گیا" (الذاریات، ۳۹)۔ لیکن خدا پرستوں کا رویہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس چیز کا بھی وہ خوف محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ مادی ہو یا اخلاقی یا روحانی، اس کے شر سے بچنے کے لیے وہ خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریم کے متعلق بیان ہوا ہے کہ جب اچانک تنہائی میں خدا کا فرشتہ ایک مرد کی شکل میں ان کے سامنے آیا (جب کہ وہ نہ جانتی تھیں کہ یہ فرشتہ ہے) تو انہوں نے کہا اَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا، "اگر تو خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے تو میں تجھ سے خدا سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں" (مریم - ۱۸)۔ حضرت نوح نے جب اللہ تعالیٰ سے ایک بے جادے کی اور جواب میں اللہ کی طرف سے اُن پر ڈانٹ پڑی تو انہوں نے فوراً عرض کیا رَبِّ اِنِّيْ اَعُوذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ، "میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے" (ہود - ۷)۔ حضرت موسیٰ نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں، تو انہوں نے جواب میں فرمایا اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ "میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں کی سی بائیں کروں" (البقرہ - ۶۷)۔

یہی شان اُن تمام تعوذات کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتب حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے

طور پر حضور کی حسب ذیل دعاؤں کو ملاحظہ کیجیے:

عن عائشة ان النبي صلى

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی

الله عليه وسلم كان يقول في دعائه

دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ "خدا یا میں تیری پناہ مانگتا ہوں

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا
عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ أَعْمَلْ
(مسلم)

اُن کاموں کے شر سے جو میں نے کیے اور ان کاموں کے شر سے جو
میں نے نہیں کیے (یعنی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کے
برے نتیجے سے پناہ مانگتا ہوں، اور اگر کوئی کام جو کرنا چاہیے تھا
میں نے نہیں کیا تو اس کے نقصان سے بھی پناہ مانگتا ہوں، یا
اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو کام نہ کرنا چاہیے وہ میں
کبھی کر گزروں)۔

عن ابن عمر كان من دعاء
رسول الله صلى الله عليه وسلم
اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ
نِعْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ،
وَفُجْأَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيعِ سَخَطِكَ.
(مسلم)

ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "خدا یا میں تیری پناہ مانگتا ہوں
اس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھین جائے، اور تجھ
سے جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نصیب نہ رہے، اور تیرا
غضب یا ایک ٹوٹ پڑے، اور پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح
کی ناراضی سے"۔

عن زيد بن ارقم كان رسول الله صلى
الله عليه وسلم يقول اللهم اني اعوذ بك
من علم لا ينفع ومن قلب لا يجتهد ومن
نفس لا تشبع ومن دعوة لا يستجاب (مسلم)
عن ابى هريرة كان رسول الله صلى
الله عليه وسلم يقول اللهم اني اعوذ
بك من الجوع فانه يئس للضعيف ولتؤذ
بك من الخيانة فانه يئس البطانة
(ابوداؤد)

زيد بن ارقم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے
تھے "خدا یا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُس علم سے جو نافع نہ ہو،
اس دل سے جو تیز اخوف نہ کرے، اس نفس سے جو کبھی سیر نہ
ہو، اور اس دعا سے جو قبول نہ کی جائے"۔
حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم فرماتے تھے "خدا یا میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے
کیونکہ وہ بدترین چیز ہے جس کے ساتھ کوئی رات گزارے،
اور تیری پناہ مانگتا ہوں خیانت سے کیونکہ وہ بڑی
بد باطنی ہے۔"

عن انس بن النبي صلى الله عليه وسلم
كان يقول اللهم اني اعوذ بك من البرص
والجنون والجذام وسبي الاسقام (ابوداؤد)
عن عائشة ان النبي صلى الله عليه
وسلم كان يدعو بهذا لعل الكلمات
اللهم اني اعوذ بك من غنسة النار ومن

حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "خدا یا میں تیری پناہ مانگتا ہوں
کوڑھ اور جنون اور جذام اور تمام بری بیماریوں سے"۔
حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حضور ان کلمات
کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے "خدا یا میں تیری پناہ مانگتا
ہوں آگ کے فتنے سے اور مالداروں اور مفلسوں کے

شَرِّ الْعَفْوَ وَالْعَفْوِ (ترمذی و ابوداؤد) شَرِّسے ۱
 عَنْ قُطَيْبَةَ بْنِ مَالِكٍ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ مُتَكَرِّرِ
 الْأَخْلَاقِ وَالْأَعْمَالِ وَالْأَهْوَاءِ (ترمذی) اور میری خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۲

شکل بن مجید نے حضور سے عرض کیا مجھے کوئی دعا بتائیے۔ فرمایا کہہو:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي
 وَمِنْ شَرِّ بَصَرِي وَمِنْ شَرِّ لِسَانِي
 وَمِنْ شَرِّ قَلْبِي وَمِنْ شَرِّ مَنِيَّتِي
 (ترمذی و ابوداؤد)

خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کے
 شر سے، اور اپنی بصارت کے شر سے، اور اپنی زبان
 کے شر سے، اور اپنے دل کے شر سے، اور اپنی شہوت
 کے شر سے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي
 أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَمَمِ
 وَالْبُخْلِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ
 فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ (وفی روایة
 لِمُسْلِمٍ) وَضَلَمِ الدِّينِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ
 (بخاری و مسلم)

انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی
 اور سستی اور بزدلی اور بڑھاپے اور بخل سے، اور
 تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب اور زندگی و موت
 کے فتنے سے (اور مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے)
 اور قرص کے بوجھ سے اور اس بات سے کہ لوگ مجھ پر
 غالب ہوں ۳

عَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ حَكِيمِ السُّلَمِيَّةِ
 سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 يَقُولُ مَنْ تَزَلَّ مَنْزِلًا ثُمَّ قَالَ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ
 اللَّهِ الثَّمَاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَهُ بَيْتُهُ
 شَيْءٌ حَتَّى يَرْتَحِلَ مِنْ ذَلِكَ الْمَنْزِلِ (مسلم)

خولہ بنت حکیم سلمیہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی نئی منزل پر اتارے
 اور یہ الفاظ کہے کہ "میں اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ
 مانگتا ہوں مخلوقات کے شر سے، تو اسے کوئی چیز نقصان
 نہ پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس منزل سے کوچ کر جائے۔

یہ حضور کے چند تعویذات بطور نمونہ ہم نے احادیث سے نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا کام
 ہر خطرے اور شر سے خدا کی پناہ مانگنا ہے نہ کہ کسی اور کی پناہ، اور نہ اس کا یہ کام ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر وہ
 اپنے آپ پر بھروسہ کرے۔

۱۱ اصل میں لفظ رَبُّ الْفَلَقِ استعمال ہوا ہے۔ فلق کے اصل معنی بچاڑنے کے ہیں۔ مفسرین کی
 عظیم اکثریت نے اس سے مراد رات کی تاریکی کو بچاڑ کر سپیدہ صبح نکالنا لیا ہے کیونکہ عربی زبان میں فَلَاقُ الصُّبْحِ کا
 لفظ طلوع صبح کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے فَالِقُ الْإِصْبَاحِ کے الفاظ استعمال

ہونے میں یعنی ”وہ عجرات کی تاریکی کو بچاؤ کر صبح نکالتا ہے“ (الانعام۔ ۹۶)۔ فلق کے دوسرے معنی خلق بھی بنے گئے ہیں، کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی چیز کو بچاؤ کر نکلتی ہیں۔ تمام نباتات بیج اور زمین کو بچاؤ کر اپنی کونپل نکالتے ہیں۔ تمام حیوانات یا نورم مادر سے برآمد ہوتے ہیں، یا انڈا توڑ کر نکلتے ہیں، یا کسی اور مانع ظہور چیز کو چیر کر باہر آتے ہیں۔ تمام چشمے پہاڑ یا زمین کو شق کر کے نکلتے ہیں۔ دن رات کا پردہ چاک کر کے نمودار ہوتا ہے۔ بارش کے قطرے بادلوں کو چیر کر زمین کا رخ کرتے ہیں۔ غرض موجودات میں سے ہر چیز کسی نہ کسی طرح کے انشفاق کے نتیجے میں عدم سے وجود میں آتی ہے، حتیٰ کہ زمین اور سارے آسمان بھی پہلے ایک ڈھیر تھے جن کو بچاؤ کر انہیں جدا جدا کیا گیا، کانتار تَفَقًّا فَفَتَقْنَهُمَا (الانبیاء۔ ۳۰)۔ پس اس معنی کے لحاظ سے فلق کا لفظ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ اب اگر پہلے معنی لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں طلوع صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں۔ اور دوسرے معنی لیے جائیں تو مطلب ہوگا میں تمام خلق کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات چھوڑ کر اُس کا اسم صفت ”رب“ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ پناہ مانگنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ”رب“ یعنی مالک و پروردگار اور آقا و مہتری ہونے کی صفت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ پھر سَابِ الْفَلَقُ سے مراد اگر طلوع صبح کا رب ہو تو اس کی پناہ لینے کے معنی یہ ہوں گے کہ جو رب تاریکی کو چھانٹ کر صبح روشن نکالتا ہے میں اس کی پناہ لیتا ہوں تاکہ وہ آفات کے ہجوم کو چھانٹ کر میرے لیے عافیت پیدا کر دے، اور اگر اس سے مراد سَابِ خَلْقُ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ میں ساری خلق کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تاکہ وہ اپنی مخلوق کے شر سے مجھے بچائے۔

۵۷ بالفاظ دیگر تمام مخلوقات کے شر سے میں اُس کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس فقرے میں چند باتیں قابل غور ہیں: اول یہ کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی، بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اُن شرور سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ نے پیدا کیے ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ اُن چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اُس نے پیدا کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کے لیے ہوتا ہے، البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اُس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ اُن کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، اُن سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ اگر صرف اسی ایک فقرے پر اکتفا کیا جاتا اور بعد کے فقروں میں خاص خاص قسم کی مخلوقات کے شرور سے الگ الگ خدا کی پناہ مانگنے کا نہ بھی ذکر کیا جاتا تو یہ فقرہ مدعا پورا کرنے کے لیے کافی تھا، کیونکہ اس میں ساری ہی مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگ لی گئی ہے۔ اس عام استعاذے کے بعد چند مخصوص شرور سے پناہ مانگنے کا ذکر خود بخود یہ معنی دیتا ہے کہ ویسے تو میں خدا کی پیداکر ہوتی ہر مخلوق کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن خاص طور پر وہ چند شرور جن کا ذکر سورہ فلق کی باقی آیات اور سورہ ناس میں کیا گیا ہے، ایسے ہیں جن سے خدا کی امان پانے کا میں بہت محتاج ہوں۔

سوم یہ کہ مخلوقات کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے موزوں ترین اور موثر ترین استعاذہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو

وہ یہ ہے کہ اُمی کے خالق کی پناہ مانگی جائے، کیونکہ وہ بہر حال اپنی مخلوق پر غالب ہے، اور اُن کے ایسے شر در کو بھی جانتا ہے جنہیں ہم جانتے ہیں اور ایسے شرور سے بھی واقف ہے جنہیں ہم نہیں جانتے۔ لہذا اُس کی پناہ گویا اُس حاکم اعلیٰ کی پناہ ہے جس کے مقابلے کی طاقت کسی مخلوق میں نہیں ہے، اور اس کی پناہ مانگ کر ہم ہر مخلوق کے ہر شر سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، خواہ وہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ نیز اس میں دنیا ہی کے نہیں آخرت کے بھی ہر شر سے استغاثہ شامل ہے۔

چہاں ہم یہ کہ شر کا لفظ نقصان، ضرر، تکلیف اور الم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اُن اسباب کے لینے بھی جو نقصان و ضرر اور تکلیف و الم کے موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا جنگ میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ سے ڈسا جانا، اولاد کی موت کے غم میں مبتلا ہونا، اور ایسے ہی دوسرے شر در پہلے معنی میں شر ہیں، کیونکہ یہ سچے خود تکلیف اور آذیت ہیں۔ بخلاف اس کے مثال کے طور پر کفر، شرک، اور ہر قسم کے گناہ اور ظلم دوسرے معنی میں شر ہیں کیونکہ ان کا انجام نقصان اور ضرر ہے اگرچہ بظاہر ان سے فی الوقت کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو، بلکہ بعض گناہوں سے لذت ملتی یا نفع حاصل ہوتا ہو، پس شر سے پناہ مانگنا ان دونوں مفہومات کا جامع ہے۔

پہنچ یہ کہ شر سے پناہ مانگنے میں دو مفہوم اور بھی شامل ہیں۔ ایک یہ کہ جو شر واقع ہو چکا ہے، بندہ اپنے خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ وہ اسے دفع کر دے۔ دوسرے یہ کہ جو شر واقع نہیں ہوا ہے، بندہ یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا مجھے اُس شر سے محفوظ رکھے۔

۵۵ مخلوقات کے شر سے عموماً خدا کی پناہ مانگنے کے بعد اب بعض خاص مخلوقات کے شر سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ آیت میں غَاسِقِیْ اِذَا وَقَبَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ غاسقِی کے لغوی معنی تاریک کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ الرِّشَادِ بِوَابِ اَنْحِالِ الصَّلٰوةِ اَلِدُّ لَوْلِہِ الشَّمْسِ اِلٰی عَسَنِ الْبَلِّ ” نماز قائم کر زوال آفتاب کے وقت سے رات کے اندھیرے تک“ (بنی اسرائیل - ۷۸)۔ اور وَقَب کے معنی داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں۔ رات کی تاریکی کے شر سے خاص طور پر اس لیے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اکثر جرائم اور مظالم رات ہی کے وقت ہوتے ہیں۔ موزی جانور بھی رات ہی کو نکلتے ہیں۔ اور عرب میں طوائف الملوکی کا جو حال ان آیات کے نزول کے وقت تھا اس میں تو رات بڑی خوفناک چیز تھی، اس کے اندھیرے میں چھاپہ مار نکلتے تھے اور بستیوں پر غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے وہ بھی رات ہی کے وقت آپ کو قتل کر دینے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے تاکہ قاتل کا پتہ نہ چل سکے۔ اس لیے اُن تمام شرور و آفات سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا جو رات کے وقت نازل ہوتی ہیں۔ یہاں اندھیری رات کے شر سے طلوع فجر کے رب کی پناہ مانگنے میں جو لطیف مناسبت ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ متعدد صحیح احادیث میں حضرت عائشہ کی یہ روایت آئی ہے کہ رات کو چاند نکلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اُس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ

اشد کی پناہ مانگو، هذا الفاسق اذا وقب، یعنی یہ الفاسق اذا وقب ہے، احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ۔ اس کی تاویل میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اذا وقب کا مطلب یہاں اذا خسف ہے، یعنی جبکہ وہ گہنا جائے یا چاند گرہن اس کو ڈھانک لے۔ لیکن کسی روایت میں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ جس وقت حضور نے چاند کی طرف اشارہ کر کے یہ بات فرمائی تھی اس وقت وہ گرہن میں تھا۔ اور لغت عرب میں بھی اذا وقب کے معنی اذا خسف کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ چاند نکلنے کا وقت چونکہ رات ہی کو ہوتا ہے، دن کو اگر چاند آسمان پر ہوتا بھی ہے تو روشن نہیں ہوتا، اس لیے حضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے (یعنی چاند کے) آنے کے وقت یعنی رات سے خدا کی پناہ مانگو، کیونکہ چاند کی روشنی مدافعت کرنے والے کے لیے اتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی حملہ کرنے والے کے لیے ہوتی ہے، اور جرم کا شکار ہونے والے کے لیے اتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی مجرم کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان الشمس اذا غابت انتشت الشیاطین، ناکفتوا صبیانکم و احبسا مواشیکم حتی تنهب فحمة العشاء جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں، لہذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہو جائے۔

۱۱ اصل الفاظ میں نَفَاثَاتٌ فِي الْعُقَدِ۔ عُقَدٌ جمع ہے عُقْدَةٌ کی جس کے معنی گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً تانگے یا رسی میں ڈالی جاتی ہے۔ نَفْثٌ کے معنی پھونکنے کے ہیں۔ نَفَاثَاتٌ جمع ہے نَفَاثَةٌ کی جس کو اگر علامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والے مرد ہوں گے، اور اگر اسے مؤنث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور نفوس یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مؤنث ہیں۔ گرہ میں پھونکنے کا لفظ اکثر، بلکہ تمام تر مفسرین کے نزدیک جادو کے لیے استعارہ ہے، کیونکہ جادو گر عموماً کسی ڈور یا تانگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکنے جاتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طلوع فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جادو گروں یا جادو گریوں کے شر سے۔ اس مفہوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آکر حضور کو معوذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی، اور معوذتین میں ہی ایک فقرہ ہے جو براہ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی اور زکریا بن محمد نے نَفَاثَاتٌ فِي الْعُقَدِ کا ایک اور مفہوم بھی بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکاری، اور مردوں کے عزائم اور آراء اور خیالات پر ان کی اثر اندازی ہے اور اس کو جادو گری سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ عورتوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اگر چہ پُر لطف ہے، لیکن اس تفسیر کے خلاف ہے جو سلف سے مسلم چلی آتی ہے۔ اور ان حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں معوذتین نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔

بیان کر چکے ہیں۔

جادو کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر بڑا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواحِ خبیثہ



یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے اس لیے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا
يُعَلِّمُونَ النَّاسَ الْمَيْخَرَةَ، "سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیطان نے کفر کیا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے"
(البقرہ - ۱۰۲)۔ لیکن اگر اُس میں کوئی کلمہ کفر یا کوئی فعلِ شرک نہ بھی ہو تو وہ بالانفاق حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے اُسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت
ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا سات غارت گریزوں سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول
اللہ؟ فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا،
یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا، اور تھوپی بھالی عقیقہ مومن عورتوں پر
رنا کی تہمت لگانا۔

۷ حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت یا فضیلت یا خوبی عطا کی ہو اس پر کوئی دوسرا
شخص جلے اور یہ چاہے کہ وہ اُس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے یا کم از کم یہ کہ اُس سے ضرور چھین جائے۔ البتہ
حسد کی تعریف میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ جو فضل دوسرے کو ملا ہے وہ مجھے بھی مل جائے۔ یہاں
حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اُس حالت میں مانگی گئی ہے جب کہ وہ حسد کرے، یعنی اپنے دل کی آگ بجھانے
کے لیے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ جب تک وہ کوئی اقدام نہیں کرتا اُس وقت تک اُس کا جلنا بجائے
خود چاہے بڑا سہی، مگر محسود کے لیے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ پھر جب ایسا شر کسی حاسد سے
ظاہر ہو تو اُس سے بچنے کے لیے اولین تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ اس کے ساتھ حاسد کے شر سے امان
پانے کے لیے چند چیزیں اور بھی مددگار ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ جب تک
اللہ نہ چاہے کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے، بے صبر ہو کر ایسی باتیں یا
کارروائیاں نہ کرنے لگے جن سے وہ خود بھی اخلاقی طور پر حاسد ہی کی سطح پر آجائے۔ تیسرے یہ کہ حاسد خواہ
خدا سے بے خوف اور خلق سے بے شرم ہو کر کیسی ہی بہبودہ حرکتیں کرتا رہے، محسود بہر حال تقویٰ پر قائم رہے۔
چوتھے یہ کہ اپنے دل کو اُس کی فکر سے بالکل فارغ کرے اور اُس کو اس طرح نظر انداز کر دے کہ گویا وہ بے ہی نہیں۔
کیونکہ اُس کی فکر میں پڑنا حاسد سے مغلوب ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش
آنا تو درکنار، جب کبھی ایسا موقع آئے کہ محسود اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا برتاؤ کر سکتا ہو تو ضرور ایسا ہی
کرے، قطع نظر اس سے کہ حاسد کے دل کی جلن محسود کے اس نیک رویہ سے مٹتی ہے یا نہیں۔ چھٹے یہ کہ محسود توحید
کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس پر ثابت قدم رہے، کیونکہ جس دل میں توحید پسندی ہوئی ہو اس میں خدا کے خوف
کے ساتھ کسی اور کا خوف جگہ ہی نہیں پاسکتا۔

سُورَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ زَكَوٰتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۱ مَلِكِ النَّاسِ ۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۳ مِنْ شَرِّ
الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۴ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ ۵
مِنَ الْجَنَّةِ وَالنَّاسِ ۶

کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی
معبود کی اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں
وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

۱۔ یہاں بھی سورہ فلق کی طرح اعوذ باللہ کہنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کو اس کی تین صفات سے یاد کر کے اس کی
پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک اُس کا رب الناس، یعنی تمام انسانوں کا پروردگار و مرتی اور مالک و آقا ہوتا۔
دوسرے اُس کا ملک الناس، یعنی تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرمانروا ہونا۔ تیسرے، اُس کا الہ الناس، یعنی
انسانوں کا حقیقی معبود ہونا۔ (یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ الہ کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک
وہ شخص جس کو عبادت کا کوئی استحقاق نہ پہنچتا ہو مگر عملاً اُس کی عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرا وہ جسے عبادت کا استحقاق
پہنچتا ہو اور جو حقیقت میں معبود ہو، خواہ لوگ اس کی عبادت کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ اللہ کے لیے جہاں یہ لفظ
استعمال ہوا ہے اسی دوسرے معنی میں ہوا ہے)۔ ان تین صفات سے استعاذہ کا مطلب یہ ہوا کہ میں اُس خدا کی پناہ
مانگتا ہوں جو انسانوں کا رب، بادشاہ، اور معبود ہونے کی حیثیت سے اُن پر کامل اقدار رکھتا ہے، جو اپنے بندوں کی حفاظت
پر پوری طرح قادر ہے، اور جو واقعی اُس شر سے انسانوں کو بچا سکتا ہے جس سے خود بچنے اور دوسرے انسانوں کو بچانے کے
لیے میں اُس کی پناہ مانگ رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ وہی رب اور بادشاہ اور الہ ہے، اس لیے اُس کے سوا اور کوئی ہے
ہی نہیں جس سے میں پناہ مانگوں اور جو حقیقت میں پناہ دے بھی سکتا ہو۔

۲۔ اصل میں وَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وَسْوَاس کے معنی ہیں بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔
اور وَسْوَاس کے معنی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ
ڈالی جا رہی ہو اُسے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ انداز اُس کے دل میں ایک بری بات ڈال رہا ہے۔ وَسْوَاس کے لفظ

میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے، جیسے زلزلہ میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کی پے درپے کوشش کرنی ہوتی ہے، اس لیے ایسی کوشش کو وُسوسہ اور کوشش کرنے والے کو وُسواس کہا جاتا ہے۔ رہا لفظ ختناس، تو یہ خنوس سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد چھپے ہٹ جانے کے ہیں، اور ختناس چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے اس کے معنی یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے۔ اب یہ ظاہرات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی کے لیے آدمی کے پاس آنا پڑتا ہے، اور ساتھ ساتھ جب اسے ختناس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خورد بخورد یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ وسوسہ ڈال ڈال کر وہ چھپے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے درپے وسوسہ اندازی کے لیے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک مرتبہ اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش جب ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے، پھر وہی کوشش کرنے کے لیے دوبارہ، سہ بارہ اور بار بار آتا رہتا ہے۔

وسواس الخناس کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے، یعنی اس شر سے کہ وہ کہیں اس کے اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرے اس کے شر سے داعی حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعی الی الخناس کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ اس کی ذات کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جا رہے ہوں ان سب تک خود پیچھے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے۔ اس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر وسوسہ اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور ان کے الزامات کی جواب دہی کرنے میں لگ جائے۔ اس کے مقام سے یہ بات بھی فروتر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اترے ہوئے ہیں اسی پر خود بھی اتر آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعوت حق دینے والے کو ہدایت فرمائی کہ ایسے اشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا رہے۔ اس کے بعد ان سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ رب الناس، ملک الناس اور الہ الناس کا کام ہے۔

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ عمل شر کا نقطہ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثر انداز ہو جاتا ہے تو پہلے اس میں برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر مزید وسوسہ اندازی اس جبری خواہش کو جبری نیت اور برے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر اس سے آگے جب وسوسے کی تاثیر بڑھتی ہے تو ارادہ عزم بن جاتا ہے اور آخری قدم پھر عمل شر ہے۔ اس لیے وسوسہ انداز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وسوسہ اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے وہ کھلے کھلے کفر، شرک، دہریت، با اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اُکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دین اللہ

میں داخل ہی ہو جائے تو وہ اسے کسی نہ کسی بدعت کی راہ سمجھاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو سکے تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کر لینے میں تو کوئی مضائقہ نہیں، تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بار عظیم انسان پر لگ جائے۔ اس سے بھی اگر آدمی بچ نکلے تو بدرجہٴ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دین حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے، اُسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان تمام چالوں کو ناکام کر دے تو پھر شیاطین جن و انس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پل پڑتی ہے، اس کے خلاف لوگوں کو اکسانی اور بھڑکاتی ہے، اُس پر گالیوں اور الزامات کی بو بھچاڑ کراتی ہے، اسے ہر طرف بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر شیطان اُس مرد مومن کو آکر غصہ دلاتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے، اُٹھ اور ان حملہ آوروں سے بھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوت حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعی حق کو راہ کے کانٹوں سے الجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے بھی اگر داعی حق بچ نکلے تو شیطان اُس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے

وَمَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعًا فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ، "اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی اُکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو" (الاعراف ۲۰۰- لحم السجدہ ۳۶)۔ وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ، "کہو، میرے پروردگار میں شیاطین کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں" (المومنون ۹۷)

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَیْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا وَاِذَا هُمْ مُبْصِرُوْنَ، "جو لوگ پرہیزگار ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اُنہیں چھو بھی جائے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور پھر اُنہیں صحیح راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے" (الاعراف ۲۰۱)۔ اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان کے اس آخری حربے سے بچ سکیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا يَلْقَاهَا اِلَّا ذُوْ حِجَابٍ عَظِيْمٍ، "یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی" (لحم السجدہ ۳۵)۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی نگاہ میں رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ انسان کے دل میں دوسو سو انداز ہی صرف باہر سے شیاطین جن و انس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اُس کے اپنے غلط نظریات اُس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔ اُس کی اپنی نا جائز اغراض و خواہشات اُس کی قوت تمیز اور قوت ارادی اور قوت فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اور باہر کے شیاطین ہی نہیں، انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اُس کو بہکاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ایک جگہ فرمائی گئی ہے کہ وَنَعَلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُكَ (شق ۱۶)۔ اور ہم اُس کے اپنے نفس سے ابھرنے والے دوسو سوں کو جانتے ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشور خطبہ مسنونہ میں فرمایا ہے نَعُوْذُ بِاللَّهِ مِنْ شَرِّ وَاَنْفُسِنَا "ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے"۔

کے بعض اہل علم کے نزدیک ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ دوسو سو ڈالنے والا دو قسم کے لوگوں کے دلوں میں دوسو سو ڈالتا ہے، ایک جن دوسرے انسان۔ اس بات کو اگر تسلیم کیا جائے تو لفظ ناس کا اطلاق جن اور انسان دونوں پر ہو گا۔ وہ

خاتمہ

میں صحیح قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تفہیم القرآن لکھنے کا جو کٹھن کام میں نے محرم ۱۳۹۲ھ (فوری ۱۹۷۱ء) میں شروع کیا تھا وہ ۳۰ سال چار مہینے بعد آج پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ سراسر اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندے کو اپنی کتاب پاک کی یہ خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس میں جو کچھ صحیح و برحق ہے وہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کی بدولت ہے، اور جہاں کہیں میں نے قرآن کی ترجمانی و تفسیر میں غلطی کی ہے وہ میرے اپنے علم و فہم کا قصور ہے۔ لیکن الحمد للہ کہ میں نے کوئی غلطی جان بوجھ کر نہیں کی ہے اس لیے میں اللہ کے کرم سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے معاف فرما دے گا، اور میرے اس کام کے ذریعہ سے اگر اس کے بندوں کو ہدایت پانے میں کوئی مدد ملی ہے تو اس کو میری مغفرت کا ذریعہ بنا دے گا۔ اصحاب علم سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ میری غلطیوں پر مجھے متنبیہ فرمائیں۔ جس بات کا بھی غلط ہوتا دلیل سے مجھ پر واضح کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ اس کی اصلاح کروں گا۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کتاب اللہ کے معاملہ میں دانستہ غلطی کروں، یا کسی غلطی پر جا رہوں۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن اُس طرح سمجھاؤں جس طرح میں نے خود اسے سمجھا ہے، اُس کے اصل مفہوم و مدعا کو اس طرح کھول کر بیان کروں کہ لوگ قرآن کی روح تک پہنچ سکیں، اُن تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دوں اور اُن سوالات کے جواب دے دوں جو قرآن کو، یا اس کے محض ترجموں کو پڑھ کر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اُن چیزوں کی وضاحت کر دوں جنہیں قرآن مجید میں ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں میرے پیش نظر زیادہ تفصیل سے کام لینا تھا اس لیے پہلی جلد کے حواشی مختصر رہے۔ بعد میں جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، مجھے حواشی میں زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی گئی، بیان تک کہ بعد کی جلدوں کو دیکھنے والے اب پہلی جلد کو نشہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں مضامین کی تکرار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس مضمون کی تشریح ایک جگہ نشہ رہ گئی ہو وہ چونکہ بعد کی سورتوں میں بھی آیا ہے اس لیے ان کی پوری تشریح بعد کی سورتوں کے حواشی میں ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کو تفہیم القرآن کی مدد سے صرف ایک دفعہ پڑھنے پر اکتفا نہ کریں گے وہ پوری کتاب کو دوبارہ پڑھتے وقت خود محسوس کر لیں گے کہ بعد کی سورتوں کی تشریحات، ابتدائی سورتوں کے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

لاہور

ابوالاعلیٰ

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ

(۷ جون ۱۹۷۲ء)